اقلیتوں کے حقوق

اور

اسلاموفوبیا

اقلیتوں کے حقوق

اور

مغرب میں اسلاموفوبیا

''اقلیتوں کے حقوق، اس سلسلہ میں عہد نبوی کا اسوہ، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی تاریخ، عالم اسلام میں غیر مسلم اقلیت اور غیر مسلم اکثریت ممالک میں مسلمانوں کے مسائل اور اسلامی نقطہ نظر سے ان کا تجزیہ، نیز مغرب کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پھیلائی جانے والی نفرت کے اسباب، پس منظر اور ان کے حل پر سیر حاصل مقالات اور مباحثات کا مجموعہ جو جنوری ۲۰۱۰ء میں اکیڈمی کے تحت منعقد ہونے والے سیمنار کے لئے آنے والی تحریروں کا مجموعہ ہے''۔

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

نام کتاب	:	اقلیتوں کے حقوق اور مغرب میں اسلاموفوبیا
صفحات	:	۲۴۲
سن طباعت	:	جون ۲۰۱۱ء
قیمت	:	240/=
ISBN	:	978-81-910932-9-2
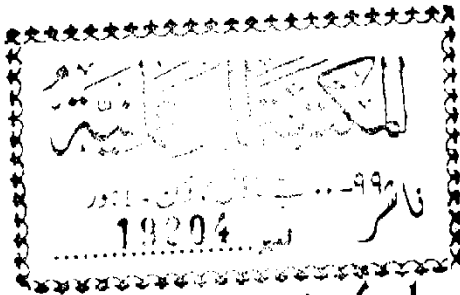
ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸
جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵
فون: 011-26981327
ای میل: ifapublications@gmail.com

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳- مولانا بدر الحسن قاسمی

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵- مولانا عتیق احمد بستوی

۶- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

فہرست

پانچواں باب - اسلاموفوبیا ۴۲۳

☆☆☆

پیش لفظ

چند صدیوں پہلے مختلف مذہبی اور نسلی اکائیاں الگ الگ بودوباش اختیار کرتی تھیں اور ان کے درمیان اختلاط و اشتراک بہت کم پایا جاتا تھا، اس لئے اقلیتوں کا وجود کم ہوتا تھا، سترہویں صدی کے انقلاب اور جمہوری نظام حکومت کے ارتقاء کے باعث صورت حال میں تبدیلی آئی ہے اور کثیر مذہبی، کثیر نسلی، کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی سماج کو ارتقا حاصل ہوا ہے، اس لئے آج بحیثیت مجموعی دنیا میں تعداد کے اعتبار سے اقلیتیں زیادہ ہیں، خود مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا میں مسلمان اقلیتوں کا تناسب پچاس فی صد ہے۔

ان حالات نے عالمی سطح پر اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ کو اہم بنا دیا ہے، بین الاقوامی قوانین میں بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، انسانی حقوق کے چارٹ میں اس کو شامل کیا گیا ہے، اور خود ہمارے ملک کے قانون میں بھی اس کی رعایت کی گئی ہے؛ کیونکہ اکثریت کا استبداد بعض اوقات اقلیت کے لئے معاشرہ کو ظلم وجور کی بھٹی بنا دیتا ہے، اسی لئے اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اقتدار اور غلبہ کے دور میں بڑی حد تک اس کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی نے ایک سمینار خاص اسی موضوع پر ۲، ۳؍جنوری ۲۰۱۰ء کو ہمدرد یونیورسٹی دہلی میں منعقد کیا، جس میں اسلامی، انسانی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اقلیتوں کے حقوق پر گفتگو کی گئی اور حقیقی صورت حال کا جائزہ لیا گیا، نیز فطری طور پر خصوصیت سے ہندوستان میں اقلیتوں کی جو صورت حال ہے، اس پر خصوصی توجہ دی گئی۔

موجودہ دور میں مسلمان اقلیتوں کے حقوق سے ایک اہم موضوع ''اسلاموفوبیا'' کا متعلق ہوگیا ہے، انسان فطری طور پر امن پسند اور انصاف پسند واقع ہوا ہے، لیکن جب کوئی انسانیت دشمن گروہ نفرت کی آگ سلگا دیتا ہے تو انسان اپنی فطرت سے ہٹ جاتا ہے اور امن و انصاف کو شرمسار ہونا پڑتا ہے، اہل مغرب بد قسمتی سے مختلف ادوار میں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈوں کا ہتھیار استعمال کرتے رہے ہیں، شاید کسی زمانہ میں یہودیوں کے خلاف بھی اس طرز عمل کو اختیار کیا گیا تھا، اس وقت مسلمانوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا جارہا ہے اور نفرت کی دیواریں اس طرح اٹھائی جارہی ہیں کہ ایک ہی سماج میں لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوں۔ خاص طور پر اسلاموفوبیا کی وجہ سے مسلمان اقلیتیں اپنے جائز حقوق سے محرومی کا شکار ہوتی ہیں، اسی پس منظر میں اقلیتوں کے حقوق سے متعلق اس موضوع سے اسلاموفوبیا کے عنوان کو بھی جوڑ دیا گیا۔

بحمد اللہ اس مجموعہ میں اپنے موضوع سے متعلق تعارفی اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے بہت اہم بحثیں آ گئی ہیں اور دینی نقطۂ نظر کے علاوہ عالمی اور عملی صورت حال پر بھی چشم کشا روشنی ڈالی گئی ہے، یہ تمام تحریریں اسی سمینار کا اثاثہ ہیں، اس مجموعہ کو اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفقاء مولانا صفدر زبیر ندوی، اور مولانا محمد سراج الدین قاسمی نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے، مجھے امید ہے کہ اصحاب ذوق کے لئے یہ ایک دستاویزی سوغات اور فکری سرمایہ ثابت ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

پہلا باب:

تمہیدی امور

الف: تعارفی کلمات

رپورٹ سمینار

سرکاری قانون اورشرعی نقطۂ نظر سے اقلیتوں کے حقوق کے موضوع پر نئی دہلی میں بروز شنبہ ویکشنبہ بتاریخ ۲-۳رجنوری ۲۰۱۰ء جامعہ ہمدردنئی دہلی کے کانفرنس ہال میں اسلامی تنظیم برائے تربیت وعلوم وثقافت (ISESCO) مراکش اور وزارت اوقاف واسلامی امورکویت کے مشترکہ تعاون سے اس کا انعقادعمل میں آیا، اس سمینار کے پروگرام اورسرگرمیوں میں ہندوستان کے اکابر علماء، یونیورسٹیوں کے اساتذہ وتعلیم یافتہ حضرات، مراکش سفارت خانہ نئی دہلی کے ارکان، ماہرین قوانین، ممتازشخصیات، اہل صحافت ومیڈیا، سیاسی قائدین، اوردینی واجتماعی تنظیموں کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔

یہ سمینار آٹھ اہم نشستوں پر مشتمل تھا، افتتاحی اوراختتامی نشستوں میں موضوع کے اہم گوشوں پر بحث کی گئی، اکیڈمی کو ماہرین کے مختلف محوروں کے متعلق بحوث حاصل ہیں جن کی تعداد ۴۲ ہے۔ جوحسب ذیل ہیں:

۱-عہدنبوی میں اقلیتوں کے حقوق-اصول اوراسوۂ نبوی۔

۲-اقلیتوں کے حقوق۔

۳-ہندوستان میں اقلیتوں کے دینی وثقافتی حقوق۔

۴-حکومتی وقومی نقطۂ نظر سے اقلیتوں کے حقوق۔

۵-عصرحاضرمیں مسلم اقلیات-حقائق ومشاکل کا مطالعہ۔

۶-اقلیات واسلاموفوبیا(اسلام سے خوف ونفرت)۔

۷-ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اوراقلیتوں کے حقوق۔

۹-ہندوستان میں اقلیتوں کے دینی وثقافتی حقوق۔

۱۰-اقلیتوں کے حقوق۔

۱۱-دستور ہند کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق۔

۱۲-یورپ میں اسلاموفوبیا۔

۱۳-مغربی واسلامی رسومات میں اقلیتوں کے حقوق-مطالعاتی تجزیہ۔

۱۴-اسلاموفوبیا وگلوبلائزیشن مغربی جمہوریت کی روشنی میں۔

۱۵-ہندوستان میں ہندو انتہاپسندی اور اسکا اثر۔

۱۶-اقلیتوں سے متعلق اسلامی اقدار۔

۱۷-مسلم اقلیت کے انسانی حقوق۔

۱۸-یورپی ممالک اور اقلیتوں کے بارے میں ان کا موقف۔

۱۹-اسلام اور امن کی زندگی

۲۰-دنیا کے معاصر اقلیتوں کے ساتھ سلوک -ایک تاریخی مطالعہ۔

۲۱-ہندوستان میں مسلم اقلیت۔

۲۲-ذرائع ابلاغ اور اسلامائزیشن۔

۲۳-اقلیتوں کے تعلیمی حقوق-مشکلات ومسائل۔

یہ بحوث ومقالات، قیمتی تجاویز وآراء پر مشتمل تھی جس کے ذریعہ سمینار اس مسئلہ سے متعلق قرارداد اور ایک بہتر نتیجہ کو پہنچا۔

اس سمینار میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اندر پرستھ یونیورسٹی، شرعی وقانونی کالجوں کے اساتذہ، جامعہ عثمانیہ، بھوپال یونیورسٹی، اڑیسہ یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی اور دیگر تنظیموں واداروں کے سربرآوردہ حضرات نے شرکت کی۔

اس سیمینار میں شرکت کرنے والے اہم شخصیات، اساتذہ وتعلیم یافتہ حضرات کے نام حسب ذیل ہیں:

١-مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی-لکھنؤ
٢-سابق جسٹس سید شاہ محمد قادری-حیدرآباد
٣-قاری سید محمد عثمان منصور پوری-دیوبند
٤-مولانا سید نظام الدین-پٹنہ
٥-جناب سید شہاب الدین-دہلی
٦-مولانا عمید الزماں کیرانویؒ-دہلی
٧-جناب اے پی بردھن-دہلی
٨-جناب مقبول احمد سراج-بنگلور
٩-برائے محکمۂ سفارت مغربی مملکت سفارت خانہ دہلی
١٠-مولانا خالد سیف اللہ رحمانی-حیدرآباد
١١-مولانا عتیق احمد بستوی-لکھنؤ
١٢-مولانا رفیق احمد قاسمی-دہلی
١٣-مولانا واضح رشید ندوی-لکھنؤ
١٤-ڈاکٹر فیضان مصطفیٰ-کٹک
١٥-جناب عبدالرشید اگوان-دہلی
١٦-جناب عبدالرحیم قریشی-حیدرآباد
١٧-پروفیسر عبدالباری-علی گڑھ
١٨-جناب سید وجیہ الدین-ممبئی

۱۹-ڈاکٹر عرشی خان-علی گڑھ

۲۰-ڈاکٹر اے۔ جی۔ نورانی-ممبئی

۲۱-ڈاکٹر عبدالرحیم بیجاپور-علی گڑھ

۲۲-پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی-علی گڑھ

۲۳-ڈاکٹر محمد سہراب-دہلی

۲۴-جناب مشتاق احمد ایڈوکیٹ-دہلی

۲۵-ڈاکٹر روی نائر-دہلی

۲۶-پروفیسر عبدالرحمٰن مومن-ممبئی

۲۷-ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس-دہلی

۲۸-جناب فیروز خان غازی ایڈوکیٹ-دہلی

۲۹-ڈاکٹر اقبال حسین-دہلی

۳۰-جناب شانتی بھائی پٹیل-گجرات

۳۱-ڈاکٹر شہاب الدین سنبھلی-حیدرآباد

۳۲-مولانا بابر حسین ندوی-بھوپال

۳۳-مولانا عبدالاحد فلاحی-ممبئی

۳۴-جناب جمیل الرحمٰن-پنجاب

۳۵-ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی

۳۶-ڈاکٹر سلطان احمد اصلاحی-علی گڑھ

پہلی نشست میں ''اقلیتوں کے حقوق اور اسلامائزیشن'' کے عنوان پر بحث ہوئی، ڈاکٹر فیضان مصطفیٰ، صدر قومی قانون یونیورسٹی نے صدارت کی، دوسری نشست کا موضوع: ''مسلمان

اور یورپی دنیا، کشمکش اور زندگی'' بصدارت عبد الرحیم قریشی، تیسری نشست کا موضوع: ''مسلم اقلیتوں کا مطالعہ اقلیت کی حیثیت سے'' بصدارت ڈاکٹر اے. جی نورانی، چوتھی نشست کا موضوع: ''اسلامی دنیا میں فرقہ وارانہ زندگی کے نمونے'' بصدارت پروفیسر عبد الباری، پانچویں نشست کا موضوع: ''اقلیتوں کے حقوق اور ہندوستانی مسلمانوں کے احوال'' بصدارت مقبول احمد سراج، چھٹی نشست کا موضوع: ''اسلاموفوبیا، اسلام سے نفرت وخوف کا مظہر، اس کے اسباب وعلل وعلاج'' بصدارت ڈاکٹر محمد افضل وانی۔

افتتاحی نشست کی کارروائی شنبہ کی صبح ۲؍جنوری کو ہوئی، جس میں ہندوستان کی مقتدر شخصیات کی حاضری ہوئی، اسی طرح عرب ممالک اور خاص کر مغربی ملک اور مختلف میدانوں کے جلیل القدر تعلیم یافتہ حضرات کی ایک جماعت نے شرکت کی، جس کی صدارت ناظم ندوۃ العلماء مولانا رابع حسنی ندوی نے فرمائی، اس کے بعد مولانا عتیق احمد بستوی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے علمی امور کے سکریٹری نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اور سمینار کے موضوع کی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کی، اور شرکاء سے اس موضوع کو سمجھنے کی امید کی، چونکہ موضوع تین پہلوؤں کا حامل ہے جو مکمل طور پر بحث ومباحثہ کا متقاضی ہے، تاکہ سمینار ایک اچھے نتیجے پر پہنچے۔

پھر ایسسکو کے کلمات عربی زبان میں پیش کیے گئے، اور اس کا اردو وانگریزی ترجمہ شرکاء میں تقسیم کیا گیا، سامعین نے پوری توجہ کے ساتھ ایسسکو کے کلمات سماعت فرمایا۔

اس کے بعد ہندوستانی سپریم کورٹ، عدالت عظمی کے سابق جج جناب شاہ محمد قادری نے اپنے افتتاحی کلمات پیش کیے جس میں موصوف نے مغربی اقوام کی سازشوں کو سمجھنے کی ضرورت اور قانونی طریقوں سے اس کا مقابلہ اور اس کو ختم کرنے کی مکمل تیاری پر زور دیا۔ اس بات پر توجہ دیتے ہوئے کہ تعبیر اور رائے کی آزادی دنیا کے کسی ملک میں بالکل نہیں ہے، اس کے باوجود اس حریت رائے کا سہارا لیکر مسلسل اسلام کے خلاف سازشیں اور فتنے بھڑکائے جا رہے ہیں، یہ

قابل افسوس بات ہے پھر موصوف نے قومی وحکومتی قوانین پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: یہ قوانین اقلیتی حقوق کو مکمل ضمانت عطا کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ اس پر اب عمل نہیں ہورہا ہے۔

اس کے بعد خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے صدارتی خطبے میں اسلامی احکام وقوانین کی روشنی میں اقلیتی حقوق پر سیر حاصل بحث کی، آپ نے فرمایا: اسلام مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے حقوق دیتا ہے۔ اور اسلامی حکومتوں نے اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک، مساوات اور عدل کا معاملہ کرتی رہی ہے، لیکن آج دنیا پر جمہوری نظام کا غلبہ ہو چکا ہے۔ اور اقلیت کو جو خوف ہمیشہ دامن گیر ہے وہ یہ کہ یہ نظام اپنی ذمہ داری سے انکار کرنے لگا ہے اور ظلم وزیادتی کی کوشش کررہا ہے، اکثریت اپنی عددی طاقت کے ہتھیار سے لیس ہوکر ظلم وجبر کرنے لگی ہے، جس سے اقلیت کو اپنی شناخت باقی رکھنا دشوار ہو گیا ہے اور اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمان اور دوسری مذہبی، لسانی اور جغرافیائی اقلیتیں اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔

محترم موصوف نے اسلامک فقہ انڈیا کے کاوشوں کو سراہا جو اقلیتی حقوق کے حقائق کو ظاہر کرنے اور اقلیتی مسائل سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے اور اکثریت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کررہی ہے، اس کے علاوہ پارلیمنٹ کے سابق رکن جناب محترم سید شہاب الدین نے اپنی بات کہی اور فرمایا کہ: اسلام سے خوف تو ایک ذہنی مرض ہے، جن ملکوں نے یہ بے جا پروپیگنڈہ کیا ہے کہ اسلام دنیا کا دشمن ہے وہ امریکا اور یورپ ہے اور موصوف نے پوری دنیا میں اسلام ومسلمانوں کے خلاف عامۃ الناس کے ذہنوں میں زہر ڈالنے اور پس پردہ مسلسل حملوں پر قلق اور افسوس ظاہر کیا، اس سلسلے میں انہوں نے یہودی قوم کی مثال دی جنہوں نے امریکا میں ظالمانہ حملوں کے خلاف دفاعی ''انجمن'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، جس کے ذریعہ یہودیوں کے خلاف ہونے والے حملے پر وہ فوری کاروائی کرتے ہیں اور یہ معاشرہ برق رفتاری

کے ساتھ بیدار ہو رہا ہے۔

محترم موصوف نے اس سلسلہ میں یہ مشورہ دیا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم حلقوں میں مسلمانوں کی سرگرمیوں میں کوئی کمی اور کوتاہی نہ ہو بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہو اور دیگر قوموں کے مسائل بھی اٹھائے جائیں، اس کے علاوہ صدر کانگریس پارٹی جناب اے بی بردھن نے اپنی گفتگو میں اپنے موقف کا اظہار کیا اور کہا کہ موجودہ جمہوری نظام نے اپنی معنویت کھودی ہے۔ اور اپنی صحیح شکل میں نہیں ہے۔ آنجناب نے اس بات کا اعتراف کیا کہ آج تمام سطح پر اقلیت کو تفریق و تمیز کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور مزید یہ کہا کہ اسلام سے دہشت گردی کو جوڑنے کی کوشش ایک گھٹیا اور ظالمانہ کوشش ہے، اور یہ کہ اب جو دہشت گردی کے اعمال مختلف صوبوں جیسے آسام و ناگالینڈ میں ہو رہے ہیں یہ ہمارے سامنے بہت سارے سوالات کھڑے کرتے ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہاد کے بارے میں اسلام کا موقف واضح ہے۔ اور امریکا نے جہاد کا لفظ دیا ہے بالخصوص ۱۱ر ستمبر کو عالمی تجارت کے مرکز پر حملہ کے بعد سے یہ شروع ہوا۔ اور اس کے لئے نئے معانی ایجاد کئے گئے، اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کے لئے لہٰذا مسلمان پر ضروری ہے کہ عوامی حلقوں میں جہاد کے اصل معنی کی ترویج واشاعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

اس مناسبت سے محترم مولانا نظام الدین جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ وامیر امارت شرعیہ پٹنہ نے اپنی تقریر میں حاضرین کی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہوئے کہا کہ اکثریت و اقلیت موجودہ سیاست کی پیداوار ہے اور یہ نئی اصطلاح بغیر ادائیگی حقوق کے حامل ہے۔ جناب والا نے حقوق اور ادائیگی حقوق کے مابین فرق واضح کرتے ہوئے کہا کہ عدل ومساوات حقوق کے ادا کرنے میں ہے نہ کہ خود حقوق میں۔ اور آج اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈوں اور افواہوں کے خلاف نبرد آزمائی کی ضرورت ہے۔

عمید الزماں کیرانوی کارگزار صدر تنظیم ابناء قدیم دار العلوم دیوبند نے اپنی تقریر میں کلمۂ

''اسلاموفوبیا'' (اسلام سے خوف) کی تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اس کے متداول معنی کو پیش کیا۔ اس تاریخی کلمہ کی ایجاد کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی شان میں گمراہ کن مفہوم تمام قسم کے غلط افکار کا خاتمہ اور تمام سطحوں پر اس کی ازالہ کے ضرورت پر زور دیا۔

اس افتتاحی نشست کے اختتام پر مولانا محمد رابع حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے صدارتی خطاب میں ہندوستان اور پوری دنیا کے ممالک کے احوال کی تصویر کشی کی جن کا موقف اسلام اور مسلمانوں سے جانی دشمن کی طرح ہے۔ ان کے خلاف مسلسل کھوکھلے پروپیگنڈے کرتے رہتے ہیں یہاں تک ''کلمہ جہاد'' دہشت گردی کے مترادف ہوگیا، اور دہشت گردی کا عمل اس بات کی طرف مکمل اشارہ کرتی ہے کہ یہ سوچی سمجھی شکل میں نافذ کیا گیا، اس کے باوجود یہ جرائم مسلمانوں کے سر تھوپے اور چپکائے جاتے ہیں۔ آنجناب نے میڈیا پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اقلیتیں اس وقت دنیا کے اکثر ملکوں میں پائے جارہے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ مظلوم و پریشان ہیں اور تفریق امتیاز اور ظلم سے دوچار ہیں۔ جسکی وجہ سے ان کے درمیان قلق و اضطراب کا دور دورہ ہے۔

پھر حضرت نے اسلامی احکام جو تشدد اور دہشت گردی کا سختی سے انکار کرتا ہے کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ اسلام اس طرح کی قبیح جرموں کو بالکل قبول نہیں کرتا، اسلام انتقام کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے لئے چند شرائط وضوابط کی تحدید کی ہے۔ محترم صدر نے پوری قوت سے یہ بات کہی کہ کوئی بھی مسلمان جس کا مکمل ایمان اللہ اور اس کے رسول پر ہو اور وہ اس کے مطالبے پر عامل ہو وہ اس طرح کا بدترین عمل انجام نہیں دے سکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں کچھ ایسے چند عناصر ہیں جو مسلسل اسلام کی برائی اور اس کی صورت کو مسخ کرنے کی سازش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے لوکل میڈیا پر سخت تنقید کی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے

ہونے والے کسی بھی حادثاتی جرم کو بے بانگِ دہل اہمیت دیتی ہے۔ جبکہ یہ میڈیا غیر مسلموں کے ہاتھوں سے ہونے والا اسی واقعہ کو گھٹانے اور چھپانے کی کوشش کرتی ہے اکیڈمی نے تمام شرکاء وحاضرین کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے سخت سردی میں سفر کی مشقتوں اور کلفتوں کو برداشت کرتے ہوئے سمینار کے خطبے اور مقالہ نگاروں کے مقالات کو بغور سماعت کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، روزنامہ ہمارا سماج، روزنامہ اخبار مشرق اور دیگر اخباروں نے اس سمینار کی خبروں کو تصویروں کے ساتھ نشر وشائع کیا۔

☆☆☆

تجاویز

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور ایسیسکو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سمینار بتاریخ ۲-۳ر جنوری ۲۰۱۰ء ہمدرد سمینار ہال میں فقہاء و ارباب افتاء، بین الاقوامی اور ہندوستانی قانون کے ماہرین، انسانی حقوق کی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے مختلف نمائندوں اور علماء اور دانشوروں کی قابل لحاظ تعداد نے شرکت کی، اور غور وفکر کے بعد سمینار نے باتفاق رائے درج ذیل تجویزیں منظور کیں:

۱- جمہوری نظام کے فروغ پانے اور اس نظام میں مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں کے لئے بنیادی انسانی حقوق فراہم ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں اقلیتی گروہوں کی تعداد بڑھی ہے، ان کے مذہبی، لسانی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت اور ان کو مساوی شہری حقوق فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقوام متحدہ اور عالمی ادارے اس سلسلہ میں اپنا فریضہ ادا کریں، اور اس بات پر نظر رکھیں کہ اقلیتیں اکثریتوں کی چیرہ دستی کا شکار نہ ہوں۔

۲- یہ ایک حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل واحسان پر ہے اور غیر مسلم اقلیت کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اسی اصول پر مبنی ہیں، وہ غیر مسلم شہریوں کو تمام ضروری سماجی، معاشی اور سیاسی حقوق عطا کرتی ہے، اور انہیں اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص کے ساتھ رہنے اور اپنے طریقہ کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتی ہے، ''میثاق مدینہ'' اس تصور کا بہترین نمونہ ہے، اس پس منظر میں سمینار مسلمان حکومتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ وہی فراخدلانہ سلوک روا رکھیں، جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے، اور احکام شریعت کا عملی نمونہ پیش کریں، یہ نہ صرف ایک مذہبی فریضہ ہے؛ بلکہ اس سے اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کے ازالہ میں بھی مدد ملے گی۔

۳-اس وقت دنیا کے بہت سے ملکوں میں مسلمان اقلیت میں موجود ہیں؛ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ بعض ملکوں میں مسلمان اقلیتوں کے ساتھ نہایت ناروا سلوک اختیار کیا جارہا ہے اور ان کے بنیادی حقوق سلب کر لئے گئے ہیں، جیسے برما اور اسرائیل وغیرہ، عالمی طاقتوں اور بالخصوص اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی ذمہ داری ہے کہ انہیں انصاف دلانے اور ریاستی دہشت گردی سے بچانے کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری ادا کرے۔

۴-یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اب بھی بعض ایسے ممالک موجود ہیں جو نسلی امتیاز پر یقین رکھتے ہیں، اس کی بدترین مثال اسرائیل ہے، عالمی برادری کا فریضہ ہے کہ وہ اسرائیل کو اس پالیسی سے باز رکھے، اس کا اقتصادی وفوجی بائیکاٹ کرے اور عربوں اور فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والے روح فرسا مظالم کا سدّباب کرے۔

۵-مسلمان جن ملکوں میں اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، وہاں انھوں نے قومی ترقی اور ملک کی تعمیر میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے، اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تعاون واشتراک کا مظاہرہ کیا ہے، نیز وہ امن وسلامتی اور ملکی قوانین کی پابندی کے علم بردار رہے ہیں؛ اس لئے ان حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ملک میں بسنے والی مسلمان اقلیتوں کو مساوی شہری حقوق دیں، اور انہیں اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخصات کے ساتھ رہنے کا موقعہ فراہم کریں۔

۶-مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ضروری ہے کہ وہ ایک طرف اسلام سے اپنی پوری وابستگی قائم رکھیں اور دوسری طرف اپنے وطن سے محبت اور وفاداری کا حق ادا کریں، اور جس ملک میں رہ رہے ہیں ان سے کئے گئے عہد وپیمان کو ملحوظ رکھیں، ان دونوں رشتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس طرح مسلمان اقلیتیں نہ صرف امن وسکون کی زندگی گزار سکیں گی؛ بلکہ ایک داعی امت کی حیثیت سے ان کی پہچان قائم ہوگی، جو مسلمانوں کا اصل منصب اور مقام ہے۔

۷- ہمارے ملک ہندوستان میں خود گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے مختلف کمیشنوں کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ مسلمان اس ملک میں معاشی اور تعلیمی اعتبار سے نہایت پسماندہ ہیں، وہ جان و مال اور عزت و آبرو کے بارے میں عدم تحفظ کا شکار ہیں، ملازمتوں میں ان کا تناسب نہایت کم ہے، پولیس اور جو ادارے امن و قانون کی پاسبانی کے لئے ہیں وہ خود مسلمانوں سے تعصب برتتے ہیں، یہاں تک کہ خود گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے کمیشنوں کی رپورٹ نظر انداز کر دی جاتی ہے، حکومت کا یہ رویہ اس ملک کی جمہوریت پر بدنما داغ ہے؛ اس لئے یہ سمینار حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلمان اقلیت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تدارک کرے، فرقہ وارانہ فسادات کے فیصلے کے لئے تیز رفتار (فاسٹ ٹریک) عدالتیں قائم کرے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے منصوبہ کو دہشت گردی قرار دے، پولیس اور فوج میں اقلیتوں کو خصوصی طور پر شامل کیا جائے، اور مختلف کمیشنوں کی رپورٹوں پر عملی کارروائی کی جائے۔

۸- افسوس کی بات ہے کہ اقلیت جیسی واضح اصطلاح اور ایک عرصہ سے مروج اس کی عدالتی تشریح پر بعض عدالتوں نے سوالیہ نشان لگا دیا ہے، یہاں تک کہ اب اقلیتوں کو اقلیت تسلیم کئے جانے سے بھی انکار کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں مسلمان قانون دانوں، خاص کر اقلیتی یونیورسٹیوں کے شعبۂ قانون سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر تحقیق کے لئے ایک ریسرچ گروپ قائم کریں، جو اقوام متحدہ، ترقی یافتہ ملکوں اور خود ہندوستان کے گذشتہ عدالتی نظائر، نیز لغوی و لسانی اعتبار سے دستور میں استعمال کی گئی اقلیت کی تعبیر کو واضح کرے اور اس موضوع پر ایک دستاویزی تحقیق مرتب کرے؛ تاکہ اقلیتوں کو اقلیتی حقوق سے محروم کرنے کی دوررس سازش کو ناکام بنایا جاسکے۔

۹- اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی قانون فطرت سے مطابقت، اور عدل و انصاف پر مبنی تعلیمات ہیں۔ اسلام اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے دل و دماغ کو فتح کرنے کی غیر

معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اسلام کی اس کشش، اس کی مقبولیت اور اس کی داعیانہ فتوحات نے بعض گروہوں کو حسد میں مبتلا کر دیا ہے اور انھوں نے اسلام کے غیر جانب دارانہ مطالعہ کے بجائے نفرت انگیز پروپیگنڈہ کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اسلاموفوبیا کی یہ تحریک نہایت قابل مذمت اور حد درجہ افسوسناک ہے؛ اس لئے یہ سمینار عالمی برادری سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن میں یکساں طور پر تمام مذاہب اور مذہبی پیشواؤں کے تقدس کو تسلیم کیا جائے، اور کسی بھی مذہب اور مذہبی شناخت کی اہانت کو دہشت گردی کی طرح ایک سنگین جرم تصور کیا جائے۔

۱۰- یہ سمینار مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف زبان وقلم کے ذریعہ اسلام کے خلاف ہونے والے نفرت انگیز پروپیگنڈوں کا سنجیدگی، متانت اور علمی وقار کے ساتھ اور داعیانہ اسلوب میں جواب دیں؛ بلکہ اپنی عملی زندگی کو بھی رحم دلی، انسانیت دوستی، جذبۂ ایثار، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور سبھوں کے ساتھ یکساں عدل وانصاف، نیز انسانی وحدت واخوت کا عملی نمونہ بنائیں کہ اسلاموفوبیا کا یہی سب سے مؤثر جواب ہوگا۔

۱۱- اس میں شبہ نہیں کہ اظہار رائے کی آزادی انسانی فطرت کا حصہ ہے، اسلام اور دنیا کے ہر مہذب قانون نے انسان کے اس حق کو تسلیم کیا ہے؛ لیکن ضروری ہے کہ یہ آزادی اخلاق اور مذاہب عالم کی مسلمہ اقدار سے باہر نہ چلی جائے؛ ورنہ یہ آزادی رحمت کے بجائے مصیبت بن جائے گی؛ اس لئے عالمی برادری کو چاہئے کہ وہ کسی بھی قوم کے معتقدات اور مذہبی مقدسات کو اس دائرہ سے باہر رکھے، اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر دشنام طرازی اور دل آزاری کا راستہ نہ کھولے، نیز اس سلسلہ میں ایسے قوانین بنائے جو تمام گروہوں کے لئے یکساں رویہ پر مبنی ہو اور مختلف قوموں کے لئے الگ الگ پیمانے نہ ہوں۔

۱۲- یہ سمینار اس بات پر سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ پنجاب کی موجودہ حکومت نے اوقاف کے سلسلہ میں از سر نو وقف دستاویز کا مطالبہ کیا ہے اور سرکاری گزٹ کے سابقہ

اندراجات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے، یہ حکومت کی طرف سے اپنے ریکارڈ کو آپ جھٹلانے کے مترادف ہے اور اوقاف کی قیمتی جائدادوں کو ہڑپ کر لینے کی منصوبہ بند سازش ہے، اس لئے حکومت پنجاب کو چاہئے کہ وہ فوری طور پر دستاویز وقف کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائے، کیونکہ جو جائیدادیں سیکڑوں سال سے وقف ہیں، عوام کے پاس ان کے ریکارڈ کا محفوظ رہنا ممکن نہیں ہے، حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس سلسلہ میں ریکارڈ کو محفوظ رکھتی اس لئے اسے سابقہ گزٹ کے اندراجات پر اعتماد کرنا چاہئے، نیز ملّی تنظیموں اور جماعتوں سے بھی اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کو محسوس کریں اور ریاستی اور مرکزی سطح پر اس سلسلہ میں جدوجہد کریں، ورنہ اس سے غلط نظیر قائم ہوگی اور پورے ملک کی وقف جائیدادوں کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے گا۔

۱۳- اس وقت عالمی حالات کی تبدیلی، بین الاقوامی اداروں کا قیام، دنیا میں تقریباً ۳۰؍ فیصد مسلمانوں کے بحیثیت اقلیت غیر مسلم ممالک میں قیام، اور جمہوری نظام حکومت کے فروغ کے نتیجہ میں ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ فقہاء اور دینی درسگاہیں غیر مسلم ممالک کی مسلمان اقلیتوں اور مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں قرآن و حدیث کے اصول، شریعت کے مقاصد اور سلف صالحین کے اجتہادات کے پس منظر میں پوری گہرائی کے ساتھ ریسرچ و تحقیق کا فریضہ انجام دیں، اور ان کو پیش آنے والے مسائل کے سلسلہ میں شرعی رہنمائی کریں؛ تاکہ اسلام کی عدل و انصاف اور انسانی تکریم پر مبنی تعلیمات کی عملی شکل دنیا کے سامنے آسکے اور امت مسلمہ نہ صرف دین و دنیا کو ساتھ لے کر زندگی گزار سکے؛ بلکہ اپنا داعیانہ کردار ادا کرنے کے موقف میں بھی ہو۔

پیغام ایسسکو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ، والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وآلہ وصحبہ ومن والاہ۔

دانشوران ملت، علماء کرام، اور بزرگان عظام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے لئے نہایت خوش نصیبی اور شرف کی بات ہے کہ اس سمینار کے **افتتاحی** اجلاس میں اسلامی تنظیم برائے تربیت وعلوم وثقافت (ISESCO) کے ڈائرکٹر **عزت مآب** جناب ڈاکٹر عبد العزیز بن عثمان التویجری کا سلام اور ان کی اس سمینار کی کامیابی کے لئے **دعاؤں** اور تمناؤں کو آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ اور اس مبارک موقع پر وزارۃ الأوقاف **والشئون** الاسلامیہ کویت کا بھی شکر گزار ہوں، جس کا عالم اسلام کے باہر، برادران ملت کی خاطر اسلامی علوم وفنون کی ترویج اور اس کے مشن کو متحرک بنانے میں ہمیشہ سے تعاون رہا ہے، نیز اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے اس سمینار کے لئے درست اور مناسب موضوع کا انتخاب کیا، اسی کے ساتھ اس سمینار میں شریک ہونے والے تمام حضرات کا بالخصوص علماء کرام، اسکالرس، مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور معزز مہمانوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے سفر کی مشقتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس علمی مجلس کو رونق بخشی۔

حضرات گرامی!

ایسیسکو (تنظیم) کے سال (۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۸ء) کے لائحۂ عمل اور تقاضوں کو سامنے

رکھتے ہوئے جوامت مسلمہ کی ثقافتی یکجہتی کو اس کی خصوصیات اور لوازم میں ثقافتی تنوع کو برقرار رکھتے ہوئے، واضح کرنے اور اسلامی علوم وفنون، اقدار وقیم اور انسانی علوم کی ترقی میں اس کی حصہ داری کو بتلاتی ہے، نیز اسلامی تنظیم برائے تربیت وعلوم وفنون، ایسیسکو کی اولین ترجیحات کو تقویت دینے اور اسلامی دنیا سے باہر مسلمانوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے اور ثقافت اسلامیہ کے میدان میں اس تنظیم کی حکمت عملی کو فعال بنانے کی غرض سے آج کا یہ سمینار بعنوان ''شریعت اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق'' کویت کی وزارۃ الأوقاف والشئون الاسلامیہ اور اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے اشتراک اور تعاون سے بتاریخ ۲/ ۳رجنوری ۲۰۱۰ء نئی دہلی میں منعقد کررہی ہے۔

یہ سمینار بین الأقوامی قانون اور شریعت کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا جائزہ لے گا؛ تاکہ یہ پتہ چلے کہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعامل کرنے میں کس طرح کی عالمی پالیسیاں اپنائی جارہی ہیں، ان پالیسیوں کا تعلق چاہے اسکولوں اور ٹیچروں کی صورتحال سے ہو یا مسلم اقلیتی ممالک میں اسلامی تنظیموں کی قانونی پوزیشن سے یا دائرہ کار کی تشکیل سے یا اس وقت کی سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی دینی وفکری قیادتوں سے ہو۔

اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ اس سے قبل ایسیسکو، عالم اسلام سے باہر یورپ، جنوب مشرق ایشیا، بحر الکاہل اور لاطینی امریکا میں علمی وثقافتی مراکز اور دینی تنظیمات کے سربراہوں کی مختلف مجالس کا انعقاد کرچکی ہے، مزید برآں اس نے عالم اسلام سے باہر ''مسلم بورڈ برائے تعلیم وتربیت'' قائم کیا اور یہ ساری مشنریاں پورے سال سہ ماہی پروگراموں کا انعقاد کرتی ہیں۔ اس سال بھی ان شاء اللہ العزیز کلچرل سینٹرز اور اسلامی ایسوسی ایشن کی پہلی کانفرنس منعقد ہوگی، ایسیسکو نے لائحہ عمل اور دستاویزوں کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے، جن میں سب سے اہم لائحہ عمل: اسلامک کلچرل مشن کو عالم اسلام کے باہر عام کرنا، مسلم صلاحیتوں

سے استفادہ کرنا اور اسلام کے مختلف النوع ثقافتی جہتوں کو عام کرنے کی حکمت عملی اپنانا وغیرہ، اہم دستاویز شامل ہیں۔

ایسیسکو نے افراد سازی کا بھی ایک پروگرام وضع کیا ہے جو ۲۰۰۸ء سے عالم اسلام کے باہر عملی طور پر نافذ ہو چکا ہے۔ تنظیم اس پروگرام کو ترقی اور وسعت دینے کا پختہ عزم رکھتی ہے؛ کیونکہ عالم اسلام کے باہر اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں میں دینی شخصیات کو اس قابل بنایا جائے جو شرعی اصول وضوابط کے حقیقی پاسبان ہوں اور پوری ذمہ داری اور بصیرت کے ساتھ نئے حلقوں میں کام کرنے کے اہل ہوں۔

اس سمینار کے انعقاد کے ذریعے ہم کوشش کرتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کی صورتحال پر روشنی ڈالیں، ان کے مسائل اور مشکلات کا جائزہ لیں اور پھر مسلم اقلیتی ممالک کا تعاون حاصل کرتے ہوئے ان مسائل کا مفید حل نکالا جا سکے، اس تنظیم کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تنظیم اسلامی امور کی تدبیر وتطبیق کے تعلق سے ابھرنے والے مسائل جو اس کے تربیتی، ثقافتی اور قانونی اختصاص کے تحت آتے ہیں، ان ممالک کے شریک وسہیم ہوں؛ تا کہ مسلمان اپنے وطن میں ایڈجسٹ ہو سکیں اور اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لے سکیں، نیز عالم اسلام کے ساتھ ان کا تعاون مضبوط تر ہو جائے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یورپ، ایشیا اور امریکا کے بہت سارے ممالک نے اس رشتہ کو مستحکم بنانے کا نہایت فراخ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا، جس کا حالیہ نتیجہ ہمارے سامنے یہ آیا ہے کہ ایسیسکو کے ممالک ممبران کے متعدد وزرائے ثقافت کو کلچر منسٹرز کی یورپین کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی جو دسمبر ۲۰۰۸ء میں آذربائیجان کی دارالسلطنت باکو میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس کے دوران یورپین کونسل کی تیار کردہ کتاب ''الکتاب الأبیض حول حوار الثقافات'' کو پیش کیا گیا اور اس کی اہم دفعات پر غور وفکر کرنے کے بعد ایسیسکو نے اس کا عربی ترجمہ شائع کیا، اسی طرح ایسیسکو نے یوروپی ملکوں کے ثقافتی امور

سے متعلق بعض وزراء کو بھی کو اپنی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، جو چھٹی اسلامی کانفرنس برائے وزرائے ثقافت کے ضمن میں باکو میں ۱۳/ ۱۴/ اور ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں منعقد ہوئی، اس طرح کی مشترکہ پہل اس لئے کی جارہی ہے؛ تاکہ آپسی اعتماد اور تعاون کی فضا قائم ہو سکے اور قوموں کے مابین علوم وثقافت کا تعارف وتبادلہ ہو سکے، اس گول میز کانفرنس سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس کا عنوان تھا ''مستحکم ڈائیلاگ اور ثقافتی تنوع۔ سفر باکو: بین تہذیبی ڈائیلاگ کے لئے ایک نیا چیلنج'' کے موضوع پر شائع ہوا۔

حضرات گرامی قدر!

یہ تنظیم ''تقریب بین المذاہب'' (دینی مسالک کے مابین توافق) کے مسئلے کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ اس کے تعلق سے اس نے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے جو مقاصد شریعت اور علمی مبادیات پر مبنی ہے اور جو موجودہ دور میں اسلامی فکر کا نچوڑ پیش کرتی ہے، یعنی مسلکی اختلافات کو ختم کرنے پر زور دینا اور اسلامی قانون سازی کے مصادر سے احکام مستنبط کرنے اور اجتہاد کرنے کے طریقوں میں پائے جانے والے اختلافات پر مرتب ہونے والے اثرات کے علمی حل کے معیار کو بڑھانا ہے، اور اجتہاد کرنے میں حکم کے مقصد کو پیش نظر رکھنا ہے جو کہ مصلحت عامہ کے حصول کا سبب ہے جسے اجماع امت کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ علمی سیمینار اس بلند مقصد کی ایک اہم اینٹ ہے جس کے ذریعے ان خصوصیات کو نمایاں کیا جا سکے جنہیں مسلم اقلیتوں نے غیر اسلامی ممالک میں لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جن سے فقہی اجتہادات اور بین الاقوامی قانون کو اقلیتوں کو ثقافتی، تربیتی اور معاشرتی تحفظ دلانے میں آسانی ہوگی، اور ایک ایسے ملک کی تعمیر میں معاون ہوگی جو حق، قانون، اور خصائص کا احترام کرتی ہو اور مؤثر وطنیت کے فروغ وبقائے باہم اور انسانی حقوق کی ضامن ہو۔

اقلیتیں ہی ہر تہذیب وتمدن کی تاسیس میں اہم رول ادا کرتی ہیں، دین اسلام بھی یقیناً

اقلیت کی شکل میں رونما ہوا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "واذکروا إذ کنتم قلیلا فکثرکم" ونیز فرمایا: "واذکروا إذ انتم قلیل مستضعفون فی الأرض تخافون أن یتخطفکم الناس فآواکم وأیدکم بنصره" معلوم ہوا کہ اقلیتیں ہمیشہ سے ہی ظلم وستم کا شکار رہی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ دینی یا نسلی یا لسانی اقلیتیں ہمیشہ مل جل کر اپنے حقوق کے لئے لڑتی رہی ہیں اور آج جبکہ ذرائع ابلاغ اور باہمی تعلقات کی وجہ سے زمینی فاصلے کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں، تو بین الاقوامی قوانین ان ممالک میں جہاں قانونی احترام حاصل ہے، اقلیتوں کے ثقافتی، تربیتی اور معاشرتی حقوق کی پاسداری کررہی ہے؛ تاکہ معاشرے میں امن وامان، بقائے باہم اور ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ پیدا ہوسکے۔

اب اخیر میں ایسیسکو کے سکریٹری کی جانب سے آپ تمام حضرات کا دوبارہ شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے اس علمی مجلس کو رونق بخشی، اس امید کے ساتھ کہ اس سمینار کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے جو مذہبی، نسلی اور لسانی اقلیتوں کے لئے مفید ثابت ہوسکے۔ اور تکثیری معاشرہ میں مختلف طبقات کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا آسان ہوسکے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں خیر کی توفیق دے آمین۔

والسلام

ڈاکٹر عبدالالہ بن عرفہ

ایسسکو، مراکش

استقبالیہ کلمات

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب☆

الحمد لله الذی هدانا الإسلام وجعل أمة خیر الأنام والصلاة والسلام علی خاتم الأنبیاء والمرسلین محمد بن عبد الله الأمین وعلی آله وأصحابه أجمعین اما بعد!

اس سمینار کے افتتاحی اجلاس کے صدر عالی قدر جناب حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم یہاں دہلی تشریف لا چکے ہیں، انشاء اللہ جلد ہی یہاں تشریف لے آئیں گے، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت بہار واڑیسہ اور جسٹس قادری صاحب اور ڈائس پر تشریف فرما علماء اور بزرگان دین، محترم سیاسی وسماجی رہنما، انسانیت اور ملت کا درد رکھنے والے تمام حاضرین!

یہ سمینار جو جامعہ ہمدرد کے پرشکوہ ہال میں اقلیتوں کے حقوق، اسلاموفوبیا اور آزادی کے حدود کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور ایسسکو کے اشتراک وتعاون سے ہو رہا ہے، اس میں آپ کی شرکت اور رونق افزائی پر میں اپنی جانب سے اور اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے، اس کے تمام ذمہ داروں اور کارکنوں کی جانب سے آپ کا پُرجوش استقبال اور خیر مقدم کرتا ہوں، موسم کی ان شدتوں اور سفر کی ان صعوبتوں کو جھیل کر آپ حضرات کی اس سمینار میں شرکت، ایک طرف آپ کے اس سمینار سے دلچسپی اور موضوع کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے، تو

☆ استاذ فقہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وسکریٹری برائے علمی امور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

دوسری طرف اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا پر آپ کا اعتماد اور تعلق کی غماز ہے۔

اس سیمینار کا موضوع دراصل تین موضوعات کا مجموعہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، پہلا موضوع ہے: اقلیتوں کے حقوق اسلامی قانون اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں، نیز ملکی قانون کی روشنی میں اس پر عمل آوری کی صورت حال کیا ہے، پوری دنیا میں کیا ہے، موضوع کا ایک حصہ تو یہ ہے، گویا ایک موضوع یہ ہوا۔ دوسرا موضوع ہے: اسلاموفوبیا، یعنی اسلام اور مسلمانوں سے بڑھتی ہوئی نفرت کا رجحان، اس کے اسباب ومحرکات کا جائزہ اور اس کے ازالہ اور سدباب کے طریقے اور تدبیریں، اور تیسرا موضوع ہے: آزادی کے حدود، مغربی ممالک میں توحید ورسالت اور مسلمانوں کے جذبات کو پامال کرنے کی بہت سی کاروائیاں، اور مغربی ممالک کی طرف سے ان کی سرپرستی اظہار رائے کی آزادی کے نام پر کی جارہی ہے، ہمیں غور کرنا ہے کہ آزادی کے لئے کچھ حدود وقیود بھی ہیں، جن کی پابندی کی جانی ضروری ہے، یا آزادی بے نکیل کا اونٹ ہے جسے لگام نہیں لگایا جاسکتا، مغربی ممالک کے رویے کا یہ تضاد، ناقابل فہم ہے، ایک طرف آزادی رائے کے تقدس اور حفاظت کے نام پر تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی جیسے گروہ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گستاخانہ کارٹون شائع کرنے والے کی سرپرستی اور پشت پناہی کی جاتی ہے، دوسری طرف مسلم خواتین کا اسکارف فرانس جیسے ملک کے لئے جو اپنے آپ کو جمہوریت، آزادی اور مساوات کا گہوارہ کہتا ہے ناقابل قبول ہے، اور یورپ کے مختلف ملکوں میں اسکارف کے خلاف زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے، اور سوئٹزرلینڈ میں مسجد کے میناروں پر پابندی لگ چکی ہے۔

معزز حاضرین! یہ جو موضوعات اس سیمینار میں زیر بحث لائے گئے ہیں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ان پر الگ الگ سیمینار کی ضرورت ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ تینوں موضوعات باہم مربوط ہیں، اس لئے ان تینوں موضوعات پر اس سیمینار میں غور کرنے کی کوشش کی

جائے گی، اس باوقار سمینار میں آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کے مقالات اور تبادلہ خیالات سے سمینار کو اچھے نتائج اور فیصلوں تک پہونچنے میں انشاء اللہ آسانی ہوگی۔

اس وقت اقلیتوں کا موضوع ہمارے ملک میں اٹھا ہوا ہے اور سچر کمیٹی کی رپورٹ اور رنگا ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہونے کے بعد سے اس موضوع پر کافی سرگرمیاں ہیں اور یہ وقت اقلیتوں کے حقوق کے جائزے کا ہے اور اس موضوع پر اظہار خیال کا یہ بہت اچھا موقعہ ہے، اس سمینار میں آپ حضرات کی تشریف آوری اور شرکت اس سمینار کو انشاء اللہ نتیجہ خیز بنائے گی، اور اس سمینار میں سب مل بیٹھ کر تجویزیں مرتب کریں گے اور کچھ ایسے فیصلے کریں گے جو انشاء اللہ ان موضوعات پر رہنما خطوط ہوں گے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جس کی دعوت پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں، میں اس کے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بیس سال سے یہ ادارہ سرگرم عمل ہے، الحمد للہ نئے مسائل کو حل کرنے میں اس کا بنیادی رول رہا ہے، اور ۱۸ رفقہی سمینار باقاعدہ ہم کر چکے ہیں، انیسواں سمینار انشاء اللہ گجرات میں فروری میں منعقد ہوگا، اس میں کافی اہم موضوعات زیر بحث آئیں گے، اور اس کے علاوہ مختلف ورکشاپس، سمینارس، اکیڈمی کی طرف سے ہوتے رہتے ہیں، اصلاً یہ ایک اکیڈمک ادارہ ہے، یہ دینی مسائل کا تحقیقی ادارہ ہے، ریسرچ کا ادارہ ہے، لیکن وہ موضوعات جو ان سے مربوط ہیں بسا اوقات ان موضوعات پر گویا دانشوروں و ماہرین کو جمع کرنا اور ان کی آراء سے استفادہ کرنا یہ بھی اس کا کام ہے، بہر حال میں اکیڈمی کے ذمہ داروں کی طرف سے اور اکیڈمی کے کارکنوں کی طرف سے آپ سب حضرات کا استقبال کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ سمینار نتیجہ خیز ہوگا، اور اس سے متعلق جو مقالات آئیں گے ان سے یہ بات واضح ہوگی کہ اسلام نے اقلیتوں کو کیا حقوق دیے ہیں، اس لیے کہ اقلیتوں کے بارے میں یہ

بات طے شدہ ہے کہ اقلیتوں کے خاص حقوق ان کو دیے بغیر، ان کے حقوق کا تحفظ ممکن نہیں ہوا کرتا، اور جو عام انسانی حقوق ہوا کرتے ہیں، اس ملک کے شہریوں کے محض ان تحفظات سے اقلیتوں کا تحفظ ہو نہیں پاتا، جب تک کہ خاص ان کو تحفظ فراہم نہ کیا جائے، اسی لئے اسلام اور ان کی تعلیمات کا اگر جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے خاص اقلیتوں کو حقوق دیے ہیں، ان کا خاص تحفظ کیا ہے، اس وقت یہ احساس پوری دنیا میں ہے کہ جو جنرل حقوق ہیں شہریوں کے محض ان حقوق کی بنیاد پر تنہا اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا جاسکتا، تو اس تعلق سے یہ ہمارے جسٹس صاحب ہیں اور بہت سے قانون کے ماہر ہیں وہ روشنی ڈالیں گے، ہمارے دستور میں جو حقوق اقلیتوں کو دیے گئے ہیں وہ حقوق موجودہ حالات میں کس حد تک مل رہے ہیں اور کس حد تک پامال ہو رہے ہیں اس کا جائزہ بھی آپ لیں گے، اس کے ساتھ ساتھ اسلاموفوبیا جو عالمی مسئلہ ہے، خاص مغرب کی بات نہیں ہے، ہمارے ملک میں کچھ گروپس اور ایسی جماعتیں ہیں جو مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا کر اسلام کے خلاف نفرت پھیلا کر جذبات کو بھڑکاتی ہیں اور اس کے بہت سے نتائج سامنے آتے ہیں، لبراہن کمیشن کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہو چکی ہے، اور اس کا بھی تجزیہ لوگ کر رہے ہیں، اس کا مطالعہ کر رہے ہیں، اس میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں وہ حقائق بھی ہماری توجہ کے طالب ہیں اور اس کی روشنی میں ہمیں کیا کرنا چاہئے، یہ سب باتیں بھی زیر بحث آسکتی ہیں، میں سمجھتا ہوں کے آپ حضرات کا یہ اجتماع اگر چہ محدود ہے، مگر بہت اہم افراد ہیں، چنندہ افراد ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ ایک فرد بسا اوقات اپنی صلاحیت کے اعتبار سے، اپنی کارکردگی کے اعتبار سے ہزاروں افراد کی قائم مقامی کرتا ہے، انشاءاللہ آپ کی شرکت اس سمینار میں بہت مفید ہوگی، میں آپ سب کا استقبال اور خیر مقدم کرتا ہوں۔

☆☆☆

افتتاحی خطبہ

جسٹس سید شاہ محمد قادری ☆

بسم الله الرحمن الرحيم وصلى الله على رسوله الكريم.

حضرت مولانا رابع حسنی صاحب میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اعزاز بخشا کہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی جانب سے منعقدہ سمینار بعنوان ''اقلیتوں کے حقوق اور اسلاموفوبیا اور آزادی کی حدود'' کا افتتاح کروں۔ یہ عنوان بے حد اہمیت اور معنویت کا حامل ہے۔علماء اور اسکالرز کو خطاب کرنا بھی اپنی جگہ اہم ہے، میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور خصوصاً مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس دو روزہ سمینار کا اہتمام کیا۔

اقلیت سے مراد وہ چھوٹا طبقہ ہے جو مذہبی، لسانی، ثقافتی اور نظریاتی طور سے ملک کی بقیہ آبادی سے مختلف ہو۔لہٰذا مسلمان بھی ہندوستان میں اور عالمی طور پر اقلیت ہیں، کسی ملک کا سیاسی اور معاشرتی استحکام اور خوشحالی اس تناسب پر منحصر ہوتی ہے کہ ملک کے تمام طبقات کو قانونی طور پر مساوی حقوق حاصل ہوں اور غیر منصفانہ امتیاز سے تحفظ عطا کیا ہو اور دیگر تمام طبقات کے ساتھ قانونی مساوات سے بھی بہرہ ور ہوں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی ملک کی اقلیت اکثریت کے ہاتھوں جبر کا شکار ہو اور اپنے آپ کو محصور محسوس کرے تو وہ ملک مہذب ہونے کا دعوی نہیں کرسکتا۔۱۹۹۰ء میں کناڈا میں کال گیری یونیورسٹی میں انسانی حقوق اور قانونی ذمہ داریاں کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے نانی پالکی والا نے پال سیگارٹ کا یہ قول دوہرایا تھا جس میں اس

☆ سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا

نے بالکل صحیح کہا تھا کہ حقوق کی جانچ کا معیار یہ نہیں ہے کہ خوشحال طبقہ کو کس حد تک قانون تک رسائی حاصل ہے یا اکثریت کا معیار زندگی بہتر ہو رہا ہے بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ کمزور طبقہ کو طاقتور طبقہ کی جانب سے کتنی مددمل رہی ہے۔ کسی معاشرہ کی بابت حتمی طور پر یہ فیصلہ کرنا کہ آیا وہ مہذب ہے اس پر انحصار کرتا ہے کہ اس کے سب سے نچلے اور کمزور طبقہ کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔

اسلام ایک ایسی مثالی ریاست کی تشکیل کا حکم دیتا ہے جہاں ہر شخص کو بلا امتیاز مذہب، نسل اور عقیدہ قانون کے سامنے مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اس نے اقلیتوں کو اس بات کی مکمل آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنی پسند کا مذہب یا عقیدہ اختیار کریں، اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں ارشاد فرمایا ہے: "لا إكراه في الدين" (دین میں کوئی جبر نہیں ہے)، ایک دوسری جگہ اللہ رب العزت نے اعلان فرمایا کہ: "لكم دينكم ولي دين" (تمہارے لئے تمہارا مذہب اور میرے لئے میرا مذہب ہے)، قرآن عظیم دین کے معاملے میں کسی جبر کو برداشت نہیں کرتا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی ہی مثالی ریاست قائم کی اور آپ کے بعد خلفاء خصوصاً خلفائے راشدین نے سیاسی طور پر پوری احتیاط سے اس مثال کی پیروی کی۔ اقلیتوں کے بارے میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: خبردار اگر کسی نے کسی اقلیتی کمیونٹی کے حقوق کی پامالی کی یا اس نے اس پر حد سے زیادہ ستم کیا یا اس کا مال جبراً حاصل کیا تو قیامت میں اس جابر کے خلاف اللہ کے حضور استغاثہ کروں گا (سنن ابوداؤد)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی نے کسی غیر مسلم کو قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا؛ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت کے فاصلے سے سونگھی جا سکتی ہے (بدایۃ المجتہد)۔

علامہ طاہر القادری نے اسلام اور اقلیت کے عنوان پر خطاب کرتے ہوئے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج سے یہ قول نقل کیا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

مبارک اور اس کے بعد خلفاء راشدین کے عہد میں شہری قوانین (سول لا) اور تعزیری قوانین میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کے طور پر اس مسلمان کو قتل کئے جانے کا حکم صادر فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا: غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کرنا میری سب سے اہم ذمہ داری ہے (مسند الشافعی)۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہل یروشلم کے ساتھ جو معاہدہ کیا وہ صدر اول میں غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کے برتاؤ کی ایک بہترین مثال ہے۔ معاہدہ کی تحریر یہ ہے:
''یہ منشور امن اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کی جانب سے ایلیا کے باشندوں کو عطا کیا جا رہا ہے، انہیں ان کے جان و مال، کلیسا، صلیبوں کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے، بیمار ہوں یا صحت مند، ان کے ہر شخص کو امن دیا جائے گا، ان کے کلیساؤں پر نہ قبضہ کیا جائے گا نہ انہیں منہدم کیا جائے گا، نہ کوئی شئی جبراً لی جائے گی نہ تنقیبات اور صلیبیں ہٹائی جائیں گی، اور نہ رقم حاصل کی جائے گی۔ انہیں ان کے مذہب سے خارج نہیں کیا جائے گا نہ مذہب کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ایلیا میں یہودی آباد کار ان کی زمینوں وغیرہ پر قبضہ کریں گے (طاہر)۔

یہ بات بلا خوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی عہد میں عموماً غیر مسلموں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا گیا۔ اگرچہ امتیاز اور غیر منصفانہ برتاؤ کے چند قلیل المدت ادوار کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

یوروپ پر اسلام کے اثرات کا جائزہ لیجئے، اسپین میں آٹھویں صدی سے پندرہویں صدی کے دوران آٹھ سو سالہ مدت میں اسلام نے یوروپ کے ظلمت کدے میں علم کی روشنی پہنچائی۔ وقت کی تنگی کے سبب شہزادہ چارلس (ولی عہد برطانیہ) کی آکسفورڈ کے اسلامی سینٹر میں تقریر کا پورا حوالہ پیش نہیں کر سکتے؛ تاہم شہزادہ نے اپنی تقریر میں اسپین میں مسلم معاشرہ کی

برکات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مسلم اسپین نے نہ صرف قدیم یونان اور روما کے علمی اثاثوں کا تحفظ کیا، انہوں نے قدیم تہذیب کے علمی اثاثوں کا تحفظ ہی نہیں کیا بلکہ ان میں نئے اضافے بھی کئے اور اپنی علمی وفکری کاوشوں سے علم کے مختلف میدانوں سائنس، فلکیات، طب، دواسازی، تاریخ، قانون، بصریات، زراعت، ریاضی، الجبرا (جو کہ خود ایک عربی لفظ ہے)، فن تعمیر اور دینیات میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ابن رشد اور ابن منظور کے ساتھ ابن سینا اور رازی مشرق میں ان کے ہم عصر تھے، انہوں نے طب کے مطالعہ اور معالجہ میں ایسی ایجادات کیں کہ یوروپ نے ان کے بعد ان کی عظیم خدمات سے صدیوں تک استفادہ کیا۔ جدید یوروپ کو ان کی خدمات کے بارے میں شہزادہ نے کہا: وہ متعدد خصوصیات جن پر آج یوروپ ناز کرتا ہے وہ اسے مسلم اسپین سے حاصل ہوئی ہیں۔ ڈپلومیسی، آزاد تجارت، کھلی سرحدیں، علم الانسان میں تحقیق ومطالعہ کا منہج، آداب مجلس، فیشن، دواؤں کی متعدد اقسام، اسپتال یہ سب اسی عظیم شہر سے سے حاصل ہوئے۔

اس جدید دور میں اقلیتوں کی پوزیشن اقوام متحدہ کے سول اور سیاسی حقوق کے عالمی عہدنامے ۱۹۶۶ کی دفعہ ۲۷ میں درج ہے اور جس کی توثیق ہندوستان نے ۱۹۷۹ میں کی، اس میں کہا گیا ہے کہ مذہبی، نسلی، لسانی یا مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو ان کی اپنی شناخت، ثقافتی پہچان، اپنے حسب مرضی مذہب اختیار کرنے یا اپنی زبان کے استعمال کے بارے میں ان کے حقوق کو پامال نہیں کیا جائے گا۔ قومی، مذہبی یا نسلی اقلیتوں کے حقوق کے اعلامیہ ۱۹۹۲ء میں ان اقلیتوں کے حقوق کی تحفظ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ان میں ثقافتی، مذہبی عقیدے اور امتیاز کے خلاف تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔

حصہ سوم میں مندرجہ خصوصی حقوق۔ وہ بنیادی حقوق جن کی دستور ہند میں دیگر امور کے ساتھ ضمانت دی گئی ہے:

(i) ضمیر کی آزادی کا حق اور آزادانہ طور پر مذہبی شعائر کی ادائیگی، تبلیغ اور اپنے مذہبی اداروں کے نظم وانصرام کا حق (آرٹیکل ۲۵ اور ۲۶)۔

(ii) شہریوں کے کسی بھی طبقہ کو اپنی زبان اور رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کا حق (آرٹیکل ۲۹ (۱))۔

(iii) حکومت کے زیر انتظام یا حکومت سے امداد پانے والے تعلیمی اداروں میں مذہبی، لسانی، ذات یا نسل کی بنیاد پر کسی امتیاز کے بغیر داخلہ حاصل کرنے کا حق (آرٹیکل ۲۹، ۲)۔

(iv) تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور سرکاری طور پر انہیں مالی امداد دیے جانے میں کسی امتیاز کے بغیر رسائی کا حق (آرٹیکل ۳۰)۔

(v) پرائمری سطح پر اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق۔

عالمی اور قومی پیمانے پر ایسے تمام تحفظات کے ہوتے ہوئے بھی ان حقوق کی تعبیر و تشریح اور نفاذ میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس سے اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد میں عدم تحفظ، بے مہری اور محرومی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک اسلاموفوبیا کا تعلق ہے تو یہ عمل اور ردعمل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ بدنیتی کے ارادوں کے تحت غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلانے کی مذموم کوشش ہے، اس وقت مسلمانوں سے جو سلوک کیا جارہا ہے اس کے لئے کسی بھی اعتبار سے ماضی میں ان کے دور اقتدار کے مفروضہ عوامل ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ایک منصوبہ بند طریقے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی وسیع تر مہم کا حصہ ہے۔

اظہار خیال کی آزادی ایک بہت ہی اہم حق ہے۔ ۱۹۴۸ء کے عالمی انسانی حقوق کے اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو اظہار خیال اور اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے، اس میں کسی مداخلت کے بغیر اپنی رائے قائم کرنے کا حق بھی شامل ہے اور ذرائع ابلاغ سے بلا کسی

سرحدی حدود کی پابندی، اطلاعات حاصل کرنا بھی شامل ہے۔

اس اعلامیہ کے آرٹیکل ۲۸ (۲) کے تحت مذکور ہے کہ اپنی آزادی کے حق کو استعمال کرتے ہوئے ہر شخص کو اپنی حدود کی پابندی کرنا لازمی ہے جو دوسروں کے حقوق اور جذبات کے احترام کے تحت مقرر کی گئی ہیں اور جو اخلاق، عوامی نظم وضبط اور ایک جمہوری معاشرہ میں عمومی خیرسگالی کے لئے مطلوب ہیں۔

شہری اور سیاسی حقوق کے بارے میں عالمی اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی کا حق حاصل ہے، اس حق کے تحت اطلاعات حاصل کرنا اور ہر قسم کے خیالات کی تعلیم دینا، ان میں زبانی، تحریری یا مطبوعہ ہر قسم کی اطلاعات بھی شامل ہیں اور ان میں سرحدی پابندیاں حائل نہیں ہوں گی، اس حق کے ساتھ اس پر خصوصی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، پھر اس کے تحت بعض پابندیاں عمل میں آئیں گی، یہ ایسی پابندیاں ہیں جو قانون کے تحت عائد ہوں اور ضروری سمجھی جائیں۔

(a) دوسروں کے حقوق اور حیثیت عرفی کا احترام کرنا۔

(b) قومی سیکورٹی اور عوامی امن وقانون کا تحفظ مفاد عامہ یا صحت عامہ کے تحت ضروری ہو (آرٹیکل ۱۹)۔

ایسے ہی مفہوم پر مبنی امریکن کنونشن برائے حقوق انسانی کی دفعات بھی ہیں، پیکٹ آف سان جوز کوسٹاریکا، انسانی حقوق کے بارے میں افریقی چارٹر اور انسانی حقوق پر یوروپین کنونشن وغیرہ بھی ایسی مثالیں ہیں۔

دستور ہند کے آرٹیکل ۱۹ (۱) کے تحت اظہار خیال کی آزادی کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے؛ لیکن آرٹیکل ۱۹ (۲) کے تحت ہندوستان کی سیکورٹی اور اتحاد کی خاطر اس آزادی پر مناسب پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں، اسی زمرہ کے تحت غیر ممالک سے خوشگوار تعلقات،

اخلاقیات، معقولیت، عوامی امن و امان، توہین عدالت، کسی کو بدنام کرنے یا جرم کے لئے بھڑکانے جیسی باتیں بھی آتی ہیں۔

یہاں یہ بات صراحت سے سمجھ لینی چاہئے کہ دنیا کے کسی ملک میں بھی آزادی اظہار کا حق ایک ناقابل تنسیخ حق کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اسلام امن کا داعی ہے اور اللہ کی مرضی کے مکمل طور پر تابع ہونے اور اللہ اور رسول کی کامل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، صلح حدیبیہ کے روز اول سے ہی یہ بات واضح ہے کہ مومن دنیا کی ہر شئ اپنے مال، اولاد، اہل وعیال بلکہ خود اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اللہ کے رسول سے محبت کرتے ہیں، وہ ہرگز کوئی ایسی بات برداشت نہیں کرسکتے جو ان کے رسول یا ان کے مذہب کے خلاف کہی یا کی جائے، اسلاموفوبیا کی یہ تازہ مہم دراصل مسلمانوں کو اذیت پہنچانے اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے جسے آزادی اظہار رائے کے نام پر بھڑکایا جارہا ہے۔ کسی بھی ملک اور کسی بھی دور میں آزادی اظہار کو قطعی اور ناقابل تنسیخ نہیں سمجھا گیا، اس کے استعمال کی اسی طور پر اجازت دی گئی ہے کہ اس سے دوسروں کے جذبات مجروح نہ ہوں، یہ بات صحیح طور پر کہی گئی کہ آپ کے آزادی اظہار کی حدود وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں وہ دوسروں کے حقوق سے متصادم ہوتی ہے، شرارت پسندوں کے عزائم کو ناکام کرنے اور کسی ناگوار صورت حال کے وقوع سے بچنے کے لئے اقلیتوں کو بیدار رہنا اور دو طرح سے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے: پر امن طریقے سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کر کے شرپسندوں کے عزائم کو ناکام کرنا، اسکے لئے اس جیسے سیمینار منعقد کرنا صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ ان شرپسندوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے، اس بارے میں انفرادی اور اجتماعی طور پر کوشش کی جانی چاہئے، قانونی کارروائی کے لئے ہر ملک کے قانونی نظام کا اچھی طرح مطالعہ کیا جانا چاہئے، اگر ریاستہائے متحدہ میں اس قسم کی صورت حال پیدا ہوتو

مسلم ممالک کو سفارتی ذرائع سے اس کا تدارک کرنا چاہئے۔

اس کے علاوہ دیگر دو ادارے بھی ہیں جن کا اس سلسلے میں استعمال کیا جانا چاہئے، میڈیا اور عدالت۔

۱- یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے بارے میں الیکٹرانک میڈیا ایسے افراد کے انٹرویو نشر کرتا ہے جو مسلم پرسنل لا اور شریعت سے کما حقہ واقف نہیں ہوتے، وہ میڈیا کے سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں دے پاتے، اس سے اسلام کی رسوائی ہوتی ہے، اگر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا تجربہ کار افراد کو یہ ذمہ داری سونپے کہ وہ میڈیا کو جواب دیں تو اس سے دیکھنے والوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

۲- بعض اوقات ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ ایسے فیصلے صادر کرتے ہیں جو شرعی اصولوں کے مطابق نہیں ہوتے، وکلاء سے درخواست کی جائے کہ وہ ایسے فیصلوں کے خلاف اپیل دائر کریں یا قانون سازی کے ذریعہ اس کا تدارک کریں۔

مجھے امید ہے کہ سمینار کے فاضل مقررین ان مسائل پر بحث کر کے ان کا صحیح حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

☆☆☆

کلیدی خطبہ:

اقلیتوں کے حقوق

خالد سیف اللہ رحمانی ☆

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ۔

حضرات! آج ہم ایک ایسے موضوع پر اکٹھا ہوئے ہیں، جو نہایت اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ آج پوری دنیا میں جمہوریت اور سیکولرزم کو سب سے بہتر اور معیاری نظامِ حکومت تصور کیا جاتا ہے اور یہ اس پہلو سے واقعی اہم ہے کہ اس نظام میں ایک شخص یا ایک خاندان کے بجائے عوام کی رائے کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ان کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چوں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ ہوتا ہے؛ اس لئے اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اکثر مواقع پر اقلیت کو اپنی بقا اور تشخص کے لئے جدو جہد کئے بغیر چارہ نہیں رہتا؛ اسی لئے جب سے دنیا میں جمہوری نظام کو غلبہ حاصل ہوا ہے، اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اقلیتوں کے مسائل ہمہ جہت نوعیت کے ہیں، ان کا تعلق سیاست سے بھی ہے، معیشت سے بھی، تعلیم سے بھی اور مذہبی اُمور سے بھی۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو عبادت گاہوں کی چہار دیواری تک محدود نہیں؛ بلکہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور ہر شعبہ میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے، مکہ کی سرزمین میں جب

☆ جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

اسلام کا سورج طلوع ہوا، تو اس وقت تنہا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان تھے، پھر اسلام کی کرنیں پھیلتی گئیں اور اس کی خوشبو نے روشن ضمیر لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا، لوگ جس قدر اسلام کی طرف جھکتے، اتنی ہی شدت کے ساتھ عداوتیں بھی اُبھرتی گئیں اور مسلمانوں کے لئے جینا دوبھر ہوگیا، یہاں تک کہ وہ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوگئے، تیرہ سال مکہ میں آپ نے زندگی گذاری اور اس پورے عرصہ میں مسلمان ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے مکہ میں مقیم رہے، جو انتہائی جبر وتشدد کا شکار تھی، اس لئے پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقلیت کے درد اور ان کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری عمومی خطبہ میں بھی حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کو اقلیت کے ساتھ حسن سلوک (جن کو اہل ذمہ کہا جاتا تھا) کی خاص طور پر تلقین فرمائی۔

اسی لئے اسلام میں اقلیتوں کو وسیع تر حقوق دیے گئے ہیں، اسلامی مملکت میں مذہبی اقلیت کو اہل ذمہ کہا جاتا ہے، ذمہ کے اصل معنی عہد اور امان وغیرہ کے ہیں (لسان العرب: ۵/۵۹)، چوں کہ اہل ذمہ کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہے اور مسلمان ان سے عہد کے پابند ہیں، اس لئے ان کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے، علامہ ابن اثیر رقم طراز ہیں:

وسمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم۔ (النهاية فی غريب الحديث والأثر: ۲/۱۶۸)

چوں کہ اسلام نے ذات پات، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر کوئی تقسیم نہیں کی ہے، اس لئے لسانی اور نسلی اقلیت کا عام طور پر اسلامی قانون کے ماہرین نے ذکر نہیں کیا ہے اور چند صدی پہلے تک عالم اسلام میں اس کی وجہ سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا؛ کیوں کہ اسلام اسلامی وحدت اور انسانی وحدت پر بہت زور دیتا ہے؛ لیکن ہمیں شریعت میں ایسے اُصول ملتے ہیں جو ایسی اقلیتوں کو بھی مساویانہ حقوق فراہم کرنے کے لئے بنیادی ہدایات کا درجہ رکھتی ہیں، قرآن

مجید میں صاف طور پر ہے کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے، تفاخر کے لئے نہیں، اس سے واضح ہوا کہ نسلی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی؛ اسی لئے دربارِ محمدی میں ہمیں جہاں قریش کے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی ملتے ہیں، وہیں حبش کے بلال، روم کے صہیب، فارس کے سلمان اور یمن کے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم بھی اسی عزت و وقار کے ساتھ موجود ہیں۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں مقاماتِ مقدسہ کے علاوہ تمام روئے ارض کی حیثیت برابر ہے، علاقہ کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی، جغرافیائی تقسیم انسانوں کی خودساختہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھینچی ہوئی سرحدیں نہیں ہیں؛ اس لئے علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں، یہی حال زبان کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اللہ کی تمام مخلوقات قابلِ احترام ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کچھ مخصوص زبانیں ہی وقعت کی حامل ہوتیں، تو صرف ان ہی زبانوں میں آسمانی کتابیں اُتاری جاتیں؛ لیکن قرآن مجید نے واضح کردیا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ان ہی کی زبان میں اپنا پیغام بھیجا ہے، گویا ہر زبان کو پیغامِ الٰہی کا امین بننے کا شرف حاصل ہے۔

اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے کسی خاص زبان ہی کو استعمال کرے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان جس علاقہ میں گئے، انھوں نے پوری فراخدلی کے ساتھ وہاں کی زبان اختیار کرلی، اگر دنیا کی مختلف زبانوں میں عربی الفاظ کی موجودگی کا تجزیہ کیا جائے تو بہتر طور پر اس کا اندازہ ہوسکتا ہے؛ اسی لئے ہمیں اسلامی فقہ میں مذہبی اقلیتوں کا ذکر تو ملتا ہے اور بعض احکام میں مسلمانوں کے اور ان کے درمیان فرق کی نشاندہی ملتی ہے؛ لیکن نسلی، لسانی اور علاقائی اقلیتوں کے جداگانہ احکام نہیں ملتے ہیں؛ کیوں کہ شریعت اسلامی میں اسلامی وحدت اور اسلامی اُخوت کے جو آفاقی تصورات ہیں، ان کی روشنی میں جغرافیائی، لسانی اور نسلی بنیاد پر حقوق و اختیارات کے اعتبار سے اکثریت اور اقلیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

حضرات! موضوع کی مناسبت سے یہ بات مناسب محسوس ہوتی ہے کہ اس وقت مسلم ملک میں غیر مسلم اقلیت کے حقوق کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، توحید کے معنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات، اختیارات اور بعض حقوق، عبادت و بندگی کے استحقاق میں یکتا ماننے کا نام ہے، اس بنیادی تصور سے جہاں خدا کی عظمت دل میں گھر کرتی ہے، وہیں اس سے خود انسان کا مقام ومرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے اور اس نسبت سے تین باتیں بہت اہم ہیں، اول یہ کہ جب خدا ہی تنہا معبود ہے اور تمام انسان اس کے بندے ہیں، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں، قرآن مجید نے اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسان کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے: '' **خلقکم من نفس واحدۃ**'' (النساء:۱)، یہ وحدتِ انسانیت کا واضح اعلان ہے، تصور توحید سے جو دوسرا تصور اُبھرتا ہے، وہ یہ ہے کہ بحیثیت عبد ومعبود، خدا اور انسان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، ایسا نہیں کہ کسی خاص انسان یا مخصوص انسانی گروہ کے بغیر انسان خدا کی خوشنودی کو نہیں پاسکتا؛ بلکہ ہر شخص خدا سے براہ راست مانگ سکتا ہے، اس کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے اور اس کی بندگی کرسکتا ہے، اس لئے کہ وہی قادر مطلق ہے اور باقی سب عاجز ہیں، قرآن مجید کی پہلی سورت، سورۂ فاتحہ میں ''**إیاک نعبدو إیاک نستعین**'' (الفاتحہ:۴) کے فقرہ میں بندہ کی زبان سے یہ بات کہلائی گئی ہے کہ: خداوند! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد کے خواستگار ہیں، یہ اس بات کا صریح وبے غبار اعلان ہے کہ بندہ براہ راست اپنے رب سے مربوط ہے۔

ان دو تصورات کے ساتھ جو تیسرا تصور سامنے آتا ہے، وہ ہے اِنسانی کرامت وشرافت کا: کہ چوں کہ بحیثیت انسان سارے لوگ برابر ہیں اور کائنات انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے؛ اس لئے وہ اس کائنات کی سب سے زیادہ معزز اور قابل احترام مخلوق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبات**

وفضلنٰهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا" (بنی اسرائیل:۷۰)۔

(ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی، انھیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا، ان کو پاک رزق عطا کی اور ہم نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی مخلوقات پر ان کو فضیلت دی)۔

یہ انسان کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصورات ہیں، جو بحیثیت انسان ہر ابن آدم سے متعلق ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، پس اسلام کی نگاہ میں غیر مسلم بھی ہمارے انسانی بھائی ہیں اور بحیثیت انسان قابل احترام ہیں، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق انھیں تصورات پر مقرر کیے گئے ہیں، جن کے بنیادی نکات اس طرح ہیں :

۱- اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں کو ذمی یا اہل ذمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ذمہ کے اصل معنی عہد اور امان وغیرہ کے ہیں (لسان العرب:۵/۵۹)؛ چوں کہ اہل ذمہ کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہے اور مسلمان ان سے عہد کے پابند ہیں، اسی لئے ان کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے، علامہ ابن اثیرؒ رقمطراز ہیں : " **وسمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم**" (النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر:۲/۱۶۸) گویا اس نام کا مقصد مسلمانوں کو غیر مسلم بھائیوں کے تئیں، اپنی ذمہ داری کا احساس دلانا ہے، اس میں ان کی تحقیر یا تذلیل مقصود نہیں۔

۲- غیر مسلموں کی جان کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی، جیسے مسلمان کی؛ کیوں کہ قرآن مجید نے کسی بھی انسان کے قتل ناحق کو منع فرمایا ہے:" **ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ إلا بالحق**" (بنی اسرائیل:۳۳)، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی معاہد کو قتل کر دیا، وہ جنت کی بُو سے بھی محروم رہے گا،" **من قتل معاهداً لم یرح رائحة الجنة**" (بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۶) غرض کہ ایک غیر مسلم شہری کی جان کی وہی اہمیت ہے، جو ملک کے مسلمان شہری کی ہے، چنانچہ :

(الف) اگر مسلمان کسی غیر مسلم کو ظلماً قتل کر دے تو وہ مسلمان قصاص کے طور پر قتل کیا

جائے گا، اس لئے کہ قرآن مجید نے قصاص کا یہی اُصول بتایا ہے کہ نفس انسانی کے بدلہ قاتل قتل کیا جائے گا" النفس بالنفس " (المائدۃ:۴۵)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ایک مسلمان کو غیر مسلم معاہد کے بدلہ قتل کیا اور فرمایا: " أنا أکرم من وفی بذمته " (سنن بیہقی: ۱۲/ ۴۰، حدیث نمبر: ۱۶۳۴۵)، اسی پر صحابہ کا عمل رہا ہے۔ اہل حیرہ میں سے ایک عیسائی یا یہودی کو کسی مسلمان نے قتل کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان سے اس کا قصاص لیا (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۱۰۲، حدیث نمبر: ۱۸۵۱۸)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ایک ذمی کو قتل کرنے کے جرم میں مسلمان قاتل کے قتل کئے جانے کا فیصلہ کیا؛ لیکن ذمی کے ورثہ نے خود ہی قصاص معاف کر دیا، اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُصولی بات کہی کہ ذمیوں کا خون اور خون بہا برابر ہے،" من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیتهٗ کدیتنا " (سنن بیہقی: ۱۲/ ۴۶، حدیث نمبر: ۱۶۳۶۳)، صحابہؓ کے بعد بھی اسی پر عمل رہا، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، انھوں نے بھی اپنے گورنر کو مسلمان قاتل پر قصاص جاری کرنے کا حکم دیا (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۱۰۲، حدیث نمبر: ۱۸۵۱۸)۔

(ب) اسی طرح غیر مسلم کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت اوپر گذر چکی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا فرمائی (دارقطنی، کتاب الحدود: ۳۴۳، نیز دیکھئے: نصب الرایۃ: ۴/ ۳۶۶)۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں: " جعل دیة المعاهد کدیة المسلم " (دارقطنی، کتاب الحدود: ۳۴۹) امام ابوحنیفہؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جو دیت مسلمان کی ہے، وہی معاہد کی ہے (کتاب الآثار للإمام محمد، حدیث نمبر: ۵۸۷)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد تک مسلمان ، یہودی اور عیسائی کی دیت برابر سمجھی جاتی تھی ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ذمی کی دیت نصف کردی ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے پھر دونوں کی دیت برابر کردی (نصب الرایۃ: ۳۶۶/۴)،اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں بھی ذمی کی دیت وہی تھی ، جو مسلمانوں کی ہے (مراسیل أبی داؤد: ۱۳، باب دیۃ الذمی) چنانچہ فقہاء احناف کے نزدیک ذمی کی وہی دیت ہوتی ہے جو مسلمان کی (دیکھئے: ہدایہ: ۵۸۵/۲، کتاب الدیات، ط: دیوبند، البحر الرائق: ۷۹/۹)،اور یہی نقطۂ نظر مشہور فقیہ اور محدث سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے اہل علم کا بھی ہے (ترمذی: ۲۶۱/۱، باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر)۔

۳- غیر مسلم شہریوں کے مال اسی طرح قابل احترام ہیں اور ان کو تحفظ حاصل ہے، جیسے مسلمانوں کے مال، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جبری طور پر کسی کا بھی مال لینے سے منع کیا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں " **لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل**" (البقرۃ: ۱۸۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُصولی بات فرمائی ہے کہ اہل ذمہ کے مال بھی مسلمانوں کے ہی مال کی طرح ہیں "**دمائهم كدمائنا وأموالهم كأموالنا**" (دیکھئے: نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غیر مسلموں سے معاہدہ کرتے تو جان و مال دونوں کے لئے امان منظور فرماتے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۲۷)۔

مال کے تحفظ میں بنیادی طور پر یہ اُمور شامل ہیں :

(الف) مالک ہونے کا حق ، غیر مسلموں پر جو ٹیکس عائد کیا جاتا ہے، وہ خود ان کی املاک پر ان کے حق کو تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔

(ب) اپنے مال میں تصرف کا حق۔

(ج) غیر مسلموں کے املاک کا تحفظ۔

غیر مسلموں کے مال کی چوری پر وہی سزا دی جائے گی ، جو مسلمان کا مال چوری کرنے

پر دی جاتی ہے، اگر چہ خود چوری کرنے والا مسلمان ہو" ویقطع المسلم بسرقة مال المسلم و الذمی" (المغنی لابن قدامة: ۱۲/ ۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ)

۴- مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کو بھی اپنی خواہش کے مطابق ذریعہ معاش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت اور مختلف طرح کے کاروبار غیر مسلموں کا کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عہد میں ثابت ہے؛ البتہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اگر وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جس کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور اس کی نااہلی سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو اس پیشہ کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؛ چنانچہ جو شخص فن طب سے واقفیت کے بغیر علاج و معالجہ کرے تو آپ نے اس کو مریض کو پہنچنے والے نقصان کا ضامن قرار دیا؛ چنانچہ ارشاد ہے:" من تطبب ولم يعلم منه قبل ذلك الطب فهو ضامن" (ابوداؤد: ۲/ ۲۳۰)۔

۵- غیر مسلم شہریوں کی عزت و آبرو کا اسی طرح تحفظ کیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں کی، اسی لئے قرآن نے مطلقاً نگاہ کو پست رکھنے کا حکم دیا، اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں (النور: ۳۰-۳۱)، اسی طرح زنا کی سزا مطلق ہے، چاہے کسی مسلمان عورت سے ہو یا غیر مسلم عورت سے۔

۶- غیر مسلموں کو بھی تعلیم و تعلم کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے، مدینہ میں یہودیوں کا اپنا مدرسہ "بیت المدارس" قائم تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندیوں کو تعلیم دینے کی ترغیب دی (بخاری: ۱/ ۲۰)، جو عام طور پر غیر مسلم ہوا کرتی تھیں۔

۷- اسلام میں وضع قانون اصل میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وما اختلفتم فيه من شئ فحكمه إلى الله" (الشوریٰ: ۱۰) اس لئے اس کی مملکت میں پارلیمنٹ کے کام دو نوعیت کے ہوں گے، ایک تو قرآن و حدیث کے دیے ہوئے قوانین کی تشریح و توضیح،

دوسرے انتظامی اُمور جیسے ٹریفک، ریلوے وغیرہ کے بارے میں قانون سازی، تو پہلی قسم کے پارلیمانی کام میں غیر مسلموں کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ اس قانون پر یقین ہی نہیں رکھتے؛ البتہ انتظامی نوعیت کے قوانین میں ان سے رائے لی جائے گی، اسی طرح غیر مسلم اپنے سماجی قوانین وضع کر سکتے ہیں، پس مسلم مملکت کی پارلیمنٹ میں غیر مسلم ارکان ہوسکتے ہیں؛ لیکن شرعی قوانین کی توضیح ان کے دائرۂ عمل سے باہر ہوگی؛ البتہ ان کے مفادات کی پوری رعایت ملحوظ رہے گی۔

۸- غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں ملازمت کے مواقع دیئے جائیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدر کے قیدیوں سے مسلمان بچوں کو تعلیم دلانا ثابت ہے (دیکھئے: مسند أحمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۵، عن ابن عباسؓ)، اس سے معلوم ہوا کہ شعبۂ تدریس میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر ایک مشرک کو دلیل بنایا ہے، اس سے علامہ ابن قیمؒ نے ثابت کیا ہے کہ غیر مسلم ملازم رکھے جاسکتے ہیں (أحکام أہل الذمۃ: ۱؍۲۰۷، لابن القیم)، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن غیر مسلموں سے ملک کی سلامتی اور اس کی فکری سمت کو خطرہ نہ ہو، ان کو حساس عہدوں پر بھی مامور کیا جاسکتا ہے اور ان سے فوجی مدد بھی لی جاسکتی ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقینقاع کے یہودیوں سے بھی مدد لی تھی (نصب الرایۃ: ۳؍۴۲۲)، اسی لئے فقہاء کا ایک بڑا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قابل بھروسہ مشرکین سے عسکری مدد بھی لی جاسکتی ہے (کتاب الاعتبار للحازمی: ۲۱۷)۔

۹- غیر مسلموں کو کچھ خاص حدود کے ساتھ مذہبی آزادی بھی حاصل ہوگی؛ البتہ اس سلسلہ میں چند نکات قابل لحاظ ہیں:

(الف) غیر مسلموں کو عقیدہ کی مکمل آزادی ہوگی، قرآن مجید کا ارشاد بالکل واضح ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں " **لا إکراہ في الدین قد تبین الرشد من الغی** " (البقرۃ: ۲۵۶) اس لئے کسی غیر مسلم کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) ایسی بات کہنا جو ان کے لئے مذہبی دل آزاری کا باعث ہو اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی اہانت کے دائرہ میں آتا ہو جائز نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے: " ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله " (الانعام:۱۰۸)، پھر یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ " اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ان کی زبان میں رسول بھیجے ہیں " (ابراہیم: ۴)، پس غیر مسلم حضرات جن خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں، یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے پیغمبر رہے ہوں اور کسی بھی پیغمبر کی اہانت باعث کفر ہے؛ اس لئے اسلام سے پہلے جو مذاہب گذرے ہیں، ان کے پیشواؤں کی بے احترامی کسی طور روا نہیں۔

(ج) غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہبی طریقہ پر عبادت کرنے کی آزادی ہوگی اور وہ اپنے معاشرتی قوانین میں بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں مختار ہوں گے، حضرات صحابہؓ کے دور میں جہاں کہیں جنگ کے بعد صلح ہوئی تو اس میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کے حق کو تسلیم کیا گیا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ مسلمان شوہر کی یہودی عیسائی بیوی کو اس کا شوہر بھی عبادت اور اس کے مذہبی فرائض سے نہیں روک سکتا اور نہ اس کو ایسی چیزوں کے کھانے پر مجبور کر سکتا ہے، جو اس کے مذہب میں حرام ہو (احکام أہل الذمۃ:۱/۳۱۶)۔

چنانچہ غیر مسلموں کو خنزیر کھانے کی اجازت ہوگی، ان کو شراب کی خرید و فروخت کی بھی اجازت ہوگی (ہدایۃ، باب نکاح أہل الشرک)، یہاں تک کہ مجوسیوں کے یہاں ماں، بیٹی اور محرم رشتہ داروں سے بھی نکاح کی اجازت تھی، فقہاء نے لکھا ہے کہ جب تک وہ دونوں یا ان میں سے ایک مسلمان نہ ہوں، ہم ان کے معاملہ میں دخل نہیں دیں گے (ہدایۃ، باب وصیۃ الذمی)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عرفہ بن حارث رضی اللہ عنہ ذمیوں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: " وأن يخلى بينهم وبين أحكامهم " (مجمع الزوائد، حدیث نمبر:۹۱۸۰۳)۔

(د) غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بھی حق حاصل ہوگا، قرآن مجید نے

اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ فاتحین، مفتوحین کی عبادت گاہوں کو منہدم کردیں: "ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيراً" (الحج: ۴۰)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے جو معاہدہ فرمایا، اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی، ان کے مذہبی پیشوا سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ انھیں ان کے دین سے ہٹایا جائے گا" لا يهدم لهم بيعة ولا يخرج لهم قس ولا يفتن عن دينهم" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱)، اسی طرح کی تحریریں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی مختلف صلح ناموں میں لکھی ہیں (کتاب الخراج لأبی یوسف: ۱۴۳)۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل نجران سے معاہدہ کی تجدید میں بھی اس دفعہ کو شامل رکھا ہے (کتاب السیر والخراج والعشر للشیبانی: ۲۵۰)۔ حضرت خالدؓ کے صلح ناموں میں صراحت ہے کہ وہ اوقات نماز کو چھوڑ کر جس وقت بھی چاہیں ناقوس بجانے کا حق رکھیں گے اور اپنے تیوہاروں میں صلیب بھی نکالیں گے (کتاب الخراج: ۱۴۶)۔ فقہاء کے یہاں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ ان کی جو عبادت گاہیں ٹوٹ جائیں، وہ ان کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حق رکھتے ہیں، چنانچہ علامہ ظہیر الدین مرغینانی فرماتے ہیں:" إن انهدمت البيع والكنائس القديمة أعادوها" (ہدایۃ، باب الجزیۃ)۔

جہاں تک نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بات ہے تو قرآن وحدیث میں صراحتاً کہیں اس کی ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے، اور بعض فقہاء کے یہاں اس کے جائز ہونے کی صراحت ملتی ہے کہ وہ اپنی زمین میں عبادت گاہ تعمیر کرلیں "ولا يمنعون أن يجعلوا في أراضيهم ولاصوامع ولا كنائس" (کتاب السیر والخراج والعشر للشیبانی: ۲۵۳)، اسی طرح غیر مسلم اپنی عبادت گاہوں کے لئے وقف بھی کرسکتے ہیں، بعض فقہاء کی عبارت سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے: " إذا تبنىٰ داره بيعة أو كنيسة فهو جائز من الثلث" (ہدایۃ، باب وصیۃ الذمی)۔

(ہ) غیر مسلموں کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے سوا دوسری اقوام پر اپنے

مذہب کی تبلیغ کریں، اگر وہ رضا کارانہ اپنا مذہب بدل لیں، جیسے یہودی عیسائی، یا عیسائی ہندو بن جائے تو اس سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں ہوگا، امام مالکؒ نے اس کی صراحت کی ہے، (مؤطا امام مالک: ۳۰۸، القضاء فیمن ارتد عن الإسلام) البتہ اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب میں آنے کی دعوت دیں، اگر دارالاسلام میں کوئی مسلمان مرتد ہوجائے تو اس کی سزا قتل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: " **من بدل دینه فاضربوا عنقه**" (ابوداؤد: ۲/ ۵۹۸، ترمذی: ۲/ ۲۷۰)؛ کیوں کہ دارالاسلام میں اسلام سے ارتداد بغاوت کے مترادف ہے اور دنیا کے ہر قانون میں بغاوت کی سزا قتل یا اس کے مماثل ہے۔

۱۰- غیر مسلم شہریوں کو بھی احتجاج کا حق اور اظہار رائے کی آزادی ہوگی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " **لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول إلا من ظلم وکان اللہ سمیعاً علیماً**" (النساء: ۱۴۸)۔ غیر مسلموں کو مسلمان اور ان کے افکار پر سنجیدہ اور شائستہ تنقید کا بھی حق ہوگا؛ جیسا کہ قبیلۂ بنی نجران سے آپ کا مباحثہ ومناقشہ ہوا، فقہاء نے تو یہ بھی لکھا ہے: "**ومن امتنع من الجزیة أو قتل مسلماً أو سب النبی صلی اللہ علیه وسلم أو زنی بمسلمة لم ینتقض عھدہ**" (ہدایۃ، باب الجزیۃ)؛ لیکن ظاہر ہے کہ ایسی تنقید جو بدتمیزی اور بے ادبی کے دائرہ میں آتی ہو، کی اجازت نہیں ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی وجہ سے چاہے عہد ذمہ ختم نہ ہو، لیکن بطور سرزنش وہ لائق قتل ہوگا۔

۱۱- غیر مسلموں کے ساتھ عمومی حسن سلوک اور مالی اعانت نہ صرف جائز؛ بلکہ مستحسن ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " **لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم إن اللہ یحب المقسطین**" (الممتحنۃ: ۸) اہل ذمہ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اہل مکہ کی بھی مدد فرمائی، جو اسلام سے برسر جنگ اور قحط سے دوچار تھے، آپ نے ان کی مدد کے لئے پانچ سو دینار ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن

امیہ کو بھیجا کہ اسے اہل مکہ پر تقسیم کردیں، (ردالمختار: ۳/ ۳۰۲، باب المصرف) اسی لئے فقہاء حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کے سوا تمام صدقات واجبہ، نیز صدقۃ الفطر غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے اور صدقات نافلہ تو بدرجۂ اولیٰ، (دیکھئے: درمختار مع الرد: ۳/ ۳۰۱) پس غیر مسلم اقلیت کو تمام معاشی سہولتیں دی جائیں گی، خاص طور پر بیمار، معذور، آفت زدہ، مفلس اور قدرتی مصائب سے دوچار ملک کے تمام شہریوں کی انسانی بنیادوں پر مدد کی جائے گی۔

۱۲- غیر مسلموں پر شخصی حیثیت سے ایک خاص ٹیکس جزیہ کا اور زرعی پیداوار پر خراج کا لیا جائے گا، عورت، نابالغ بچہ، فاتر العقل، سن رسیدہ بوڑھا، اپاہج اور دائم المریض اشخاص نیز معاشی اعتبار سے کمزور افراد پر جزیہ کا ٹیکس عائد نہیں ہوگا (احکام اہل الذمۃ: ۱/ ۴۸، ۵۲، ۵۳، ہدایہ، باب الجزیۃ)۔ جزیہ کی مقدار بہت ہی معمولی ہے، جزیہ کے عوض حکومت ان کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے اور چوں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اگر ان سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنے کے مترادف ہوتا؛ اس لئے ان پر ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا ہے، جو پہلے سے ایران وغیرہ کے علاقہ میں مروج تھا۔

جیسے مسلمانوں سے ان کی زرعی پیداوار میں عشر لیا جاتا ہے، جو ایک طرح کی عبادت ہے، اسی طرح غیر مسلموں سے بجائے عشر کے خراج لیا جاتا ہے، جس کی مقدار معمولی ہے اور جو سیلاب یا سوکھا پڑ جانے کی صورت میں معاف ہو جاتا ہے (ہدایہ، باب العشر والخراج)۔ یہ ٹیکس غیر مسلموں کی تذلیل نہیں؛ بلکہ ملک کی انتظامی ضرورتوں کو اس طرح پورا کرنا ہے کہ ان پر زکوٰۃ وعشر جیسی خالص اسلامی عبادت لازم قرار نہ دی جائے؛ کیوں کہ یہ مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کو حل کرنے، نوجوان نسل کی علمی وفکری تربیت کرنے اور اس دور میں پیدا ہونے والے سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں رہنمائی کے لئے کوشاں ہے، اس نے اب تک اٹھارہ سمینار کئے

ہیں، جس میں تقریباً ڈیڑھ سو فقہی فیصلے کئے گئے، ان سمیناروں سے ہٹ کر تربیتی وفکری نوعیت کے چوبیس پروگرام منعقد کئے جاچکے ہیں، اہم علمی وفقہی موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، کویت سے شائع ہونے والی عظیم الشان فقہی انسائیکلو پیڈیا ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کی پوری پینتالیس جلدوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور اکیڈمی کے سمیناروں میں پیش ہونے والے مقالات کے تقریباً تیس مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جو اُردو زبان میں نئے مسائل پر ہونے والی فقہی کاوشوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نہ صرف ملک میں؛ بلکہ بیرونِ ملک بھی اکیڈمی کی علمی وتحقیقی کاوشوں کو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

حضرات! اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ سمینار ہے، اس وقت پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق زیر بحث ہیں، اقوام متحدہ بھی اس سلسلہ میں مختلف فیصلے کرتی اور رکن ممالک کو توجہ دلاتی رہی ہے؛ کیوں کہ جمہوری نظام میں اگر اکثریت انصاف کا دامن چھوڑ دے اور اپنی عددی طاقت کا ہتھیار ظلم وجبر کے لئے استعمال کرنے لگے، تو پھر یہ جمہوریت اکثریت کی آمریت اور استبداد کا روپ اختیار کرلیتی ہے اور اقلیت کے لئے اپنی شناخت کو باقی رکھنا دشوار ہوتا ہے؛ بلکہ کسی قوم کا غالب حصہ اگر کم تعداد اقلیت پر ظلم وزیادتی کے لئے کمربستہ ہوجائے تو اس کا زخم شخصی آمریت اور استبداد سے بھی زیادہ گہرا ہوتا جاہے اور اقلیت نہ صرف دکھ اُٹھاتی ہے؛ بلکہ اس کی مصیبت پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ بھی میسر نہیں ہوتی، اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمان اور دوسری مذہبی، لسانی اور جغرافیائی اقلیتیں اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، انشاء اللہ یہ سمینار اقلیتوں کے حقوق کو واضح کرنے، اس نسبت سے اکثریت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے، نیز اقلیتوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں مفید ومعاون ثابت ہوگا، خدا کرے یہ سمینار ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

☆☆☆

ب: تاثراتی کلمات

صدارتی کلمات

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد!

محترم حضرات! میرے لئے یہ بہت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ میں ایسی محترم اور اہم مجلس میں حاضر ہوا، اور میں نے مختلف حضرات کے خیالات سنے، اور ان کی باتیں سنیں جو انھوں نے موجودہ عہد میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں اور اقلیتوں کے سلسلہ میں جو طرز عمل سامنے آرہا ہے، ان پر روشنی ڈالی اور ان چیزوں کو واضح کیا جن کی وضاحت کی ضرورت ہے، اگرچہ یہ وضاحت کسی ایک مجلس اور مختصر وقت میں کی جائے، یہ کافی نہیں ہے، اس وضاحت کی بڑے پیمانے پر ضرورت ہے، اس لئے کہ بعض اصطلاحات کو غلط سمجھا جارہا ہے، اور ان سے بہت ہی بگاڑ کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور اس میں وہ حضرات کہ جن کو خاص طور پر نشانہ بنالیا گیا ہے، یعنی وہ بعض اقلیتیں اور خاص طور پر مسلمان اقلیتیں جو اس وقت دنیا کے اکثر ملکوں میں پائی جاتی ہیں، مسلمانوں کی تھوڑی بہت تعداد، یعنی اقلیت کے دائرے میں ہے وہ دنیا کے ہر ملک میں اس وقت پائی جارہی ہے، شاید ہی کوئی ملک مستثنیٰ ہو، یورپ کے ملک ہوں یا مشرقی ممالک کے ملک ہوں ان میں آپ دیکھیں گے کہ مسلم اقلیت ہر جگہ موجود ہے، اور کثرت سے ملکوں میں آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے، اور ابھی اسی تعلق سے دنیا کے اکثر ملکوں میں یہ مسئلہ چل

☆ صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

رہا ہے اور مسلمان اقلیت کو مسائل درپیش ہیں، جس کی خبریں آپ اخبارات میں دیکھتے ہوں گے، کہیں مسجدوں کے مینار اونچے کرنے کا مسئلہ آجاتا ہے، کہیں لڑکیوں کے سر ڈھکنے کا مسئلہ آجاتا ہے، کہیں اور بھی مسئلہ اٹھادیا جاتا ہے، اوراس سے مسلمانوں میں بے چینی کی فضا پیدا ہوجاتی ہے، یہ یوں ہی بلاوجہ نہیں ہورہا ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے باقاعدہ ایک مقصد ہے اور اگر یہ کہوں تو یہ بات غلط نہ ہوگی کہ جب روس کی طاقت ختم ہوئی اور مغربی دانشوروں میں جو سیاسی بصیرت رکھتا تھا اس نے کہا کہ اب ہمارے پیش نظر مسلمان ہے، خاص طریقے سے کہا، اوراس کی اس بات کو بعض ملکوں نے سراہا، اورایسا معلوم ہوا کہ اسی کے مطابق پالیسی اختیار کرلی گئی، اوراس پالیسی کو نافذ کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ اختیار کئے جانے لگے۔

یہ جو واقعات ہوتے ہیں جسے دہشت گردی کہا جاتا ہے جس کے بارے میں متعین قطعی طور پر یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ کرنے والے نے اپنے مذہب یا فرقے یا اپنے گروہ کی خاطر ایسا کیا ہے، بلکہ اس میں ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ بعض لوگوں کو کرائے پر لے کر بھی کرائے جاتے ہیں اوراس کا اخفا کیا جاتا ہے، تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کس نے کرایا ہے اور مسلمانوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں نے کیا، حالانکہ اسلام میں ایسی کوئی چیز مطلق جائز قرار نہیں دی گئی، اورانتقام لینے کے لئے ہمارے یہاں ہم کو قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ اگر تم پر جو ظلم ہوا ہے اس کا اگر تم انتقام لو تو جتنا ظلم ہوا ہے اتنا ہی تم انتقام لے سکتے ہو، اس سے زائد نہیں، اس کے بعد اگر تم نے انتقام لیا تو وہ تمہارے خلاف قابل سزا چیز بن جائے گی، اوراگر تم معاف کردو گے تو یہ زیادہ بہتر ہے، قرآن مجید نے ہم کو ہدایت دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسلمانوں کو ہدایات دی ہیں وہ امن پسندی کی ہدایات دی ہیں، قرآن مجید میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ دوسرے مذہب والوں کو برا مت کہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور معاف کرنے کو ترجیح دی ہے، کہ

تمہارے ساتھ اگر کوئی زیادتی کرتا ہے اور ظلم کرتا ہے تو اسے معاف کردو تو یہ زیادہ اچھا ہے، ورنہ تم اتنا ہی انتقام لے سکتے ہو جتنا تم پر ظلم ہوا ہے، اور یہ واقعات جو ہو رہے ہیں یہ بالکل اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، ظاہر ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایسا نہیں کرسکتا، اگر وہ کرتا ہے تو اسلام کے خلاف کرتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی مقصد سے ایسا کر رہا ہے، اور اس سے کرایا جارہا ہے، آپ دیکھئے سب سے پہلے جہازوں کے اغوا کے واقعات یہ تبت سے شروع ہوئے، اور آپ دیکھئے خودسوزی کے واقعات اور انسانی بم کے واقعات تو یہ تو ایل ٹی ٹی ای کی طرف سے پہلے اس طرح کے واقعات سامنے آئے، اور مسلمانوں کی طرف اس کو منسوب کیا جارہا ہے، یہ تاریخ لمبی نہیں ہے، چند سال پہلے سے اچانک اس طرح کے واقعات سامنے لائے جانے لگے، جبکہ اس سے پہلے دوسروں کے واقعات سامنے آرہے تھے، مسلمانوں کے واقعات اس طرح کے بالکل نہیں آتے تھے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہمارے قرآن کی تعلیم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیم سب ہم کو اس بات سے روکتے ہیں، اور ہمارا میڈیا ان چیزوں کو نمایاں کر کے پیش کرتا ہے، حالانکہ میڈیا کا کام یہ ہونا چاہئے کہ اچھے اخلاق اور اچھے صفات پیدا کرنے والی جو باتیں ہیں ان کو نمایاں کرے، کیا اچھے واقعات کم ہوتے ہیں، بہت ہوتے ہیں ہمدردی کے واقعات، انسانی بھلائی کے واقعات اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے واقعات، حالانکہ میڈیا ان کو نہیں پیش کرتا، میڈیا یہ پیش کرتا ہے کہ فلاں نے فلاں کو مار دیا، فلاں نے وہاں ڈاکہ ڈالا، فلاں نے یہ کردیا، صرف جرائم کے واقعات میڈیا پیش کرتا رہتا ہے، اور ان جرائم کو اگر مسلمانوں کے نام اس میں ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اخبارات ان کو خوب نمایاں کرتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے واقعات کو نمایاں کیا جاتا ہے اور دوسروں کے واقعات کو ہلکے طریقے سے پیش کیا جاتا ہے، میڈیا یہ کام کر رہا ہے اور میڈیا ظاہر ہے کہ بہت زیادہ اثر انداز ہے، اور میڈیا کیا آپ خود دیکھیں کہ کوئی بات اگر بار بار کہی جائے تو اس

کا اثر پڑتا ہے، میں حوالہ دیتا ہوں ایک کتاب: ''کلیلہ ودمنہ'' کا جس کے واقعات ہندوستان ہی کے ہیں، اس میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک سادھو یا سوامی جی بکری لے جا رہے تھے چار ڈاکوؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ بکری ان سے کسی طرح حاصل کی جائے، اس نے یہ کیا کہ چاروں کچھ کچھ فاصلوں پر کھڑے ہوگئے، جب سوامی جی بکری لے کر نکلے تو پہلے نے کہا کہ سوامی جی یہ کتا آپ کہاں سے لے آئے، سوامی جی بولے یہ کتا ہے، یہ بکری ہے، تم اندھے ہو، پھر آگے چلے دوسرا ملا اس نے بھی کہا کہ سوامی جی یہ آج کتا آپ کے ساتھ کیسے ہے، سوامی جی نے کہا یہ کتا ہے، یہ بکری ہے دیکھتے نہیں ہو تم، پھر تیسرے نے ایسے ہی کہا، آخر میں گھبرا کر انہوں نے بکری چھوڑ دی کہ ایسا لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہے یہ بکری سب کو کتا نظر آ رہی ہے، وہ کیا جانیں کہ یہ ایک سازش ہے تو سازش کے طریقے سے بعض وقت کسی کو پریشان کرنا اور حقائق کو بدل کر پیش کرنا اور اپنی مرضی کی باتیں رائج کر دینا یہ کیا جا سکتا ہے، کرنے والے کر سکتے ہیں، اور خاص طور سے آپ دیکھئے کہ مسلمانوں کے تعلق سے جو پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور بات کہی جاتی ہے وہ اتنی زیادہ کہی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات آ جاتی ہے۔

ایک واقعہ ہمیں بتایا ایک صاحب نے کہ ایک مسلمان دفتر میں کام کرتے تھے اس کے ساتھی ہندو تھے، ان کے گھر پہ وہ ملنے گئے بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے بس آناً فاناً ان کا بچہ آیا، انھوں نے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا یہ میرا بیٹا ہے، اب جو اخلاق کا طریقہ ہوتا ہے اس نے کہا آؤ بیٹے آؤ وہ نہیں آیا، حتی کے اس کے باپ نے کہا جاؤ بیٹا تمہارے چچا ہیں، اس کے باوجود نہیں آیا، پھر اس بچے نے چپکے سے اپنے والد کے کان میں کچھ بات کہی، انہوں نے پوچھا کہ کیا بات کہی تو انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی، مگر زیادہ اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ یہ بچہ یہ کہہ رہا تھا کہ یہ مسلمان ہیں تو ان کے جیب میں چاقو ضرور ہوگا، اب آپ ہی بتایئے ایک بچہ اس بات کو کیسے کہے گا؟ ظاہر ہے گھر میں اس بات کا چرچا رہا ہوگا کہ مسلمانوں کے جیب میں چاقو ضرور رہتا ہے، تو

پروپیگنڈے کا اثر یہ پڑتا ہے کہ اصطلاحات کے متعلق اور جو الفاظ ہیں اس کے متعلق رائے بدل جاتی ہے، جیسے جہاد کا پروپیگنڈا اتنا کیا کہ معلوم ہوا کہ خالص دہشت گردی کا نام جہاد ہے، حالانکہ قرآن کریم کو دیکھ کر سمجھا جاسکتا ہے، حدیث شریف کو دیکھ کر سمجھا جاسکتا ہے، کہ جہاد تو ''جہد'' کو کہتے ہیں اور اس میں طاقت کا استعمال بعد میں آتا ہے، پہلے ساری کوششیں آتی ہیں اور طاقت کا استعمال بے گناہوں کے ساتھ اور صحیح لوگوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا، بلکہ طاقت کا استعمال اسلام میں اس وقت ہے جب کوئی بڑا بگاڑ پیدا ہو رہا ہو، بہت خرابی پیدا ہوگئی ہو اس کو بغیر طاقت کے روکا نہیں جاسکتا ہو، دنیا کی کون سی ایسی شریعت اور قانون ہے جو ایسے موقعہ پر طاقت کے استعمال کو جائز نہ کہتا ہو، اور جہاد تو ''جہد'' کو کہتے ہیں، مگر ایسا ذہنوں میں بیٹھا دیا گیا ہے کہ جہاد کے لفظ سے لوگ خوف زدہ ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دہشت گردی کی تعلیم ہے، یہ ضرور ہے کہ ہماری غلطی بھی ہے کہ اسلام کے متعلق، اسلام کی تعلیم کے متعلق ہم زیادہ بتا نہیں پاتے، ہمیں کام کرنا چاہئے، ہم ان کے ذہنوں کو صاف کریں، ظاہر ہے آدمی جس چیز کو سنتا ہے اسے مان لیتا ہے، اس میں ان کا قصور نہیں ہے، قصور ہمارا ہے کہ ہم ان کو سمجھا نہیں سکے ایک بات تو یہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ عمداً اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے متعلق خراب تصور پیدا ہو، اور اس کی سازش کرتے ہیں، جیسا کہ اس وقت مغربی ممالک میں کی جارہی ہے، مغربی ممالک کی طرف سے باقاعدہ اس کی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ مسلمانوں کے متعلق خراب تصور پیدا ہو، اور ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ یہ جانور قسم کے لوگ ہیں، یہ شریف انسان نہیں ہیں، اس کے لئے تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، اور اس کے لئے ان کی سب سے بڑی تدبیر میڈیا ہے، لیکن ہمارے ملک میں اور ہمارے علاقوں میں، مشرقی علاقوں میں میڈیا کو ایسی پالیسی پر نہیں چلنا چاہئے، یہاں جو جمہوریت ہے اور اقلیتوں کو اور دوسرے مذہب کے لوگوں کو دستور جو حقوق دیتا ہے اس کو سامنے رکھ کر میڈیا کو کام کرنا چاہئے، ہمارے ملک کی یہ میڈیا کی

اخلاقی ذمہ داری ہے، آپ لوگ دیکھتے ہوں گے کہ میڈیا کا رویہ گھٹا دینے کا اور بڑھا دینے کا صاف نظر آئے گا، بعض واقعات کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں بڑی سرخیوں کے ساتھ اور نمایاں کر کے، حالانکہ وہ واقعہ معمولی ہوتا ہے، اور بعض واقعات بہت اہم ہوتے ہیں مگر ان کو معمولی طور پر ایک کالم میں اور معمولی سرخی کے ساتھ دیتے ہیں، یہ طریقہ نہیں اختیار کیا جانا چاہئے یہ ناانصافی کا طریقہ ہے، ہر چیز کا ایک قد ہوتا ہے، اس قد کے مطابق عمل کرنا چاہئے، قد بڑھا نہیں دینا چاہئے اور گھٹا نہیں دینا چاہئے، تو یہ میڈیا کا بہت بڑا قصور ہے اور ہمارا بھی قصور ہے کہ ہم اس کی کوشش نہیں کرتے کہ جو غلط فہمیاں ہیں وہ صاف ہوں، اور سچی بات یہ ہے کہ جو واقعات ہوئے یورپ میں اور مسلمانوں پر ڈال دیے گئے کہ انھوں نے یہ سب کرایا ۱۱/۹ کا واقعہ، اب تو تحقیقات آ رہی ہیں کہ خود امریکہ نے کرایا ہے اور جن لوگوں پر الزام ہے وہ غلط الزام ہے، اب تو کتابیں آ گئی ہیں، لیکن اس کا اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا جان بوجھ کر کہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے کیا ہے، مسلمان جو ترقی یافتہ ہیں وہ بھی اس منزل پر نہیں پہونچ پاتے کہ وہ اتنا بڑا واقعہ کر دیں، اور اس واقعہ کے اندر کئی جھول ہیں اس پر کتابیں آ گئی ہیں، مضامین آ چکے ہیں، بہرحال یہ پروپیگنڈا کر کے مسلمانوں کے تعلق سے ایسا خراب تصور پیش کر دیا گیا ہے کہ سب ان کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجرموں کی ٹولی ہے۔ جو لوگ خاص طور پر اس سازش کو کر رہے ہیں یہ بہت افسوس کی بات ہے اور اس کو کیسے روکا جا سکتا ہے، اس کو روکنا بہت مشکل ہے، لیکن یہ کہ جہاں تک اس غلط فہمی کو دور کر سکتے ہیں ہمیں دور کرنا چاہئے۔

اب اس کا دوسرا پہلو یہ سامنے آیا کہ ان واقعات کے نتیجہ میں لوگوں نے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کیا، کہ بھائی اسلام جو اتنا خطرناک ہے اور لوگوں کو دہشت گردی سکھاتا ہے اور اتنے بڑے بڑے واقعات کرتا ہے اور اس کے دین والے کرتے ہیں تو اس کے دین کو سمجھنا بھی چاہئے تو کثرت سے لوگوں نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا، ہمیں اس وقت اطلاع ملی تھی کہ

سارے کتب خانے خالی ہوگئے تھے قرآن مجید کے نسخے سے، لوگوں نے خرید لیا اور اس کا مطالعہ شروع کیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مطالعہ کے بعد بجائے مسلمانوں کے خلاف وہ تصور قائم کرتے جو باور کرایا جارہا تھا، وہ مسلمان ہوگئے، سال بھر کے اندر امریکہ میں تیس ہزار لوگ مسلمان ہوئے، قرآن مجید پڑھ پڑھ کر، تو قرآن مجید اور حدیث پڑھنے کے بعد تو خود ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ دین کس قدر امن پسندی اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے، اس دین کے اندر کتنی تاکید آئی ہے کہ تمام انسانوں کو انسان کے برابر سمجھا جائے، اور حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر صاف صاف اعلان فرمایا کہ عرب برتر ہیں نہ عجم برتر ہیں، بس جو اچھی زندگی گزارے، جو احتیاط کی زندگی گزارے وہ اس سے اچھا ہے جو احتیاط کی زندگی نہیں گزارتا'' **لافضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأسود على أحمر إلا بالتقوى كلكم من آدم و آدم من تراب**'' فرمایا: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے، کوئی کسی پر فضیلت نہیں رکھتا، اور اسی سے آپ دیکھیں گے کہ جہاں واقعی اسلامی حکومت قائم ہوئی قرآن و حدیث کی رو سے وہاں غیر مسلموں کے ساتھ اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا گیا کہ شراب اسلام میں منع ہے اور اس پر سزا ہوتی ہے، مگر غیر مسلم اس زمانے میں شراب پی کر مسلمانوں کی مجلس میں آتا تھا، اور کوئی ٹوکتا نہیں تھا، کیا شراب جائز ہے؟ تو قرآن و حدیث کی رو سے جو عمل کرے گا وہ قطعاً ان میں سے کسی چیز کا مرتکب نہیں ہوگا اور ہو بھی نہیں سکتا، اس کے سامنے آخرت کا مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے اور جواب دینا ہے اپنے اعمال کا تو کیسے وہ ظلم کرے گا، اور اتنا بڑا ظلم کرے گا کہ دوسرے کی جان لے لے، تو جو مسلمان اس کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اسلام کی بنیاد پر نہیں، یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے، تو ہمارے کچھ وہ لوگ جو غلط فہمی میں مبتلا ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کو صحیح طور پر معلوم کریں، قرآن مجید موجود ہے، حدیث شریف موجود ہے، اور مسلمانوں کا یہ رویہ ہونا چاہئے کہ وہ ان غلط فہمیوں کو دور

کرنے کی کوشش کریں، کم سے کم اپنے تعلق والوں کو ایسی چیزیں دیں جن سے غلط فہمی دور ہو، اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ غلط ہے، بلکہ وہ چیزیں جن سے ان کو ثبوت ملے اس بات کا کہ یہ چیزیں اسلام میں صحیح نہیں ہیں۔

تو مسلمان جہاں اقلیت میں ہیں، محض اس لئے نہیں کہ وہ اقلیت میں ہیں، بلکہ حقیقت میں ان کے متعلق جو غلط پروپیگنڈا ہو رہا ہے، اس کی بنا پر ان کے ساتھ برا سلوک ہوتا ہے، ورنہ اقلیت، اقلیت کی اصطلاح تو نئی اصطلاح ہے، پہلے یہ اصطلاح تھی ہی نہیں، پہلے اقلیت اور اکثریت کی اصطلاح چلتی ہی نہیں تھی، یعنی اس دور میں یہ اصطلاح چلی ہے اقلیت اور اکثریت کی، تو اقلیت اکثریت کوئی چیز ہی نہیں ہے، سب انسان برابر ہیں، سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے، سب کے حقوق ادا ہونے چاہئے، ایک دوسرے کے ساتھ پڑوسیوں جیسا اور بھائیوں جیسا سلوک ہونا چاہئے، ہمارے یہاں اسلام میں تو اس کی تاکید آئی ہے، لیکن جمہوری لحاظ سے بھی یہ ضروری ہے کہ سب کو یکساں سمجھا جائے، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے کہ یہ سب انسان ہیں اور برابر ہیں، اگر ایسا کیا جائے تو ایسا امن قائم ہوگا کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگی، میں اپنے بچپن کی بات عرض کرتا ہوں، اب وہ چیزیں خال خال ہوگئیں ہیں، میں نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ رہ رہے ہیں ایک محلّہ میں، ایک دوسرے کے ساتھ ایسی ہمدردی کرتے ہیں کہ جیسا کہ بھائی پڑوسی ہونے کی وجہ سے، یہ ان کے خوشی اور غم میں شریک ہیں، وہ ان کے خوشی اور غم میں شریک ہیں، بھائیوں کی طرح سلوک کرتے ہیں، یہ بات میں نے دیکھی ہے اور یہ بات عام تھی، اب اس ملک میں ایسی تبدیلی آ گئی کہ یہ چیز خال خال ہوگئی، اور اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ مسلمان ہے یا ہندو ہے، فرق کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کر رہا ہے، مذہب بدلنے کی بات نہیں کہی جا رہی ہے، لیکن انسان ہونے کے ناطے ہم سب یکساں ہیں، ہم

سب ایک ملک کے باشندے ہیں، ہم سب پر ملک کی ترقی کی ذمہ داری ہے، ہم کو ملک کی ترقی کو دیکھنی چاہئے، اور اس میں شریک ہونا چاہئے، اس لئے کہ ہم اس ملک کے رہنے والے ہیں، اور اپنی خوشی سے رہ رہے ہیں، ہم کو کسی نے مجبور نہیں کیا ہے، دستور بھی ہم کو سکھاتا ہے اور انسانی قدریں ہم کو یہ بات سکھاتی ہیں، اس میں جو فرق آ گیا ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، میڈیا کے ذریعہ سے بھی، آپسی ملاقاتوں کے ذریعہ بھی، برادرانہ گفتگوؤں کے ذریعہ سے بھی، یہ ہماری بھی ذمہ داری ہے اور غیروں کی بھی ذمہ داری ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق دے، اور یہ کانفرنس جو ہو رہی ہے یہ بہت ہی مفید کانفرنس ہے اس میں اچھے اچھے مقالے اور تحریریں آ رہی ہیں، اور اسلاموفوبیا جو ہے، حقیقت میں یہ اصطلاح نکالی گئی ہے زبردستی کہ اسلام سے ڈرو، اسلام بہت خطرناک ہے، یہ تحریک چلائی گئی ہے، یہ کوئی پہلے سے اختیار کی گئی بات نہیں ہے، باقاعدہ یہ تحریک چلائی جا رہی ہے، تاکہ مسلمانوں کے متعلق خراب تصور قائم ہو، اور سب ان کو چھوڑ دیں، بلکہ انسانیت سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ ان کا ہم کو مقابلہ کرنا چاہئے، لیکن علمی اور ادبی ذرائع سے ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہے، تاکہ لوگوں کا ذہن صاف ہو اور یہ غلط فہمیاں دور ہوں، یہ کانفرنس اور اس طرح کی دوسری کانفرنسیں بھی انشاء اللہ اس میں مفید ہوں گی، اگر یہ سلسلہ رہے تو انشاء اللہ اس کا اچھا اثر مرتب ہوگا۔

☆☆☆

مولانا سید نظام الدین صاحب☆

الحمد لله رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین۔

بزرگان محترم، علماء کرام، دانشوران ملت اور حاضرین مجلس!

آج کا یہ سمینار جس عنوان پر اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے، اس میں تین عنوانات آگئے ہیں، اقلیتوں کے حقوق، اسلاموفوبیا، اور آزادی رائے کے حدود۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس پر جو باتیں سامنے آچکی ہیں وہ آپ سب نے سن لی ہیں، جہاں تک حقوق کی بات ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ عام انسانی حقوق کے بارے میں قرآن نے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا ہے، وہ تفصیل آچکی ہے، قرآن پاک نے تو تمام انسانوں کی وحدت کو بیان کیا ہے کہ وہ ایک ماں باپ سے پیدا کئے گئے اور ان میں جو ایک دوسرے پر فضیلت ہے وہ تقوی کی وجہ سے ہے، جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو اور جس کے اندر اللہ کے سامنے اور اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو اور اس کی وجہ سے وہ گناہوں سے بچتا ہو، اور جو حکم ہے، اور طریقہ زندگی ہے سب کے ساتھ انسان کے حق کو ادا کرنا اور جن انسانوں کے ساتھ ہم رہتے ہیں، چاہے وہ ماں باپ ہوں، بیوی بچے ہوں، بھائی بہن ہوں، پڑوسی ہوں ان کے حقوق کو ادا کرنا اگر اس کو اللہ کے خوف سے اور اس کی جوابدہی کو سامنے رکھ کر کرتا ہے تو وہی انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا ہے، ایسے تمام انسان ایک ماں باپ آدم اور حوا سے پیدا کئے گئے ہیں اور وہ محض تعارف کے لئے جان پہچان

☆ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امیر شریعت بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ

کے لئے قبیلوں اور خاندانوں میں یا لسانی اعتبار سے یا بدنی اور وطنی اعتبار سے الگ الگ ہوں، لیکن ہیں وہ اللہ کی نظر میں ایک ہی ماں باپ سے پیدا کئے ہوئے اور اس کو ناپنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ واقعی وہ اللہ سے ڈرتے ہیں کہ نہیں اور ان کے دل میں اللہ کا اور اپنے پیدا کرنے والے کا خوف ہے یا نہیں، یہ صاف بات ہے کہ ہر انسان اس کو تو مانتا ہے کہ ہم اس دنیا میں اپنے آپ نہیں آئے ہیں، اپنی خواہش سے نہیں آئے، ماں باپ کی خواہش سے نہیں آئے اور نہ ہی کسی اور کی خواہش سے آئے ہیں، بلکہ کسی غیبی طاقت نے ہم کو اس دنیا میں بھیجا ہے، اور اس دنیا سے جانے میں بھی میری خواہش کو کوئی دخل نہیں ہے، کوئی بہت بڑی عمر کو پہونچنے کے بعد بھی برسوں بستر پر پڑا رہتا ہے اور جب تک وقت نہیں آتا دنیا سے نہیں جاتا، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان جس کی زندگی کی سارے لوگ دعا کرتے رہتے ہیں اچانک کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے یا کسی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو جب آنا ایک اللہ کے حکم سے ہوا جس کو ہم پیدائش کہتے ہیں اور جانا اس کے حکم سے ہوا تو آنے اور جانے کے درمیان جو یہ Period ہے زندگی ہے یہ کس کے حکم سے ہے، ظاہر ہے ہماری ویسٹری کا جو بنانے والا ہے وہی زیادہ جانتا ہے کہ ہماری زبان کو کیا بولنا چاہئے، ہماری آنکھ کو کیا دیکھنا چاہئے، اور ہمارے ہاتھ اور پیر سے کونسا عمل ہونا چاہئے اور کونسا نہیں ہونا چاہئے، اسی نظام زندگی کو قرآن نے بیان کیا، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ رسالہ زندگی، عہد نبوت میں اس پر عمل کر کے دکھلایا ۱۳ رسال مکی زندگی میں، جبکہ آپ کو مخالفتوں کا زبردست سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ آپ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی، آپ کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا، آپ کو لالچ دیا گیا، آپ کو دھمکیاں دی گئیں تو لالچ کی وجہ سے بھی، دھمکی کی وجہ سے بھی بائیکاٹ سے یا قتل کی سازش سے بھی آپ حق بات بولنے سے رکے نہیں اور آپؐ نے بھی سماج بنایا برداشت اور تحمل کے ساتھ حق کی دعوت دی، تو حق کی دعوت دینے کے ساتھ حالات کے تقاضوں کے تحت کہاں کہاں ہم کو تحمل اور برداشت سے کام لینا

چاہئے، یہ حضورؐ کی ۱۳ رسالہ مکی زندگی میں بہت نمایاں، واضح اور صاف موجود ہے، اسی طرح ۱۰ رسالہ زندگی جو مدینہ کی ہے، اس میں ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے آپ اس کو اسلامی معاشرہ کہیں، لیکن حقیقت میں وہ ایک انسانی معاشرہ ہے، اس میں انسانوں کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ تمہاری دنیا کی زندگی بھی اور آخرت کی زندگی بھی اسی وقت کامیاب ہوگی کہ جب اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس کروگے، آخرت پر ایمان لاؤگے، نیک عمل کروگے، برائیوں سے بچے رہوگے، یہ دس سال کے اندر ہوا، یہاں تک کہ جب آپ دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت ایک لاکھ انسان کو اپنے لائے ہوئے پیغام پر عمل کرنے والا بنا کر چھوڑا اور انھوں نے ساری دنیا کے اندر اس پیغام کو پہونچایا، اس میں دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سی خصوصیات تھیں، کیا تعلیم تھی قرآن کی، اور اس قرآن کی تعلیم کا کیا عملی نمونہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، جس کو قرآن نے ''اسوۂ حسنہ'' کہا ہے، یہ اسوۂ حسنہ کیا تھا، اور کیا آپ کی زندگی جو ہمارے سامنے ہے اس کو کہاں تک ہم سامنے رکھتے ہیں، اس کا مطالعہ ضروری ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ عام انسان ہونے کے اعتبار سے انسانوں کے حقوق کیا ہیں، اقلیتوں کے حقوق کیا ہیں؟ پھر ہمارے انسانوں کے درمیان جو اونچے طبقے کے لوگ ہیں، اہل علم ہیں ان کے حقوق کیا ہیں، پھر جو پسماندہ لوگ ہیں ان کے حقوق کیا ہیں، غلاموں کے کیا ہیں جو اس زمانے میں تھے، اور آج جو کمزور اور مظلوم ہیں ان کے حقوق کیا ہیں اور عورتوں کے کیا ہیں، مردوں کے کیا ہیں؟ یہ ساری نشاندہی قرآن و سنت کے اندر موجود ہے، اسی میں یہ ''حقوق الاقلیات'' بھی ہے۔

یہ اقلیت اور اکثریت کی اصطلاح تو اب نکلی ہے، یہ سیاسی اصطلاح ہے، قرآن میں یہ اصطلاح کہاں ہے، سنت میں یہ اصطلاح کہاں ہے، ابتدائی تاریخ میں یہ اصطلاح کہاں ہے، یہ تو سیاست کی اصطلاح ہے؟ کہ موجودہ جمہوریت میں جن کا ووٹ اکاون فیصد ہے وہ اکثریت میں ہے اور جن کا ووٹ ۴۹ رفیصد ہے وہ اقلیت میں ہے، اب ۵۱ رفیصد نے جو فیصلہ کردیا وہ حق ہوگیا

اور ۴۹ ؍فیصد زیرو ہوگیا، یہ تو سیاسی اصطلاح ہے، اور اسی سیاسی اصطلاح نے لوگوں کو حق کی ادائیگی سے روک دیا ہے، ہم چونکہ طاقت میں ہیں، ہم اقتدار میں ہیں، ہم اکثریت میں ہیں، ہمارے ہاتھ میں قانون سازی ہے، ہم جو چاہیں کریں گے، اور اس میں چاہے مغرب ہو یا ہمارے ملک میں بھی اسی طرح کے احساسات پائے جاتے ہیں، جہاں ظلم و ناانصافی ہے وہاں یہ احساس ہے کہ جو ظلم کرنے والا ہے وہ اپنے آپ کو انصاف کے ترازو میں نہیں دیکھتا، وہ دوسروں کے حقوق کو پہچانتا ضرور ہے، کون ہے جو نہیں پہچانے گا، آج ساری دنیا نے پڑھ لیا کہ عراق کے اوپر جو الزام تھا کہ عام تباہی کے ہتھیار اس کے پاس موجود ہیں وہ چھپائے ہوا ہے وہ ظاہر نہیں کرتے اور اس کو فتح کرکے اس کے چپے چپے کو چھان مارا اور پھر اس نے خود کہا کہ یہ اطلاع غلط تھی، اور اس کے بعد اس میں لاکھوں انسان مارے گئے، صرف یہ نہیں کہ وہاں کے صدر کو پھانسی دی گئی، بلکہ لاکھوں بے قصور انسان مارے گئے، آج کون اس کو برا کہہ رہا ہے؟ ہمت نہیں ہے برا کہنے کی، ہمت نہیں ہے کسی ملک کی سیاسی پارٹی کو اور پارلیمنٹ کو کہ اس کی مذمت کرے، یہ خوف کا ماحول پیدا کرنے سے یہ اسلاموفوبیا ہی نہیں ہے کہ اسلام کے بارے میں خوف لوگوں کو دلایا جاتا ہے، یہ تو ایک طرح کا پروپیگنڈا ہے، لیکن عمل کے اعتبار سے دیکھئے کہ یہ رویہ کیا ہے، اسلامی ملکوں کے ساتھ، دوسرے ملکوں کے ساتھ، خود ہمارے ملک کے اندر کیا رویہ ہے، تو یہ دیکھنا پڑے گا ہمارے پاس قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے، وہ جیسی نازل ہوئی ویسے ہی موجود ہے، انسانی مسائل کا سارا حل اس میں موجود ہے، اس کے سارے حقوق بیان کردیئے گئے ہیں، اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حقوق میں مساوات نہیں ہے، حقوق کی ادائیگی میں مساوات ہے، ماں کا الگ ہے، بیوی کا الگ ہے، باپ کا الگ ہے، بیٹے کا الگ ہے، لیکن دونوں کے حق کی ادائیگی میں عدل ہے اور عدل کا حکم ہے، ظاہر ہے کہ ماں کا حق اور ہے اور بیوی کا کچھ اور ہے، بیوی کا حق بیوی ہونے کی حیثیت سے ادا کیا جائے گا، ماں کا حق ماں ہونے کی حیثیت سے ادا کیا جائے گا۔

ایک بڑا علم والا ہے اور ایک مزدور ہے، مزدور کا بھی حق ہے وہ مزدور کی حیثیت سے ادا کیا جائے گا اور جو پروفیسر ہے، ڈاکٹر ہے یا سائنس داں ہے اور اس کی جو خدمات ملک کے لئے ہیں ان کے حقوق ان کی خدمت کے لحاظ سے ادا کئے جائیں گے، تو یہاں یا جن جن ملکوں میں اقلیات ہیں، تو اقلیت تو تعداد کے اعتبار سے ہے، حق کے اعتبار سے اقلیت نہیں ہے، حقوق تو وہی ہیں، ہم کہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کے اندر چاہے پندرہ کروڑ ہوں یا سترہ یا بیس کروڑ ہوں ان کی خاص چیزیں تو بہت چند ہیں، مسجد ہے، مدرسہ ہے، قبرستان ہے، لیکن ۹۵ رفیصد حقوق تو ان کے وہ ہیں جو اس ملک کے سارے لوگوں کے ہیں، جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کا معاملہ سب کے لئے ہے، تعلیم کا مسئلہ سب کے لئے ہے، صحت کا معاملہ سب کے لئے ہے، راستہ ہونا چاہئے سب کے لئے ہے، بجلی سب کے لئے ہے، پانی سب کے لئے ہے، روزگار سب کے لئے ہے، ملک کی ترقی میں سب کو ساجھیدار ہونا چاہئے، سب کو ترقی کرنا چاہئے، ملک کا ہر باشندہ ترقی کرے یہ حق سب کو ہے، پھر بتایئے کیوں ناانصافی ہے؟ تو ناانصافی تو اس لئے ہوتی ہے کہ ایک مذہبی عنوان اس کو دے دیا جاتا ہے، اس کو اقلیت قرار دے دیا جاتا ہے، چاہے لسانی بنیاد پر ہو، یا بدنی بنیاد پر ہو، یہ تو ہم کرتے ہیں کہ ان کو تعداد کی کمی کی وجہ سے یا مذہبی تعداد کی وجہ سے اقلیت کہہ دیتے ہیں اور ابھی آپ کے سامنے بات آ گئی جناب سید شہاب الدین صاحب نے اور لوگوں نے بھی بتایا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ آ گئی اور دوسری رپورٹیں آ گئیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ:

مصرعہ:

"ترا ہی دل نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں"

آپ دینا ہی نہیں چاہتے ہیں تو اس میں حق کا کیا مطلب، جب دن کی روشنی کی طرح یہ بات عیاں ہے کہ یہاں مسلمانوں کی جو آبادی ہے وہ پچھڑتی جارہی ہے، سیاسی میدان میں پچھڑ رہی ہے، تعلیمی میدان میں پچھڑ رہی ہے، اقتصادی میدان میں پچھڑ رہی ہے اور گاؤں گاؤں میں

اس طرح کی نفرت کی بات پھیلائی جاتی ہے، کیا ریاست کی سرکاریں اس کی ذمہ دار نہیں ہیں؟ کیا برسر اقتدار گروپ اس کی ذمہ دار نہیں ہے؟ یہاں اور لوگ جو شریک ہیں اس کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ اس فضا کو ختم کریں۔

میں پھر وہی بات کہوں گا جو برابر کہتا رہتا ہوں کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے صرف تماشا دیکھنے کو پیدا نہیں کیا، یا ہم صرف احتجاج کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں، بلکہ مسلمان ایک اقدامی امت ہے، ان کے ذمہ یہ سونپا گیا ہے کہ معروف کو پھیلاؤ، جو چیز ہونا چاہئے اس کی دعوت دو اور جو چیز نہیں ہونی چاہئے اس کو روکنے کی کوشش کرو، یہ ہماری ذمہ داری ہے، اس لئے اگر دوسرے مسلم ملکوں کے اندر اقلیات کے حقوق دبائے جاتے ہیں تو ہمیں آواز اٹھانا چاہئے، کیوں نہیں اٹھائیں گے آواز، قرآن کے خلاف کوئی کرے اس کے خلاف ہمیں آواز اٹھانا ہے، اگر اس ملک کے اندر کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اور ظلم کیا جاتا ہے تو آواز اٹھانی چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سنجیدگی کے ساتھ اس جمہوری ملک میں اس درجہ انحطاط کس طرح آیا ہے، انصاف کی کسوٹی میں فرق کیوں آیا، اور ہمارا گراف کیوں گرتا ہوا چلا جارہا ہے؟ اس کو سنجیدگی سے دیکھنا ہوگا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے جو فرمایا کہ غیر مسلم کے حقوق کا خیال رکھنا چاہئے یہ اظہر من الشّمس بات ہے، یہ صاف بات ہے، سوال یہ ہے کہ آج کے حالات کے اندر اقلیتوں کے ساتھ اور خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ اسلاموفوبیا کے نام پر ہوں یا جیسے بھی ہوں جو مظالم ہورہے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اور اس میں ہمیں کیا رول ادا کرنا پڑے گا۔

بلاشبہ اس مضمون کو اسلامک فقہ اکیڈمی نے اٹھایا ہے، لیکن غور کرنے کی بات سب کے لئے ہے، جو اس ملک کے دانشور ہیں وہ غور کریں کہ اگر سترہ یا بیس کروڑ انسان یہاں پسماندہ ہوگئے، بے کار ہوگئے اور غربت وافلاس کے شکار ہوگئے تو کیا بقیہ لوگ آرام اور چین کی زندگی گزار سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، بے انصافی اور جس ملک میں ظلم بڑھے گا، بے انصافی آئے گی

وہ ملک کے لئے اور مستقبل کے لئے بلا شبہ نقصان دہ ہے، یہ مسلمانوں کو بھی سوچنا ہے، یہاں کے دانشوروں کو بھی سوچنا ہے اور ہمیں بھی اس بات کی کوشش کرنی ہے۔

آزادی رائے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے کے حقوق کا خیال کریں، اظہار رائے میں اگر ہم دوسری قوموں کے جذبات کا خیال نہیں رکھتے اور اظہار چاہے اخبار میں کریں یا تقریروں میں کریں، اظہار رائے کا مطلب یہ ہے کہ آپ وہ بات کہئے جس سے تصادم نہ ہو، اگر آپ کی بات سے تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور آپ کی بات سے سوسائٹی میں نفرت پیدا ہوتی ہے تو یہ اظہار رائے کی آزادی نہیں ہے، اور اس کی آزادی نہیں دی جائے گی، یا اس طرح کی آزادی جیسا کہ قانون آیا تھا کہ ہم جنسی کی شادی، کہ مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ کرلے بالکل غیر فطری بات ہے جس کو خود تعزیرات ہند میں جرم قرار دیا جائے، قابل سزا جرم اور سپریم کورٹ خود اس کی شفارس کرے کہ اس قانون میں ترمیم کی جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے، جب ہم اخلاقی اعتبار سے اتنے گر جائیں گے تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا حال ہوگا؟ اب اس معاملہ کے اندر آواز کون اٹھائے گا، وہ دانشوران اٹھائیں گے جن کے دل میں انسانی حیا موجود ہے، یا خود مسلمانوں کو اٹھانا چاہئے دانشوروں کو اٹھانا چاہئے، اسی طرح عورتوں کی آزادی کی بات اٹھائی جاتی ہے، آزادی نسواں، حقوق نسواں، عورتوں کے کونسے حقوق کی پامالی ہورہی ہے جس کی آواز اٹھانے کی ضرورت ہے؟ اس کی تفصیل پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ہوس کے لئے، اپنی نگاہ کی تسکین کے لئے، ان کو بالکل بے پردہ کردیں، ان کو بازار میں لاکر کھڑا کردیں، ان کو ایسی آزادی دیدیں کہ جس سے معاشرہ اور سوسائٹی سب خراب ہوجائے، یورپ میں، فرانس میں، مغربی یورپ میں، امریکہ اس میں پر تجربہ کیا جاچکا ہے، کیا ہمارے ملک میں بھی اس کا تجربہ کیا جائے، کیا ہمارے ملک اور پرانی سنسکرتی میں جو حیا اور شرم کی بات ہے وہ ختم ہوجائے، اسلام میں جو "الحیاء شعبة من الایمان" کہا گیا ہے وہ ختم ہوجائے

اور ہم تماشا دیکھیں؟ نہیں اس کے بارے میں ہمیں بہت سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ پروپیگنڈا کا معاملہ ہے میڈیا کا معاملہ جن کے ہاتھ میں میڈیا کی قوت ہے وہ جھوٹی سچی جیسی بات چاہتے ہیں دنیا میں پھیلا رہے ہیں، جن کے پاس نہیں ہے وہ نہیں کر رہے ہیں، ہمیں ان چیزوں کے بارے میں بہت ہی اچھے انداز میں ریسرچ کر کے، تلاش کر کے بولنا چاہئے پھیلانا چاہئے، مجلسوں میں، سمیناروں میں، الکٹرونک میڈیا میں، پرنٹ میڈیا میں، ہر زبان میں، لکھنا اور بولنا چاہئے، صرف اردو میں لکھنے اور بولنے سے کام نہیں چلے گا، بین الاقوامی زبان انگریزی ہے، ہماری قومی زبان ہندی ہے اور علاقائی زبانیں ہیں، ان کے اندر بڑی تعداد میں لکھیں اور صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، ہمارا ملک اخلاقی اور روحانی اعتبار سے انحطاط کے راستے پر چلا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ گاؤں گاؤں اور بڑے بڑے شہر کے اندر کاؤنٹنگ کر کے یہ باتیں کہی جائیں کہ انسانی حقوق کا کیا مطلب ہے اور آزادی رائے کا کیا مطلب ہے، اور اسلام امن کا مذہب ہے، انصاف کا مذہب ہے، مساوات کا مذہب ہے، اخوت کا پیغام دیتا ہے، اس سے ڈر اور خوف کی کیا بات ہے؟ یہ بات جب تک پوری قوت کے ساتھ نہیں کہی جائے گی، اور اس کی ذمہ داری جب تک ہم نہیں لیں گے، اور ہم میں سے جو لوگ جس نام سے بھی کام کرتے ہیں اس ملک کے اندر ان سب کو سامنے رکھنا چاہئے، صرف مسلمان ہی نہیں، ہمارے سامنے پوری آبادی ہے، ان کے سامنے ہم الفت کا پیغام، اسلام کا پیغام پہونچائیں اور جو بات اسلام کے خلاف کہی جا رہی ہے خود بخود ختم ہو جائے گی، جب اس کی اصلی صورت لوگوں کے سامنے آئے گی تو یہ باتیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

آج آپ پڑھ رہے ہیں کہ مغرب میں اور جاپان میں اسلام پھیل رہا ہے، اسلام پھیل رہا ہے اپنی خوبیوں کی وجہ سے، جب پروپیگنڈا شروع ہوا تو لوگوں نے کہا کہ جب ۱۴ سو سال سے یہ مذہب دنیا کے اندر ہے آخر آج سارا مسلمان دہشت گرد کیسے ہو جائے گا، آج سارے

مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آواز کیوں اٹھ رہی ہے، تب انہوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا، اپنے طور پر لوگ اسلام کا مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہونچے کہ آج اگر امن اور عافیت اور انصاف مل سکتا ہے اور انسانی مساوات کا صحیح پیغام مل سکتا ہے تو وہ اسلام کا راستہ ہے وہی لوگ قرآن سمجھنے کی طرف راغب ہوئے، وہی سنت سمجھنے کی طرف راغب ہوئے، وہی اسلام کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے، اس حقیقت کو جاننے کے بعد وہ اسلام کی طرف آرہے ہیں، اب اس سے مغربی ممالک کے اندر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں اسلام پھیل گیا پورے طریقے پر تو ہمارے ہاتھ سے اقتدار چلا جائے گا تو انھوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا، تو جس انداز سے یہ پروپیگنڈا کیا جارہا ہے اسی انداز سے اس کے دفاع کی ضرورت ہے، اور یہ صرف قول سے نہیں، بلکہ عمل سے ہم کو پیش کرنا ہوگا کہ اسلام کی صحیح تصویر کیا ہے، صرف مسجد کے اندر سے کوئی اسلام کو نہیں سمجھے گا جب تک اس کو ہم بازار میں نہیں دکھلاتے کہ اسلامی تجارت کیسے ہوتی ہے، اسلامی شادی بیاہ کیسا ہوتا ہے، اور اگر کوئی مسلمان جو ملازمت کرتا ہے اور کوئی ذمہ داری اس کے سپرد کی جاتی ہے تو وہ کیسے نبھاتا ہے، مسلمان ڈاکٹر کیسا ہوتا ہے، مسلمان انجینئر کیسا ہوتا ہے، اس کا فیصلہ کیسا ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان وزیر اعظم بنادیا جائے تو اس کو کیا کرنا چاہئے، وہاں اگر وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرے گا، اپنے محلّہ میں، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ، غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ، ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ رام پرشاد ماسٹر تھے وہ دوسری جگہ ملازمت کرتے تھے، ان کے گھر میں صرف عورتیں تھیں، ڈاکوؤں نے ان کے گھر پہ حملہ کر دیا اس کے بغل میں ایک مسجد تھی، جہاں ستائیسویں شب جو ہوتی ہے رمضان کی شب قدر اس میں لوگ عبادت کر رہے تھے، ہر آدمی لگا ہوا تھا قرآن کی تلاوت میں، اچانک شور کی آواز آئی عورتوں کے چیخنے کی رام پرشاد کے گھر سے، کچھ لوگوں نے دیکھا نکل کر فوراً پہونچ گئے، گولیاں چلیں ان کی طرف سے کافی لوگ اس میں زخمی بھی ہوئے، لیکن عورتوں کی عزت بچ گئی، رام پرشاد کا گھر بچ گیا، تو جب ہم سمجھائیں گے کہ بھائی

آج اس رام پرشاد کے جان مال کی حفاظت ایک پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہم پر ضروری ہے اور جب ان پر آفت آ گئی تو ہمیں قرآن کی تلاوت اور نماز کی نیت اور مسجد کا احاطہ سب کچھ چھوڑ کر جان بچانا ہے، جب یہ چیز ان لوگوں کی سمجھ میں آئے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک نکاح کے موقعہ پر جب ہم نے عورتوں کے حقوق بیان کئے کہ اسلام میں کیا ہیں، شہر ٹاٹا کی بات ہے، ساٹھ فیصد اس میں ہندو غیر مسلم اور پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع تھا اور میں نے کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی بس پندرہ بیس منٹ کی تھی، اس کے بعد نکاح پڑھا کر ہم چلے گئے، لوگوں نے پھر بلایا، اس وقت کے گورے لال کلکٹر تھے، پرویز حیات ایس پی تھے اور ٹاٹا کارپوریشن کے بڑے بڑے لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب نکاح تو برابر ہوتا تھا، مگر یہ ہم نے نہیں سنا تھا، آج پہلی بار میں نے سنا ہے کہ عورتوں کے حقوق کیا ہیں؟ اور گورے لال جو کلکٹر تھے انہوں نے یہاں تک کہا کہ مولانا صاحب آپ کی بات سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ جب میری بیٹی کا نکاح ہو تو پنڈت جی چاہے جیسے نکاح پڑھائیں مگر لکچر آپ کا ہونا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ جب لوگ واقف ہی نہیں ہوں گے، لوگوں کو واقفیت ہی نہیں ہے، ہم لوگوں کو سمجھایا ہی نہیں ہے، اس لئے ہم کو سب سے پہلے اپنی ذمہ داری دیکھنا چاہئے اور اس میں جو کچھ ہو، چاہے اسلاموفوبیا ہو، یا اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں غلط فہمی ہو، یا آزادی رائے کا غلط مطلب سمجھا جا رہا ہو، اس کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ہمیں تیار ہونا ہوگا اور اس کے لئے باضابطہ حکمت عملی طے کرنا ہوگی، اور اس میں تمام غیر مسلم دانشوروں کو، امن پسندوں کو، انسانیت دوست لوگوں کو ساتھ لیکر ایک لمبی تحریک چلانی ہوگی تو ہمارے حق میں اور اس ملک کے حق میں بہتر ہوگا، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

☆☆☆

اے بی وردھن کی انگریزی تقریر☆

خلاصہ: ڈاکٹر قاسم رسول الیاس صاحب

جو باتیں وردھن صاحب نے کہیں وہ بہت اہم ہیں اور Important ہیں، انھوں نے یہ کہا کہ جو باتیں مجھ سے پہلے بہت سے مقررین نے کہیں ہیں میں ان سے اتفاق کرتا ہوں، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جمہوریت میں 51 رفیصد لوگوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ باقی لوگوں کے بارے میں جو چاہیں فیصلے کریں اور 49 رفیصد لوگ جو کچھ ہیں وہ زیرو ہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ بات بھی کس حد تک صحیح ہے، جن کو آپ 51 رفیصد کہتے ہیں وہ بھی کہاں ۵۱ ر فیصد ہوتے ہیں، اس وقت جو لوگ سرکار میں ہیں حکومت کر رہے ہیں وہ بھی پوری آبادی کا صرف ۳۰ رفیصد ووٹ لاتے ہیں اور اس کے بعد حکومت کے اہل بن جاتے ہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ جمہوریت میں ۵۱ رفیصد لوگ ہی حکمراں ہوتے ہیں یہ بات موجودہ جمہوریتوں کے اندر صحیح نہیں ہے، لیکن بہر حال ہمارے نزدیک ڈکٹیٹر اور بادشاہت کے مقابل جمہوریت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

ایک بات وردھن صاحب نے یہ کہی کہ یہ بات کہی جارہی ہے کہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ بھید بھاؤ (Discrimination) ہورہا ہے، استحصال ہورہا ہے مذہب کی وجہ سے اور مذہب کی بنیاد پر، لیکن یہ اس کا ایک Spect یعنی ایک پہلو ہے، آپ کو یہ دیکھنا چاہئے کہ استحصال کی کئی شکلیں ہیں جو اس ملک میں رائج ہیں، مثال کے طور پر کسی اقلیت کے لوگوں کو اقتدار

☆ جنرل سکریٹری سی، پی، آئی، ایم

میں برابری کی شرکت نہیں ملتی Employment میں Job میں ان کے ساتھ Discrimination ہوتا ہے، تو یہ بھی استحصال ہے، ہمارے لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ سرکاری نوکریوں میں، پولیس میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے، پولیس کی ذمہ داری Lawand Order کی ہے اور خاص طور سے جب فسادات ہوتے ہیں ملک میں تو اس وقت پولیس کا بہت بڑا رول ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ پولیس کے اندر مسلمانوں کا تناسب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو استحصال Discrimination کے اندر شمار ہوتے ہیں۔

جہاں تک میڈیا کے رویہ کا تعلق ہے بحیثیت کمیونسٹ کے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کا میڈیا کس طرح سے Treat کرتا ہے۔

بہت ساری غلط فہمیاں ہیں جو پیدا کی جاتی ہیں اسلام کے تعلق سے، مسلمانوں کے تعلق سے اور پھر یہ کہ اس کو پھیلایا جاتا ہے میڈیا کے ذریعہ سے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایک لفظ ''جہاد'' ہے جس کے بارے میں اس ملک میں اور پوری دنیا میں غلط معنی پہنائے گئے ہیں، وردھن صاحب کہتے ہیں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس لفظ کے بارے میں بہت صاف ہوں اور بہت کلیر ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ایک خاص وقت ایمرجنسی کے دوران ملا اور کئی سال جیل میں رہنے کا موقعہ ملا تو اس وقت ہمیں مسلمان دوستوں کے درمیان رہنے سے مجھے قرآن شریف پڑھنے کا موقعہ ملا اور اس دوران میں نے لفظ جہاد کو اچھی طرح سے سمجھا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تعلق سے لوگوں کو صحیح معنی اور مطالب بتائے جائیں، یہ بات جو مولانا نظام الدین صاحب نے کہی ہے کہ غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت ہے اپنے قول سے بھی اور اپنے عمل سے بھی، یہ بہت اہم ہے کہ آپ اپنے عمل کے ذریعہ سے بھی لوگوں کی غلط فہمیاں دور کریں، لفظ جہاد کو اس سے آگے بڑھا کر مسلمانوں کو جہادی کہا جارہا ہے۔

جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے اور کرکرے صاحب نے جو کچھ کیا وہ کہتے ہیں کہ

اس کا ایک بیک گراونڈ ہے، میں بھی ناگپور کا رہنے والا ہوں اور کرکرے کے والد بھی وہیں کے رہنے والے ہیں وہ ہمارے دوست تھے میں جانتا ہوں ان کے بیک گراونڈ کو، لیکن دہشت گردی کو ۱۱/۹ کے بعد جو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کیا جارہا تھا، یہ بات غلط تھی اور یہ خاص امریکہ کی ایجاد ہے کہ اس نے دہشت گردی کا تعلق مذہب سے جوڑ دیا، آپ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ناگالینڈ میں آسام میں جو دہشت گردی ہورہی ہے وہ کون کررہا ہے، اس کا مسلمانوں سے کیا تعلق ہے، تو یہ دہشت گردی کے لفظ کو مسلمانوں سے جوڑنا یہ بہت غلط بات ہے اور یہ دور ہونا چاہیے۔

وردھن صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر مذہب کا ایک ہدف ہوتا ہے، ہر مذہب کے بارے میں یہ کہنا کہ میرا مذہب برتر ہے اور دوسرے کا مذہب کمتر ہے یہ صحیح نہیں ہے، ہر مذہب کی اپنی تعلیمات ہیں وہ بہت اچھی ہیں اور ہمیں ہر مذہب کا احترام کرنا چاہئے، اس اعتبار سے اگر کوئی شخص دوسرا مذہب قبول کرتا ہے تو اس کی آزادی ہونی چاہئے، یہ بات جو کہی جاتی ہے ہمارے ملک میں خاص طور سے فسطائی طاقتوں کے ذریعہ سے کہ کوئی شخص اگر اسلام مذہب قبول کرتا ہے یا کرسچینیٹی قبول کرتا ہے تو یہ تبدیلی مذہب جبر کا نتیجہ ہے، دباؤ کا نتیجہ ہے یہ بات غلط ہے جو لوگ تبدیلی مذہب کی بات کرتے ہیں وہ Reconversion کی بات کرتے ہیں یعنی جو لوگ اسلام یا کرسچنٹی قبول کرتے ہیں ان کو دوبارہ اپنے مذہب میں لانے کی بات کرتے ہیں تو ان کے نزدیک اگر تبدیلی مذہب غلط ہے تو Reconversion بھی غلط ہونا چاہئے، اسی طرح جو لوگ اسلام میں Reform اور اصلاح کی بات کرتے ہیں ان کے سلسلہ میں میرا احساس یہ ہے کہ ہر مذہب کا اپنا یہ اندرونی معاملہ ہے، دوسرے لوگوں یا باہر کے لوگوں کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اصلاح کو یا Reform کو اس مذہب پر Impose کریں۔

☆☆☆

جناب سید شہاب الدین صاحب ☆

میرے بزرگو اور دوستو!

یہ جو چند منٹ ملے ہیں ان میں کچھ بنیادی باتیں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں، یہ سوال جو اقلیتوں کے ساتھ جو حسن سلوک کا ہے، اور اقلیت کے ساتھ کارفرمائی ہے ظاہر ہے یہ ہندوستان تک محدود نہیں ہے، یہ گلوبل مسئلہ ہے، بین الاقوامی مسئلہ ہے، اگر یہ جائزہ لیں کہ دنیا کی کل آبادی میں میرا اندازہ ہے کہ پانچواں حصہ تقریباً اقلیتوں سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اپنے اپنے ملک میں وہ اقلیت میں ہیں، ہمارے ملک میں تو کئی مذہب والے اقلیت میں ہیں، اور جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے تو ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا میں اگر ان کی آبادی سولہ سو ملین مانی جائے تو میرے اندازے کے مطابق کم سے کم چار سو ساڑھے چار سو ملین مسلمان اقلیتی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے یہ مسئلہ ظاہر ہے کہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے اور ہندوستان ایک نمونہ پیش کرتا ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی خامیوں پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں اور دنیا میں جو کمیاں ہیں ان پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں۔

دوستو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کے ساتھ جو تفریق برتی جاتی ہے اس پر بہت تفصیل سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے نظر ڈالی ہے میں چند لفظوں میں یہ کہوں گا کہ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ملک کی سیاست میں ہماری نمائندگی پوری نہیں ہوتی، اقتصادی معاملات میں ہمیں حصہ داری نہیں ملتی، ہم محروم رہ جاتے ہیں، سماجی معاملات میں ہم کنارے بٹھا دیے جاتے ہیں، اور تعلیمی معاملات میں آپ جانتے ہیں کہ ہم پیچھے رہ جاتے ہیں یا پیچھے رکھ دیے جاتے

☆ سابق ممبر پارلیمنٹ

ہیں، اور اسلاموفوبیا جو ہمیں نظر آتا ہے ہر جگہ اس کو کئی پہلو سے ہمیں دیکھنا چاہئے، ایک پہلو جو سب سے اہم ہے وہ میڈیا کا ہے جس پر آپ نے توجہ دلائی خاص کر آج کے زمانے میں جو الکٹرونک میڈیا کا رول رہتا ہے، اس کے بعد ہمارے یہاں جو تقریریں ہوتی ہیں سیاست دانوں کی ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کی، ان تقریروں میں اسلاموفوبیا کہاں تک جھلکتی ہے، اس کے علاوہ جو بیانات ہوتے ہیں یا جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں، جو نصابی کتابیں ہیں ہمارے اسکولوں کے اندر ان کے اندر کس قدر زہر افشانی ہوتی ہے، اور خاص کر کے ہمارے جو لوگ ہیں ان کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے، چونکہ میں سوال یہ رکھنا چاہتا ہوں کہ جب ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ کچھ قانون تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ معاملہ دراصل ایک ذہنی بیماری ہے، اور ایک بات میں آپ سے عرض کرنا چاہوں گا بڑے ادب کے ساتھ اور حال کی بات ہے کہ پوری رام جنم بھومی تحریک کے دور میں کسی مسلمان نمائندے نے ایک بات ایسی نہیں کہی جس سے رام کی تکذیب یا ہندو بھائیوں کی دل آزاری ہو، جبکہ مسلمانوں کی دل آزاری کے لئے جس دن جو اخبار چاہیں اٹھا لیجئے، جو کتابیں چاہیں اٹھا لیجئے ان کے اندر آپ کو صفحے کے صفحے مل جائیں گے، اور اس کے نمونے ملتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جو تعلیم ہمیں دی ہے اس کی روشنی میں اس معاملہ میں ہم آگے ہیں کہ ہم دوسرے کے معبودوں کو دوسروں کے خداؤں کو برا نہیں کہتے یا نیچا نہیں دیکھاتے، آج یورپ میں اسلاموفوبیا اتنی تیزی سے پھیل رہی ہے، مگر اس بات پر آپ غور کریں کہ یورپ کی طرف اسلام دو طرف سے بڑھا ہے، ایک اندلس کے راستے سے اور ایک بلقان کے راستے سے، اسپین سے تو آہستہ آہستہ اسلام کا صفایا ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھی ترکوں کی یورش جاری رہی اور وہ تقریباً یورینا کے دروازے سے وہ پیچھے ہٹا دی گئی، اب آپ غور کریں اس دور میں ہم نے یورپ کو بہت فیض پہونچایا، مگر آج اس کی ذہنی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کو ماننے کو بھی تیار نہیں ہے، کل ہی میں ایک رسالہ پڑھ رہا تھا اس میں یہ لکھا تھا کہ

انگلینڈ میں ایک کتاب چھپی اس میں جو بڑے بڑے سائنس دان جو قبل مسیح کے یونانی سائنس داں دنیا میں پیدا ہوئے جیسے آر کے وڈیسٹ وغیرہ ان کے نام اس میں لکھے گئے، اس کے بعد پورے بارہ سوسال کا گیپ ہوتا ہے اور بارہ پندرہ سوسال کے بعد نشاۃ ثانیہ کے بعد اسلام سے فیض یاب ہونے کے بعد یورپ میں کچھ نئے جو سائنس داں پیدا ہوئے ان کا نام آتا ہے اور اس دور میں پانچ سو برس ایسا رہا جس کے متعلق تاریخ داں یہ کہتے ہیں کہ ہر پچاس سال میں ایک نمایاں اسلامی شخصیت سائنس کے میدان میں پیدا ہوئی ان کا کہیں پر نام نہیں ہے، یہ کیوں ہوتا ہے، یہ نظر انداز ہمیں کیوں کیا جاتا ہے، اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کے دماغ میں یہ زہر بھرا ہوا ہے کہ مسلمان ہمارے دشمن ہیں، اس دشمنی اور انتقام کے جذبہ سے ہم کو دور رکھا جاتا، آج بھی یورپ میں جو کوآپریٹیو پرنسپل ہے وہ یہی ہے کہ Islam is seem as a thret اسلام میں وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں، صرف مذہبی خطرہ ہیں سماجی خطرہ محسوس کرتے ہیں، اقتصادی خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو سیاست ہے ہمارے یہاں اس میں ایذا رسانی ہوتی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے؛ میڈیا میں ہمیں جواب دینا چاہئے، ہم مونیٹرنگ بھی نہیں کرتے، ہم کتابوں پر نظر رکھیں، اسکول کی کتابوں میں غلطیاں لکھی ہوئی ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کریں، میں اس سلسلہ میں آپ کے سامنے ایک مثال دینا چاہتا ہوں، امریکہ میں یہودیوں کی ایک بہت منظّم تنظیم ہے۔ (ANTIDIFINATION TEEM) وہ اس پر زبردست کام کر رہی ہے، خاموشی سے کام کرتی ہے، اگر ٹی وی پر ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیں جس سے کسی یہودی کی دل آزاری ہو، یا اس کو کوئی صدمہ پہونچے تو فوراً پوری قوم حرکت میں آجاتی ہے پھر اس کے بعد اس ریڈیو اسٹیشن کے پاس، بولنے والے کے پاس، اپنی رائے پیش کرنے والوں کے پاس ہزاروں کی، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مراسلات موجود ہوتے ہیں، جمہوری طاقت کا وہ استعمال کرنا چاہتے ہیں، کاش ہمارے پاس بھی ایک ایسا کوئی نمونہ موجود ہوتا اور ہم مل جل کر اس کا علاج

کر سکتے، بین الاقوامی سطح پر قانون پاس ہوتے ہیں، ہیومن رائٹس چارٹر کا ذکر ہوا، کلیریشن کے چارٹر کا ذکر ہوا، لیکن اس میں ایک بات آئی ہے، میں نے UNO، کے ہیومن رائٹس چارٹر کا مطالعہ کیا اور میں نے اس کا مقابلہ کیا جو اسلامی انسانی حقوق ہیں ان سے اس کے اندر تھوڑی سی ڈسکیپنسی (Discapancy) ہے میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، مگر بتانا چاہوں گا کہ ہماری اس تحریک کے ذریعہ جو ہم اسلاموفوبیا کے خلاف چلا رہے ہیں جو اسلامک چارٹر میں، ورلڈ چارٹر میں جو (Discapancy) ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ایک حکومت جو اپنے کو اسلامی حکومت کہتی ہے، وہاں کوئی غیر مسلم سربراہ نہیں ہوسکتا، اور نہ کوئی پالیسی میکنگ پوزیشن پر آسکتا ہے، دوسری جگہ بھی نہیں آسکتا یہ الگ بات ہے، لیکن یہاں پر جو تفریق رکھی گئی ہے اس کو ہمیں دیکھنا چاہئے۔

اس کے علاوہ ایک بوٹل نیم فریڈم Freedem کا، ہر آزادی کی کچھ Limits ہیں، جیسا کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے فرمایا، اور یہ Limits ہر آئین میں، ہر قانون میں واضح ہیں، لیکن اس میں بنیادی بات یہی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ سلمان رشدی کے زمانے میں یہ جواب دیا تھا اسی کو کوٹ کرتے ہوئے کہ آپ کی آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے، جہاں میری ناک سامنے آجائے، یہ بات درست ہے کہ میری لڑائی ہے مگر میری ناک سامنے آجائے تو ہم رک جاتے ہیں، ہر مہذب سوسائٹی میں ایک Limits ہے، ایک حد ہے کہ اس کو ہمیشہ مانا جائے، اس کے بغیر ملک میں امن وچین نہیں رہ سکتا اور قانون صحیح ڈھنگ سے نہیں برتا جاسکتا، اس کے علاوہ ہمیں اپنی طرف سے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ یہ جو آوٹ لوک ہے (Outlok) جو نظریہ ہے رہنے کا سوچنے کا اس میں تبدیلی آئے اور فریڈم کے جو غلط معنی لئے جاتے ہیں اور اس کو Absolot سمجھا جاتا ہے، اس کو دور کیا جائے، مذہبی معاملات کے بارے میں ذکر ہوا، تعلیم کا ذکر آیا، آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں، جبکہ لوگ یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ مذہبی تعلیم مذہب کا حصہ ہے،

یا مذہبی جو پرسنل لاء ہے وہ مذہب کا حصہ ہے، اسی پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں، مذہب کا حصہ یہ ہے کہ آپ کو صرف نماز پڑھنے کی آزادی ہے، گھر میں پڑھئے یہ بہتر ہے، جی چاہے تو جماعت سے پڑھ لیجئے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے Mood of Wership، کی بات آجاتی ہے، ہمارے یہاں اسلام کی جو Comprehansive چیز ہے، اس کی بات آجاتی ہے۔

میں ایک دومنٹ اور لوں گا، ایک مسئلہ ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ اگر غیر مسلم ملکوں میں اسلامی مسلم اقلیات ہیں تو مسلم ملکوں میں بھی غیر مسلم اقلیات ہیں، اگر ان کے حقوق پر کوئی دست درازی ہوتی ہے، تو ہمیں اس کے بارے میں بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے، اور اس کے بارے میں بھی کوئی صحیح بات کہنی چاہئے، کیونکہ یہ Sicrokon سوال ہے، جیسا سلوک ان کے ساتھ ہوگا، اسی کو سامنے رکھ کر سلوک ہمارے ساتھ ہوگا، اس کے علاوہ ہمارے یہاں یہ بھی بات ہے کہ مسلمان اکثر الگ تھلگ رہتے ہیں، یہ بات برطانیہ کے بارے میں بھی کہی جارہی ہے کہ وہاں پر جو مسلمان جا کر بسے ہیں غیر ملکوں سے آئے ہیں، اب تو تیسری جنریشن میں ہیں، لیکن وہ عام لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک تو نفسیاتی علاحدگی پیدا ہوتی ہے مسلم اقلیات اور دوسرے لوگوں کے درمیان اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان عام سماجی معاملات میں الگ رہتے ہیں اور ان کی ساری سرگرمیاں اپنے آپ تک محدود رہتی ہیں، اپنے محلے تک اپنے لوگوں تک اپنی مساجد تک، اپنی تنظیموں تک، جبکہ ان کو تمام ملک کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے، تمام عوام کی ہدایت کے لئے، ان کی رہنمائی کے لئے ان کو آگے بڑھ کر ساتھ لے کر چلنا چاہئے، اس سے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے بارے میں خیالات بدلیں گے، بلکہ نفسیاتی ایک کیفیت پیدا ہوگی۔

حضرات میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاملہ صرف آئین، قانون اور حکومت کے آرڈر سے طے نہیں ہوتا، ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہمارے بارے میں سامنے والے کے ذہن

میں کیا ہے، اس کے ذہن میں کیا زہر بھرا ہوا ہے، کیا غلط فہمیاں ہیں، بغیر اس کے پوچھے، بغیر اس کے سامنے لائے، بہت ممکن ہے کہ اگر وہ مہذب انسان ہوگا تو وہ اس کو منہ پر بھی نہیں لائے گا، مگر ہمیں اس کو سمجھ کر اس کا جواب دینے کی کوشش کرنی چاہئے، جو کہ صحیح ہو، یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ایک ایسے آئین کے تحت رہتے ہیں جن میں برابری، انصاف اور بھائی چارے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

کسی نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ ہندوستان کے آئین کے Piriyambol میں ہم تین شقوں سے تو گزر گئے Fratamati تک ہم نہیں پہونچے ہیں ابھی صرف ریکولیٹیو، جسٹس تک ہی ہم پہونچے ہیں، ہمیں کوشش یہ کرنی چاہئے اور مسلمانوں کو خاص طور سے ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ Fratanati کی حد کو قبول کریں، فریٹنٹی تک جا پہونچیں، اور اس کو وہ قبول کرنے کی کوشش کریں، میرے خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، کہ جو زہر افشانیاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے خلاف ہوتی ہیں، اس ملک کے اندر بھی اور دوسرے ملکوں میں بھی، جس کے نمونے بہت سے ہمارے سامنے ہیں، میں صرف ایک بات جو اسی سے متعلق ہے آپ سے کہوں گا جو ذہن میں آرہی ہے بلگار مجوف نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جب میں جامع مسجد سے گزرتا ہوں تو اس کے منارے مجھے کھٹکتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کے اس کو برابر کرادوں، یہ اس نے آج سے پچیس تیس برس پہلے کہا تھا، اور ابھی سوئٹزرلینڈ نے یہی قانون پاس کردیا کہ وہاں نئی مساجد کے اندر مینار یں نہیں بنیں گی، دیکھئے خیالات کی دنیا سے عملی دنیا تک لوگ کیسے پہونچ جاتے ہیں، اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں جو موضوع آپ نے چنا ہے بہت مناسب ہے، وقت کے لحاظ سے ہے اور اس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ہم اپنے آپ کی تربیت کریں گے، اپنے ہم وطنوں کی بھی تربیت کریں گے، بلکہ دنیا کے سامنے ایسی مثالیں اور ایسی باتیں رکھنی چاہیں گے جس کے ذریعہ غلط فہمیاں دور ہوں، بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری ☆

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی سید المرسلین محمد وآله وصحبه أجمعین أما بعد!

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یریدون لیطفؤا نور اللہ بأفواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون"

صدر اجلاس حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ وناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ڈائس پر تشریف فرما معزز حضرات اور تمام حاضرین آج کا یہ موضوع بڑا اہم موضوع ہے جس پر یہ سمینار بلایا گیا ہے۔ اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب یہاں تشریف فرما ہیں، فقہ اکیڈمی کا جو چوتھا فقہی سمینار ہوا تھا حیدرآباد میں اس کا بھی تعلق اس موضوع سے تھا۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ اقلیت اور اکثریت کی اصطلاح یہ عجیب اصطلاح ہے، جب دنیا بھر میں نظام حکومت جمہوری اختیار کیا گیا ہے، اور اختیار کیا جارہا ہے، اور اس کے لئے ساری کوششیں کی جارہی ہیں، حتی کہ جنگ وجدال بھی ہورہا ہے کہ اسی نظام پر آؤ، کوئی اور نظام تمہیں چلانے کا اور اپنے ملک کو چلانے کا حق نہیں ہے، اور کسی دوسرے نظام کو آج کی دنیا میں قابل قبول نہیں قرار دیا جارہا ہے، آپ نے عراق میں، افغانستان میں جہاں جہاں بھی دیکھا ہے ایک ہی چیز کارفرما ہے، بلکہ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں جمہوریت لاگو کردیں اور اس

☆ صدر جمعیۃ العلماء ہند واستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند یوپی

کے لئے کوشش بھی کر رہے ہیں، دو چار واقعات تو پیش آ گئے ہیں، اور اپنی خواہش کے مطابق جیسی وہ جمہوریت چاہتے ہیں اس کو لاگو کرنے کے لئے ہر طرح کے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں، لیکن ان کا نشانہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، وہ یہی نعرہ دے رہے ہیں اور ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں ہر ملک کے اندر اور اپنی من چاہی جمہوریت کے لئے ہر کام کر رہے ہیں اور یہی کہہ رہے ہیں کہ جمہوری نظام ہونا چاہئے، اس کے بغیر کوئی شکل انصاف کی نہیں ہے، آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں جمہوریت کے علاوہ بھی نظام حکومت رہے ہیں، اسلامی نظام حکومت بھی رہا ہے، اس کا مطلب یہ کہ وہ سب ظلم و جبر کے نظام حکومت تھے، یہ غلط فہمی پوری طرح بٹھائی جا رہی ہے، ٹھیک ہے ہم جمہوریت کو ناجائز نہیں کہتے، اس کو اختیار بھی کر لیتے ہیں، لیکن جمہوریت کے اندر جب یہ ہے اور اقوام متحدہ کا منشور ہے کہ ہر شخص کا حق برابر ہے، کوئی ہو، کسی طبقہ کا ہو، کسی مذہب سے ہو، کسی نسل سے ہو، کسی علاقے سے ہو بالکل برابر ہے تو جو لوگ جمہوریت کے علمبردار ہیں، اس کو پھیلانا چاہتے ہیں تو ان کے یہاں یہ اقلیت اور اکثریت کیا ہے؟

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب شخصی استبداد ہوا کرتا تھا، اب یہ شخصی کے بجائے اجتماعی استبداد ہے، ایک آدمی جو کہتا تھا ہٹلر کے طریقے پر وہ ہوا کرتا تھا، اب اکثریت جو کہتی ہے وہ ہوگا، ٹھیک ہے اکثریت کے کہنے پر آپ فیصلہ کر لیجئے، لیکن ہر ایک کا جو حق ہے وہ تو نہ ماریئے؟ اجتہاد سے اقلیتوں کے حقوق کا ایک مسئلہ بن گیا، ورنہ تو جو حق اکثریت کا ہے وہی اقلیت کا بھی ہے، ایک طرف طبقات کو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں- آپ کو وہ کتاب دی گئی ہے آپ اس کے ترجمہ پڑھ لیجئے اقوام متحدہ کا جو منشور ہے- کوئی رنگ و نسل کسی قسم کا فرق نہیں ہے، سب کے حقوق برابر ہیں تو پھر یہ اقلیت اور اکثریت کے نام سے، آپ نے علمی اعتبار سے ان کے حقوق میں کیوں فرق کر دیا ہے؟ جس ملک میں آپ دیکھیں گے اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت حقوق سے محروم ہے اور پریشان ہے، تو اس لحاظ سے پہلی بات تو یہی ہے کہ جتنے ملکوں میں یہ جمہوریت ہے ان کو اور خاص

طریقہ پر ہمارا ملک بھی انہیں میں شامل ہے اور بہت بڑی جمہوریت مانی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں اقلیتیں مانی جاتی ہیں ان میں سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہے، ان کے حقوق کے سلسلہ میں کیوں بے اعتنائی برتی گئی ہے؟ آپ کے سامنے بہت سی رپورٹیں آگئیں ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے اور بہت سی رپورٹیں آگئیں، سب تفصیل سامنے آگئی ہے، معلوم تھا سب پہلے سے، لیکن اب باضابطہ ریکارڈ کے اندر ہے یہ، آخر اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ ظاہر ہے جو جمہوریت چلا رہے ہیں وہ ذمہ دار ہیں، انہیں سے کہا جائے گا، لیکن یہ جرم ان سے ہوا ہے، اس کا مداوا ٹھیک ہے آپ کر دیں، لیکن وہ بھی مشکل ہے، ہزار رکاوٹیں اس میں ڈالی جارہی ہیں، لیکن ان کے خلاف کوئی اقدام ہوگا؟ کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، آج ساٹھ باسٹھ سال ہوگئے، ہم اسی طرح محروم ہیں۔

تو اس لئے بہرحال اقلیت کے حقوق کے سلسلہ میں یہ آواز اٹھانی پڑ رہی ہے، حالات نے ہمیں مجبور کیا ہے، ہم نے یہ تقسیم نہیں کی ہے، تقسیم ان لوگوں نے کی ہے، اور اس بنیاد پر کہ انھوں نے حقوق مارے ہیں، اس لئے اقلیتوں کے حقوق کی آواز اکثریت سے کوئی نفرت پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اکثریت کو ان کا مقام یاد دلانا ہے کہ آپ کو کس طرح اپنے اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے، اور دوسری جانب حکومتوں کو متوجہ کرنا ہے کہ آپ سب کو ایک نظر سے دیکھیں، یہ امتیاز جو آپ نے کر رکھا ہے، کسی بھی اعتبار سے، نسل کے اعتبار سے، مذہب کے اعتبار سے، علاقے کے اعتبار سے، آپ کو نہیں کرنا چاہئے، یہ تو موضوع کے اعتبار سے ہمیں ان کے حالات اور آج کے حالات میں سوچنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فقہ اکیڈمی کے ماتحت یہ پروگرام ہو رہا ہے، وہ فقہی اعتبار سے ہم مسلمانوں کی پوزیشن یعنی وہ جو بات آئی اسلاموفوبیا والی کہ اسلام کا خوف، اور یہ حقیقت ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ٹھیک ہے اس میں اضافہ ہوگیا ہے اور اس کے لئے عوامل اور اسباب بہت سارے ہوگئے ہیں، آج کل پوری دنیا پر جو ایک

صہیونی طاقت مسلط ہے جو امریکہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، پورے یورپ کو لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، اسی نے پوری صورت حال پیدا کی ہے کہ پوری دنیا کے اندر مسلمانوں کے سلسلہ میں اور اسلام کے خلاف مستشرقین یورپ نے جو کام کیا تھا وہ کتابوں کے اندر تھا، لیکن اس کو عملی شکل میں لانے کے لئے اس کے مظاہر پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت کی گئی ہے، ہر طرح کے میڈیا سے، پرنٹ ہو یا الکٹرانک ہو سب کے ذریعہ اسلام کی وہ تصویر پیش کی گئی ہے، اور غلط فہمی پھیلائی گئی ہے، آیات کریمہ اور احادیث نبویہ اور آثار اصحاب رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے وہ معانی بیان کئے گئے ہیں جو دنیا کے لوگوں میں اسلام کی طرف سے اور مسلمانوں کی طرف سے یہ محسوس کرائے کہ جو اسلام کا مذہب رکھتا ہے اور مسلمان ہے وہ دوسروں کے ساتھ رواداری برت نہیں سکتا، وہ کسی بھی حال میں رہے گا وہ اپنے غیر مسلم ساتھی کو نقصان کو پہونچائے گا، ضرور پہونچائے گا، اس لئے ان سے دور دور رہو، سوال یہ ہے کہ یہ خطرہ کیوں پیدا کرایا جارہا ہے؟ یہ خوف کیوں پیدا کرایا جارہا ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بند کمرے کے اندر ہے، اور الماریوں کے اندر ہے، اتنا چھپتا ہے قرآن کریم کہ شاید دنیا کی کوئی کتاب اتنی نہیں چھپتی، ہر زبان کے اندر اس کے ترجمے موجود ہیں، احادیث کی بڑی بڑی کتابیں ہیں جو یورپ والے چھاپ رہے ہیں، یہ ساری چیزیں ہونے کے باوجود پھر یہ کیوں کہا جارہا ہے؟

بات اصل میں یہی ہے کہ اسلام کی ان تعلیمات کو پڑھ کر جو اسلام کا ذہن بن رہا ہے لوگوں میں اور یورپ کے اندر خاص طریقہ پر یہ جو ۹/۱۱ کا واقعہ پیش آیا ہے ۲۰۰۱ میں اس کے بعد سے قرآن کریم کا مطالعہ چونکہ اپنے خیال کے مطابق کہا یہی گیا کہ مسلمانوں کے یہاں دہشت گردی کی تعلیم ہے، اس وجہ سے یہ حملہ کرایا گیا، حالانکہ یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ جو حملہ کرنے والے تھے وہ مسلمان ہی تھے، اور مسلمانوں نے حملہ کرایا یہی مسئلہ زیر بحث ہے، لیکن یہ بات کہی گئی، مگر اس کے بعد سے قرآن کریم کا اتنا مطالعہ ہورہا ہے اور اس مطالعہ کے نتیجہ میں اتنے لوگ

اسلام کی طرف آرہے ہیں، اس ماحول کو روکنے کے لئے اس ماحول کے خلاف یہ فضا بنائی جارہی ہے کہ اسلام میں یہ چیزیں ہیں اسلام میں یہ چیزیں ہیں وغیرہ وغیرہ، اس لئے اس صورت حال کے اندر ہماری بڑی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ ہم صحیح صورت حال لوگوں کے سامنے پیش کریں، ٹھیک ہے ہم سیمینار بھی کرتے ہیں، لیکن مسلسل کرنے کا کام ہے اور ہم آیات کریمہ کے بارے میں، احادیث مبارکہ کے بارے میں اور تاریخی واقعات کے بارے میں اپنے علاقے کے لوگوں کو سمجھائیں اور بتائیں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے، آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب مسلمانوں کو مکہ مکرمہ کی زندگی میں ستایا گیا اور اپنے وطن سے ان کو باہر نکلنے کے لئے مجبور کیا گیا، اسی دوران حبشہ ہجرت ہوئی ہے اور وہاں نجاشی شاہ حبشہ نے مسلمانوں سے اور ان کے ذمہ داروں سے جو وہاں آئے ہوئے تھے، حضرت ابوجعفر بن ابی طالبؓ چونکہ جماعت کے امیر اور ترجمان تھے ان سے پوچھا تھا کہ کیوں تم لوگوں نے ہجرت کی، کیا مسئلہ ہے، تم نے اپنا مذہب کیوں بدلا ہے، اسلام کیوں قبول کیا ہے؟ انھوں نے جو تقریر کی ہے، وہاں عقائد، وحدانیت، رسالت تو بیان ہی فرمایا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ باتیں ذکر فرمائیں جو ہر معاشرہ کے اندر لازم وضروری ہیں، اس کے کلمات میں آپ کے سامنے پڑھتا ہوں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "أمرنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بصدق الحدیث وأداء الأمانة وصلة الأرحام وحسن الجوار والکف عن المحارم والدماء ونھانا عن الفواحش وقول الزور وأکل مال الیتیم وقذف المحصن" (یہ وجوہات ہیں اور ہمارے پیغمبر جن کو ہم نے پیغمبر مانا ہے انھوں نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ہمیشہ سچ بولیں، امانت ادا کریں رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، حرام چیزوں سے بچیں، ناحق خون کرنے سے بچیں اور ہر قسم کی فحش چیزوں سے بچیں، بے شرمی سے بچیں، جھوٹ بولنے سے بچیں، یتیموں کے مال کھانے سے بچیں اور کسی پاکدامن عورت پر تہمت لگانے سے بچیں) یہ وہ باتیں

ہیں اسلام کے معاشرتی تعلیم کی کہ اگر ہم ان کو اختیار کرلیں تو آج کا جو معاشرہ ہے ہمارا بہترین معاشرہ ہوگا، مگر یورپ کے معاشرے میں آپ دیکھئے ان سب کے خلاف پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے وہ یہ نہیں چاہتے کہ اسلام کی یہ تعلیم سامنے آئے اور ہمارے معاشرے کے اندر جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ ختم ہوں اور اسلام کا بول بالا ہو اور اسلام کی تعریف ہو، اس لئے اسلام کا خوف ہے، بہر حال یہ ضروری ہوگا کہ ان سب چیزوں کو ہم خود بھی اپنائیں ہم صرف تحریراً یا تقریراً ان باتوں کو واضح کردیں کافی نہیں ہے، جیسا کہ ابھی تذکرہ میں بات آئی کہ ہم جس محلّہ میں رہتے ہیں وہاں بھی ان تعلیمات کو عام کرنا ہے، اور ہماری زندگی بھی ایسی ہونی چاہئے کہ اچھے پڑوسی بن کر لوگوں کے ساتھ برتاؤ کریں اوران کے دکھ درد میں شریک ہوں، بہر حال ہمیں خوشی ہے کہ آپ حضرات نے اس موضوع پر پروگرام مرتب کیا ہے اور اس کے لئے آگے جو پروگرام اور تجاویز ہوں گی انشاء اللہ اس سلسلہ میں جو تعاون درکار ہے، اس کے لئے ہم حاضر ہیں اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحبؒ☆

اقلیتوں کے حقوق اور ان حکومتوں کے کیا فرائض ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے فقہی اور شرعی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

میں نے اپنا ایک مضمون لکھا تھا، وقت بہت زیادہ ہوگیا ہے اور پڑھنے کا موقعہ نہیں، شاید اس میں سے ایک آدھ صفحہ پڑھوں، اسلاموفوبیا اور مسلم اقلیت کے انسانی حقوق، میں نے اس مضمون میں اس پر زور دیا ہے، اسلاموفوبیا کیا ہے اور اس کے مظاہر اور نتائج ہمارے سامنے کس شکل میں آرہے ہیں، اور اس وقت پوری دنیا میں خاص طور پر ۱۱/۹ کے بعد اسلاموفوبیا، یا اسلاموفوبیا کے نتیجہ میں جو مسلمان مسائل اور مشکلات سے دوچار ہیں وہ بہت ہی تشویش ناک ہے، اس کے پیش نظر ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم کیا کریں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے مولانا سید نظام الدین صاحب نے بہت بلیغ انداز میں فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عملی نمونہ بن کر پیش کریں اور جو غلط فہمیاں منصوبہ بند طریقے سے ہمارے خلاف پھیلائی جارہی ہیں وہ غلط فہمیاں دور ہوں، اور اسلاموفوبیا تو ایک نفسیاتی سا مرض ہے اور ہمیشہ سے ہی فوبیا رہا ہے، لیکن اب اس کو باقاعدہ ہتھیار کی شکل میں اپنایا جارہا ہے، وہ لوگ جانتے ہیں کہ اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے ڈرا جائے، یا اس سے نفرت کی جائے، مگر جان بوجھ کر اسلاموفوبیا پھیلا رہے ہیں، تاکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف ایک فضا بنے اور تباہی کی طرف ان کو لے جائیں، یہ ایک مہم ہے اور ہمارے ملک میں بھی جو فرقہ پرست طاقتیں ہیں ان کے لیڈر اچھی

☆ سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند-نئی دہلی

طرح جانتے ہیں کہ اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، دہشت پسندی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کچھ واقعات ہو رہے ہیں، جن کا خاص کوئی بیک گراونڈ ہے، چاہے افغانستان ہو، یا عراق ہو یا اس کا پڑوسی ملک وہاں اس کا خاص بیک گراونڈ ہے، اس کے نتیجہ میں کچھ سر پھرے مسلمان کچھ غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں، چاہے وہ ردعمل ہو، یا وہاں کے حالات کے حساب سے مزاحمت ہو وہ ایک الگ چیز ہے، اسلام کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسلام امن کا مذہب ہے، اسلام سلامتی کا مذہب ہے، اس کے خلاف یہ مستقل ایک پروپیگنڈا ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ ایک ویپن جو ماس اسٹکشن والا ہے اس کے طور پر اس کو استعمال کیا جا رہا ہے مسلمانوں کے خلاف۔

اسلاموفوبیا پوری دنیا میں، یورپ میں، امریکہ میں با قاعدہ جو چیز ہوتی تھی اور پیدا ہوتی تھی لوگوں کے اندر وہ ایک طرح کا شک تھا، ایک وسوسہ تھا عربی کی ایک ڈکشنری ''المعجم الکبیر'' میں معنی لکھے ہیں ''فوبیا'' کے: ''خوف وسواسی لامعقول له من شئ ما'' (ایسی کسی بھی چیز سے ایسا ڈر جو وسوسہ پر مبنی ہو اور اس کے اندر کوئی معقولیت نہ ہو) اس طرح اس کی تشریحات کی گئیں جس کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے، کیا ہے، وہ ایک ٹرینڈ ہے، ایک فیڈ ریڈ ہے مسلمانوں کے خلاف جو پھیلائی جا رہی ہے، وہ لوگ جو اس کا شکار ہیں وہ اسلاموفوبیا کہتے ہیں، اور اسلام کے خلاف نفرت وعداوت یا خوف کی جو ایک نفسیات ہے وہ اس وقت پوری منصوبہ بندی کے ساتھ پوری دنیا میں پھیلائی جا رہی ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان تمام ممالک، یورپ ہو یا امریکہ ہو ہر جگہ مسلمان پریشانیوں کا سامنا کر رہے ہیں، ہمارے جناب سید شہاب الدین صاحب نے اشارہ دیا کہ ایک لیڈر تھا جو جامع مسجد کے بارے میں کہتا تھا کہ جب میں جامع مسجد کے قریب سے گزرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اس کے میناروں کو مسمار کر دوں، ایک ہی نفسیات ہے ہر جگہ، سوئزرلینڈ کا باضابطہ سروے کیا تو یہاں پر میناروں پر پابندی **لگادی گئی**

ہے۔ مساجد بن سکتی ہیں، مینار نہیں، تو نفسیات ہر جگہ ہے، اگر آپ جائزہ لیں، میں نے اپنے مضمون میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ سب حال ہی کے واقعات ہیں، جو اسلاموفوبیا ہے۔ وہ لوگ جو سادہ لوح ہیں اور اسلام کے بارے میں جانتے نہیں ہیں وہ غلط فہمیاں جو صدیوں سے پھیلائی جارہی ہیں ان غلط فہمیوں کا شکار ہوکر ڈرے ہوئے ہیں، یا اسلام سے نفرت رکھتے ہیں وہ تو ہیں ہی، مگر میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ یہ منصوبہ ہے، سازش ہے، اس سازش کے تحت وہ کام کررہے ہیں اور اسلاموفوبیا پھیلا رہے ہیں، اور بڑی تعداد میں دنیا کے اندر اسلامی فوب پیدا ہوگئے ہیں،، اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کی تعلیمات کو صحیح انداز سے پیش کریں، اور اسی طرح جن ممالک میں غیر مسلم اقلیتیں موجود ہیں ان کے بارے میں بھی ہم پر ضروری ہے کہ ہم ان کے حقوق کا خیال کریں اور حکومتوں کو توجہ دلائیں کہ وہ اسلام کی صحیح نمائندگی کریں، وہ اپنی اقلیتوں کے ساتھ صحیح معاملہ کریں، اسلامی تعلیمات کے مطابق معاملہ کریں، تاکہ وہ ایک مثال بنے، اور ہمارے یہاں ہندوستان میں بھی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ فرقہ پرست طاقتیں ہندوستان کے باہر جو صورت حال ہے، پڑوسی ملکوں میں وہ اس کا پورا فائدہ اٹھاکر اسلام کا ایک خوف، اسلام سے نفرت وگلہ پیدا کررہی ہیں، اور وقت کی فضا اس کے لئے سازگار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر مسلمان الحمدللہ کسی طرح کی تحریک میں، اس طرح کے واقعات میں ملوث نہیں ہیں، جیسا کہ ہیمنت کرکرے نے بعض معاملات سے نقاب کشائی کرکے یہ ثابت کردیا کہ جو بھی واقعات ہوئے تھے اور جو دہشت گردی کا واقعہ ہوتا تھا اس کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، مگر ہیمنت کرکرے نے جو کارنامہ انجام دیا، اور بڑی سازش کے تحت اس کو اس سین سے ہٹادیا گیا، وہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں جو بھی واقعات ہورہے ہیں وہ اسی اسلاموفوبیا کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہورہے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ وہ غیر مسلم بھائی جو صدیوں سے ہمارے ساتھ رہ رہے تھے ان کے ذہنوں کو خراب کیا جائے، ان کے

اوران کے بچوں کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جائے اور راسخ کیا جائے کہ مسلمان، اور اسلام ڈرنے کی چیز ہے، اور وہاں دہشت گردی ہی دہشت گردی ہے۔

اس کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو نہ صرف یہ کہ تحریری اور تقریری طور پر عام کریں، بلکہ اس کے لئے ہم نمونہ عمل بن کر دکھائیں، میں اپنے گھر کیرانہ کی کچھ بات آپ کے سامنے رکھتا ہوں، میرے والد مولانا مسیح الزماں کیرانوی بہت بڑے عالم تھے، نہایت ہی متدین اور دینی معمولات پر اسی قدر وہ پابندی سے عمل کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہاں جتنے بھی معزز غیر مسلم حضرات تھے ان سے تعلقات رکھتے تھے، اور وہ تعلقات ایسے تھے کہ ان کے نتیجہ میں مسلمان کیا ہیں، اسلامی تعلیمات کیا ہیں وہ سامنے آتے تھے، اسی طرح ہمیں بھی ضرورت ہے کہ وہ نمونہ عمل بن کر دیکھائیں اور یہ ثابت کریں کہ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں، اور قابل عمل ہیں اور اس کے اندر Peace ہے سلامتی ہے، امن ہے، شانتی ہے، محبت ہے، بس میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، یہ جو مقالہ ہے ظاہر ہے اس وقت اسے پڑھنے کا موقعہ نہیں ہے، زبانی طور پر میں نے چند باتیں کہہ دی ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆

دوسرا باب

اقلیتوں کے حقوق پر دستاویزات

انسانی حقوق کا عالمی منشور

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسے اپنے ریزولیوشن نمبر (III) 217-A، ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ کے ذریعہ منظور کیا اور اعلامیہ جاری کیا:

تمہید:

دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد تمام بنی نوع انسان کے فطری وقار، مساوی اور ناقابلِ تفریق حقوق پر قائم ہے۔

انسانی حقوق کی عدم پاسداری اور بے حرمتی کے سبب ایسے وحشیانہ افعال عمل میں آئے ہیں جنھوں نے انسانی ضمیر کو مجروح کیا ہے، اور ایک ایسی دنیا کے وجود میں آنے سے مانع ہے جس میں انسان کو اظہارِ رائے اور عقیدہ کی آزادی، اسی طرح خوف اور احتیاج سے نجات کو عامۃ الناس کی سب سے بڑی آرزو قرار دیا گیا ہے۔

اگر انسان کو اس حد تک مجبور نہ کیا جائے کہ وہ ظلم وجبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر مجبور ہو، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی حکمرانی کے ذریعہ تحفظ عطا کیا جائے۔

یہ لازمی ہے کہ اقوامِ عالم کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کیے جائیں۔

اقوامِ متحدہ کے افراد نے اس منشور میں انسانوں کے بنیادی حقوق، انسانوں کے وقار اور حیثیت، عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق میں اپنے یقین و اعتماد کا اعادہ کیا ہے، اور

معاشرتی بہبودی اور وسیع پیمانہ پر بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کا پختہ ارادہ کیا ہے۔

اقوام متحدہ کے ارکان نے اقوام متحدہ کے تعاون سے عالمی پیمانہ پر ایک دوسرے کے احترام کو فروغ دینے، انسانی حقوق پر عمل کرنے اور بنیادی آزادی کے حصول کا عہد کیا ہے۔

اس عہد کو کامل طور پر بروئے کار لانے کے لئے انسانی حقوق اور آزادی کی بابت ایک عمومی تفہیم سب سے زیادہ ضروری بات ہے۔ لہٰذا:

جنرل اسمبلی:

اس عالمی حقوق انسانی منشور کو تمام افراد اور اقوام کے لئے ایک عمومی معیار کے طور پر جاری کرتی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد اور ہر ممبر اس منشور کو مستقل طور پر اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے تعلیم وتدریس کے ذریعہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان حقوق اور آزادیوں کے احترام کے جذبہ کو فروغ دینے کی کوشش کرے گا اور اس کے لئے مسلسل اقدامات کرتا رہے گا۔ تاکہ عالمی طور پر انہیں موثر تسلیم کیا جائے اور عمل کیا جائے، وہ اقوام بھی جو اس عالمی ادارے کی ممبر ہیں اس پر عمل کریں اور ان اقوام کے افراد بھی جو ان ممالک کے دائرہ اثر میں رہتے ہیں۔

دفعہ ۱: تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور اپنے حقوق اور وقار کے اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ انہیں قدرت نے عقل وشعور سے نوازا ہے، لہٰذا انہیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ جذبہ سے پیش آنا چاہئے۔

دفعہ ۲: ہر فرد کو اس منشور میں بیان کئے گئے تمام حقوق اور آزادیوں کا استحقاق حاصل ہے، اس سلسلے میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا خواہ وہ کسی رنگ، نسل، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر خیالات، قومی یا سماجی تعلق یا جائداد، خاندان (پیدائش) یا اسی قسم کی دیگر حیثیتوں پر مبنی ہو۔

علاوہ ازیں سیاسی، سیاسی اقتدار، یا کسی ایسے ملک یا علاقہ کو جہاں سے کسی فرد کا تعلق

ہو، بین الاقوامی حیثیت حاصل ہونے کے بعد کوئی امتیاز نہیں برتا جائیگا، خواہ یہ ملک آزاد ہو، زیر اقتدار ہو خود اختیار حکومت کا حامل نہ ہو، یا کسی اقتدار کی دیگر پابندیوں کے ماتحت ہو۔

دفعہ ۳: ہر فرد کو زندگی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۴: کسی شخص کو غلامی یا محکومی میں نہیں رکھا جاسکتا، غلامی اور غلاموں کی تجارت خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو ممنوع ہے۔

دفعہ ۵: کسی بھی شخص کو تعذیب کا، ظلم کا، غیر انسانی یا تحقیر آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

دفعہ ۶: ہر فرد کو ہر جگہ قانون کے روبرو اپنے حقوق کو تسلیم کرانے کا حق ہوگا۔

دفعہ ۷: قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور بغیر کسی امتیاز کے مساوی طور پر قانونی تحفظ کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس منشور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر کسی سے کوئی امتیاز برتا جاتا ہے یا ایسے امتیاز پر ابھارا جاتا ہے تو ایسے افراد کو مساوی سطح پر تحفظ کا حق ہوگا۔

دفعہ ۸: ہر شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر اس کے ان حقوق کو پامال کیا جائے جو قانون یا دستور کے تحت اسے حاصل ہیں تو وہ اس کے خلاف کسی با اختیار ادارہ میں استغاثہ کرے۔

دفعہ ۹: کسی بھی شخص کو یکطرفہ کارروائی کے ذریعہ گرفتار، محبوس یا جلاوطن نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ ۱۰: ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے حقوق کی تعیین اور وضاحت کے لئے کسی آزاد اور با اختیار ٹریبونل کے روبرو استغاثہ کرے، اور اگر اس پر کوئی مجرمانہ الزام عائد کیا گیا ہو تو اس کی بابت بھی چارہ جوئی کرے۔

دفعہ ۱۱: اگر کسی شخص کو کسی قابل تعزیر جرم میں ماخوذ کیا گیا ہو تو اسے اس وقت تک بے قصور سمجھا جائے گا جب تک کہ کسی عدالت میں کھلے طور پر اس کے مقدمہ کی سماعت نہ ہو جس

میں اسے اپنے دفاع کے جملہ حقوق و مراعات حاصل ہوں۔

کسی بھی شخص کو کسی ایسے قابل تعزیر جرم کا مرتکب قرار نہیں دیا جائے گا جو قومی یا بین الاقوامی قانون کے تحت تعزیر کے دائرہ میں نہیں آتا جس وقت اس جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا، اور نہ اس جرم کے لئے اس سے زیادہ سزا دی جا سکتی ہے جو اس کے ارتکاب کے وقت نافذ تھی۔

دفعہ ۱۲: کسی شخص کی نجی، خانگی، گھریلو یا مراسلاتی معاملات میں یک طرفہ طور پر مداخلت نہیں کی جائیگی، نہ اس کی عزت یا حیثیت عرفی پر حملہ کیا جائے گا، ہر شخص کو اس قسم کی مداخلت یا حملہ کے خلاف قانونی تحفظ حاصل کرنے کا حق ہے۔

دفعہ ۱۳: ہر شخص کو اپنے ملک میں کسی بھی جگہ رہائش یا نقل و حرکت کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو کسی بھی ملک بشمول اپنے وطن کو چھوڑنے اور پھر واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۱۴: ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی یا دیگر بنیاد پر ستائے جانے سے بچنے کے لئے کسی دوسرے ملک میں پناہ حاصل کرے۔

تاہم اس پر کسی جائز مقدمہ میں عدالتی کارروائی جو کسی سیاسی جرم یا اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کی خلاف ورزی کی پاداش میں ہو، چلائی جائے۔

دفعہ ۱۵: ہر شخص کو قومیت کا حق حاصل ہے، کسی بھی شخص کو نہ اس کی قومیت سے یکطرفہ طور پر محروم کیا جائے گا، نہ اسے قومیت تبدیل کرنے سے روکا جائے گا۔

دفعہ ۱۶: بالغ مرد اور عورتوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب، شادی کرنے اور خاندان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے، انہیں شادی کرنے، شادی شدہ زندگی گذارنے اور طلاق دینے کا مساوی حق حاصل ہے۔

شادی مرد اور عورت دونوں کی آزادانہ مرضی کے تحت ہی عمل میں آئے گی۔

خاندان (فیملی) کسی معاشرہ کا فطری اور بنیادی حصہ ہے اور اسے معاشرہ اور ریاست سے تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ:۱۷ ہر شخص کو انفرادی طور پر یا دوسروں کی شرکت میں جائداد رکھنے کا حق حاصل ہے، کسی شخص کو یکطرفہ طور پر اس کی جائداد سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ ۱۸: ہر شخص کو اپنے ضمیر، مذہب، عقیدہ اور خیالات کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں اپنے مذہب اور عقیدہ کو تبدیل کرنے نیز اسے انفرادی طور پر یا اپنے فرقہ میں دوسروں کے ساتھ، عوامی طور پر یا نجی طور پر اپنے مذہب اور عقیدے کا اظہار کرنے، اس کی تبلیغ و اشاعت، عبادت اور شعائر پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۱۹: ہر شخص کو اپنی رائے قائم کرنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق حاصل ہے، اس میں بغیر مداخلت بے جا کے اپنی رائے قائم کرنے، اطلاع طلب کرنے یا فراہم کرنے اور کسی بھی ذرائع سے اپنے خیالات کو بغیر کسی پابندی کے دوسروں تک پہنچانے کا حق بھی شامل ہے۔

دفعہ ۲۰: ہر شخص کو پر امن طور پر اجتماع کرنے اور ایسوسی ایشن بنانے کا حق حاصل ہے، کسی شخص کو کسی ایسوسی ایشن (تنظیم) سے وابستگی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ ۲۱: ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق حاصل ہے، یہ شرکت براہ راست یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

ہر شخص کو ملک میں عوامی خدمات تک رسائی کا مساوی حق حاصل ہے۔

عوام کی مرضی ہی حکومت کی بنیاد ہو گی۔ عوام کی مرضی کا اظہار وقفہ وقفہ سے آزادانہ مساوی حق رائے دہندگی، خفیہ ووٹنگ یا مساوی آزادانہ حق رائے دہندگی کے ذریعہ ظاہر کی

جائے گی۔

دفعہ ۲۲: ہر شخص کو معاشرہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے، یہ حق قومی جدوجہد، بین الاقوامی تعاون اور ہر ریاست کی تنظیمی ذرائع ووسائل کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق، اس کے وقار اور اس کی شخصیت کے فروغ کے لئے لازمی ہیں۔

دفعہ ۲۳: ہر شخص کو روزگار کا حق حاصل ہے، اسے اپنی مرضی کا روزگار حاصل کرنے، روزگار کی منصفانہ اور اپنے موافق شرائط حاصل کرنے اور بے روزگاری سے تحفظ کا حق بھی حاصل ہے۔

ہر شخص کو بلا امتیاز یکساں کام کے لئے یکساں تنخواہ کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو جو برسر روزگار ہے اسے معقول معاوضہ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، ایک ایسی زندگی کے لئے جو انسانی وقار کے مطابق ہو، اور اگر ممکن ہو تو دیگر ذرائع سے بھی معاونت فراہم کرے۔

ہر شخص کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ٹریڈ یونین بنانے اور اس میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۲۴: ہر شخص اس کا مستحق ہے کہ اسے فرصت اور آرام کا موقع ملے، اس میں کام کے اوقات کی معقول انداز میں تحدید، چھٹیاں اور چھٹیوں کے دوران تنخواہ حاصل کرنے کا حق بھی شامل ہے۔

دفعہ ۲۵: ہر شخص کو ایک ایسے معیار زندگی کا حق حاصل ہے جو اس کی صحت اور اس کے اہل خاندان کی صحت وعافیت کے لئے مناسب اور ضروری ہو، اس میں کھانا، پینا، کپڑا، مکان، طبی سہولیات اور ضروری معاشرتی خدمات اور بے روزگار ہوجانے پر معاشی

تحفظ کا حق بھی شامل ہے، نیز بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور معاشی تنگی جو ایسے حالات سے پیدا ہوتی ہو جو اس کے قبضہ سے باہر ہیں، اس کے تحت آتے ہیں۔ ماں اور بچہ کو خصوصی تعاون اور توجہ مطلوب ہوتی ہے۔ تمام بچے جو شادی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہوں یا اس کے بغیر، سب کو مساوی سماجی تحفظ حاصل ہوگا۔

دفعہ ۲۶: ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، تعلیم مفت ہوگی، کم از کم پرائمری یا ابتدائی سطح تک، ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی، تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم عمومی طور پر مہیا کرائی جائیگی، اعلیٰ تعلیم تک بھی سب کی رسائی ہونی چاہئے جو صلاحیت کی بنیاد پر ہو۔

تعلیم کا مقصد انسان کی مجموعی شخصیت کا سدھار اور فروغ ہے، نیز انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا شعور اور احساس کو بھی فروغ دیا جانا چاہئے، اس سے اقوام میں رنگ ونسل و مذہب کی تفریق کے بغیر ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا اور اقوام متحدہ کے امن قائم رکھنے کے مقاصد کو تقویت ملے گی۔

والدین کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اس کا انتخاب کریں۔

دفعہ ۲۷: ہر شخص کو اپنے فرقہ کی ثقافتی سرگرمیوں میں آزادانہ شرکت کا حق حاصل ہے، وہ آرٹ اور سائنس کے ذریعہ حاصل ہونے والی سہولیات سے بھی فائدہ اٹھانے کا مستحق ہے۔

ہر شخص آرٹ، سائنس یا ادب جو اس نے تخلیق یا ایجاد کیا ہو، اس سے متعلق اپنے مفاد کے تحفظ کا حقدار ہے۔

دفعہ ۲۸: ہر شخص کو ایک ایسے سماجی اور بین الاقوامی نظم کا حق حاصل ہے جس میں وہ حقوق و مراعات کامل طور پر حاصل ہوں جن کا اس منشور میں ذکر کیا گیا ہے۔

دفعہ ۲۹: ہر شخص کی اپنے معاشرہ سے متعلق ذمہ داریاں ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر اس کی

شخصیت کا کامل اور آزادانہ فروغ ممکن نہیں ہے۔

ان حقوق ومراعات کے حصول کے لئے ہر شخص کو ان قوانین کا پابند ہونا پڑے گا جو اس مقصد کے لئے وضع کئے گئے ہیں جن میں دوسروں کے حقوق ومراعات تسلیم کرنا، انصاف، اخلاقی تقاضوں کی بجا آوری، عوامی نظم اور ایک جمہوری معاشرہ میں عمومی بہبود بھی اس میں شامل ہے۔

ان حقوق ومراعات کے حصول کے لئے اقوام متحدہ کے اصول ومقاصد کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔

دفعہ ۳۰: اس منشور کی مندرجات کا مفہوم اس انداز سے بیان نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی ریاست، جماعت یا فرد اس کا سہارا لے کر ایسے افعال کا مرتکب ہو جو ان حقوق ومراعات کی بربادی کا سبب بنیں جو اس منشور میں درج کئے گئے ہیں۔

☆☆☆

اسلام میں انسانی حقوق پر قاہرہ اعلامیہ

۵ راگست ۱۹۹۰ء کو قاہرہ میں منعقد وزرائے خارجہ کی انیسویں اسلامک کانفرنس میں اعلامیہ منظور کر کے جاری کیا گیا۔

تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے ممبر ممالک!

امت اسلامیہ کے تاریخی وتہذیبی کردار کی پرزور تائید جسے اللہ تبارک وتعالی نے بہترین امت بنایا ہے اور اس امت نے انسانیت کو عالمی اور متوازن تہذیب سے روشناس کرایا جس تہذیب کی بنیاد دنیاوی اور اخروی زندگی کے مابین یقین اور علم پر مشتمل ہے اور اس امت نے مختلف رسم ورواج اور نظریات کے مابین الجھے اور پریشان حال لوگوں کی صحیح رہنمائی کی اور اس مادہ پرستانہ تہذیب کے گوناگوں مسائل کا حل پیش کیا۔

انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لئے بنی نوع انسان کی کوششوں میں تعاون کرنے کی دلچسپی اور کسی بھی آدمی کو استحصال اور تکالیف سے محفوظ رکھنا اور شریعت اسلامیہ کے مطابق آدمی کی آزادی وحق اور باعزت زندگی کو یقینی بنانا۔

مادہ پرستانہ علوم وتہذیب کے ترقی یافتہ دور میں پہنچی ہوئی انسانیت اور ضلالت وگمراہی کے اندوہناک وادی میں بھٹکے ہوئے لوگوں کی صحیح رہنمائی اور انہیں ان کے حقوق کے صحیح استعمال کے لئے بیداری کو یقینی بنانا۔

اور اس بات کا یقین کرنا کہ مذہب اسلام میں دنیاوی آزادی اور بنیادی حقوق اس کا جزء لاینفک ہے، اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو مکمل طور

پر خارج کر دے یا اس کی خلاف ورزی کرے یا احکام ربانی کے ان پختہ اصولوں کو نظر انداز کر دے جن کا انکشاف خدا کی آخری کتاب میں کیا گیا ہے، اور خدا نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ اپنے آخری اور مکمل پیغام کو بھیجا تا کہ انسانیت عبادات کی بجا آوری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے، ان احکامات اور طریقوں کے خلاف کرنا بہت بڑا گناہ ہے، امت کا ہر ہر فرد اور مجموعی امت ان احکامات پر عمل درآمد کر کے اپنی نجات کو یقینی بنائے۔

ا-دستاویز: اوپر بیان کردہ اصولوں کی روداد:

الف: پوری انسانیت ایک خاندان کی مانند ہے جس کے ارکان خدا کی اطاعت اور آدم کی اولاد ہونے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، معاشرہ کا ہر شخص بنیادی انسانی اعزاز، فرائض اور ذمہ داری کے اعتبار سے بغیر کسی رنگ ونسل، زبان وجنسیت، مذہبی عقائد، سیاسی الحاق، سماجی مرتبہ اور دیگر نظریات کی بنیاد پر بغیر کسی امتیاز وتفریق کے برابر ہیں، اسلام انسانیت کو عزت وشرف کے درجہ کمال پر پہنچانے کی ضمانت لیتا ہے۔

ب-تمام انسانیت خدا کی رعایا ہے، خدا کے نزدیک اس کے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچائے، اور کسی بھی انسان کو صرف تقویٰ اور اعمال حسنہ کی بنیاد پر فوقیت حاصل ہوگا۔

-دستاویز:

الف-زندگی خدا کا عطیہ ہے اور تمام انسانیت کو زندگی کے حقوق کی ضمانت حاصل ہے، ہر فرد واحد ومعاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان کی حقوق کی پامالی سے حفاظت کرے، بغیر کسی شرعی جواز کے کسی کی جان لینا سخت ممنوع ہے۔

ب-انسانیت کو کچلنے اور نسل کشی کے لئے کسی بھی طرح کے وسائل کو اختیار کرنا قطعاً

ممنوع ہے۔

ج-خدائی منشا کے مطابق حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی زندگی کا تحفظ شریعت کے تناظر میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔

د-جسمانی اذیت سے تحفظ ایک یقینی حق ہے، یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس تحفظ کو یقینی بنائے، اور بغیر کسی شرعی دلیل کے ان قوانین کی عہد شکنی کرنا سخت ممنوع ہے۔

۳-دستاویز:

الف-جنگ اور طاقت کے استعمال کے وقت کسی بھی بوڑھے شخص، عورت، بچے اور ان لوگوں کو جو جنگ میں حصہ نہ لیں انہیں قتل کرنا ایک سخت جرم ہے۔ مجروحین اور بیمار اشخاص کو طبی سہولیات حاصل ہوں گی، جنگی قیدیوں کو کھانا، کپڑا اور رہنے کی جگہ بھی مہیا کرائی جائے گی، مردہ شخص کے جسم کا مثلہ کرنا سخت ممنوع ہے، جنگی قیدیوں کا تبادلہ اور جنگ کی وجہ سے بکھرے ہوئے خاندانوں کے لئے ملاقات کا موقع فراہم کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے۔

ب-درختوں کو کاٹنا، کھیتیوں اور مویشیوں کو نقصان پہنچانا، دشمن کے علاقہ میں شہری بلڈنگ وعمارت کو بم یا دیگر آلات کے ذریعہ تباہ وبرباد کرنا سخت ممنوع ہے۔

۴-دستاویز:

تمام انسانوں کو ان کی زندگی میں اور موت کے بعد ان کے ناموں کا احترام اور ان کی عزت کے تحفظ کا حق حاصل ہے، معاشرہ اور ریاست ان کی لاش اور ان کے جائے تدفین کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

۵-دستاویز:

الف-خاندان معاشرہ کی بنیاد ہے اور شادی خاندان کو تشکیل دینے کا ایک عملی نمونہ

ہے، ہر مرد وعورت کو شادی کرنے کا حق حاصل ہے اور انہیں رنگ ونسل وقومیت کی بنیاد پر ان حقوق سے متمتع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

ب-معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ شادی میں آنے والی تمام رکاوٹ کو دور کر کے شادی کی کارروائی کو آسان بنائے اور خاندان کے تحفظ وبقاوخوشحالی کو یقینی بنائے۔

۶-دستاویز:

الف-انسانی عزت وشرف میں عورت مرد کے برابر ہے اور اسے زندگی سے لطف اندوز ہونے اور اپنی ذمہ داری کو بروئے کار لانے کا مکمل حق حاصل ہے، وہ اپنی شہری انفرادیت اور معاشی خودمختاری اور اپنے نام ونسب کا مکمل حق رکھتی ہے۔

ب-شوہر فیملی کی خوشحالی وکفالت کا ذمہ دار ہے۔

۷-دستاویز:

الف-پیدائش کے وقت سے ہی ہر بچہ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ والدین، معاشرہ اور ریاست بچے کی مناسب دیکھ بھال، تعلیم، آسائش وآرام، حفظان صحت اور اخلاقیات پر مکمل توجہ دیں۔ جنین اور ماں کو خاص تحفظ وتوجہ کا حق حاصل ہوگا۔

ب-والدین یا ولی کو اپنی پسند کے مطابق بچے کے تعلیمی کورس کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اس انتخاب میں والدین کو بچے کا شوق، مستقبل، اخلاقی اقدار اور شریعت کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

۸-دستاویز:

الف-ہر انسان کو اس کے فرائض وذمہ داری کے تئیں جو قانونی حق دیا گیا ہے اسے اختیار کرنے کا پورا پورا قانونی صلاحیت کے مطابق لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے، اور اگر

اس کی یہ صلاحیت ختم ہو جائے یا کمزور ہو جائے تو والدین کو اس کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا۔

۹-دستاویز:

الف-طلب علم فرض اور ایک اہم ذمہ داری ہے، اور معاشرہ وریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمی حصول کے ذرائع کو مہیا کرائیں، ریاست مطلوبہ تعلیمی طریقہ ووسائل کو مہیا کرانے کی یقین دہانی کرے اور معاشرہ کے رجحان کے مطابق تعلیمی تنوع کی ضمانت دے، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر لوگوں کو اس لائق بنائے کہ وہ مذہب اسلام اور دنیا کی حقیقت سے روشناس ہوسکیں۔

ب-تمام انسانوں کو مختلف تعلیمی اداروں سے دنیاوی اور دینی تعلیم کے حصول کا حق حاصل ہے؛ تاکہ وہ اس کے حصول کے بعد مناسب انداز میں اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکیں اور اس طرح وہ خدا پر اپنے یقین کو مضبوط کر کے اپنے ہر طرح کے حقوق وفرائض و ذمہ داری کا دفاع کر سکتے ہیں۔

۱۰-دستاویز:

یقیناً اسلام ایک صحیح دین فطرت ہے، کسی بھی آدمی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا، غربت کی بنیاد پر اس کا استحصال کرنا، اور اگر کوئی اسے دوسرا مذہب قبول کرنے یا الحاد پر مجبور کرے تو سے نظر انداز کرنا سخت ممنوع ہے۔

۱۱-دستاویز:

الف-تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور کسی کو بھی انسان کو غلام بنانے یا اس کی تذلیل کرنے یا اس پر ظلم وزیادتی واستحصال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اور اسلام میں خدائے

واحد کی عبادت کے علاوہ کسی اور کی پرستش کی اجازت نہیں ہے۔

ب۔کسی بھی طرح کا استعمار جو کہ غلامی کی مذموم شکل ہے سخت ممنوع ہے، استعماریت سے پریشان حال لوگوں کو اپنی آزادی اور اپنے قضیہ میں خودمختاری کا مکمل حق حاصل ہے، یہ تمام لوگوں اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ استعماریت سے جوجھ رہے لوگوں کی کوششوں میں مکمل تعاون کرے اور ہر طرح کے استعمار کا خاتمہ کرے، اور ہر ریاست و فرد کو اپنی ذاتی شناخت، دولت اور قدرتی وسائل کو تصرف میں لانے کا مکمل حق حاصل ہے۔

۱۲-دستاویز:

ہر آدمی کو شرعی دائرہ کے مطابق کسی بھی جگہ آنے جانے، یا پھر ملک یا بیرون ملک اپنی رہائش کی جگہ کا انتخاب کرنے کا مکمل اختیار و حق حاصل ہے، اور اگر کسی شخص کو کسی بنیاد پر بے جا آزار پہنچایا جارہا ہو تو اسے نقل مکانی کا حق حاصل ہے، جس ملک میں مہاجرین پناہ لیں گے اس ملک کی حکومت مہاجروں کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہوگی تا آنکہ مہاجرین اپنے وطن پہنچ جائیں۔

۱۳-دستاویز:

ہر باصلاحیت و بے عیب شخص کام کا حق رکھتا ہے جس کی ذمہ داری معاشرہ و ریاست کے سر جاتی ہے، ہر شخص کو اپنی پسند و خواہش کے مطابق کام کے انتخاب کا اختیار حاصل ہے، ملازم کو ہر طرح کا تحفظ و امان اور سماجی ضمانت حاصل ہے، ملازم کو اس کی صلاحیت کے بقدر ہی کام دیا جائے گا، اس کا استحصال نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اسے کسی ایسے کام پر مجبور کیا جائے گا جو کہ اس کے بس میں نہ ہو، ملازمین کو بغیر کسی مرد و عورت کی تفریق کے وقت متعینہ پر انہیں ان کے کام کی اجرت دی جائے گی، اسی طرح انہیں رعایتی رقم، چھٹیاں اور اپنے کام کے مطابق ترقی بھی

حاصل ہوگی، ساتھ ساتھ اس کا بھی مطالبہ ہوگا کہ وہ اپنا کام یکسوئی وانہماک اور نہایت محتاط طریقہ سے کریں، اگر ملازمین یا مزدور کسی معاملہ پر ناراض ہوجائیں تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس جھگڑے کو اپنی مداخلت سے حل کرے، شکوہ وشکایت کو ختم کر کے حق بات کو واضح کرے اور بغیر کسی تعصب کے انصاف نافذ کرے۔

۱۴- دستاویز:

ہر فرد کو بغیر کسی تسلط، فریب کاری، اور بغیر کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچائے جائز و درست دولت وثروت کمانے کا حق حاصل ہے، اور ربا ہر حالت میں ممنوع ہے۔

۱۵- دستاویز:

ہر شخص کو قانونی وجائز طریقہ سے خود کو یا کسی دوسرے شخص یا معاشرہ کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی ذاتی ملکیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور اس ذاتی ملکیت پر اسے مکمل مالکانہ استحقاق حاصل ہے، ریاست کو عوامی فائدہ کے علاوہ اور بروقت مناسب عوض کی ادائیگی کے علاوہ کسی شخص کی املاک کو ضبطی میں لینے کی قطعی اجازت نہیں ہے، قانون کے متعین کردہ دفعات کے علاوہ کسی کے املاک کو ضبط کرنا سخت ممنوع ہے۔

۱۶- دستاویز:

ہر شخص کو اپنے علم وادب وفن کاری، اور میکانیاتی علوم کے فروغ سے لطف اندوز ہونے کا مکمل حق حاصل ہے اور انہیں اپنی صلاحیتوں کو اپنی حیثیت کے مطابق بروئے کار لانے اور وسائل کے استعمال کا حق حاصل ہے اور انہیں اس طرح کے وسائل مہیا کرانا شرعی اصول کے تضاد بھی نہیں ہے۔

۱۷- دستاویز:

الف- ہر شخص کو ایک صاف ستھری و پاکیزہ فضا جو کہ برائی، اور اخلاقی گراوٹ سے پاک ہو اس میں سانس لینے و زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے، ایسی فضا جو اس کی ذاتی ترقی کو پروان چڑھائے اور اس طرح کے حقوق کو مہیا کرانا معاشرہ اور ریاست کی لازمی ذمہ داری ہے۔

ب- ہر شخص کو طبی و سماجی توجہ کا حق حاصل ہے، معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کی خصوصیات کے مطابق اپنے موجودہ وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں یہ سہولیات مہیا کرائے۔

ج- ریاست ہر شخص کی ذاتی زندگی کے حق کو یقینی بنائے اور وہ لوگ جو اپنی کفالت خود نہ کر سکتے ہوں ان کے لئے کپڑا، مکان، کھانا، تعلیم، طبی سہولیات اور دیگر بنیادی ضرورتوں کے حصول کے طریقوں کو ممکن بنائے۔

۱۸- دستاویز:

الف- ہر شخص کو اس کے مذہب، اس کی خود مختاری، عزت و شرف اور جائداد کا بذات خود تحفظ کا حق حاصل ہے۔

ب- ہر شخص کو اپنے تعلقات و جائداد کے بارے میں اپنے گھر میں، اپنی فیملی کے بیچ، اپنے ذاتی معاملات کو بیرونی مداخلت کے بغیر حل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے، اس کے خلاف تاک جھانک کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اور نہ ہی اسے کڑی نگرانی میں رکھنے یا اس کے نام پر بٹہ لگانے کی کسی کو اجازت ہے، ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ دوسرے اشخاص کو اس کے ذاتی معاملات میں بغیر کسی واقفیت کے دخل اندازی سے روکے۔

ج- ہر شخص کا ذاتی گھر ہر حالت میں قابل احترام ہے، گھر کے مکین کی اجازت کے

بغیر کسی بھی غیر قانونی طریقہ سے کسی کو گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ ہی اس گھر کو منہدم کیا جائے گا، نہ ہی قرقی کی جائے گی اور نہ ہی مکین کو بے دخل کیا جائے گا۔

۱۹-دستاویز:

الف: حاکم ومحکوم میں تفریق کے بغیر ہر فرد قانون کی نظر میں برابر ہے۔
ب-ہر شخص کو انصاف کے لئے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔
ج-ہر شخص اپنی ذمہ داری کے تئیں جوابدہ ہے۔
د-شریعت کی بیان کردہ تفصیلات کے علاوہ کوئی بھی چیز جرم یا سزا نہیں سمجھی جائے گی۔
ج-جب تک کسی شخص کا جرم منصفانہ عدالتی کارروائی سے ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اسے معصوم سمجھا جائے گا اور اسے ہر طرح کے دفاع کا حق حاصل ہوگا۔

۲۰-دستاویز:

بغیر کسی قانونی وجوہات کے کسی شخص کو قید کرنے یا اس کی آزادی کو سلب کرنے یا اسے جلاوطن کرنے اور سزا دینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے، اور نہ ہی اس پر جسمانی، نفسیاتی تشدد اور تذلیل روا رکھنے کی اجازت ہے، اس کی جان اور صحت کو خطرہ میں ڈال کر بغیر اس کی اجازت کے اس پر طبی اور سائنٹفک تجربات کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

۲۱-دستاویز:

کسی بھی مقصد اور ارادہ کی خاطر کسی شخص کو یرغمال بنانا سخت ممنوع ہے۔

۲۲-دستاویز:

الف-ہر شخص کو شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنی رائے اور سوچ

کے اظہار کا حق حاصل ہے۔

ب- بلاشبہ خبریں معاشرہ کے لئے انتہائی اہم ہیں مگران کا غلط استعمال کسی کے تقدس کو پامال کرنے کے لئے یا نبیوں کی بے حرمتی کے لئے کرنا ایک واضح خلاف ورزی ہے، ان کا غلط استعمال اخلاقی اقدار کی بنیادوں کو کھوکھلا اور معاشرہ کو نقصان اور اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔

ج- کسی بھی شخص کو قومیت یا عقائد کی بنیاد پر نفرت پھیلانے یا کسی بھی طرح کے نسلی اختلافات کو بھڑکانے اور شہہ دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

۲۳- دستاویز:

ہر شخص کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے ملک کے عوامی معاملات کے نظم و ترتیب میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے، اور عوامی انتظامی کارروائی کو شریعت کے مطابق یقینی بنانے میں اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔

۲۴- دستاویز:

اس مسودہ میں بیان کردہ ہر قسم کی آزادی اور حقوق اسلامی شریعت کا موضوع بحث ہے۔

۲۵- دستاویز:

اس مسودہ کے کسی بھی جز کی وضاحت و تشریح کے لئے فقط شریعت اسلامی ہی منبع و مرجع ہے۔

☆☆☆

انسانی حقوق کا عالمی اسلامی منشور

پیش لفظ:

چودہ سو سال قبل اسلام نے انسانیت کو انسانی حقوق کا کامل قانونی ضابطہ دیا، ان حقوق کا مقصد انسانیت کو عزت و شرف عطا کرنا اور ظلم و جبر، استحصال اور ناانصافی کو دور کرنا ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق کے ٹھوس و مستحکم ہونے کی بنیاد اس کے متبعین کا ایک خدا پر یقین ہے، اور یہ کہ اللہ ہی قانون بنانے والا اور تمام انسانی حقوق کا سرچشمہ ہے، نہ کوئی حاکم وقت، مجلس قانون ساز یا اختیاری ادارہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں تخفیف و ترمیم کرسکتا ہے اور نہ خود صاحب حق ہی اس سے دستبردار ہوسکتا ہے۔

مجموعی طور پر اسلام میں انسانی حقوق کی حیثیت ایک جزء لاینفک کی ہے۔ تمام مسلم حکومتوں اور معاشرہ کے ہر طبقہ کی لازمی ذمہ داری ہے کہ ان مطالبات کو ان کے دائرے میں نافذ کریں۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں انسانی حقوق کو بلا خوف وخطر پیروں تلے روندا جارہا ہے جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں، اس طرح کی خلاف ورزی بہت ہی تشویشناک معاملہ ہے، اور ہمارے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سلسلہ میں بیدار کریں۔

میں خلوص نیت کے ساتھ اس بات کی امید کرتا ہوں کہ انسانی حقوق کا یہ مسودہ مسلمانوں کو ایک مضبوط قوت محرکہ عطا کرے گا کہ وہ مضبوطی و ثابت قدمی اور دلیری کے ساتھ خدا

کے عطا کردہ حقوق کے تحفظ و بقا کے لئے تیار ہوجائیں رکھڑے ہوجائیں۔

اسلامک کونسل کی جانب سے حقوق انسانی کے سلسلہ میں یہ دوسری اساسی دستاویز ہے جو کہ اسلامک دور کے پندرہویں صدی کو نشان زد کرتا ہے، پہلا عالمی اسلامک مسودہ (آپ ﷺ اور آپ کے پیغامات کے تعلق سے) عالمی کانفرنس لندن ۱۲/اپریل تا ۱۵/اپریل ۱۹۸۰ میں پیش اعلان کیا گیا تھا۔

انسانی حقوق کے عالمی اسلامک مسودہ کی بنیاد قرآن و حدیث ہے اور ممتاز مسلم دانشوروں کے ذریعہ ترتیب دیا گیا ہے جو کہ اسلامی افکار و خیالات کے ماہرین اور ترجمان ہیں۔ اللہ ان کی کوششوں کا انہیں بہتر بدل عطا فرمائے اور ہماری صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرے۔

Paris 21 Dhul Qaidah 1401 Salem Azzam 19

September 1981 Secretary General

یاأیها الناس إنا خلقنکم من ذکر وأنثی و جعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله أتقاکم إن الله علیم خبیر (سورۂ حجرات ۴۹:۱۳)۔

(اے لوگو! بیشک میں نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہیں قبیلوں اور گروہوں میں بانٹ دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے، بے شک اللہ تمام چیزوں کو جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے)۔

تمہید:

قدیم زمانے سے لوگوں کی خواہشات ایک ایسی منظم دنیا کے لئے ہے جہاں لوگ زندگی گزار سکتے ہوں، ترقی کر سکتے ہوں، اور ایسی فضا میں پھل پھول سکتے ہوں، جہاں نہ خوف ہو، نہ ظلم و جبر، نہ استحصال ہو اور نہ ہی محرومی، جس کی آج تک تکمیل نہیں ہو پائی ہے۔

جبکہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب اور اپنے پیارے حبیب ﷺ کی سنت میں انسانی ادارہ اور تعلقات کو قائم کرنے اور اس کو صحیح طور سے چلانے کے لئے قانونی فرمانبرداری اور اخلاقی ڈھانچہ پیش کیا ہے۔

چونکہ انسانی حقوق کو خدائی قانون کے ذریعہ نافذ کرنے کا مقصد انسانوں کو عزت و شرف عطا کرنا اور ظلم و جبر و ناانصافی کو خارج کرنا ہے۔

چونکہ ان حقوق میں خدائی سرچشمہ کی خوبی اور صداقت کی وجہ کر نہ ہی اُن میں کوئی ترمیم کی جاسکتی ہے اور نہ ہی منسوخ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی اختیاری ادارہ اور انجمن و مجلسوں کے ذریعہ نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ ادارے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کئے جاسکتے ہیں۔

لہٰذا ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں:

الف: اللہ مہربان اور رحیم ہے، وہی خالق ہے، سہارا دینے والا ہے، مقتدر ہے، اور تنہا انسانوں کی اور تمام قانونی سرچشموں کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

ب- انسانی شکل میں خلیفہ کی پیدائش اسی لئے ہوئی ہے کہ روئے زمین پر وہ خدائی مرضیات کا نفاذ کرے۔

ج- خدائی رہنمائی کے افکار انبیاء کے ذریعہ لائے گئے جن کا مقصد خدا کے اس آخری آفاقی پیغام کی ہمہ گیریت کی دریافت تھا جسے آپ ﷺ انسانیت کے لئے لے کر آئے۔

د- خدا کے بتائے ہوئے ہدایت کے راستہ سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اپنی عقل کی بنیاد پر کوئی ہدایت تلاش کرتا ہے تو نہ ہی وہ کوشش انسانی حق میں مفید ہوسکتی ہے اور نہ ہی انسانی روح کو وہ روحانی غذا مہیا کرا سکتی ہے، ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ اسلامی تعلیمات خدائی ہدایت کو اس کے صحیح اور آخری شکل میں لب لباب کے طور پر پیش کرتا ہے، ہمیں اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور معاشرہ کے اعلی اور باعزت لوگوں کو خدا کا وہ انعام یاد دلانا چاہئے جو انہیں عطا کیا گیا ہے۔

ح-تمام انسانیت کو اسلامی پیغام کی دعوت دینا۔

د-یہ ہمارا خدا کے ساتھ بہت ہی قدیم اقرار نامہ ہے کہ ہم اپنے فرائض اور ذمہ داری کو اپنے حقوق کے اوپر ترجیح دیں گے، اور ہم میں سے ہر ایک کی لازمی ذمہ داری اسلامی تعلیمات کو پھیلانا، قول وعمل اور تمام صحیح راستوں کے ذریعہ انہیں مؤثر بنانا، اپنے اردگرد سماج میں بھی نہ کہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں۔

ز-اور اسلامی نظم ونسق کا قیام ہماری ذمہ داری ہے۔

۱-جہاں تمام انسانیت میں مساوات قائم کیا جائے گا، نہ کوئی خصوصی اعزاز سے لطف اندوز ہوگا اور نہ ناموافق صورتحال یا رنگ ونسل، قبیلہ وزبان کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز برتا جائے گا۔

۲-جہاں تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں۔

۳-جہاں غلامی اور مزدوروں کے ساتھ سختی غلط سمجھا جاتا ہو۔

۴-جہاں ایسے حالات تیار کئے جائیں گے کہ خاندانی نظم ونسق کو اس کی صحیح شکل میں قائم کیا جائے اور سماجی زندگی کی بنیاد پر ان کی عزت اور حفاظت کی جائے۔

۵-جہاں قانون کی نظر میں حاکم ومحکوم کے ساتھ یکساں معاملہ ہو۔

۶-جہاں صرف قانونی ہدایات کی موافقت کی بنیاد پر فرمانبرداری کی جائے۔

۷-جہاں تمام دنیاوی طاقت قانون کے ذریعہ بیان کردہ حدود کو بجالانے اور قانون کا منظور شدہ طریقہ اور اس کو اولیت دینے کی بنیاد پر مقدس سمجھی جائیں گی۔

۸-جہاں تمام اقتصادی وسائل کو جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں، خدائی انعام سمجھ کر اس کی صحیح تقسیم عمل میں آئے تا کہ تمام انسانیت قرآن وحدیث میں بیان کردہ قانون واقدار کے مطابق لطف اندوز ہو سکے۔

۹- جہاں تمام عوامی امور کا فیصلہ اور بندوبست کیا جائے اور جو اختیارات عوام الناس پر حکومت کرنے کے لئے حاصل کئے جائیں وہ شورائی فیصلہ کے بعد ہوں، اور اس شورائی نظام کو چلانے میں ایسے پڑھے لکھے قابل اہل ایمان ہوں جو کوئی بھی فیصلہ لینے میں عوامی بھلائی اور قانون کی اہمیت کو مدنظر رکھیں۔

۱۰- جہاں ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر مناسب ذمہ داری لے گا اور اپنے اس عمل کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔

۱۱- جہاں ہر انسان کو قانون کے مطابق صحیح اصلاحی طریقہ کی یقین دہانی کرائی جائے گی، اگر اس سے اس کے حقوق کی خلاف ورزی ہو جائے۔

۱۲- جہاں کوئی بھی اپنے قانونی حق سے محروم نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ قانونی اختیار اور دائرہ عمل اس بات کی اجازت دے۔

۱۳- اگر کوئی شخص معاشرہ یا اس کے کسی فرد کے خلاف جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو ہر فرد اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ اس کے خلاف قانونی پیش قدمی کرے۔

۱۴- جہاں تمام کوششوں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

الف- ہر طرح کے استحصال، ظلم و جبر، ناانصافی سے انسانیت کو تحفظ دینا۔

ب- قانونی دائرہ میں جو طریقہ منظور شدہ ہے اس کے مطابق ہر کسی کی جان کی حفاظت اور عزت اور آزادی کی حفاظت کو یقینی بنانا۔

اسلامی دور کے پندرہویں صدی کے آغاز میں بحیثیت بندہ خدا اور عالمی اسلامی برادری کے ارکان کی حیثیت سے ہم اپنے عہد و پیمان کی توثیق کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل مقدس، اور لاینفک انسانی حقوق کی حمایت و توثیق ہماری ذمہ داری ہے، جسے اسلام نے ہمیں پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۱-زندگی کا حق:

الف-انسانی زندگی جو کہ مقدس اور قابل احترام ہے اس کی حفاظت کی ہر طرح کی کوشش کی جائے گی، خاص کر کسی بھی شخص کا زخم یا اس کی موت کو ظاہر نہیں کیا جائے گا، الا یہ کہ قانونی اختیار اس بات کی اجازت دیتا ہو۔

ب-ایک آدمی کے جسمانی تقدس کو مرنے کے بعد اسی طرح مقدس سمجھا جائے گا جیسا کہ اس کی زندگی میں، اس بات کا دھیان رکھنا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ ایک متوفی آدمی کے جسم کو باوقار انداز میں رکھا جائے گا۔

۲-حق آزادی:

الف-انسان آزاد پیدا ہوا ہے، کسی بھی طرح کی بیجا مداخلت کو اس کی آزادی کے راستہ میں حائل نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ قانونی اختیارات اس کارروائی کی اجازت دیں۔

ب-ہر فرد واحد اور معاشرہ کے ہر آدمی کو مکمل حق آزادی اس کی تمام شکلوں کے ساتھ حاصل ہے، خواہ وہ جسمانی ہو، تہذیبی ہو، اقتصادی ہو، یا سیاسی ہو، اور اسے اس بات کا حق دیا جائے گا کہ اگر اس کے اس حق کو کوئی منسوخ کرتا ہے یا اس میں مداخلت بے جا کرتا ہے تو وہ تمام موجودہ وسائل کو اس کے مقابلہ میں استعمال کرے، اور کسی بھی طرح کی انفرادی یا عوامی ناانصافی کی کوشش کے خلاف قانونی دعوی کا حق اور اسے عوام الناس کی حمایت حاصل ہوگی۔

۳-حق مساوات اور ممنوع امتیازات کے خلاف ممانعت:

الف-قانون کی نظر میں ہر آدمی برابر ہے اور ہر شخص کو قانونی تحفظ اور یکساں ترقی کے مواقع مہیا کیے جائیں گے۔

ب- ہر شخص کو ایک ہی جیسے کام کے لئے برابر تنخواہ دی جائے گی۔

ج- کسی بھی شخص کو مذہبی عقیدہ، رنگ و نسل، جنسیت اور زبان کی بنیاد پر یا اور کسی دوسری وجوہات کی بنیاد پر اس پر بڑی جسمانی بیماری ظاہر کر کے نہ ہی اسے کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے سے روکا جائے گا اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز برتا جائے گا۔

۴- حق انصاف:

الف- ہر شخص اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ کیا جائے۔

ب- اس کے علاوہ ہر شخص کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائے مدد اور اصلاح کے لئے جو اسے قانون نے مہیا کرایا ہے کسی بھی بلا جواز ذاتی زخم اور نقصان کے، اور ہر شخص کو ذاتی دفاع کا بھی حق حاصل ہوگا اگر اس کے خلاف بلا جواز کوئی ذاتی زخم یا نقصان کا مقدمہ کیا جائے کہ وہ منصفانہ فیصلہ حاصل کرے۔

ج- یہ ہر شخص کا حق اور ذمہ داری ہے کہ دوسرے افراد یا گروہ کے حقوق کا عمومی دفاع کرے۔

د- کسی بھی شخص کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جائے گا برخلاف اس کے کہ وہ انفرادی یا عوامی حقوق کا دفاع چاہ رہا ہو۔

ح- اگر قانون کے برعکس کوئی فرمان یا حکم ہو تو ہر مسلمان کی ذمہ داری اور حق ہے کہ اس کی فرمانبرداری سے انکار کرے گرچہ کسی کی طرف سے بھی وہ فرمان جاری کیا گیا ہو۔

۵- منصفانہ عدالتی کارروائی کا حق:

الف- خود مختار عدالتی کارروائی کے بعد اگر کسی مجرم کا جرم ثبوت کی بنیاد پر ثابت

ہو جائے تو اس کے خلاف سزا کا حکم صادر کیا جائے گا اور اسے جوابدہ بنایا جائے گا۔

ب-کسی بھی شخص کو اپنے دفاع کا معقول موقع فراہم کرنے اور منصفانہ عدالتی کارروائی کے بعد ہی مجرم ٹھہرایا جائے گا۔

ج-جرم کی سنگینی اور جن حالات میں اس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے اس پر مناسب غور و خوض کے بعد ہی قانون کے مطابق مناسب سزا دی جائے گی۔

د-کوئی بھی عمل جرم نہیں سمجھا جائے گا الا یہ کہ قانون اسے واضح لفظوں میں جرم بتائے۔

ح-ہر فرد واحد اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کسی بھی فرد کے جرائم کی ذمہ داری اس کے اہل خانہ یا لواحقین کے سر نہیں ڈالا جائے گا جو صراحتاً یا بلا واسطہ اس جرم کے ارتکاب میں شامل نہیں ہیں۔

۶-طاقت کے بیجا استعمال کے خلاف حق تحفظ:

ہر شخص سرکاری ادارہ کے ہاتھوں ستائے جانے کے خلاف تحفظ کا حق رکھتا ہے، وہ خود ہی سبب بتانے کا ذمہ دار نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اپنے خلاف تیار کئے گئے الزام کے خلاف دفاع تیار کرے؛ تاکہ جب بھی اس کے خلاف کسی جرم میں شمولیت کا شک و سوال پیدا ہو تو معقول انداز میں اس دفاع کا استعمال کر سکے۔

۷-تشدد کے خلاف حق تحفظ:

کسی بھی شخص کے خلاف ذہنی، جسمانی، بے عزتی، دھمکی آمیز تشدد روا نہیں رکھا جائے گا، اور نہ ہی اسے یا اس کے اقرباء میں سے کسی کو زخم دیا جائے گا، اور نہ ہی اس کے عزیز کو گرفتار کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر ارتکاب جرم قبول کرنے پر زور دیا جائے گا۔

۸-عزت ووقار کے تحفظ کا حق:

ہر شخص تہمت طرازی، بے بنیاد الزام یا دانستہ ہتک کرنے یا افشاء راز کی دھمکی کے خلاف اپنی عزت ووقار کے تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

۹-جائے پناہ کا حق:

الف-ہر مظلوم یا آزار پہنچایا گیا شخص اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ مستقل پناہ گاہ یا جائے قرار تلاش کرے، یہ تمام انسانوں کو قطع نظر رنگ ونسل، مذہب اور جنس کے حق ضمانت مہیا کرتا ہے۔

ب-خدا کا مقدس گھر مسجد حرام جو کہ مکہ میں ہے وہ تمام مسلمانوں کے لئے محفوظ پناہ گاہ ہے۔

۱۰-اقلیتی حقوق:

الف-قرآنی ضابطہ کے مطابق غیر مسلم اقلیت کو مذہبی حقوق حاصل ہوں گے؛ کیونکہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

ب-مسلم ممالک میں مذہبی غیر مسلم اقلیت کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے شہری یا انفرادی معاملات کو اسلامی قانون یا اپنے قانون کے حوالے سے چلائیں۔

۱۱-عوامی معاملات کے نظم ونسق میں شراکت کی ذمہ داری اور حق:

الف-قانونی معاملہ، معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ عوامی منصب کو تسلیم کرے۔

ب-حکومت اور عوام کے درمیان انتظامی تعلقات کی بنیاد آزاد مشورہ کا طریق عمل

ہے،عوام کومزید یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے حکام کا انتخاب یاان کی برطرفی ان اصول کے مطابق کریں۔

۱۲-آزادی عقیدہ،فکر وخطابت کا حق:

الف-ہر شخص قانونی دائرہ کے مطابق اپنی فکراور عقیدہ کے اظہار کا حق رکھتا ہے،اس کے باوجود کسی شخص کو ایسی غلط خبر نشر کرنے یا پھیلانے کا حق نہیں دیا جائے گا جو کسی عام آدمی کی ایمانداری کی تذلیل کا سبب بنے، یا اس کا بھی حق نہیں دیا جائے گا کہ وہ دوسرے شخص پر ہتک آمیز الزام تراشی،طنز یا تہمت کا اظہار کرے۔

ب-سچائی کے بعد معلومات کا تتبع اور چھان بین یہ ایک مسلم کا حق ہی نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری بھی ہے۔

ج-ظلم و ناانصافی کے خلاف مظاہرہ اور جدوجہد کرنا (قانونی دائرہ میں رہ کر) ہر مسلمان کا حق اوراس کی ذمہ داری ہے بلکہ اگر یہ جدوجہد ضلع کی اعلیٰ ترین ہستی کو شامل کرلیتا ہے تو یہ ایک چیلنج ہے۔

د-جہاں مہیا کرائی گئی معلومات کے نشر کرنے میں کوئی بندش نہ ہو،وہ معلومات معاشرہ اور ضلع کے امن وامان کو خطرہ میں نہ ڈالے اور وہ قانونی دائرہ کے مطابق محصور کردیا گیا ہو۔

ذ-کوئی بھی شخص دوسروں کے مذہبی عقیدہ کی تذلیل یا اس کا مذاق نہیں اڑائے گا یا ان کے خلاف عوامی مخالفت کو نہیں اکسائے گا،دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام تمام مسلم کا اولین فریضہ ہے۔

۱۳-مذہبی آزادی کا حق:

ہر شخص کو اس کے مذہبی عقیدہ کے مطابق عبادت اور ضمیر کی آزادی کا حق حاصل ہے۔

۱۴- آزادی انجمن کا حق:

الف- ہر شخص کو اس کے معاشرہ کی سیاسی، اقتصادی، مذہبی، رسمی، زندگی میں انفرادی یا مجموعی شراکت کا حق دیا جاتا ہے اور اس کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ تنظیم یا ادارہ قائم کرے جس کا مقصد بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہو۔

ب- ہر شخص کو اس کا بھی حق دیا جاتا ہے کہ وہ ان اداروں کے قیام میں بھرپور جدوجہد کرے جہاں ان خوشگوار حقوق پر عمل کرنا ممکن بنایا جا سکے، مجموعی طور پر معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ایسے حالات پیدا کریں کہ جن حالات میں اس کے افراد کو اپنی شخصیت پروان چڑھانے کا بھرپور موقع مل سکے۔

۱۵- اقتصادی نظم وترتیب اور حق ترقی:

الف- ہر شخص کو اس کی معاشی مصروفیت کے لئے مظاہر فطرت اور اس کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا حق دیا جاتا ہے۔

یہ انعام قدرت کی طرف سے تمام انسانیت کو دیا گیا ہے۔

ب- تمام انسانوں کو قانون کے مطابق اپنی زندگی کی کفالت کے لئے کمانے کا حق حاصل ہے۔

ج- ہر شخص کو جائیداد کا حق دیا جاتا ہے خواہ انفرادی ہو یا شراکت کے ساتھ ہو، بیان کردہ یقینی معاشی وسائل کی ملکیت عوامی فائدہ کے لئے قانونی طور پر درست ہے۔

د- غریبوں کو امیروں کے مال میں سے زکوۃ کی شکل میں بیان کردہ حصہ کے مطابق حق حاصل ہے جو حصہ امیروں سے قانون کے مطابق لیا جائے گا۔

ذ- تمام پیداواری دولت کو امت کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جائے گا، نہ اسے نظر

اندازکیا جائے گا اور نہ ہی اس کا غلط استعمال کیا جائے گا۔

ر-متوازن اقتصادی ترقی کو فروغ دینے اور معاشرہ کو استحصال سے بچانے کے لئے اسلامی قانون نا مناسب ممنوعہ تجارت کرنے، سود، جابرانہ معاہدہ کا استعمال اور گمراہ کن اشتہارات کی اشاعت سے منع کرتا ہے۔

ز-اگر کوئی ایسی معاشی سرگرمی ہو جو کہ امت کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے اور نہ ہی اسلامی قانون واقدار کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اجازت دی جاتی ہے اور ہر طرح کے ممکنہ وسائل اسے مہیا کرائے جائیں گے۔

۱۶-ملکیت کے تحفظ کا حق:

عوامی فائدہ کے علاوہ کسی بھی ملکیت کو ریاست اپنے کنٹرول میں نہیں لے گی الا یہ کہ ریاست اس کی صحیح رقم یا مناسب معاوضہ دے۔

۱۷-عاملین کی عزت اور مرتبہ:

اسلام عمل اور عاملین کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور سختی کے ساتھ مسلمانوں کو عاملین کے ساتھ وسیع القلبی سے برتاؤ کرنے کا حکم دیتا ہے، اسلام عاملین کی اجرت وقت پر ادا کرنے کا صرف حکم ہی نہیں دیتا ہے بلکہ عاملین کو آرام واطمینان کرنے کا مناسب وقت دیتا ہے۔

۱۸-معاشرتی تحفظ کا حق:

ہر شخص کھانا، کپڑا، مکان، تعلیم، طبی سہولیات کا مناسب معاشرتی وسائل کے ذریعہ حق رکھتا ہے، معاشرہ کے یہ احسانات ان ہی اشخاص کو حاصل ہوں گے جو اپنی کسی وقتی یا دائمی نااہلیت

کی وجہ سے اپنی کفالت کا بار نہ اٹھا سکتے ہوں۔

۱۹- خاندان اور اس کے متعلقہ معاملات کو انجام دینے کا حق:

الف- ہر شخص کو اس کے مذہب اور رسم و رواج کے مطابق شادی کرنے، خاندان بسانے اور بچہ کی پیدائش کا حق حاصل ہے، ہر میاں بیوی کو قانونی مطالبات کے مطابق ان تمام حقوق و مراعات ذمہ داری کے ساتھ بروئے کار لانے کا حق حاصل ہے۔

ب- ہر شادی شدہ جوڑے کو ایک دوسرے کی عزت اور لحاظ کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔

ج- ہر شوہر اپنے وسائل کے مطابق اپنی بیوی اور بچے کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔

د- ہر بچے کو اس کا حق حاصل ہے کہ اس کے والدین اس کی مناسب پرورش اور دیکھ بھال کریں اور کسی بھی طرح کے کام کی ذمہ داری بچوں پر سن بلوغ سے پہلے ڈالنا، جو ذمہ داری ان کے قدرتی نشو ونما پر اثر انداز ہو ممنوع ہے۔

ھ- اگر والدین کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داری ادا نہ کر پا رہے ہوں تو معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ عوامی اخراجات سے اس بچہ کی کفالت کریں۔

و- ہر بوڑھے، نا اہل شخص اور بچہ کو اپنے خاندان کی طرف سے ہر قسم کا تحفظ، مادی مدد، اور نگہداشت کا حق حاصل ہے، اسی طرح والدین کو بھی اپنی اولاد کی جانب سے ہر طرح کی مدد، نگہداشت اور تحفظ کا حق حاصل ہے۔

ز- خاندان اور معاشرہ کا اہم حصہ ہونے کی وجہ سے ماں کو خصوصی عزت و وقار، مدد اور نگہداشت کا حق حاصل ہے۔

ح- فیملی میں مرد و عورت کی ذمہ داری ہے کہ اپنی قدرتی اہلیت، صلاحیت اور رجحان کو دیکھتے ہوئے اپنی جنسیت کے مطابق ذمہ داریوں کو باہمی شراکت کے ساتھ انجام دیں اور اپنے

بچوں ورشتہ داروں کے تئیں اپنی عمومی ذمہ داری کو سمجھیں۔

۲۰-شادی شدہ عورت کے حقوق:

ہر شادی شدہ عورت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ:

الف-وہ اس گھر میں رہے جس میں اس کا شوہر رہتا ہے۔

ب-اپنے شوہر کے مد مقابل اپنے معیار کی زندگی کی دیکھ بھال کے لئے ضروری وسائل حاصل کرے اور طلاق کی صورت میں مدت عدت کے دوران اپنے شوہر کے وسائل سے اسی گھر میں اپنی ضروریات اور بچے کی ضروریات کی تکمیل کرے، قطع نظر اس کے کہ وہ خود ہی کماتی ہو یا اس کے پاس اچھی خاصی جائداد ہو۔

ج-اگر میاں بیوی کے درمیان اتحاد باقی نہ رہے تو عورت کو قانونی شرائط کے مطابق عدالت سے خلع کا حق حاصل ہے۔

د-قانون کے مطابق عورت کا اس کے شوہر، والدین، بچے اور خاندان کے وراثت میں حق ہے۔

ھ-اگر شوہر عورت کے پوشیدہ راز کا افشاء کرتا ہے یا سابق شوہر اس کے راز کا افشاء کرتا ہے تو عورت اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھا سکتی ہے؛ کیونکہ افشاء راز اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، اور ٹھیک یہی ذمہ داری عورت پر بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ شوہر یا سابق شوہر کے کسی بھی راز کو افشاء نہ کرے۔

۲۱-تعلیمی حق:

الف-ہر شخص کو اپنی قدرتی صلاحیت کی بنیاد پر تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

ب-ہر شخص اپنی فطری اہلیت کی بنیاد پر اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اپنے علمی شعبہ کا انتخاب، آنے والی زندگی اور مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی فطری صلاحیت کو پروان چڑھائے۔

۲۲-حق خلوت:

ہر شخص اپنی خلوت کے تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

۲۳-نقل مکانی اور گھر کی آزادی کا حق:

الف-حقیقت میں مسلم دنیا ایک امت اسلامیہ ہے، ہر مسلمان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ جس ملک میں بھی چاہے آزادی کے ساتھ جا سکتا ہے۔

کسی بھی مسلمان کو اس کے آبائی ملک کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، یا اگر کسی وجہ سے اسے جلاوطن کیا بھی جائے تو یہ عمل قانونی کارروائی کے بعد ہوگا۔

توضیحی بیان:

۱-اوپر مذکور حقوق انسانی کی تشکیل بطور متبادل سیاق وسباق مہیا کرتی ہیں۔

الف-آدمی کی اصطلاح مرد اور عورت دونوں جنس کو شامل ہے۔

ب-قانون کی اصطلاح شریعت کو ظاہر کرتی ہے، ضابطہ کی تمام قسمیں: قرآن و حدیث اور ان دیگر قوانین سے جنہیں قرآن و حدیث سے استنباط کیا گیا ہے، اسلامی فقہی اصطلاح کو درست سمجھتے ہوئے اخذ کی گئی ہیں۔

۲-اس مسودہ میں تمام انسانی حقوق کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو کہ ایک اہم ذمہ داری ہے۔

۳-اوپر بیان کردہ انسانی حقوق کے ضابطہ کا ذمہ دار قانونی احکام کے مطابق ہر

شخص ہے؛ کیونکہ یہ ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی عزت، تشخص، حقوق، آزادی کی حفاظت کا قصد کرے اور مطلوبہ اخلاقیات اور امت کی فلاح وبہبود کی طرف توجہ کرے۔

عربی اصطلاحات کے فرہنگ الفاظ:

سنت: آپ ﷺ کی زندگی کے طریقہ کو اپنانا کہ آپ ﷺ نے کیا کہا، کیا عمل کیا، اور کس عمل پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

خلیفہ: وہ شخص جو روئے زمین پر نبی کے مشن کا جانشین بنے۔

حسبہ: اسلامی ریاست کا ایک ادارہ جو ذمہ دار ہوتا تھا اس بات کا کہ وہ عوامی معاملات اور صحیح معیار زندگی کی تکمیل کے لئے سہولت پیدا کرے اور عوام الناس کے مسائل کی نگرانی کرے۔

معروف: اچھا کام۔

منکر: قابل مذمت عمل۔

زکوۃ: یہ اسلام کے پانچ ارکانوں میں سے ایک رکن ہے اور ہر مسلمان کی لازمی ذمہ داری ہے کہ اپنے دولت کو پاک کرنے کے لئے ایک طے شدہ رقم ادا کرے۔

عدت: طلاق شدہ عورت کی وہ متعینہ مدت جسے وہ طلاق کے فوراً بعد اپنے گھر میں گذارتی ہے اور اس مدت میں وہ شادی نہیں کرسکتی ہے۔

خلع: عورت اپنے مطالبہ پر طلاق کا حق حاصل کرتی ہے۔

امت اسلامیہ: عالمی مسلم سوسائٹی۔

شریعت: اسلامک لا۔

حوالہ جات:

۱- سورۂ مائدہ ۳۲: ۵

۲- مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی بیان کردہ روایت

۳- بخاری کی بیان کردہ روایت

۴-۲ بخاری و مسلم کی روایت

۵- خلیفہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا قول

۶- سورۂ شوریٰ ۴۱: ۴۲

۷- سورۂ حج ۴۱: ۲۲

۸-۳ آپ ﷺ کا خطاب

۹- بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی کی روایتیں

۱۰- خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خطبہ

۱۱- آپ ﷺ کا الوداعی خطبہ

۱۲- سورۂ احقاف ۱۹: ۴۶

۱۳- امام احمد کی روایت

۱۴- سورۂ ملک ۱۵: ۶۷

۱۵- سورۂ زلزلہ ۸، ۷: ۹۹

۱۶-۴ سورۂ نساء ۵۹: ۴

۱۷- سورۂ مائدہ ۴۹: ۵

۱۸- سورۂ نسا ۱۴۸: ۴

۱۹- بخاری، مسلم اور ترمذی کی روایت

۲۰- بخاری ومسلم کی روایت

۲۱- مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی روایات

۲۲- بخاری مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی روایات

۲۳- ابوداؤد وترمذی کی روایات

۲۴- بخاری، مسلم، ابوداؤد وترمذی کی روایات

۲۵- بخاری کی روایت

۲۶-۵ بخاری ومسلم کی روایت

۲۷- سورۂ اسراء: ۱۵:۱۷

۲۸- سورۂ احزاب ۵:۳۳

۲۹- سورۂ حجرات ۶:۴۹

۳۰- سورۂ نجم ۲۸:۵۳

۳۱- سورۂ بقرہ ۲۲۹:۲

۳۲- بیہقی اور حکیم کی روایت

۳۳- سورہ اسراء ۲۱:۵۲

۳۴- سورۂ طور ۲۹:۱۲

۳۵- سورۂ یوسف ۷۹:۱۲

۳۶-۶ سورۂ احزاب ۵۸:۳۳

۳۷-۷ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی روایات

۳۸- ابن ماجہ کی روایت

۳۹-۸ آپ ﷺ کا الوداعی خطبہ

۴۰- سورۂ حجرات ۱۲:۴۹

۴۱- سورۂ حجرات ۱۱:۴۹

۹- ۴۲ سورۂ توبہ ۶،۹

۴۳- سورۂ عمران: ۹۷،۳

۴۴- سورۂ بقرہ ۱۲۵:۲

۴۵- سورۂ حج ۲۵:۲۲

۱۰- ۴۶ سورۂ بقرہ ۲۵۶:۲

۴۷- سورۂ مائدہ ۴۲:۵

۴۸- سورۂ مائدہ ۴۳:۵

۴۹- سورۂ مائدہ ۴۷:۵

۱۱- ۵۰ سورۂ شوریٰ ۳۸:۴۲

۵۱- احمد کی روایت

۵۲- حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خطبہ

۱۲- ۵۳ سورۂ احزاب ۶۱-۶۰:۳۳

۵۴- سورۂ سبا ۴۶:۳۴

۵۵- ترمذی اور نسائی کی روایت ۴۸:۴

۵۶- سورۂ نسا ۸۳:۴

۵۷- سورۂ انعام ۱۰۸:۶

۱۳- ۵۸ سورۂ کافرون ۶:۱۰۹

۱۴- ۵۹ سورۂ یوسف ۱۰۹:۱۲

۶۰- سورۂ عمران ۱۰۴:۳

۶۱- سورۂ مائدہ ۲:۵

۶۲- ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کی روایات

۱۵-۶۳ سورۂ مائدہ ۵:۱۲۰

۶۴- سورۂ جاثیہ ۴۵:۱۳

۶۵- سورۂ شعراء ۲۶:۱۸۳

۶۶- سورۂ اسراء ۱۷:۲۰

۶۷- سورۂ ہود ۱۱:۶

۶۸- سورۂ ملک ۶۷:۱۵

۶۹- سورۂ نجم ۵۳:۲۸

۷۰- سورۂ حشر ۵۹:۹

۷۱- سورۂ معارج ۷۰:۲۴-۲۵

۷۲- خلیفہ ابوبکر کا قول

۷۳- بخاری و مسلم کی روایت

۷۴- مسلم کی روایت

۷۵- مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی روایات

۷۶- بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی روایات

۷۷- سورۂ مطففین ۸۳:۱-۳

۷۸- مسلم کی روایت

۷۹- سورۂ بقرہ ۲:۲۷۵

۸۰- بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی روایات

۱۶-۸۱ سورۂ بقرہ ۲:۱۸۸

۸۲- بخاری کی روایت

۸۳- مسلم کی روایت

۸۴- مسلم و ترمذی کی روایت

۱۷-۸۵ سورۂ توبہ ۹:۱۰۵

۸۶- ابو یعلی۔ مجمع الزوائد کی روایت

۸۷- ابن ماجہ کی روایت

۸۸- سورۂ احقاف ۴۶:۱۹

۸۹- سورۂ توبہ ۹:۱۰۵

۹۰- طبرانی مجمع الزوائد کی روایت

۹۱- بخاری کی روایت

۱۸-۹۲ سورۂ احزاب ۳۳:۶

۱۹-۹۳ سورۂ نساء ۴:۱

۹۴- سورۂ بقرہ ۲:۲۲۸

۹۵- بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد و نسائی کی روایات

۹۶- قرآن، سورۂ روم ۳۰:۲۱

۹۷- سورۂ طلاق ۶۵:۷

۹۸- سورۂ اسراء ۱۷:۲۴

۹۹- بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کی روایات

۱۰۰- ابوداؤد کی روایت

۱۰۱- بخاری و مسلم کی روایت

۱۰۲- ابوداؤد و ترمذی کی روایت

۱۰۳- احمد و ابوداؤد کی روایت

۲۰-۱۰۴ سورۂ طلاق ۶۵:۶

۱۰۵- سورۂ نساء ۳۴:۴

۱۰۶- سورۂ طلاق ۶۵:۶

۱۰۷- سورۂ بقرہ ۲:۲۲۹

۱۰۸- سورۂ نساء ۴:۱۲

۱۰۹- سورۂ بقرہ ۲:۲۳۷

۱۱۰- سورۂ طلاق ۶۵:۶

۲۱-۱۱۱ سورۂ اسراء ۲۴-۱۷:۲۳

۱۱۲- ابن ماجہ کی روایت

۱۱۳- سورۂ آل عمران ۳:۱۸۷

۱۱۴- آپ ﷺ کا الوداعی خطبہ

۱۱۵- بخاری و مسلم کی روایت

۱۱۶- بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی کی روایات

۲۲-۱۱۷ مسلم کی روایت

۱۱۸- سورۂ حجرات ۴۹:۱۲

۱۱۹- ابوداؤد و ترمذی کی روایت

۲۳-۱۲۰ سورۂ ملک ۶۷:۱۵

۱۲۱- سورۂ انعام ۶:۱۱

۱۲۲- سورۂ نساء ۴:۹۷

۱۲۳- سورۂ بقرہ ۲:۲۱۷

۱۲۴- سورۂ حشر ۵۹:۹

☆☆☆

قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی عوام کے حقوق کا اعلامیہ

A/RES/47/135

۹۲ ویں عام میٹنگ/ ۱۸ر دسمبر ۱۹۹۲ء

جنرل اسمبلی:

☆ یہ توثیق کرتے ہوئے کہ اقوام متحدہ کے اہم مقاصد میں، جن کی اقوام متحدہ کے چارٹر میں تصریح کی گئی ہے، ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بلا امتیاز نسل، جنس، زبان یا مذہب کے سب کے لئے بنیادی آزادی کے فروغ اور حقوق انسانی کے تئیں احترام اجاگر کیا جائے۔

☆ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی عوام کے حقوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور عالمی حقوق انسانی وسائل کے مزید مؤثر انداز میں نفاذ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے۔

☆ عوامی حقوق کے اداروں کی جانب سے عدم امتیاز اور اقلیتی تحفظ پر توجہ میں اضافہ کو خوش آمدید کہتے ہوئے۔

☆ شہری اور سیاسی حقوق، وہ حقوق جو نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیت سے متعلق ہیں، پر عالمی معاہدہ کے دفعہ ۲۷ کے شرائط کو علم میں رکھتے ہوئے۔

☆ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اقوام متحدہ کا تحفظ اقلیت کے میدان میں بڑھتا ہوا اہم کردار ہے۔

☆ اور اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ یہ کام اس وقت تک اقوام متحدہ نظام کے تحت کئے گئے ہیں، خصوصاً انسانی حقوق کمیشن کے متعلقہ ڈھانچہ کے ذریعہ، خاص طور پر قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی حقوق کی حفاظت اور فروغ کے لئے، اور اقلیتی تحفظ کے بچاؤ پر ذیلی کمیشن کے ذریعہ۔

☆ اس میدان میں اہم حصولیابیوں کو جانتے ہوئے جو خطہ یا ذیلی خطہ اور دو طرفہ خاکے میں حاصل ہوئیں، اور جو اقوام متحدہ کے مستقبل کی سرگرمیوں کے لئے حوصلہ کے ذرائع مہیا کرتی ہیں۔

☆ کسی بھی طرح کے امتیاز کے بغیر، سب کے لئے مکمل طور پر انسانی حقوق اور بنیادی آزادی پر عمل کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، اور قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں جاری ڈرافٹ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے۔

☆ ۱۷/دسمبر ۱۹۹۱ء کے 46/115ویں قانون کا احیاء کرتے ہوئے، اور ۲۱/فروری ۱۹۹۲ء کے 1992/16ویں انسانی حقوق قانون کمیشن، جس کی وجہ سے کمیشن نے ڈرافٹ کی عبارت کی اجازت دی، جو ڈرافٹ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی حقوق کے متعلق تھا، کا احیاء کرتے ہوئے، اور مزید ۲۰/جولائی ۱۹۹۲ء کے 1992/4 کے اقتصادی اور سماجی کونسل ریزیولوشن کا احیاء کرتے ہوئے جس میں کونسل نے جنرل اسمبلی سے اس کے قبول کرنے اور مزید عمل کی سفارش کی تھی۔

☆ سکریٹری کے نوٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے:

۱- یہ جنرل اسمبلی قومی، نسلی، مذہبی، اور لسانی اقلیتی حقوق کا اعلان کرتی ہے، عوامی حقوق اعلان کی عبارت موجودہ قرارداد سے منسلک ہے۔

۲- یہ جنرل اسمبلی سکریٹری جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ممکنہ طور پر اس اعلان کو

زیادہ سے زیادہ تقسیم کریں اور اعلان کی عبارت (Human Rights: A compilation of international instruments) کو اگلے اشاعت میں شامل کریں۔

۳- یہ جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے ایجنسیوں، اداروں اور حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کو مدعو کرتی ہے تاکہ وہ اپنی کوششوں کو تیز سے تیز تر کرسکیں اور تاکہ اس اعلان کے سلسلہ میں معلومات کو پھیلا دیا جائے اور اس کے سمجھنے کو فروغ دیا جاسکے۔

۴- یہ جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے متعلقہ عناصر اور اداروں بشمول میثاقی اداروں، انسانی حقوق کمیشن کے نمائندوں اور اقلیتی تحفظ اور بھید بھاؤ کے بچاؤ پر ذیلی کمیشن کے نمائندوں کو مدعو کرتی ہے تاکہ اس اعلان پر اپنے اختیارات کے تحت مناسب توجہ مبذول کرسکیں۔

۵- یہ جنرل اسمبلی، سکریٹری جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس اعلان کے مؤثر فروغ اور اس کے مطابق منصوبہ طے کرنے کی خاطر مناسب راستے کے بارے میں غور کریں۔

۶- یہ جنرل اسمبلی، سکریٹری جنرل سے اس بات کی بھی درخواست کرتی ہے کہ وہ "Human Rights Questions" کے زیر عنوان موجودہ قرارداد کے نفاذ پر اقوام متحدہ کے 48 ویں نشست میں جنرل اسمبلی میں رپورٹ پیش کریں۔

☆☆☆

منسلکہ:

قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی عوام کے حقوق کا اعلان

یہ جنرل اسمبلی

☆ یہ تصدیق کرتے ہوئے کہ اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد میں، جن کی اقوام متحدہ کے چارٹر میں تصریح کی گئی ہے، ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بلا امتیاز نسل، جنس، زبان یا مذہب سب کے لئے بنیادی آزادی کے فروغ اور حقوق انسانی کے تئیں احترام اجاگر کیا جائے۔

☆ بنیادی انسانی حقوق میں یقین رکھتے ہوئے چاہے وہ حقوق وقار اور انسانی قدر و قیمت سے متعلق ہوں یا مرد و عورت کے برابری حقوق یا بڑی چھوٹی قوموں کے برابری حقوق سے متعلق ہوں۔

☆ درج ذیل چیزوں کی مبادیات جو چارٹر میں مصرح ہیں، کے سمجھنے کو فروغ دینے کی خواہش رکھتے ہوئے، وہ چیزیں یہ ہیں: انسانی حقوق کا عالمی اعلان، کنونشن برائے نسل کشی جرم کو روکنے اور اس پر سزا، ہر طرح کے نسلی امتیاز کو ختم کرنے پر بین الاقوامی کنونشن، شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ، ہر قسم کی عدم تحمل و بردباری اور مذہب وعقیدہ کی بنیادوں

پر بھید بھاؤ اور امتیاز کے خاتمہ کا اعلان، بچہ حقوق پر کنونشن، اور اس طرح کی دیگر چیزیں جو بین الاقوامی ان وسائل سے متعلق ہیں جنہیں عالمی یا علاقائی سطح پر اختیار کر لی گئی ہیں، اور وہ چیزیں جو اقوام متحدہ کے انفرادی اسٹیٹ ممبران کے درمیان شامل ہیں۔

☆ شہری اور سیاسی حقوق، وہ حقوق جو نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیت سے متعلق ہیں، پر عالمی معاہدہ کے دفعہ ۲۷ کے شرائط سے حوصلہ پا کر۔

☆ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور فروغ کی وجہ سے اسٹیٹ، جس میں وہ رہ رہے ہیں، کے سماجی و سیاسی استحکام میں مدد ملتی ہے۔

☆ اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق سمجھنے اور پیہم فروغ، مجموعی طور پر اور قانون کے اصولوں کی بنیادوں پر، جمہوری خاکے کے اندر، سماج کی ترقی کے جزء لاینفک کے طور پر، عوام اور اسٹیٹ کے مابین باہم تعاون اور دوستی کے رشتے کو مضبوط کرے گا۔

☆ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اقوام متحدہ کا تحفظ اقلیت کے میدان میں بڑھتا ہوا اہم کردار ہے۔

☆ اور اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو کام اس وقت تک اقوام متحدہ نظام کے تحت کیے گئے ہیں، خصوصاً انسانی حقوق کمیشن کے ذریعہ، قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی حفاظت اور فروغ اور امتیاز و بھید بھاؤ کے بچاؤ کے ذیلی کمیشن کے اداروں کے ذریعہ اور انسانی حقوق اور دیگر متعلقہ بین الاقوامی حقوق و وسائل پر بین الاقوامی معاہدے کو ماننے والے اداروں کے ذریعہ، جو قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی

حفاظت اور فروغ کرتی ہیں۔

☆ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور فروغ کی حکومتی اور غیر حکومتی تنظیموں کے ذریعہ اہم کاموں کو وزن دیتے ہوئے۔

☆ قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی عوام کے حقوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے عالمی حقوق انسانی وسائل کے مزید مؤثر انداز میں نفاذ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے۔

یہ جنرل اسمبلی قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتی عوام کے حقوق کا اعلان کرتی ہے:

دفعہ (۱)

۱-تمام اسٹیٹ اقلیتوں کے وجود اور ان کی قومی، نسلی، ثقافتی، مذہبی اور لسانی شناخت کی اپنے متعلقہ حلقوں میں حفاظت کریں گی اور اس شناخت کی حفاظت کے لئے صورت حال کی حوصلہ افزائی کریں گی۔

۲-اسٹیٹ مناسب قانونی اور دیگر اقدامات کریں گی تا کہ نتائج کی حصولیابی ہو سکے۔

دفعہ (۲)

۱-قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں (آگے صرف ''اقلیتوں سے تعبیر کیا جائے گا'') کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاص اور عام مقامات میں آزادانہ بغیر کسی دخل اندازی اور کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر اپنی تہذیب و کلچر کو اپنائیں، اپنے مذہب کا اعتراف کریں اور اس کو اپنائیں۔

۲-ان اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ثقافتی، مذہبی، سماجی، اقتصادی اور عام زندگی میں موثر انداز میں اپنی شراکت درج کرائیں۔

۳-ان اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قومی اور جہاں مناسب ہو علاقائی سطح پر ان

اقلیتوں سے متعلق جن سے وہ متعلق ہوں یا جن علاقوں میں وہ رہتے ہوں، اس طور پر مؤثر انداز میں فیصلوں میں شریک ہوں کہ قومی قانون سے متصادم نہ ہو۔

۴- ان اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تنظیمیں اور ادارے قائم کریں اور چلائیں۔

۵- ان اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر کسی امتیاز کے اپنے گروپ کے دوسرے افراد کے ساتھ یا دوسرے گروپ کی اقلیتوں کے ساتھ آزاد اور پُر امن تعلقات بنائیں اور بحال رکھیں۔ ان کو اس بات کا بھی حق ہے کہ وہ خارج ملک کے شہریوں، جن کے ساتھ ان اقلیتوں کے قومی، نسلی، مذہبی یا لسانی تعلقات ہیں، کے ساتھ تعلقات بنائیں اور استوار رکھیں۔

دفعہ (۳)

۱- ان اقلیتوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ یہ اپنے حقوق کو بشمول ان حقوق کے جو موجودہ اعلان میں ہیں، انفرادی یا اپنے گروپ سے دیگر افراد کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے، اپنا سکیں۔

۲- موجودہ اعلان میں شامل حقوق کو اپنانے یا نہ اپنانے کے نتیجہ کے طور پر کسی بھی اقلیتی شخص کو نقصان نہیں ہوگا۔

دفعہ (۴)

۱- اسٹیٹ ضرورت کے وقت اقدامات کریں گی تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ اقلیت مکمل طور پر اور مؤثر انداز میں اپنے تمام انسانی حقوق اور قانون کی نظر میں مکمل مساوات کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے بنیادی آزادی کو اختیار کر سکیں۔

۲- اسٹیٹ اقدامات کریں گی اور معاون صورت حال پیدا کریں گی تا کہ اقلیتیں اپنی خصوصیات کا اظہار کر سکیں، اپنی تہذیب، زبان، مذہب، رسوم ورواج کو ترقی دے سکیں، سوائے اس جگہ کے جہاں کچھ خاص اعمال کی برآوری سے قومی قانون کی خلاف ورزی لازم آتی ہو یا بین الاقوامی معیار کے مخالف ہوں۔

۳- اسٹیٹ مناسب اقدامات کریں گی تا کہ جہاں ممکن ہو، اقلیتیں کافی مواقع پا سکیں تا کہ وہ اپنی مادری زبان سیکھ سکیں یا اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

۴- اسٹیٹ، جہاں مناسب ہو، تعلیم کے میدان میں اقدامات کریں گی تا کہ تاریخ، روایات، زبان اور اپنے حلقوں میں رہ رہے اقلیتوں کی تہذیب کا علم ہو سکے، اقلیتوں کو کافی مواقع حاصل ہونا چاہئے تا کہ وہ مجموعی طور پر سماج کا علم حاصل کر سکیں۔

۵- اسٹیٹ کو مناسب اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اقلیتیں اقتصادی فروغ اور اپنے ملک کی ترقی میں مکمل طور پر شریک ہو سکیں۔

دفعہ (۵)

۱- اقلیتوں کے قانونی فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی پالیسیاں اور پروگرام طے کئے جائیں گے اور نافذ کئے جائیں گے۔

۲- اقلیتوں کے جائز فوائد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسٹیٹ کے درمیان باہمی تعاون اور مدد کے پروگرام طے پائیں گے اور ان کا نفاذ ہوگا۔

دفعہ (۶)

اقلیتوں کے مسائل میں اسٹیٹ باہم تعاون کریں گی، مزید یہ اسٹیٹ باہمی تفاہم اور

اعتماد کو بڑھاوا دینے کے لئے معلومات اور تجربات کے باہمی تبادلے میں مدد کریں گی۔

دفعہ (۷)

موجودہ اعلان میں درج حقوق کے تئیں احترام کو فروغ دینے کے لئے اسٹیٹ تعاون کریں گی۔

دفعہ (۸)

۱- اس موجودہ اعلان میں اس طرح کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اقلیتوں سے متعلق اسٹیٹ کے بین الاقوامی فرائض کی ادائیگی کی راہ میں حائل ہو، بلکہ یہ اسٹیٹ صحیح یقین کے ساتھ ان فرائض اور وعدوں کو پوری کریں گی جن کو ان اسٹیٹ نے ان بین الاقوامی معاہدوں کے تحت طے کیا ہے جن کے یہ شریک کار ہیں۔

۲- موجودہ اعلان میں درج حقوق ایسے نہیں ہیں جو عالمی طور پر متعارف انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کو اپنانے سے لوگوں کو روک دے یا حارج ہو۔

۳- موجودہ اعلان میں درج حقوق کو اچھے طور پر اپنانے کو یقینی بنانے کے لئے اسٹیٹ کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات بالکل ایسے نہیں ہیں جو عالمی انسانی حقوق اعلان میں شامل مساوات کی بنیادوں کے معارض ہوں۔

۴- موجودہ اعلان میں اس طرح کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کوئی ایسا دوسرا مطلب نکلتا ہو جو اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد بشمول اقتدار، مساوات، علاقائی انضمام اور اسٹیٹ کی سیاسی آزادی، کے خلاف کسی عمل کی اجازت دیتا ہو۔

دفعہ (۹)

موجودہ اعلان میں درج تمام بنیادوں اور حقوق (اپنی قابلیت وصلاحیت سے متعلق میدان میں) کا مکمل طور پر ادراک کرنے کے لئے اقوام متحدہ نظام کی تمام تنظیمیں اور مخصوص ایجنسیاں شریک رہیں گی۔

اسلام اور دیگر مذاہب کی توہین کو روکنے کے لئے انسانی حقوق کونسل نے آزادی اظہار کی حدود متعین کیں

کونسل برائے انسانی حقوق

۲۰۰۵ء کے عالمی سربراہ اجتماع کے نتائج کے پیش نظر جو جنرل اسمبلی نے اپنے ریزولوشن ۱/۶ مورخہ ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۵ء میں منظور کیے جس میں اسمبلی کے ممبران پر زور دیا گیا کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی مندرجات کے مطابق انسانی حقوق اور سب کے لئے اظہار رائے کی آزادی کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔ اس میں کسی قسم کے نسلی، مذہبی، رنگ، بنیادی جنس، زبان، پیدائش، دولت، مرتبہ، سیاسی یا دیگر خیالات یا معاشرتی زمرہ سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا جانا چاہئے اور عالمی سطح پر تمام مذاہب اور ثقافتی تنوع کو تسلیم کر کے ان کا احترام کیا جانا چاہئے۔

عالمی کانفرنس میں نسل، نسلی امتیاز، دوسروں سے بیزاری اور اسی سے متعلق عدم رواداری کے خلاف ڈربن ڈکلیریشن ستمبر ۲۰۰۱ء اے/سی او این ۱۲/۱۸۹ اور سی او این ا باب II کو مدنظر رکھتے ہوئے جنرل اسمبلی نے اپنے ریزولوشن ۵۳/۳۶ مورخہ ۲۵/نومبر ۱۹۸۱ء کے ڈکلیریشن جس کے تحت ہر قسم کے امتیاز اور عدم رواداری کو جو مذہب یا عقیدہ کی بنیاد پر ہوں ختم کرنے کا اعادہ کیا۔

تمام مذاہب نے جدید تہذیب کے ارتقاء میں جو کردار ادا کیا ہے اور تہذیبوں کے

درمیان باہمی مذاکرات کے ذریعہ ان اقدار کے فروغ اور بہتر تفہیم میں مدد ملے گی جو تمام بنی نوع انسانی میں مشترک ہیں، مئی ۲۰۰۷ء میں اسلامی کانفرنس کے وزراء خارجہ کی ۳۴ویں کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں اسلاموفوبیا کے بڑھتے ہوئے رجحان اور پیروان اسلام کے خلاف باضابطہ طور پر امتیاز کی مہم کی مذمت کی گئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ مذہب کو بدنام کرنے کے خلاف مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

اسی کے ساتھ مارچ ۲۰۰۸ء میں دارفر میں رابطہ عالم اسلامی کی گیارھویں سربراہ کانفرنس کے آخری اعلامیہ کو یاد کیا گیا جس میں مسلمانوں نیز اسلام اور دیگر سماوی مذاہب کانفرنس کو بدنام کرنے کی عمومی ذہنیت پر اظہار تشویش کیا گیا۔ اس قسم کی ذہنیت اور رویہ انسانی وقار اور حقوق انسانی کے عالمی اقرار ناموں کی توہین کے مترادف ہے۔

اسی کے ساتھ رابطہ عالم اسلامی کے مشترکہ اجلاس یورپی یونین اور سکریٹری جنرل کے ۷رفروری ۲۰۰۶ء کے مشترکہ اعلامیہ کا حوالہ دیا گیا، جس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ تمام معاشروں میں ان تمام حساس مسائل کی اہمیت کو مدنظر رکھا جائے جو کسی خاص مذہب یا ان کے ماننے والوں کے احساسات سے متعلق ہوں جو کسی دیگر عقیدے کے حامل ہیں، ان کے بارے میں بے حد محتاط رہنا چاہیے۔

۱۵رمارچ ۲۰۰۴ء کو جنرل اسمبلی کے صدر کے اس بیان کی تائید کی گئی جس میں انہوں نے کہا کہ بدگمانی اور کشیدگی کے موجودہ ماحول میں یہ ضروری ہے کہ تہذیبوں، مذاہب اور ثقافت کے درمیان مذاکرات کے ذریعہ باہمی مفاہمت پیدا کی جائے تاکہ اشتعال اور دیگر افسوسناک واقعات کو روکنے کے لئے مشترک اقدامات کئے جاسکیں اور رواداری کے جذبہ کو فروغ دینے اور دیگر مذاہب اور عقائد کے احترام کے احساس کو بیدار کرنے میں آسانی ہو۔

ایسے تمام اقدامات کی ستائش کی گئی جن کا عالمی یا علاقائی طور پر آغاز کیا گیا، جن سے

ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ حاصل ہو، اس میں تہذیبوں کے درمیان مذاکرات اور مذاہب کے درمیان باہمی تعاون بھی شامل ہے تاکہ ہر سطح پر امن و مفاہمت کا ذہن پیدا ہو۔

اس کے ساتھ خصوصی رابطہ کاروں کی اس رپورٹ کا بھی خیر مقدم کیا گیا جنھوں نے نسلی امتیاز، غیروں سے بیزاری اور متعلقہ امور کی عصری شکلوں اور مسلمانوں نیز عربوں کے خلاف دنیا کے مختلف حصوں میں جو تعصب پایا جاتا ہے اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔

(ای/سی/این/ ۴/ ۲۰۰۶/ ۱۷)

ان خصوصی رابطہ کاروں کی اس رپورٹ کا بھی خیر مقدم کیا گیا جو کونسل کے چوتھے اور چھٹے سمیناروں میں پیش کی گئی (اے/ ایچ آر سی/ ۴/ ۱۹) اور اے/ ایچ آر سی/ ۶/ ۶) جس میں ممبران کی توجہ جملہ مذاہب کی توہین کے سنگین مسئلہ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس پر زور دیا گیا کہ مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان باہمی مذاکرات و مفاہمت سے اس صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی جانی چاہیے، اسی کے ساتھ باہمی مفاہمت اور ترقی و امن اور تحفظ کے بنیادی مسائل کا مشترکہ طور پر حل کرنے نیز انسانی حقوق اور قانونی حکمت عملی کی تکمیل کی بابت امور کو فروغ دیا جائے۔

خصوصی رابطہ کار نامہ نگاروں کی اس اپیل کی تائید کی گئی جو انہوں نے نسلی امتیاز، دوسروں سے بیزاری اور تعصب کی عصری صورتوں کے تناظر میں ممبر ممالک سے کی ہے، جس میں نسلی اور مذہبی امتیاز کو ابھارنے کی مہم کے خلاف ایک مؤثر قدم اٹھانے اور سیکولرزم اور مذہبی آزادی کے احترام کے درمیان ایک محتاط توازن قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے، اور شہری و سیاسی حقوق کے عالمی اقرار نامے میں جن جملہ آزادیوں کو تسلیم کیا گیا ہے انہیں کلی طور پر بروئے کار لانے اور احترام کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

۱-اس بات پر زور دیا گیا کہ تعلیم کے فروغ کے ذریعہ رواداری اور مذہبی آزادی کے جذبہ کو ابھارنے میں ریاستوں، غیر سرکاری تنظیموں، مذہبی جماعتوں اور ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا اہم کردار ہے۔

۲-اس بات کو تشویش کے ساتھ نوٹ کیا گیا کہ مذہبی دل آزاری، قومی اور بین الاقوامی سطح پر معاشرتی عدم رواداری اور عدم استحکام کا ایک اہم سبب ہے، اس سے انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔

۳-اس بات پر بھی شدید تشویش کا اظہار کیا گیا کہ حالیہ برسوں میں انسانی حقوق کے اداروں میں ایسے بیانات کا اضافہ ہوا ہے جن میں مذاہب بشمول اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حملے کئے گئے ہیں۔

۴-اس پر بھی بے حد تشویش ظاہر کی گئی ہے کہ جملہ مذاہب کے خلاف دل آزاری کی ایک یکساں انداز کی مہم اور مذہب نیز عقیدہ کی بابت عدم رواداری اور امتیاز کے ایک منفی رویہ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

۵-اس بات پر بھی شدید تشویش ظاہر کی گئی ہے کہ اسلام کو دہشت گردی، تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے جوڑا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ اس بات پر زور دیا گیا کہ کسی مذہب کو دہشت گردی سے وابستہ کرنے کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا جائے اور ہر سطح پر ہر طرف سے اس کی مخالفت کی جانی چاہیے۔

۶-اس پر بھی تشویش ظاہر کی گئی کہ مذہبی دل آزاری کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے اور ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے المناک واقعہ کے بعد مسلم اقلیتوں کو نفرت اور امتیاز کا شکار بنایا جا رہا ہے۔

۷-مذاہب، پیروان مذاہب اور مذہبی پیشواؤں کے خلاف شعوری طور پر جو دل آزاری کی یکساں نوعیت کی مہم میڈیا، سیاسی جماعتوں اور افراد کی طرف سے چلائی جا رہی ہے

اس اشتعال انگیزی اور سیاسی استحصال پر بھی شدید تشویش کا اظہار کیا گیا۔

۸-اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا کہ دہشت گردی کے خلاف لڑائی میں مذہب کو بدنام کئے جانے میں بھی اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے بنیادی انسانی حقوق پامال کئے گئے ہیں اور مظلوموں کے معاشی وسماجی حقوق اور آزادیوں کا استحصال کیا گیا ہے۔

۹-اس بات پر تشویش ظاہر کی گئی ہے کہ ایسے قانون بنائے گئے ہیں اور ایسے انتظامی اقدامات کئے گئے ہیں جن میں مسلم اقلیت کو دبانے اور ان پر نظر رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، اس سے ان اقلیتوں کو مورد الزام قرار دینے اور ان پر سخت قوانین کو نافذ کرنے کا جواز تلاش کیا جاتا ہے۔

۱۰-عبادت گاہوں، ثقافتی مراکز، کاروباری اور مذہبی اداروں پر حملوں کے خلاف شدید مذمت کا اظہار کیا گیا۔

۱۱-کونسل ممبر ممالک پر زور دیتی ہے کہ وہ سیاسی اداروں اور تنظیموں کی طرف سے نسلی اور دوسروں سے بیزاری کے خیالات اور مذاہب کی توہین اور پیروان مذاہب کی دل آزاری سے پُر مواد کو جس سے اشتعال پھیلتا ہے اور نسلی نیز مذہبی نفرت اور تفریق کے جذبات بھڑکتے ہیں، ایسی تمام سرگرمیوں کو روکیں۔

۱۲-کونسل تمام ممبران سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے قانونی حدود اور دستوری نظام کے تحت کسی بھی مذہب سے نفرت، امتیاز، دھمکی، یا جبر کے خلاف پورا تحفظ فراہم کریں اور تمام مذاہب اور ان کی اقدار کے احترام کو فروغ دینے کے اقدامات کریں، ایسی دانشورانہ اور قانونی حکمت عملی تیار کریں جس سے ان برائیوں کا تدارک کیا جاسکے۔

۱۳-کونسل اس بات پر زور دیتی ہے کہ مذاہب کے احترام اور توہین سے ان کے تحفظ کا معاملہ، وہ لازمی عنصر ہے جو خیالات خیر اور مذہبی آزادی کی حفاظت اور فروغ میں معاون

ہوسکتا ہے۔

۱۴- کونسل تمام ممبران پر زور دیتی ہے کہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ قانون بنانے والے ادارے، سرکاری ملازمین، فوجی ملازمین، شہری افسران، تعلیمی اداروں اور دیگر متعلقہ افراد اپنی سرکاری ذمہ داریوں کی بجا آوری کے دوران کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے، تعلیم و تربیت کے ذریعہ رواداری کے جذبات کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔

۱۵- کونسل اس پر بھی زور دیتی ہے کہ عالمی حقوق انسانی کے تحت ہر شخص کو آزادیٔ اظہار کا حق حاصل ہے؛ لیکن اس حق پر عمل کرنے میں کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، اس میں کچھ حدود بھی ہیں، یہ پابندیاں وہ ہیں جو از روئے قانون عائد ہوتی ہیں، جس میں دوسروں کے جذبات وحقوق کا احترام، قومی مفاد کا تحفظ، صحت عامہ اور اخلاق عامہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔

۱۶- کونسل اس بات پر زور دیتی ہے کہ نسلی امتیاز کو ختم کرنے سے متعلق کمیٹی کی کارروائی میں ۱۵ کے تحت جو رائے زنی کی گئی ہے کہ ایسے تمام خیالات کا تدارک جو نفرت اور نسلی امتیاز پر مبنی ہو، یہ ممانعت اظہار رائے کی آزادی سے مطابقت رکھتی ہے، اور اس ممانعت میں مذہبی نفرت واشتعال پھیلانا بھی شامل ہے۔

۱۷- یہ کونسل، اسلام یا کسی دیگر مذہب کے خلاف نفرت پھیلانے، تشدد پر ابھارنے، دیگر لوگوں سے بیزاری وغیرہ کو بڑھاوا دینے کے لئے نجی ذرائع ابلاغ (میڈیا)، انٹرنیٹ یا اسی قسم کے دیگر ذرائع کو استعمال کرنے کی مذمت کرتی ہے۔

۱۸- کونسل رابطہ کارنامہ نگاروں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ نسلی امتیاز، نسلی منافرت، غیروں سے بیزاری اور متعلقہ معاملات کی عصری صورتوں کی بابت اپنی رپورٹنگ کا کام جاری رکھیں، اس منفی ذہنیت میں مذاہب کی توہین اور خاص طور پر اسلاموفوبیا کے جو سنگین اثرات مرتب ہوتے

ہیں اس کو بھی مدنظر رکھا جائے نیز ان حقوق کو جن کا کونسل کے اپنے نویں اجلاس میں احاطہ کیا جائے گا۔

۱۶-کونسل، ہائی کمشنر برائے حقوق انسانی کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ موجودہ ریزولیوشن کے نفاذ کی بابت اپنی رپورٹ پیش کریں، نیز کونسل کے نویں اجلاس میں پیش کئے جانے کے لئے مذہبی منافرت کے خلاف موجودہ قوانین سے متعلق ایک مطالعاتی مسودہ بھی مرتب کریں۔

چالیسواں اجلاس ۲۷/مارچ ۲۰۰۸ء

☆☆☆

فریم ورک کنونشن برائے تحفظ قومی اقلیات

اسٹراس برگ-۱/۲/۱۹۹۵

تعارف:

فریم ورک کنونشن برائے تحفظ قومی اقلیات کو کونسل آف یوروپ کی ایڈہاک کمیٹی برائے تحفظ قومی اقلیات (سی اے ایچ ایم آئی این) نے تیار کیا اور وزراء کمیٹی کے اختیارات کے تحت وزراء کی کمیٹی کونسل آف یوروپ نے ۱۰/نومبر ۱۹۹۴ء کو منظور کیا اور یکم فروری ۱۹۹۵ء کو اسے کونسل آف یوروپ کے ممبر ممالک کے روبرو دستخط کے لئے پیش کیا گیا۔ وزراء کی کمیٹی غیر ممبر ممالک کو بھی اس دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے مدعو کرسکتی ہے۔

اس مطبوعہ میں فریم ورک کنونشن برائے تحفظ قومی اقلیات کا متن اور وضاحتی رپورٹ شامل ہے۔

فریم ورک کنونشن برائے تحفظ قومی اقلیات:

کونسل آف یوروپ کی ممبر ریاستیں اور دیگر ریاستیں (ممالک) جنہوں نے اس دستاویز پر دستخط کئے ہیں۔

اس کے مدنظر کہ کونسل آف یوروپ کا مقصد اپنے ممبر ممالک کے درمیان وسیع پیمانہ پر اتحاد قائم کرنا ہے تاکہ کونسل کے اساسی مقاصد کو حاصل کیا جاسکے اور ان کی حفاظت کی جاسکے اس سلسلے میں ایک اہم قدم حقوق انسانی کی برتری تسلیم کرانا اور بنیادی آزادی کے تحفظ کے لئے

کوشش کرنا ہے۔

لہٰذا کونسل آف یوروپ کے ممبر ممالک کی حکومتوں کے سر براہان اور صدور نے اس دستاویز کو ۹/ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں یانا میں منظور کیا۔

اس کے ذریعہ طے کیا کہ وہ اپنے ممالک کی حدود میں قومی اقلیات کے وجود کا تحفظ کریں گے، یوروپ کی تاریخ میں جو شورشیں بر پا ہوئیں ان کے پیش نظر یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان ممالک میں امن اور جمہوری معاشرہ کے تحفظ اور بقا کے لئے قومی اقلیتوں کا تحفظ لازمی ہے۔

اس بات کے مدنظر کہ ایک کثیر القومی اور سچے جمہوری معاشرہ میں ہر شخص جو قومی اقلیت سے تعلق رکھتا ہو اس کی نسلی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی شناخت کی تکریم ہونی چاہئے بلکہ ایسے ماحول کو بھی فروغ دینا چاہئے جس میں وہ اپنی شناخت کا تحفظ کریں اور انہیں اس کے اظہار اور فروغ کے بھرپور مواقع مہیا کئے جائیں۔

اس کے مدنظر کہ ایسا ماحول وضع کیا جائے جس میں برداشت، تحمل اور باہمی مکالمہ کی لازمی گنجائش ہو، اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ثقافتی تنوع، انتشار واختلاف کی بنیاد نہ بنے بلکہ تمام معاشرتی اقدار کو فروغ حاصل ہو۔

اس بات کے مدنظر کہ ایک متحمل اور خوشحال یوروپ کا وجود ریاستوں کے باہمی تعاون پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ مقامی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان تعاون بھی ضروری ہے، یہ تعاون ان ممالک کے دستور اور زمینی حدود کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر ہونا چاہئے۔

انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ اور اقدامات کے کنونشن کا لحاظ رکھتے ہوئے اور قومی اقلیتوں کے تحفظ کی بابت اقوام متحدہ کے کنونشن اور اعلامیہ اور یوروپ میں تعاون وسیکورٹی سے متعلق ہونے والی کانفرنس کی دستاویزات (خصوصا جوکوپن ہیگن اعلامیہ ۲۹/ جون ۱۹۹۰ میں درج ہیں) کا لحاظ رکھتے ہوئے ان اصولوں کی تشریح وتعبیر کی بابت فیصلہ کر کے جن کا احترام

کیا جانا چاہئے، نیز ان ذمہ داریوں کا احساس جو ان اصولوں سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اور ان ممبر ممالک اور دیگر ممالک جو اس سے منسلک ہونا چاہیں قومی اقلیتوں کے تحفظ اور ان اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق اور بنیادی آزادی کے حق کو موثر تحفظ فراہم کرنے کے لئے جو قانونی دائرے کے تحت مطلوب ہوں اور ان ممالک کی زمینی حدود اور آزادی و بالادستی کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فریم ورک کنونشن میں مندرجہ اصولوں کا نفاذ قانون سازی اور معقول سرکاری پالیسیوں کے ذریعہ کیا جائے گا۔

اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل دفعات پر رضامندی ظاہر کی جاتی ہے:

دفعہ ۱:

دفعہ ۱، آرٹیکل ۱: قومی اقلیتوں کے تحفظ اور ان اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق اور بنیادی آزادی کا تحفظ، بین الاقوامی تحفظ حقوق انسانی کے دائرہ میں آتا ہے اور اسی لحاظ سے یہ بین الاقوامی تعاون کے زمرہ میں بھی شامل ہے۔

آرٹیکل ۲: اس فریم ورک کنونشن کی دفعات کا اطلاق نیک نیتی سے کیا جائے گا، تحمل اور افہام و تفہیم کے جذبہ اور ریاستوں کے درمیان بہتر ہمسائیگی، دوستانہ تعلقات اور تعاون پر مبنی ہوگا۔

آرٹیکل ۳ (۱) قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ اسے اس زمرہ میں شمار کیا جائے یا نہیں، دونوں صورتوں میں اسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا، نہ ان حقوق پر اثر پڑے گا جو اس اختیار سے متعلق ہوں۔

(۲) قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد ان حقوق کا استعمال اور اس آزادی سے انفرادی یا اجتماعی طور پر دیگر افراد کے ساتھ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو اس فریم ورک کنونشن میں درج ہیں۔

دفعہ ۲:

آرٹیکل ۴: فریقین اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو قانون کے تحت مساوی حق حاصل ہوں گے اور قانون کے تحت یکساں تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ قومی اقلیات سے تعلق رکھنے کے سبب ان سے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

۲-فریقین اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ جہاں کہیں ضروری ہو گا وہ پورے ملک میں اقلیت اور اکثریت کے درمیان معاشی، سماجی، سیاسی و ثقافتی زندگی میں بہتر تعلقات کو فروغ دینے کے لئے مناسب اقدامات کریں گے، اس سلسلے میں وہ قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے لئے سازگار حالات فراہم کریں گے۔

۳-زمرہ ۲ کے تحت جو اقدامات کئے جائیں گے انہیں امتیازی اقدامات نہیں سمجھا جائے گا۔

آرٹیکل ۵: فریقین اس بات کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں کہ وہ ایسے ماحول کو فروغ دیں گے جس میں اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنی ثقافت کے تحفظ اور فروغ کا موقع ملے اور وہ اپنی شناخت کے لازمی عناصر یعنی مذہب، زبان، روایات اور ثقافتی وراثت کا تحفظ کر سکیں۔

۲-اپنی عمومی یکجہتی کی پالیسی کو ضرر پہنچائے بغیر فریقین اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ ایسی پالیسی یا عمل سے اجتناب کریں گے جو قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو ان کی مرضی کے خلاف قومی دھارے میں ضم کرنے کے لئے کئے جائیں اور وہ اقلیت سے تعلق رکھنے والے ان افراد کو اس قسم کے کسی اقدام سے محفوظ رکھیں گے۔

آرٹیکل ۶ (۱) فریقین اور تہذیبوں کے درمیان تحمل کے جذبہ کو فروغ دینے کی حوصلہ افزائی کریں گے اور باہمی احترام، افہام و تفہیم اور تعاون کو اپنی مملکت کے حدود میں رہنے والے تمام افراد کے درمیان فروغ دیں گے۔ اس میں افراد کی نسل، مذہب، زبان و ثقافت کی بنیاد پر

کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا، خصوصاً وہ افراد جن کا تعلق قومی اقلیتوں سے ہے۔

آرٹیکل ۷: فریقین اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو پرامن اجتماع کی آزادی، جماعت (ایسوسی ایشن) بنانے کی آزادی، اظہار فکر و خیال کی آزادی اور ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہو۔

آرٹیکل ۸: فریقین اس کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ وہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے مذہب و عقیدہ کو ظاہر کرنے، مذہبی تنظیمیں قائم کرنے اور ایسوسی ایشن بنانے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔

آرٹیکل ۹ (ا) فریقین اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ وہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی میں اپنی رائے قائم کرنے اور اپنی اقلیتی زبان میں علم و معلومات فراہم کرنے اور اس کی ترسیل و ابلاغ کا حق بھی شامل ہے، سرحدی عہدیداران اس میں کسی قسم کی مداخلت کے مجاز نہیں ہوں گے اور اس میں سرحدیں بھی مانع نہیں ہوں گی، فریقین اپنے قانونی نظام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو ذرائع ابلاغ (میڈیا) تک رسائی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

۲- پیراگراف (ا) کے مندرجات فریقین کے لئے اس میں مانع نہیں ہوں گی کہ وہ سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ کی جانے والی نشریات کے لئے بلا امتیاز اور با مقصد معیار کے تحت لائسنس حاصل کرسکیں۔

۳- فریقین قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو مطبوعاتی ذرائع ابلاغ (پرنٹ میڈیا) قائم کرنے اور ان کا استعمال کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے، ٹی وی، ریڈیو کے ذریعہ براڈ کاسٹ پر قانونی حدود کے دائرہ میں جہاں تک ممکن ہوگا اور درج بالا

پیراگراف (۱) کے مندرجات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنا میڈیا قائم کرنے کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۴-اپنے قانونی نظام کے حدود کار کے تحت قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کی میڈیا تک رسائی کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں تاکہ برداشت وتحمل کے جذبہ اور کثرت (متعدد فرقوں) کے تصور کو فروغ حاصل ہو۔

آرٹیکل ۱۰۔ فریقین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو اس بات کا حق اور آزادی حاصل ہے کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اقلیتی زبان کا نجی یا عوامی انداز میں زبانی یا تحریری طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

۲-ایسے علاقوں میں جہاں قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کی آبادی ہے یا خاصی آبادی ہے تو ایسے علاقوں کے لوگ اگر درخواست کریں اور جہاں ایسی درخواست کو واقعی ضروری سمجھا جائے تو فریقین حتی الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے اقلیتی زبان کو عوام اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بنایا جائے۔

۳-فریقین اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ اگر قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو گرفتار کیا جائے یا اس کے خلاف کوئی الزام ہو تو اسے اس کے اسباب کی اطلاع اس زبان میں فراہم کی جائے گی جس سے وہ مرد یا عورت واقف ہو، اور اسے اسی زبان میں اپنے دفاع کا حق ہوگا، ضرورت پڑنے پر اسے مترجم بھی فراہم کیا جائے گا۔

۴-آرٹیکل ۱۱ (۱) فریقین اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ وہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں اپنی عرفیت، اصل نام، اپنی اقلیتی زبان میں استعمال کرنے اور اسے قانونی ضوابط کے مطابق سرکاری طور پر تسلیم کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۲-فریقین اس بات کا ذمہ بھی لیتے ہیں اور اقلیتی افراد کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں اپنی اقلیتی زبان میں اپنے نشانات، علامات وغیرہ اور نجی نوعیت کی دیگر اطلاعات کو عوامی طور پر نمایاں کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۳-ایسے علاقے جہاں روایتی طور پر قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کی آبادی ہے، وہاں فریقین پوری کوشش کریں گے کہ قانونی ضابطہ کی حدود میں اور جہاں کہیں ممکن ہو دیگر ریاستوں کی رضامندی سے اور ان کے خصوصی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان افراد کو اپنے علاقائی و مقامی نام، سڑکوں کے نام اور دیگر علامتی ناموں ٹوپوگرافی (Topography) جن کے استعمال کے لئے عوامی مطالبہ ہو عمومی طور پر اسے ظاہر و نمایاں کر سکتے ہیں۔

آرٹیکل ۱۲ (۱) اگر مناسب ہو تو فریقین تعلیم اور تحقیق کے میدان میں اقلیتوں اور اکثریت کے کلچر، تاریخ، زبان اور مذہب کے بارے میں علم کو فروغ دینے کے اقدامات کر سکتے ہیں۔

۲-اس سلسلے میں دیگر باتوں کے علاوہ اساتذہ کی تربیت، درسی کتب تک رسائی اور مختلف فرقوں کے طلبہ کے درمیان روابط کو فروغ دینے کے اقدامات بھی کئے جائیں گے۔

۳-فریقین اس بات کا ذمہ بھی لیتے ہیں کہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر سطح پر تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

آرٹیکل ۱۳ (۱) اپنے تعلیمی نظام کے حدود کے اندر فریقین قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے اس حق کو تسلیم کریں گے کہ انہیں اپنے پرائیویٹ تعلیمی ادارے قائم کرنے، ان کا نظم و انصرام کرنے اور تربیتی ادارے قائم کرنے کا استحقاق حاصل ہے۔

۲-اس حق کے استعمال کے نتیجے میں فریقین پر کوئی مالی پابندی عاید نہیں کی جائے گی۔

آرٹیکل ۱۴: فریقین اس امر کی ضمانت دیتے ہیں کہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے

افراد کو اپنی اقلیتی زبان سیکھنے کا حق حاصل ہے۔

۲- ایسے علاقے جہاں روایتی طور پر اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد آباد ہیں یا وہاں کی قابل ذکر آبادی ہے فریقین حتی الامکان اپنے تعلیمی نظام کے حدود میں رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کریں گے کہ اگر اس علاقے کے لوگوں کی کثیر تعداد کی طرف سے مطالبہ ہو تو اقلیت کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم و تدریس کی سہولیات فراہم کی جائیں گی۔

۳- پیراگراف ۲ کے تحت مندرجات سے اقلیتی افراد کے سرکاری زبان سیکھنے یا اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق متاثر نہیں ہوگا۔

آرٹیکل ۱۵: فریقین ایسے حالات کو فروغ دیں گے جن میں قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو ملک کے معاشی سماجی و ثقافتی معاملات میں خصوصا جن سے ان کا واضح تعلق ہے حصہ لینے میں آسانی ہو۔

آرٹیکل ۱۶: فریقین ایسے اقدامات سے گریز کریں گے جس سے ان علاقوں میں جہاں اقلیتی افراد کی آبادی ہے وہاں آبادی کا تناسب متاثر ہو یا جن سے ان حقوق اور اصولوں کے تحت جن کا اس فریم ورک کنونشن میں تذکرہ ہے حاصل آزادی کو محدود کیا جائے۔

آرٹیکل ۱۷: فریقین اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ وہ قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے اس حق میں مداخلت نہیں کریں گے کہ انہیں سرحد پار ایسے افراد سے قریبی رابطہ رکھنے کا حق ہے جو اس ملک کے جائز باشندے ہیں اور ان سب سے ان کا مذہبی لسانی ثقافتی طور پر قریبی تعلق ہے۔

۲- فریقین اس بات کا بھی عہد کرتے ہیں کہ وہ اقلیتی افراد کے اس حق میں مداخلت نہیں کریں گے کہ وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔

آرٹیکل ۱۸ (۱) فریقین جہاں تک ممکن ہوگا دیگر ممالک خصوصا پڑوسی ممالک سے

باہمی اور کثیر القومی معاہدے کریں گے تاکہ متعلقہ ممالک میں قومی اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔

۲- جہاں ضروری ہوگا فریقین بیرون سرحد تعاون کے لئے بھی اقدامات کریں گے۔

آرٹیکل ۱۹: فریقین اس فریم ورک کنونشن میں مندرجہ اصولوں کے احترام اور نفاذ کے لئے پوری کوشش کریں گے تاہم اس میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ بین الاقوامی معاہدوں سے متصادم اگر کوئی دفعہ ہو تو اس کے بارے میں احتیاط کی جائے خصوصاً جو حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تحفظ سے متعلق کنونشن کے بارے میں ہیں اور جو ان اصولوں سے فروغ پانے والے حقوق اور آزادیوں سے مناسبت رکھتے ہوں۔

دفعہ ۳:

آرٹیکل ۲۰: اس فریم ورک کنونشن میں مندرجہ اصولوں کے تحت فروغ پانے والے حقوق اور آزادی سے بہرہ ور ہوتے ہوئے قومی اقلیتی افراد قومی دستوری قوانین کا احترام کریں گے اور اکثریت سے تعلق رکھنے والے افراد اور دیگر قومی اقلیات کے افراد کے حقوق کا بھی احترام کریں گے۔

آرٹیکل ۲۱: موجودہ فریم ورک کنونشن کے مندرجات کی کسی طرح اس انداز سے توضیح و تشریح نہیں کی جائے گی نہ کسی ایسی کاروائی پر عمل کیا جائے گا جو بین الاقوامی قوانین کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو یا جس سے ان ممالک کی آزادی، اتحاد اور خودمختاری متاثر ہوتی ہو۔

آرٹیکل ۲۲: اس فریم ورک کنونشن کے مندرجات سے کسی طور پر یہ مراد نہیں لیا جائے گا جن سے انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کو محدود کیا جائے یا محدود سمجھا جائے جن کی کسی معاہدہ کے تحت ضمانت دی گئی ہو یا کوئی ایسا معاہدہ جس کا وہ ملک ایک فریق ہو۔

آرٹیکل ۲۳: موجودہ فریم ورک کنونشن کے تحت بارآور ہونے والے حقوق اور آزادی

جواس کنونشن کے مقابل ضوابط جو حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تحفظ کے بارے میں ہیں یا اس کے تحت ضابطہ سے تعلق رکھتے ہیں انہیں موخر الذکر ضوابط کے موافق تصور کیا جائے گا۔

دفعہ ۴:

آرٹیکل ۲۴: کونسل آف یوروپ کے وزراء کی کمیٹی ممبر ممالک میں فریم ورک کنونشن کی سفارشات کے نفاذ کے عمل کی نگرانی کرے گی۔

۲- جو ممبر ممالک کونسل کے ممبر نہیں ہیں وہ اس طریق کار کے مطابق جو طے کیا جائے گا اس کے نفاذ کے عمل میں شریک ہو سکتے ہیں۔

آرٹیکل ۲۵: اس فریم ورک کنونشن کی سفارشات کے نفاذ کے ایک سال کے اندر ممبر ممالک کونسل آف یوروپ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو ان اقدامات کی بابت رپورٹ پیش کریں گے جو اس سلسلے میں قانون سازی اور دیگر متعلقہ امور کی بابت اٹھائے گئے ہیں۔

۲- اس کے بعد ممبر ممالک ایک معینہ مدت کے دوران کونسل یا وزراء کی کمیٹی کو مطلوبہ معلومات باضابطہ طور پر فراہم کرتے رہیں گے۔

۳- اس آرٹیکل کے مندرجات کے تحت سیکورٹی کونسل کو جو اطلاعات فراہم کی جائے گی اسے وزراء کی کمیٹی کو ارسال کر دیا جائے گا۔

آرٹیکل ۲۶: فریم ورک کنونشن میں پیش کیے گئے اصولوں اور ہدایات کے موثر نفاذ کا جائزہ لینے کے لئے وزراء کی کمیٹی کی مدد ایک مشاورتی کمیٹی کرے گی اس مشاورتی کمیٹی کے ممبران ایسے افراد ہوں گے جو قومی اقلیتوں کے مسائل کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

۲- فریم ورک کنونشن کی ہدایات نافذ العمل ہونے کے ایک سال کے اندر وزراء کمیٹی اس مشاورتی کمیٹی کی تشکیل اور طریقہ کار کے ضوابط طے کرے گی۔

دفعہ ۵:

آرٹیکل ۲۷: فریم ورک کنونشن کی دستاویز پر متعلقہ مما لک اس وقت تک دستخط کر سکتے ہیں جبکہ اس کا نفاذ عمل میں آ جائے اگر وزراء مدعو کریں تو دیگر مما لک بھی اس دستاویز پر دستخط کر سکتے ہیں۔ یہ توثیق اور منظوری کے ساتھ مشروط ہے، توثیق اور منظوری کی یہ دستاویزات سیکورٹی کونسل کے پاس جمع کرادی جائے گی۔

آرٹیکل ۲۸: فریم ورک کنونشن کی ہدایات کا نفاذ کونسل آف یوروپ کے ۱۲ ممبران کی جانب سے دستخط کئے جانے کی تاریخ کے پہلے دن سے تین ماہ کی مدت گذر جانے کے بعد عمل میں آئے گا۔

۲- اگر کوئی اور ممبر فریم ورک کنونشن کے اصول و ہدایات پر عمل کرنے کی رضامندی دے تو اُس ملک میں ان کا نفاذ منظوری کی دستاویزات جمع کرائے جانے کی تاریخ سے تین ماہ بعد عمل میں آئے گا۔

آرٹیکل ۲۹: فریم ورک کنونشن کی ہدایات کے نافذ العمل ہونے کے بعد کونسل آف یوروپ کے وزراء کی کمیٹی کونسل آف یوروپ کے ممبران کی ایک میٹنگ میں کثرت رائے سے اس کنونشن کی توثیق کرائے گی جیسا کہ آرٹیکل ۲۰ کے تحت مطلوب ہے، کونسل آف یوروپ کا کوئی غیر ممبر ملک جسے آرٹیکل ۲۷ کے تحت کنونشن پر دستخط کے لئے مدعو کیا گیا ہے اور جس نے ابھی دستخط نہیں کئے ہیں اور کوئی دیگر غیر ممبر ریاست......

۲- توثیق کرنے والے ممبر ملک میں فریم کنونشن کی ہدایات کا نفاذ کونسل آف یوروپ کی سیکورٹی کونسل میں الحاقی دستاویزات جمع کرائے جانے کی تاریخ سے تین ماہ بعد عمل میں آئے گا۔

آرٹیکل ۳۰: کوئی ممبر ملک اس دستاویز پر دستخط کرنے یا منظوری کے دستاویزات سیکورٹی کونسل میں جمع کرائے جانے کے وقت اس علاقے یا علاقوں کی نشاندہی کرے گا جہاں

فریم ورک کونسل کی ہدایات کا نفاذ عمل میں آئے گا اور وہ ممبر بین الاقوامی تعلقات کے تحت ان علاقوں پر اقتدار رکھتا ہے۔

۲-کوئی ممبر ملک بعد کی تاریخ کو فریم ورک کنونشن کی سفارشات کسی دیگر علاقے میں جس کا باضابطہ تذکرہ کیا جائے نافذ کرنے کا اعلان کرسکتا ہے، اس کے لئے وہ کونسل آف یوروپ کی سیکورٹی کونسل کو باضابطہ طور پر اطلاع دے گا ان علاقوں میں کنونشن کی سفارشات کا نفاذ سیکورٹی کونسل میں اطلاع موصول ہونے کے تین ماہ کی مدت کی تکمیل کے بعد کیا جائے گا۔

۳-مذکورہ بالا دونوں پیراگراف کے تحت کئے گئے کسی اعلان کو جو کسی علاقہ سے متعلق ہو جس کا اس اعلان میں حوالہ ہو سیکورٹی کونسل کو ارسال کردہ ایک اعلامیہ کے ذریعہ واپس کیا جاسکتا ہے۔ واپسی کے عمل کا نفاذ سیکورٹی کونسل کو موصول ہونے والی اس اطلاع کے تین ماہ بعد سے عمل میں آئے گا۔

آرٹیکل ۳۱: کوئی بھی ممبر ممالک کسی وقت فریم درک کنونشن کو کونسل آف یوروپ کی سیکورٹی کونسل کو ایک اطلاع نامہ بھیج کر مسترد کرسکتا ہے۔

۲-یہ استرداد سیکورٹی کونسل کو ارسال کردہ متعلقہ اطلاع کے موصول ہونے کے چھ ماہ بعد سے نافذ العمل ہوگا۔

آرٹیکل ۳۲: کونسل آف یوروپ کے سیکریٹری جنرل کی جانب سے ان ممبر ممالک کو جنہوں نے فریم ورک کنونشن پر دستخط کئے ہیں یا جو اس کنونشن سے ملحق ہے مندرجہ امور کی اطلاع دے گا۔

ا-کسی دستخط کے بارے میں، ب-منظوری یا الحاق کی کسی دستاویز کے بارے میں، ج-فریم ورک کنونشن کے نافذ العمل ہونے کی تاریخ کی بابت جیسا کہ آرٹیکل ۲۸، ۲۹، ۳۰ کے تحت مطلوب ہے، د-دیگر کوئی اطلاع یا اعلان جو اس فریم ورک کنونشن سے متعلق ہو، مندرجہ ذیل

دستخط کنندگان جنہیں اس کا باضابطہ اختیار دیا گیا ہے، اس کی گواہی میں فریم ورک کنونشن پر دستخط کرتے ہیں۔

استراس برگ میں یکم فروری ۱۹۹۵ء کو انگریزی اور فرانسیسی زبان میں تحریر کردہ اس دستاویز کو تیار کیا گیا، دونوں زبانوں کی دستاویز یکساں طور پر معتبر ہوں گی۔ اس کی ایک نقل سیکورٹی کونسل کے محکمہ آثار (آرکائیو) میں جمع کرادی جائے گی، کونسل آف یوروپ کے سکریٹری جنرل کی جانب سے تمام ممبر ممالک کو اس دستاویز کی مصدقہ نقول ارسال کی جائیں گی، دیگر ممالک جنہیں اس کنونشن پر دستخط کے لئے مدعو کیا گیا، جنہوں نے کنونشن کی تائید کی ہے انہیں بھی یہ نقول ارسال کی جائیں گی۔

☆☆☆

تیسرا باب:

اقلیتوں کے حقوق عالم اسلام میں

عہد نبوی میں اقلیتوں کے حقوق - اصول و اسوۂ نبوی

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ☆

اسلام واحد مذہب و ثقافت اور حضرت محمد رسول اکرم ﷺ واحد شخصیت و قائد ہیں جنھوں نے ہر حال اور ہر زمانے میں اقلیتوں کے حقوق، ان کے اصول و مبادی، نظریات و افکار اور قواعد وضوابط کے ساتھ ساتھ ان پر عمل کر کے دنیائے انسانیت کے سامنے ایک کامل نمونہ، قابل تقلید اسوہ اور عالمگیر و آفاقی نظام بھی عطا فرمایا ہے۔ مکی عہد حیات میں رسول اکرم ﷺ نے قریش مکہ کے تکثیری معاشرے میں اپنی مسلم اقلیت کے حقوق کا ارتقا پیش کیا، مدنی دور حکمرانی میں اپنی مسلم اقلیتوں کی ممالک غیر میں ان کے حقوق کی پاسداری اور حصولیابی کی عصری نظام کے مطابق کوشش کی اور اسلامی ریاست و حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اور رسول آخر الزماں ﷺ کے منصب عالی سے اپنی غیر مسلم اقلیتوں کو خالص اسلامی نظام کے سایۂ رحمت میں ان کو تمام حقوق عطا فرمائے جن پر انسانیت بجا طور سے فخر کر سکتی ہے (بنیادی طور پر یہ مقالہ خاکسار کے خطبات سیرت پر مبنی ہے جو حیدرآباد دکن میں جولائی ۲۰۰۳ء میں مولانا محمد رضوان قاسمی رحمۃ اللہ علیہ ناظم دار العلوم سبیل السلام کی عنایت و اصرار پر باغ عامہ کے وسیع ہال میں شہر کے اہل علم و فضل کے ایک بڑے مجمع کے سامنے دیے گئے تھے۔ بعد میں وہ اردو میں ''مکی اسوۂ نبوی- مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل'' بن کر دہلی ۲۰۰۴ء اور کراچی ۲۰۰۸ء سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر کی جانب سے وہ انگریزی میں شائع ہوئے۔ عنوان ہے: "The Prophet Mohammad Peace be upon him A Role Model for Muslim Minorities"، ۲۰۰۶۔ اصل مواد تو اسی کتاب پر مبنی اور اسی سے مستفاد ہے مگر اس مقالہ میں خاصے اضافے کیے گئے ہیں۔ ان میں مواد

☆ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

وما خذ دونوں شامل ہیں۔ان کے بعض استنباطات اور نتائج بھی نئے ہیں)۔

مکی دور اقلیت میں مسلم اقلیتوں کے حقوق کا معاملہ رہا ہو یا مدنی دور حکمرانی میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ، اصول ومبادی، افکار و اعمال اور ان کو بروئے کار لانے میں ایک ہی اسوہ واصل ملتی ہے جو دونوں ادوار کے درمیان سر رشتۂ معنی ہے، اسے اسلامی عدل وانصاف کا قرآنی معیار بھی کہا جاسکتا ہے اور رسول اکرم ﷺ کا نبوی اسوہ بھی، اس نظام عدل اور اسوہ نبوی میں بے رحم اور بے لچک قانونی اور غیر منصفانہ یا جانبدارانہ دستور کا تقاضا قطعی کارفرما نہیں تھا؛ بلکہ بیکراں رحمت الٰہی اور ناپیدا کنار رحمت للعالمینی کا محبت بھرا طریقہ کارسازی کررہا تھا جو سب کے لئے رحمت وشفقت لاتا ہو۔اسے عصری اصطلاح میں سماجی عدل کا نظام بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی سماجی عدل اور معاشرتی انصاف نے اقلیتوں کے حقوق کے نبوی اسوہ میں عالمگیریت، آفاقیت اور ایک طرح کی ابدیت پیدا کردی تھی، جو عالم انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرتی ہے ("سماجی عدل– عہد نبوی میں" خاکسار راقم کا ایک طویل غیر مطبوعہ مقالہ ہے جو انشاء اللہ جلد شائع ہوگا۔وہ بھی ایک خطبہ ہے۔ سماجی عدل پر سید قطب وغیرہ کی تحریریں بھی ملاحظہ ہوں)۔

اس مختصر مقالے میں عہد نبوی کے دونوں ادوار–مکی اقلیت اور مدنی اکثریت– میں مسلم اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کا نبوی اسوہ پیش کیا جارہا ہے، وہ بنیادی طور سے ایک دفترِ معنی اور بے پایاں معنویت کا محض ایک باب ہے۔زمانی ترتیب واقعات اور تاریخی ارتقاء کے مطابق مکی دور اقلیت میں مسلم اقلیتوں کے حقوق سے بحث کا آغاز کیا جارہا ہے۔

مکی مسلم اقلیتوں کے حقوق کا ارتقاء:

قریش مکہ کے تکثیری معاشرے میں مسلم اقلیت کے حقوق کا ہی تجزیہ نہیں کیا جاسکا؛ حالانکہ وہ خالص نبوی سیرت کا باب ہے تو جزیرہ نمائے عرب کے طول وعرض میں بکھری ہوئی مسلم

اقلیتوں کے حقوق کا جائزہ کیونکر لیا جا سکتا تھا۔ ابھی تک ہمارے سیرت نگار اور افکار و نظریات ساز مکی مسلم اقلیت اور وسیع تر و پراگندہ تر عرب مسلم اقلیتوں کا ادراک بھی نہ کر سکے۔ بہر حال یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ بعثت نبوی علیہ السلام کے معاً بعد مکہ مکرمہ میں ایک مسلم اقلیت ابھرنی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک عددی قوت بن گئی۔ دینی لحاظ سے مکی مسلم معاشرہ مکہ مکرمہ کے قریش کے غالب مذہب سے الگ اور ممتاز دینی مقام رکھتا تھا؛ اگرچہ قریش مکہ بالخصوص اور دوسرے عرب بالعموم دین حنفی کے پیرو ہونے کے دعوے اور واقعہ کے سبب کچھ مشترکہ اقدار بھی رکھتے تھے۔

سماجی اور قبائلی لحاظ سے ایک اہم واقعیت یہ تھی کہ مسلم اقلیت کا تعلق قریش مکہ کے تمام بطون اور خاندان سے تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں منتشر مسلم اقلیتوں کا سماجی اور قبائلی ارتباط بالجملہ تو ایک دو قبائل سے تھا مگر وسعت و عرض میں وہ بھی بین القبائلی تھے اور مسلمان اقلیتیں مختلف علاقوں اور قبیلوں میں ان کے متعدد و مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ تیرہ سالہ مکی دور اقلیت میں مکہ مکرمہ میں مسلم اقلیت کی مرکزیت اور عددی قوت بڑھی تھی اور ان کی تعداد نے ایک خاص امت بنا دی تھی، اسی امت مسلمہ مکیہ کے بکھرے ہوئے افراد و طبقات؛ بلکہ نبوی شذرات، مشرق میں بحرین و عمان میں، جنوب مشرق میں ہجر و حضر موت میں، خاص جنوب میں یمن و حضر موت کے علاقوں کے قبائل میں اور وسطی جنوب میں قبائل دوس، اشعر و زبید وغیرہ میں موجود و کارفرما تھے (''مکی اسوۂ نبوی'' کے ابواب اول، دوم کے علاوہ خاکسار کی کتاب ''عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت'' نئی دہلی ۱۹۸۵ء باب اول، دوم، آئندہ حوالے ''تنظیم ریاست وحکومت'')۔

سیاسی لحاظ سے ماضی میں تمام مسلم اقلیتیں، خواہ مکی مرکزی مسلم اقلیت ہو یا جزیرہ عرب کی علاقائی اقلیتیں ہوں، اپنے اپنے قبائل و بطون کے ''نظام ملأ'' کا ایک حصہ تھیں اور سیاسی اختیارات و فرائض میں غیر مسلموں کا حصہ ہونے کے سبب برابر کی شریک تھیں۔ قبول اسلام کے بعد ان کی سیاسی حیثیت بھی سماجی و معاشرتی حیثیت کی طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ شریک ہونے کے

باوجود ماتحت بن گئی تھیں۔ مگر اس فروتر سماجی اور سیاسی حیثیت میں بھی ان کو مشترکہ عرب زبان وثقافت کی بنا پر بزرگ تر سماجی وسیاسی نظام کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کے افراد وطبقات اسلام لانے کے بعد بھی اپنے سماجی اور سیاسی فرائض واختیارات سے یکسر سبکدوش نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ان کی غالب اکثریت اور غیر مسلم حکمرانوں اور سماجی قائدوں نے ان کو اپنے اپنے سماج وسیاست سے باہر نکالا تھا۔ اقتصادیات ومعاش (تجارت، زراعت، حرفت وصنعت اور مزدوری) میں بھی مسلم اقلیتوں کا مقام برقرار رہا تھا اگرچہ انہیں احوال وتجاوزات میں اس کو زک پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اقلیتوں کے ان مبادی کے بعد ان کے حقوق کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے (ابن اسحاق/ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دارالمعارف مصر ۱۹۶۰ء، ۱/۱۴۱-۱۴۲، ازرقی، اخبار مکہ، بیروت ۶۶۸-۱۹۶۴ ومابعد، شبلی، سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، ۱/۱۶۴-۱۶۵؛ مفصل بحث کے لیے مضمون خاکسار، ''بنوعبد مناف۔ عظیم تر متحدہ خاندان رسالت''، معارف اعظم گڑھ فروری۔ مارچ ۱۹۹۶ء؛ مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۰-۲۰۰ ومابعد وسائل معاش کی بحث کے لیے: مکی اسوۂ نبوی، ۱۶۰-۱۶۸)۔

دینی اور مذہبی حقوق:

دین ومذہب کے اعتبار سے، کیا اکثریت اور کیا اقلیت، کا ایک مرکزی اور جامع حق ہوتا ہے جو مذہب ودین ہے۔ پھر اس دین ومذہب کے ذیلی حقوق ہوتے ہیں جو شجر دین کی کوکھ اور تنے سے پھوٹنے والی شاخوں کی مانند اس کی زائیدہ ہوتے ہیں۔ ان میں جامع حق یا حق الحقوق دین ومذہب اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔ اس کے ذیلی حقوق میں شامل ہیں: عبادات کا حق جو مختلف عبادتوں اور مناسک میں مزید منقسم ہوتا ہے، عبادت گاہوں کی تعمیر وتحفظ کا حق، زیارتوں اور مذہبی آمد ورفت کا حق، دین ومذہب کی پرامن تبلیغ واشاعت کا حق اور ان جیسے دوسرے حقوق، مرکزی مسلم مکی اقلیت کے حوالے سے ان کا بیان مزید وضاحت سے آراستہ اور

دلیل سے پیراستہ کردے گا۔

دین اختیار کرنے کا حق:

مکی تکثیری معاشرے نے بالخصوص اور دوسرے عرب سماجوں نے بالعموم ہر فرد وطبقہ کو یا پوری قوم کو اپنی پسند کا دین اختیار کرنے کا حق ہمیشہ تسلیم کیا۔ اسی دستوری اور قانونی حق کی بنا پر عربوں میں مختلف ادیان آئے۔ عرب کے مختلف حصوں میں بالخصوص جنوب عرب میں یہودیت، نصرانیت کا فروغ اسی حق واختیار کی تسلیم ورضا کے سبب ہی ہوا۔ مشرقی عرب میں مجوسیت اور صابیت کا بیج اسی نے بویا، جس طرح وسطی اور شمالی عرب میں ان ادیان نے پیر جمائے تھے۔ اسی تاریخی واقعیت نے اسلام کی تجدید محمدی علیہ السلام سے ذرا قبل مکہ مکرمہ میں بالخصوص اور دوسرے علاقوں میں حنیفیت کو فروغ دیا۔ اگرچہ مشہور احناف کا دعوی یہ تھا کہ وہ عربوں کے اصل دین - حنیفیت یا دینِ ابراہیمی - کی پیروی کررہے ہیں اور کوئی نیا دین نہیں اختیار کررہے ہیں۔ تاہم وہ عرب اور مکہ مکرمہ کے غالب رواجی دین کے خلاف بہر حال ایک تحریک مزاحمت ہی تھی (مکی اسوۂ نبوی، باب اول، ۳۶-۳۹: مقالہ خاکسار ''جاہلی عہد میں حنیفیت'' معارف اعظم گڑھ، اکتوبر۔نومبر ۲۰۰۳ء۔

رسالت محمدی کا بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسی خالص صحیح وسادہ حنیفیت: ''الحنیفیۃ السمحۃ البیضاء'' کا احیاء ہی مقصد اولین تھا۔ آپ علیہ السلام نے ان عربوں کو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل دین ہی کی طرف بلایا تھا۔ اس دعوت محمدی کا ایک حکیمانہ پہلو یہ بھی تھا کہ عرب کے اور دوسرے علاقوں کے یہودی اور نصرانی اور بعض دوسرے ادیان کے لوگ بھی دین ابراہیمی کے پیرو ہونے کے دعوے دار تھے۔ اس طرح وہ ''اصل دین'' کی طرف رجوع کی دعوت تھی جس کے دوررس اثرات تھے۔ ان میں سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اسلام یا دین وشریعت محمدی ایک ہی بنیادی حقیقت اور واحد دینِ عالمگیر ومذہب آفاقی تھا (مذکورہ بالا مقالہ؛ شاہ ولی اللہ

دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ طباعت لاہور غیر مورخہ، ۱/۱۲۴-۱۲۸ و ما بعد؛ خاکسار راقم کی کتاب مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، فرید بک ڈپو دہلی ۲۰۰۶ء کا باب اول)۔

اپنی پسند کا دین و مذہب اختیار کرنے کی تاریخی واقعیت نے مکی مسلمانوں اور دوسرے علاقائی مسلمانوں کو ایک قانونی قوت دی۔ اکابر قریش اور دوسرے شیوخ عرب دین اختیار کرنے کے حق کی واقعیت سے بالکل واقف تھے خواہ عوام وظالم اس سے آگاہ نہ ہوں۔ اس کا ایک واضح ذکر حضرت عمر بن خطاب عدوی قرشیؓ کے قبول اسلام کے واقعہ میں ملتا ہے، جو متعدد دوسرے حقوق کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اپنے اعلان اسلام یا اختیار دین کے اعلان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ پر بعض ظالموں نے تبدیلیٔ دین کی وجہ سے یورش کی اور حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی مدافعت میں سرگرداں دیکھا تو قریش کے ایک عظیم ترین سردار عاص بن وائل سہمی قرشی نے ان کا دفاع کیا اور یورش کرنے والوں کو یہ کہہ کر روکا کہ ایک شخص کو اپنی پسند کا دین اختیار کرنے کا حق ہے، لہٰذا تم اس کو اس حق کے استعمال سے کیسے باز رکھ سکتے ہو۔ "رجل اختار نفسه أمراً فماذا تريدون؟ خلوا عن الرجل"۔ اس اظہار آزادی میں کئی دوسری آزادیاں اور ان کے حقوق بھی شامل ہیں (ابن ہشام، ۱/۳۴۹؛ بخاری کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دارالسلام ریاض ۱۹۹۷ء، ۷/۲۲۳-۲۲۹؛ مکی اسوۂ نبوی، ۵۶-۵۷)۔

یہ صرف ایک شخص کبیر اور قائد قریش کا رویہ نہیں تھا، بالعموم تمام اکابر قریش نے اس حق کو کسی نہ کسی طرح تسلیم کیا تھا۔

☆ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کے قبول اسلام اور اختیار دین کے بعد ان کے والد ماجد نے خود تو آبائی دین چھوڑنے یا اسلام کا جدید دین قبول کرنے سے گریز کیا تھا مگر اپنے فرزند ارجمند حضرت علیؓ کو نیا دین اختیار کرنے کا حق دیا تھا۔ اور یہی آزادی انہوں نے اپنے دوسرے فرزند حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کو دی تھی (ابن ہشام،

۱/ ۲۴۶-۲۴۷/ بلاذری، انساب الاشراف، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ۱/ ۱۳۳)۔

☆ اخبار سیرت اور روایات حدیث کا اتفاق ہے کہ بالعموم قریش کے اکابر وعوام نے رسول اکرم ﷺ کے اختیار دین یا دوسرے قریشی اور مکی مسلمانوں کے حق اختیار وانتخاب پر نہ اعتراض کیا اور نہ اس کی روک تھام کی؛ کیونکہ وہ دین کے اختیار کرنے کے حق کو شعوری یا غیر شعوری طور سے تسلیم کرتے تھے، ان کو اعتراض وانکار اس وقت ہوا جب ان کے آبائی دین اور ان کے جھوٹے خداؤں پر تنقید ہونے لگی۔ ابن اسحاق کے الفاظ ہیں: "**فلما نادیٰ رسول اللہ ﷺ قومه بالإسلام وصدع به كما أمره الله، لم يبعد منه قومه ولم يردوه عليه.... حتى ذكر آلهتهم وعابها الخ**" (ابن ہشام، ۱/ ۲۶۴ وغیرہ)۔

☆ دوسرے عرب علاقوں کے مسلمانوں کے اختیار دین پر اسی طرح کوئی اعتراض نہیں ہوا جیسا کہ حضرت طفیل بن عمرو دوسی، حضرت اشج عبد القیسی، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابوذر غفاری اور متعدد دوسرے قبائل و دیار کے اسلامیان عرب کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے؛ البتہ ان سب کے رواجی دین سے برگشتہ ہونے کو "صبائیت" سے روایات میں ضرور تعبیر کیا جاتا ہے (مکی اسوۂ نبوی، ۵۶ ومابعد؛ قبائل عرب پر "تنظیم ریاست، حکومت"؛ حضرت عمر کے قبول اسلام کو مذکورہ بالا روایات کے مطابق مخالفین نے "صبأ عمر" کہہ کر تعبیر کیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار دین اور صحابہ میں متعدد کے قبول اسلام کے لیے یہی لفظ "صبأ" استعمال کیا گیا تھا)۔

اشاعت وتبلیغِ دین کا حق:

پیشرو انبیائے کرام اور دوسرے مصلحین مذاہب کے عالمی واقعات سے تمام اقلیتوں کو اپنے دین کی اشاعت وتبلیغ کا حق ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ وہ پر امن ہو، زور زبردستی سے پاک ہو، اکراہ

واجبار سے منزہ ہو اور خلوص و خیر خواہی پر مبنی ہو۔ رسول اکرم ﷺ کی خفیہ تبلیغ واشاعت کا معاملہ ہو یا علانیہ ترسیل دین وشریعت کا واقعہ ہو، کسی نے ان کے حق کو چیلنج نہیں کیا، رسول اکرم ﷺ کی پوری تیرہ سالہ مکی زندگی کی تبلیغی مساعی اور اشاعت دین کی کوششیں اسی حق آزادی پر استوار تھیں۔ سب تسلیم کرتے تھے کہ حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کو اپنے اختیار کردہ دین ومذہب کی اشاعت وتبلیغ کا حق حاصل ہے (مکی اسوۂ نبوی، ۵۸۔۶۶ ومابعد بحوالہ ابن ہشام ۱/ ۲۶۸۔۲۷۰، بلاذری ۱/ ۱۲۳/ ۱۲۴؛ ابن سعد الطبقات الکبری، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، ۱/ ۱۹۹ وغیرہ)۔

رسول آخر الزماں ﷺ کی تبلیغی مساعی سے مکی مسلم اقلیت میں دعوت دین اور تبلیغ اسلام کی ایک تحریک پیدا ہوئی۔ روایات حدیث اور واقعات سیرت ثابت کرتے ہیں کہ مکی مسلم اکابر نے اپنے اپنے اعزہ واقرباء اور احباب میں دین کی تبلیغ کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تبلیغی مساعی سے بالعموم ان کے آٹھ یا چھ رفقاء واحباب کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ملتا ہے؛ ورنہ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی، ان میں خاندان صدیقی کے افراد جیسے والدۂ ماجدہ، فرزند اصغر عبد اللہ اور ان کی زوجہ کے علاوہ دوسرے قریشی ومکی شامل تھے۔ دوسرے مسلم اکابر میں سے مبلغین کرام تھے: حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل عدوی، حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری قریشی، حضرت خالد بن سعید بن عاص اموی قرشی، حضرت عمر بن خطاب عدوی قرشی، حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی اور متعدد دوسرے اکابر وشیوخ بلاشبہ ان مذکورہ بالا عظیم شخصیات کے علاوہ بہت سے مبلغین اسلام اور داعیان دین تھے جنہوں نے مکی دور میں زبردست تبلیغ کی تھی۔ ان میں حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدی، جیسی خواتین نے بھی تبلیغ واشاعت کا حق استعمال کرکے شاندار نتائج حاصل کیے تھے۔ ایک انصاری خاتون یعنی مکہ مکرمہ میں آباد ہونے والی مدنی / یثربی خاتون کو ان کی جوشیلی تبلیغ کی بنا پر جلاوطن بھی کردیا گیا تھا (بالخصوص بلاذری ۱/ ۱۲۳/ ۱۲۴؛ مقالہ خاکسار ''دعوت نبوی کے طریقے'' تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری۔ اپریل ۱۹۹۵ء)۔

مکہ مکرمہ کے باہر دوسرے عرب علاقوں میں ان کے پرجوش اور باہوش مسلم مبلغین نے تبلیغ دین کا کام کیا تھا۔ غفار واسلم کے دو پڑوسی قبیلوں میں حضرت ابوذر غفاری اور ان کے بھائی حضرت انیس غفاری نے دوسرے مبلغین کے ساتھ دونوں کو چند برسوں میں مسلمان بنالیا تھا۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی نے دوس اور اس کے پڑوسی قبائل میں، حضرت ابوہریرہ دوسی نے اپنے اعزہ واقرباء میں، حضرت اشج عبدی اور ان کے رفقاء نے پورے قبیلہ عبدالقیس میں، حضرت ابوموسی اشعریؓ نے قبائل اشعر وزبید وغیرہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی تھی۔ مدینہ منورہ کے قبائل اوس وخزرج کا قبول اسلام بھی مکی واقعہ ہے اور وہ حضرت مصعب بن عمیر عبدری قرشی سے ملے، ان کے ساتھ اور ان کے بعد اوس وخزرج کے اولین مسلم اکابر جیسے ابوالہیثم بن نیہان، قیس بن ذکوان، حضرات سعدین- سعد بن معاذ اوسی وسعد بن عبادہ خزرجی- اسید بن حضیر اور متعدد دوسروں کی تبلیغ کا کارنامہ ہے جو ہجرت سے قبل انجام دیا گیا تھا (تنظیم ریاست وحکومت کا باب دوم: قبائل عرب پر)۔

دین ومذہب پر عمل کرنے کا حق:

یہ حق واختیار بھی مجموعۂ حقوق واختیارات ہے؛ کیونکہ دین ومذہب مختلف شرائع واحکام ومناسک پر عمل کرنے کا نام ہے، ان میں سب سے اہم ادائیگی نماز (اقامت صلاۃ) کا حق مسلم ہے۔ اسی سے وابستہ عبادت گاہ (مسجد) کی تعمیر وحفاظت کا حق ہے۔ دین حنیفی سے وابستگی کی بنا پر خاص مکی دور میں مقامات جلوت وخلوت میں جوار واعتکاف کا حق اکابر قریش وعرب کو بھی تسلیم تھا۔ ان سے زیادہ خاص مکہ مکرمہ میں بیت اللہ اور مسجد حرام کی موجودگی نے دوسروں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی طواف اور زیارت کا حق دیا تھا جو روزانہ کی عبادت بھی تھی اور مستقل معمولِ اہلِ مکہ تھا۔ عمرہ کو بھی اسی طرح کی مستقل اور معمول کی عبادت اور اس کا حق ہونا مسلم تھا۔ غالباً دین حنیفی کا سب سے عظیم بقیہ نقیہ بیت اللہ اور اس سے وابستہ مقامات ومناسک پر سالانہ حج کی

عظیم الشان عبادت تھی۔ ان سب اور بعض دوسرے دینی حقوق کو قریش اور عرب تسلیم کرتے تھے اور بالعموم دوسروں کو ان حقوق سے منع بھی نہیں کرتے تھے (جاہلی عہد میں حنیفیت پر بحث ملاحظہ ہو: مفصل بحث کے لیے کتاب خاکسار ''مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء''، دہلی ۲۰۰۷ء ابواب عبادات وغیرہ؛ مکی اسوۂ نبوی، ۶۷-۶۹)۔

نماز (صلوۃ) کا حق:

دین حنیفی میں نماز و صلوۃ کا مبہم سہی تصور بھی موجود تھا اور کسی نہ کسی شکل میں اس کی ادائیگی کا طریقہ بھی، مکہ مکرمہ کے قریش بقول بلاذری اور اصحاب سیر چاشت کی نماز خانہ کعبہ کے سامنے صحن مسجد حرام میں مدتوں سے ادا کرتے چلے آئے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ بنفس نفیس رسول اکرم ﷺ بعثت کے بعد بیت اللہ کے سامنے اسے قبلہ بنا کر نماز ادا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اسلامی طریقے سے ادا کرتے تھے اور اس کی ادائیگی کا حق مسلم قریش اس طرح دیتے تھے کہ اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے، بعض روایات میں اسے نماز ظہر یا دن کی یک وقتہ نماز بھی کہا گیا ہے۔ بہرحال وہ خاص تعلیم جبریلی پر مبنی اسلامی نماز تھی جو متفقہ تھی (فتح الباری، ۱/ ۳۰۶-۳۰۷: سہیلی، الروض الانف، قاہرہ غیر مورخہ، مرتبہ عبدالرحمٰن الوکیل، ۳/ ۱۱-۱۵: "كان صلى الله عليه وسلم قبل الاسراء يصلى قطعا وكذلك أصحابه" الخ۔؛ بلاذری ۱/ ۱۱۳، "فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج الى الكعبة أول النهار ويصلى صلوة الضحى وكانت تلك صلاة لاتنكرها قريش۔")۔

حق صلوۃ کا خاص مسلم انداز اس وقت شروع ہوا جب رسول اکرم ﷺ اور مکی مسلمانوں کو صبح و شام کی دو نمازوں کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ روایات میں اس کی قطعی زمانی تعیین نہیں ملتی؛ تاہم یہ طے ہے کہ دو وقتہ -صلوتین- کا حکم ابتدائی دور میں آ گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں کا عمل قریب قریب پانچ چھ سال یا اس سے کچھ زیادہ ہی رہا۔ رسول اکرم ﷺ مختلف دینی مصالح سے اور حکم الٰہی سے بھی روایات سیرت و حدیث کے مطابق مکہ مکرمہ کی وادیوں میں مختلف مقامات پر ان

دونوں نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے اور بسا اوقات مکی مسلمان مختلف ٹکڑیوں اور متعدد جماعتوں میں نمازین (صلوتین) مختلف اماموں کی امامت میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ کے ایسے ہی کسی موقع پر ایک قریشی سردار عقبہ بن ابی معیط اموی کے معترض ہونے پر اسے مار بیٹھنے کو اکابر قریش؛ بلکہ اس دشمنِ ایمان کے اصحاب تک نے جائز ٹھہرایا تھا؛ کیونکہ وہ مسلمانوں کو ان کی حق عبادت سے محروم کرنا چاہتا تھا (ابن ہشام، ۱/۲۷۵-۲۷۶؛ مکی اسوۂ نبوی، ۶۸)۔

بیت اللہ کے سامنے مسجد حرام کے صحن میں ان دونوں نمازوں کو ادا کرنے کا مسلمانوں کو حق تو تھا مگر بعض اکابر مانع تھے۔ ان کی مخالفت، مسلم تعداد کی کمی، فتنہ وفساد سے اجتناب اور بعض دوسرے مصالح سے رسول اکرم ﷺ نے اس حق پر اصرار نہیں کیا، بعثت نبوی کے چھٹے سال حضرت عمر بن خطاب عدوی قریشی کے قبول اسلام نے اسلام کو قوت وشوکت اور مسلم اقلیت کو طاقت مزاحمت عطا کردی۔ انہوں نے مانع اکابر قریش سے لڑ جھگڑ کر بیت اللہ کے سامنے دو وقتہ نمازوں کو ادا کرنے کا حق حاصل کرلیا۔ ظاہر ہے کہ اس مزاحمت فاروقی کو نبوی تائید وتوثیق حاصل تھی۔ دینی معاملات میں صلابت عمری اور قوت فاروقی ہر طرح مسلم ہے؛ مگر ایسے تمام دینی اقدامات کے لئے نبوی اذن، جو حکم واذن الٰہی کا پرتو ہے، لازمی شرط تھا۔ اس کے بغیر حضرت عمر فاروق اور نہ کوئی دوسرا کوئی اقدام کرسکتا تھا۔ بعض سیرت نگاروں نے صلابت فاروقی کو اس انداز میں پیش کیا ہے جس میں ہتک نبوت کا پہلو نکلتا ہے (بعض اردو کتب سیرت میں بالخصوص ایسی تشریح کی گئی ہے اور مستشرقین ہٹی وغیرہ خاص کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شخصیت وفعالیت کو خاص نقطہ نظر سے بیان کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان کی ''تاریخیت'' زیادہ واقعی تھی)۔

معراج میں پنجوقتہ نمازوں کی فرضیت کے بعد رسول اکرم ﷺ تمام مکی مسلمانوں کو مسجد حرام کے صحن میں نمازیں پڑھاتے تھے اور قریش وعرب اس مسلم حق کو تسلیم کرتے تھے۔ بعض

روایات میں حضرت عمرؓ کی دینی صلابت اور مسجد حرام میں نمازیں پڑھنے کا حق حاصل کرنے کا واقعہ پنجوقتہ نمازوں کے فرض ہونے کے بعد کا بتایا جاتا ہے۔اس کی تطبیق یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کارنامہ دوبار انجام دیا تھا (ابن ہشام، ۱/ ۳۶۴؛ ابن سعد ۲/ ۲۶۹۔۲۷۰، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مطبعہ دار السعادۃ، ۱۹۳۲، ۳/ ۳۱۔۳۳؛ مکی اسوۂ نبوی، ۱۸۱۔۱۸۵)۔

فرض نمازوں کے علاوہ بعض نوافل بھی رسول اکرم ﷺ اور دوسرے مکی مسلمان مسجد حرام کے صحن میں ادا کرتے تھے، ان میں دن اور رات کی انفرادی نمازیں بھی شامل تھیں۔ان نمازوں اور ان میں تلاوت قرآن کریم کے بعض دلپذیر و دلکش واقعات ابتدائی دور سے ملتے ہیں۔ان میں سے ایک ابن اسحاق وغیرہ نے حضرت عمر بن خطابؓ کے قبول اسلام سے تاثر پذیری کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ وہ ایک شبانہ نماز میں قراءت نبوی سن کر اسلام کی حقانیت اور رسول اکرم ﷺ کی رسالت کے قائل ہوکر اسلام لانے پر تیار ہو گئے تھے (اسلام عمر رضی اللہ عنہ کی بحث ابن ہشام وغیرہ)۔

گھریلو مساجد اور صحن بیت میں دن رات بالخصوص شبانہ نمازوں کا ذکر خیر مکی مسلمانوں کے مستقل معمول کے طور پر آتا ہے۔رسول اکرم ﷺ کی ''احاطہ وار'' میں نمازوں، ان میں تلاوت قرآن کرنے اور ان سے عام وخاص کے متاثر ہونے کے واقعات مشہور ومعروف ہیں۔اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شبانہ نمازوں کی رقت انگیزی اور راثر انگیزی کا واقعہ بھی سیرت وتاریخ کا ایک قابل فخر نمونہ ہے۔متعدد دوسرے مکی صحابہ کرام کی گھریلو نمازوں کا ذکر بھی مآخذ میں موجود ہے جو بالعموم ان کی گھریلو مساجد کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے۔اس خاص عبادت وصلوۃ کو قریش مکہ وعرب تسلیم کرتے تھے اور مسلمانوں کا حق سمجھتے تھے۔ان کے بعض اعتراضات کا سبب دوسرا تھا (مکی اسوۂ نبوی، ۷۱۔۷۵، مابعد بحوالہ ابن ہشام، ۱/ ۳۲۳۔۳۲۸ ومابعد؛ سہیلی ۳/ ۱۹۶۔۱۹۷ وغیرہ؛ فتح الباری ۷/ ۲۸۷۔۲۹۱: ''ثم بدا لابی بکر فابتنی مسجدا بفناء دارہ

وکان یصلی فیہ" الخ)۔

عبادت گاہوں (مساجد) کی تعمیر کا حق:

خاص مکہ مکرمہ میں شعاب مکہ کی مسجد بھی صرف نماز گاہیں تھیں، وہ تکنیکی اور اسلامی لحاظ سے مستقل مسجدیں نہ تھیں۔ ان کے مقابلے میں گھریلو مساجد، مخصوص عبادت گاہیں اور تعمیر کردہ مساجد تھیں جو احاطہ، صحن یا گھر کے کسی حصہ میں نماز کے لئے بنالی جاتی تھیں، ان تمام گھریلو مساجد میں اولین و بہترین تو مسجد نبوی مکی تھی جو رسول آخر الزماں ﷺ اور امام المسلمین کی مسجد تھی جہاں آپ عبادت کیا کرتے تھے، دوسری گھریلو مسجد صدیقی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا۔ اس مسجد خاص کی ایک اہمیت یہ تھی کہ وہ باہری احاطہ میں تھی۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز پڑھتے تو رقت وجذب کے سبب قریشی خواتین واطفال کو بے تحاشا متاثر کرتے؛ کیونکہ وہ ان کی تلاوت سننے کے لئے جمع ہوجایا کرتے تھے۔ احابیش کے سردار ابن الدغنہ کی جوار واپس کرنے اور قریشی اکابر کے اعتراض کرنے کا سبب ان کی مسجد کے حق پر نہ تھا؛ بلکہ وہ اسے اندرون خانہ لے جانے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے؛ تاکہ حضرت صدیقؓ کی نماز وتلاوت سے ان کے بچے اور عورتیں متاثر نہ ہوسکیں۔ حضرت ابوبکر ﷺ صدیقؓ نے اپنے اس حق سے دستبردار ہونے سے انکار کردیا۔ اپنی اسی باہری مسجد میں جمے رہے اور قریشی اکابر کو ان کا حق تسلیم کرنا پڑا۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ کرام کی مکی مساجد کا ذکر ملتا ہے جن میں حضرت عمار بن یاسر مذحجیؓ کی مسجد کو اولین مکی گھریلو مسجد کہا جاتا ہے (مذکورہ بالا)۔

مکی دور میں بیرون مکہ مکرمہ متعدد مقامات پر مسلمانوں نے اپنی نمازوں کی ادائیگی کے لئے مساجد تعمیر کرلی تھیں اور ان کے اس حق کو ان کے علاقے کے عربوں اور ان کے اکابر نے تسلیم کیا تھا۔ ان میں حسب ذیل مساجد اہم ترین تھیں:

۱- غفار واسلم کے قبیلوں کی متعدد مساجد، ایک مسجد میں حضرت ابوذر غفاری امام قوم تھے اور

دوسری میں حضرت ایماء بن رہنہ غفاری، ان کے علاوہ بھی دوسری مساجد اوران کے امام تھے۔

۲- بحرین کے عبدالقیس کے مسلمانوں کی مسجد جواثی وغیرہ، مسجد جواثی کا خاص ذکر اس لئے آتا ہے کہ وہ نہ صرف مکی دور نبوت کے آغاز میں تعمیر ہوئی تھی؛ بلکہ پوری قوم کی مسجد جامع تھی اوراس میں مکی دور میں مدینہ کی مسجد انصار سے بھی پہلے نماز جمعہ قائم کی گئی تھی۔

۳- یثرب میں مسلمانانِ اوس وخزرج کی متعدد مساجد جن میں حضرت اسعد بن زُرارہ خزرجی کی مسجد ''نقیع الخضمات'' اوررسول اکرم ﷺ کے فرستادہ امام شہر حضرت مصعب بن عمیر عبدری کی اقامت گاہ خاص مسجد میں تھی۔قبا کی ایک الگ مسجد تھی۔حضرت جابرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت مدینہ سے قبل دوسال تک ہم مساجد کو آباد کرتے اورنماز قائم کیا کرتے تھے:"نعمر المساجد ونقيم الصلوة"۔

۴- جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات پر آباد مسلم بستیوں کی اپنی مساجد تھیں جوقبائل اوس، اشعر، زبید وغیرہ میں موجود ومعروف تھیں۔بقول شخصے جہاں ایک بھی مسلم تھا وہاں ایک مسجد ضرور تھی،خواہ وہ ایک چبوترہ اورچھپر ہی رہی ہو۔

۵- مسجد کے تحفظ کا حق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہم اورنمائندہ مثال سے ثابت ہوتا ہے جب انہوں نے اپنی جان کے تحفظ کی قیمت پر بھی اپنے گھریلو مسجد کو باہری احاطہ سے اندرون خانہ منتقل کرنے سے انکار کردیا تھا،واقعہ فیل نے بیت اللہ کی حفاظت کا حق سب سے زیادہ ثابت کیا تھا جسے ابرہہ اشرم چھین لینا چاہتا تھا (مکی اسوۂ نبوی، ۷۵۔۷۷،بحوالہ ابن ہشام، ۲۲۱/۴؛ فتح الباری ۴۸۸/۲۔۴۸۹؛ ۳۰۶/۷ وغیرہ)۔

دوسرے دینی حقوق:

اس میں متعدد کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ان میں سب سے اہم بیت اللہ کے روزانہ یا معمول کے

طواف، عمرہ اور حج ادا کرنے پر حقوق کا معاملہ مکی دینی تناظر اور دین حنیفی پر تسلسل میں سب سے اہم تھا، اور قریش وعرب بھی ان دینی حقوق کو تسلیم کرتے تھے۔ رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا معاملہ ہو یا بیرون مکہ سے آنے والے مختلف عرب مسلمانوں کا مسئلہ ہو، اکابرِ قریش اور متولیانِ بیت اللہ اور منتظمینِ حج وعمرہ نے اختلافِ مذہب کی بنا پر مسلمانوں کو مکی دور میں کبھی نہیں روکا؛ کیونکہ وہ دین ابراہیمی کی مشترکہ میراث تھی اور مسلمانوں کے ان مناسک وعباوات کو ادا کرنے سے خوش بھی ہوتے تھے۔ مزاحمتِ قریش اگر تھی بھی تو دوسرے اسباب سے تھی۔

عہد جاہلی سے پورے تیرہ سالہ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مکی اور عرب مسلمان بیت اللہ کا طواف کرتے رہے، ان کی تعداد ان کی شعوری عمروں کے دنوں سے بھی زیادہ تھی؛ کیونکہ بسا اوقات وہ روزانہ ایک سے زیادہ طواف کیا کرتے تھے۔

مکی مسلمانوں کی عبادتِ عمرہ بھی مسلسل تھی۔ اس کی تعداد بھی کافی تھی کہ ان کی روزانہ نہ سہی مستقل اور معمول کی عبادت تھی۔ بیرونی مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہی عمرہ کرنا پڑتا تھا، کیونکہ وہ اسلامی عبادت وفرضیت تھی جو دین ابراہیمی سے مسلسل چلی آرہی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلِ بعثت اور مکی دور کے زمانۂ رسالت کے دوران عمروں اور حجوں کے بارے میں اہل روایت نے کافی ابہام پیدا کردیا ہے۔ اس پر بحث کہیں اور کی جاچکی ہے۔ مصادرِ سیرت سے اور روایاتِ حدیث سے بالکل ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلِ بعثت ان گنت حج اور عمرے کئے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ یہی عملِ صحابہ اور تعامل مسلمین بھی تھا (مفصل بحث کے لیے: اسلامی احکام کا ارتقاء باب حج وغیرہ)۔

''تحنث'' ایک وسیع تر بلکہ جامع ترین اصطلاح تھی، جس کا بنیادی مطلب یہ تھا کہ دینِ حنیفی کے مطابق نیکی واجر کی نیت سے اعمالِ صالحہ، صلہ رحمی، جوار، غلاموں کی آزادی، صدقہ وخیرات، کمزوروں، بیکسوں کی مدد، مساکین کو کھانا کھلانا وغیرہ شامل تھے۔ ان پر تمام نہ سہی بیشتر اکابر وعوام

قریش کا عمل تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حراء کا رمضان میں جوار اور مسجدِ حرام میں اعتکاف اسی کا مشہور ترین حصہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جوار رمضان کو ادا فرماتے تھے اور دوسرے مسلمان بھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جوار رمضان کا یہ سلسلہ اسلامی نبوی عہد کے بعد خلافتِ اسلامی میں بھی جاری رہا تھا (مفصل بحث کے لیے مقالہ خاکسار ''عہد جاہلی کی میں تحنث کی اسلامی روایت'' ششماہی جہات الاسلام لاہور، جولائی دسمبر ۲۰۰۷ء، فتح الباری، ۳/ ۳۸۰-۳۸۱ وغیرہ، مختلف ابواب بخاری ومباحث فتح الباری نیز ۱/ ۲۹-۳۱ ومابعد)۔

دینی تعلیم وتربیت کا حق:

ایمان واسلام قبول کرنے والوں کی سب سے بڑی دینی ضرورت ان کی دینی تعلیم وتربیت تھی، جو ان کے فرائض وحقوق سے آگاہ کرتی تھی۔ اس حقِ اقلیت کے ساتھ دوسرا لازمی حق دینی مراکز کی تعمیر وتشکیل کا تھا؛ کیونکہ ان کے بغیر تعلیم وتربیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ مراکز تعلیم وتربیت دو طرح کے تھے: ایک عام مسلمانوں کے گھروں میں قرآن واسلام کی تعلیم دی جاتی تھی، جس کی نمائندہ مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت رسالت ونبوت تھا۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت زید بن حارثہؓ اور بہت سے صحابہ کو اسی مقامِ نبوت پر تعلیم ملی تھی۔ دوسرا معروف ومسلم مرکزِ تعلیم حضرت عمر بن خطاب کے بہن و بہنوئی، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت فاطمہ بنت خطاب کا خانۂ مبارک تھا، جہاں حضرت خباب بن ارت تمیمی ان دونوں میاں بیوی کو ''صحفِ قرآن'' پڑھاتے تھے اور جن کو سن کر حضرت عمر اسلام لائے تھے۔ صرف یہی ''دو گھر'' تعلیم وتربیت کے مراکز نہیں تھے؛ بلکہ تمام اہم صحابہ کرام بالخصوص ان کے تعلیم یافتہ حضرات کے گھر تعلیم دین کے مراکز تھے۔

دارارقم کا مرکزِ تعلیم وتربیت اولین تو نہ تھا جیسا کہ بعض اہل سیر کا خیال ہے تاہم وہ سب

سے پہلا اجتماعی مدرسہ ومرکز تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دو ڈھائی سال کے بعد وہاں مستقل طور سے تعلیم وتربیت کے لیے آباد ہو گئے تھے۔ اسی مقامِ نبوی پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس مرکز کی ایک امتیازی حیثیت بن گئی کہ سابقین اولین میں سے بالعموم اکثر اسلام لانے والوں کے لیے یہ وضاحت ابن سعد وغیرہ ضرور کرتے ہیں کہ وہ دارارقم میں داخلہ سے قبل یا اس کے بعد اسلام لائے تھے اور بالعموم ان کی اسلامی عددیت بھی بیان کی جاتی تھی۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، عمر بن خطاب عدوی اور وسیوں دوسرے صحابہ کرام نے جن میں حضرت ابوذر غفاری اور عبداللہ بن مسعود ہذلی اہم ہیں، اسی مرکز تعلیم وتربیت میں دینی تعلیم پائی تھی۔ ان میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین اسلام بھی شامل تھیں۔ ابن سعد اور دوسرے اہل قلم نے متعدد صحابیات کے دارارقم کے مرکز اسلام وتربیت وتعلیم سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

مسجد حرام میں مجلس ومسند نبوی:

اکابر قریش کی مانند خانہ کعبہ کے سائے میں مسجد حرام کے صحن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ایک مسند تھی، اکابر قریش کی ان مجالس کو قرآن وحدیث میں ''اندیہ'' (کی جمع ''نادی'' کہا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسند ومجلس میں مسلمانوں کی تربیت وتعلیم تو کرتے ہی تھے، قریش کے اکابر وحاضرین کو بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس فرماتے تھے، ان کو قرآن کریم سناتے تھے اور اہم عقائد وارکان کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اخلاق ومعاملات کو سنوارنے، کمزوروں اور ضعیفوں کے حقوق ادا کرنے اور دوسرے معاملات کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اکابر صحابہ دراصل چلتے پھرتے مدرسے اور تعلیمی مراکز تھے کہ جہاں جاتے اور تمام مقامات پر جاتے تھے، وہاں تعلیم کا

کام کرتے تھے۔

بدوی قبائل کے تعلیمی مراکز:

مختلف مقامات وبلادِ عرب پر منتشر مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے مراکز بھی تھے، جن کو ان کے اکابر نے تسلیم کیا تھا (مکی اسوۂ نبوی، ۷۷۔ ۹۳: مراکز پر مفصل بحث ہے بحوالہ فتح الباری ۷/ ۳۲۴ ومابعد؛ ابن ہشام ۱/ ۲۵۹، ومابعد بلاذری ۱/ ۱۱۸ ومابعد)۔

سماجی حقوق، سماجی تحفظ کا حق:

عرب جاہلی کا معاشرہ بھی سماجی تحفظ کا حق تسلیم کرتا تھا اور اس کے تحت سب لوگوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کرتا تھا۔ اصلاً ان کا قبائلی نظام ہی اس تحفظ کا ذمہ دار تھا؛ کیوں کہ ہر خاندان بطن اور قبیلہ کی یہ سماجی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ہر فرد وطبقہ کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کرے اور ان پر کسی غیر کو ظلم نہ کرنے دے، اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اس کا انتقام وقصاص لے۔ جاہلی نظامِ حفاظت نے ہر قبیلہ، بطن وخاندان کے درمیان یا ان کے شہر وقریہ کے اندر غیروں، بیگانوں اور آفاقیوں کے تحفظ کی بھی ضمانت دی تھی۔ غیر قبیلہ والوں اور بیرونیوں کی وہ ولاء کے رشتہ سے اپنے خاندان بطن کا مولیٰ اور حلف کے رشتہ سے "حلیف بنالیتے تھے"۔ یہ دونوں مستقل رشتے تھے۔ عارضی یا وحدانی تحفظ کے شخص کو "جوار" عطا کرتے تھے، جو اس شخص کو پورے خاندان/قبیلہ کی حفاظت دیتا تھا۔ اس شخص کو جار کہتے تھے۔ ان تینوں طریقوں کے ذریعہ غیر ملکیوں یا آفاقیوں کے تحفظ کی خاطر عرب قبیلوں نے ایک دوسرے سے جنگیں لڑی تھیں، جن میں بعض بہت مشہور ہیں (سماجی تحفظ کے عرب نظام پر ملاحظہ ہو مضمون خاکسار "عہد نبوی میں سماجی تحفظ کا نظام"، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۲ء "مکی اسوۂ نبوی" ۱۶۴۔۱۷۷ بحوالہ ابن ہشام ۱/ ۲۶۹۔ ۲۱۷ وغیرہ، سہیلی ۳/ ۸۴ ومابعد؛ ابن کثیر ۳/ ۵۷ ومابعد وغیرہ)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مکی صحابہ کرام، خواہ قریشی ہوں یا غیر قریشی، اس معاشرتی نظام تحفظ سے وابستہ چلے آرہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ہاشم و بنو مطلب کی متحدہ حفاظت ان کے سربراہ جناب ابو طالب ہاشمی کی حمایت کی وجہ سے حاصل تھی، جس طرح دوسرے قریشی خاندان، بنو امیہ، بنو مخزوم، بنو زہرہ، بنو اسد، بنو عدی، بنو تیم، بنو سہم، بنو جمح وغیرہ کو اپنے تمام ارکان کی حفاظت کا فریضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دلچسپ اور اہم بات یہ تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان کے خاندان وقبیلہ والے ان کی حفاظت سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہ ایسا فریضہ اور ایسی ذمہ داری تھی جس میں ذرا سی کوتاہی بھی ان کے لیے باعث عار تھی اور وہ تمام قبائل کی نظر میں سبک بن جاتے کہ کیسے بے غیرت ہیں کہ اپنے افرادِ خاندان کی حفاظت بھی نہیں کرسکتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سماجی تحفظ کے نظام سے فائدہ اٹھایا اور اختلاف مذہب اور تبدیلئ دین کے باوجود قبیلوں اور خاندانوں کو اپنے مسلم ارکان کی حفاظت کرنی پڑی (مذکورہ بالا بحوالہ کتب حدیث وسیرت: ابن ہشام ۱/۲۱ ۳، بلاذری ۱/ ۰ ۱۳- ۱۳۱ وغیرہ)۔

اکابر قریش اور معاندینِ اسلام نے جب اس تسلیم شدہ نظام کو خود توڑا اور خود اپنے مسلم ارکان پر ظلم کرنے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جان ومال کی حفاظت کے لیے دو مسلم طریقے اختیار کئے۔ مکی سماج اور معاشرے میں رہتے ہوئے کسی دوسرے خاندان کے باا ثر سردار اور عظیم شخصیت سے پناہ (جوار) طلب کرتے اور ان کی حفاظت کے حصار میں چلے جاتے تھے۔ عرب معیار شرافت ونجابت اور طریق پندار ومروت کی بنا پر کسی شیخ وسردار کو جوار دینے سے انکار کرنے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا کہ اس میں ان کی سبکی اور ذلت تھی۔

لہٰذا وہ طلب پر جوار عطا کر دیتے تھے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ حقیقت رہتی تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود طالب جوار ان کے عزیز وحلیف تھے۔ بسا اوقات بعض اہم سردار وشیوخ بلا طلب ہی کسی مرد مسلم کو اپنی جوار و پناہ میں لے لیتے تھے کہ اس سے ان کی شان وشوکت بڑھتی

گئی۔ان کی چند مثالیں مکی تاریخ اسلام سے ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

بلاطلب جوار کی پیشکش:

(۱) تاریخی توقیت کے لحاظ سے اولین جوار بلا طلب وہ تھی جو بنو سہم کے عظیم سردار عاص بن وائل سہمی نے حضرت عمر بن خطاب عدوی کو ان کے قبول اسلام کے معاً بعد مظالم قریش سے بچانے کے لیے خود ہی بڑھ کر دی تھی۔ حضرت عمر بن خطاب عدویؓ خود اپنی ذاتی شخصیت وحیثیت سے صاحب جلال وجرأت تھے مگر ان کا خاندان بنو عدی عددی قلت کے سبب کمزور تھا اور وہ ان کی حفاظت سے قاصر تھا۔ پھر یہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ پر ظلم ہوتے دیکھ کر ان کو جوار دی گئی تھی اور بنو سلیم سے ان کا معاہدہ بھی تھا (بخاری حدیث: ۳۸۶۴۔۳۸۶۵: فتح الباری ۷/۲۲۳: میں بالترتیب عاص سہمی کا قول ہے: "انا له جار" اور اس کی تفسیر ہے: "ای اجرته من ان یظلمه ظالم" یعنی میں ان کو پناہ دینے والا ہوں جس کا مطلب ہے کہ میں نے ان (عمر) کو اپنی جوار میں لے لیا ہے کہ ان پر کوئی شخص ظلم نہ کر سکے)۔

(۲) مظالمِ قریش سے تنگ آ کر بنو تیم کے کمزور قبیلہ/خاندان کے عظیم ترین مسلم شخصیت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مکہ سے ہجرت کی اور ابھی دور تک نہ گئے تھے کہ احابیش کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی اور اس نے از خود ان کو اپنی جوار میں مکہ پہونچا دیا۔ ایک مدت تک حضرت صدیقؓ اس کی جوار میں حفاظت سے رہے (بلاذری، ۱/۲۰۵۔۲۰۷؛ فتح الباری، ۷/۲۸۷۔۲۹۱ نیز مسجد صدیقی کے ضمن میں دوسرے حوالے۔ مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۶)۔

طلب پر جوار کی عطا:

(۱) اس کی سب سے عظیم وجلیل مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوار کی ہے۔ ابوطالب کی وفات کے بعد آپ کی حمایت وحفاظت سے نئے سربراہ ہاشم ومطلب ابولہب ہاشمی نے انکار کر دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جستجو میں طائف کے اکابر ثقیف کے پاس گئے، ان کے انکار کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپسی پر مقام نخلہ سے اپنے مولیٰ حضرت زید بن حارثہ کلبی کو خاندانِ بنوعبدمناف کے ایک بطن بنو نوفل کے سردار مطعم بن عدی بن نوفل سے جوار حاصل کرنے کے لیے بھیجا اور نوفل سردار نے بلا کسی تردد کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جوار میں لے لیا۔ اکابر قریش اور نظام مکہ نے اس جوار کو تسلیم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے سایے میں مکہ میں داخل ہوئے اور تین سال تک اسی کی حفاظت میں مکہ میں رہے (ابن ہشام ۱/۴۰۶؛ سہیلی، ۳/۳۶۲ومابعد؛ بلاذری، ۱/۲۳۷ نیز مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۷ اور مضمون سماجی تحفظ)۔

(۲) مہاجرین حبشہ میں سے مکہ مکرمہ واپس آنے والوں میں متعدد حضرات مکہ مکرمہ میں ہی مقیم رہے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ومشورے سے قریش کے مختلف خاندانوں کے شیوخ سے جوار طلب کی ر مانگی اور وہ ان کو فوراً مل گئی۔ ان میں سے بعض حضرات کے اسماء گرامی تھے:

(۱) حضرت ابوسلمہ بن عبدالعزیٰ مخزومی۔ ابوطالب ہاشمی کی جوار میں۔

(۲) عثمان بن عفان اموی۔ ابواحیحہ سعید بن العاص کی جوار میں۔

(۳) حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ عبشمی حضرت امیہ بن خلف جمحی کی جوار میں۔

(۴) حضرت زبیر بن عوام اسدی۔ زمعہ بن اسود اسدی کی جوار میں۔

(۵) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری۔ اسود بن عبد یغوث زہری کی جوار میں۔

(۶) حضرت عثمان بن مظعون جمحی۔ ولید بن مغیرہ مخزومی کی جوار میں۔

بلاذری وغیرہ نے ایسے متعدد صحابہ کرام کی عندالطلب جوار کا ذکر کیا ہے۔

(۳) قریش مکہ کی طرح سماجی تحفظ کا یہ قبائلی نظام دوسرے عرب قبائل میں بھی کارفرما تھا اور مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا کہ وہ ان کا حق تھا، جس سے ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہ تھا۔ البتہ پہلی بار ہوا تھا کہ ظالموں نے غیر خاندانی مسلموں کو تو تحفظ دیا مگر اپنوں پر ظلم کرتے تھے (ابن ہشام ۱/۳۹۱۔۳۹۴؛ بلاذری ۱/۲۲۴۔۲۲۸؛ بحث کے لیے "سماجی تحفظ کا نظام" عرب سماجی تحفظ کے نظام میں حکمت نبوی سے یہ ایک نیا ارتقاء ہوا تھا کہ مختلف اکابر قریش نے دوسرے قریشی خاندانوں کے مسلمانوں کو اپنی جوار میں لے لیا تھا۔ جبکہ خود ان کے اپنے اعزہ و اقرباء؛ بلکہ ان کے فرزندان ان کے اپنے مظالم کا شکار تھے اور حمایت و تحفظ قومی سے محروم تھے۔ مثلاً ابولہب ہاشمی حمایت و نصرت نبوی کے خلاف اس حد تک گیا کہ قومی روایت توڑ دی اور ابو طالب ہاشمی کی بھی مخالفت کی۔ مگر جب ابو طالب ہاشمی نے بنو مخزوم کے ایک فرد ابوسلمہ بن عبدالعزیٰ کو حمایت دی تو ابولہب ہاشمی نے بھی اس کی تائید کی۔ حضرت ابوسلمہ ان کے بھانجے تھے۔ ابو احیحہ سعید بن العاص اموی نے حضرت عثمان بن عفان اموی کو جوار دی مگر خود اپنے فرزندوں؛ خالد و عمرو وغیرہ پر مظالم ڈھاتا تھا۔ ایسے دوسرے اکابر بھی تھے اور ان میں امیہ بن خلف جمحی مسلمانوں پر مظالم کرنے کے لیے بدنام بھی تھا؛ مگر وہ بعض کو جوار دینے والا بھی بن گیا تھا)۔

معاہدہ امان کا حق:

سماجی نظام تحفظ کے ساتھ ساتھ قبائل قریش اور ان کے شیوخ و سادات انفرادی

معاہدہ امن کا حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ بالعموم اس حق کے تحت دو دوست یا دو شریک کار یا دو تجارتی ندیم باہمی معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی جان و مال اور مفادات کا تحفظ اپنے اپنے علاقوں میں کریں گے۔ اس معاہدہ امن کے تحت وہ بالفعل ان کو حفاظت فراہم کرتے تھے اور اکابر علاقہ اس کو مانتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ نے اپنے پرانے کافر دوست اور شریک تجارت امیہ بن خلف جمحی سے ایک ایسا ہی معاہدہ کیا تھا جو ہجرت مدینہ سے قبل کیا گیا تھا اور جس کے تحت حضرت عبدالرحمٰن زہری اپنے دوست کی جان و مال و تجارت کا تحفظ مدینہ میں کرتے اور امیہ بن خلف جمحی حضرت عبدالرحمٰن زہری کے جان و مال اور تجارت کا تحفظ مکہ مکرمہ میں کرتے تھے۔ ایسے معاہدے دوسرے افراد کے درمیان میں ہوتے تھے اور مختلف علاقوں میں ہوتے تھے۔ ان کا ذکر بالعموم تجارتی تعلقات اور مکہ مدینہ میں قیامِ تجار کے حوالے سے آتا ہے (بخاری، کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب۔ او فی دار الاسلام۔ جاز؛ نیز بعض دیگر ابواب بخاری، فتح الباری ۴/ ۶۰۴ - ۶۰۵۔ یہ بحث بہت اہم حدیث اور واقعہ بھی ہے اور عہد نبوی میں سماجی تحفظ اور مالی و تجارتی معاہدہ سے متعلق اصول بھی۔ امام بخاری نے اس سے متعدد اصول و قواعد اسلامی نکالے ہیں اور احکام فقہی بھی جو ان کے تراجم ابواب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس پر مزید بحث کی ضرورت ہے۔ نیز بلاذری ۱/ ۱۹۱، ابن ہشام، ۲/ ۲۷۱ - ۲۷۲؛ سہیلی ۵/ ۱۰۵ - ۱۱۰؛ مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۸ - ۱۷۹)۔

شخصی مدافعت کا حق:

ایک شخص اپنا یا اپنے خاندان کے کسی فرد کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت میں ظلم کرنے کے خلاف آواز اٹھا سکتا تھا اور ظالم سے اپنی یا اپنے عزیز کی مدافعت میں اقدام بھی کر سکتا تھا۔ قبائلِ عرب اور شیوخ قریش اس انفرادی حق کو تسلیم کرتے تھے اور مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس مدافعت میں ظالموں کو ان کے مظالم کی پاداش میں زبانی ڈرانا بھی شامل تھا اور

ان کو بد دعا دینا بھی۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اکابر قریش کو سرِ اقدس پر اوجھڑی ڈالنے کے واقعہ پر بد دعا دی تھی اور ان کے لیے ذبح کی دھمکی بھی دی تھی۔ یا دوران طواف کعبہ ابوجہل مخزومی وغیرہ کو "عذابِ ذبح" وغیرہ سے ڈرایا تھا۔ ایسے متعدد واقعات کا ذکر کتب حدیث وسیرت میں ملتا ہے ("مکی اسوۂ نبوی" ۱۸۵۔۱۹۱ و مابعد میں اس پر مفصل بحث ہے)۔

جسمانی مدافعت کرنے میں ظالم کو مارنے، اس سے بدلہ لینے اور اس پر حملہ کرنے کا حق بھی اس نظامِ تحفظ نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ نے قریشی سردار عقبہ بن ابی معیط اموی کو اونٹ کی ہڈی مار کر زخمی کر دیا تھا کہ وہ نماز کا حق ادا کرنے میں حارج تھا۔ اسی ظالم کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دورانِ نماز تکلیف پہونچانے کی وجہ سے دھکا دے کر دور کیا تھا۔ ایسے اور کئی واقعات مذکور ہیں۔

حضرت حمزہ کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ ابوجہل مخزومی کو انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کی پاداش میں کمان مار کر زخمی کر دیا تھا اور خود ظالم نے اپنے ظلم کو مانا تھا۔ متعدد صحابہ کرام جیسے زبیر بن عوام اسدی، عثمان بن مظعون جمحی وغیرہ نے اپنے مسلم اصحاب پر ظلم کا بدلہ ظالموں کو زد وکوب کر کے لیا تھا (ابن ہشام ۱/۲۷۵۔ سہیلی ۳/۴۳؛ بلاذری ۱/۱۱۶ و مابعد؛ فتح الباری ۷/۲۰۹۔ ۲۱۴ و ماقبل و مابعد؛ مکی اسوہ نبوی ۱۷۹۔۱۸۵)۔

شخصی اور سماجی آزادی کا حق:

عرب کے مسلمہ سماجی تحفظ کے نظام کی پابندیوں سے تنگ آ کر بعض معاند اکابر قریش نے شخصی آزادی سلب کرنی چاہی، پہلے تو انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مربی وسرپرست ابوطالب ہاشمی پر دباؤ ڈالا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی حمایت اور سماجی تحفظ سے باز آ جائیں۔ جب اس میں کامیابی نہ ملی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عوض ایک "مرد کار" کو بنو ہاشم کے شیخ کے حوالے کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ سے ہٹانے کا متبادل

پیش کیا۔ وہ ایسا احمقانہ تبادلہ اور مشورہ تھا جس کی دوہری مار کا راز خود ابو طالب ہاشمی نے یہ کہہ فاش کر دیا کہ تمہارے آدمی کی حفاظت میں کروں اور تم میرے آدمی کو قتل کر ڈالو۔ ایسا نہیں تھا کہ پیش کش کرنے والے اکابر قریش احمق تھے۔ وہ بڑے دور اندیش اور سمجھ دار لوگ تھے اور ہر حیلہ بہانہ سے مقصد براری چاہتے تھے۔ ان تمام شخصی اور سماجی دباؤ اور حربوں کی ناکامی کے بعد انہوں نے بالآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی پاداش میں سماجی مقاطعہ کا منصوبہ بنایا۔ اس کے تحت بنو ہاشم اور بنو مطلب کا ہر طرح کا سماجی بائیکاٹ کر دینے کا جال بچھایا اگر وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دست برداری نہیں کرتے۔ بیشتر اکابرِ قریش اور مکی عوام اس سماجی مقاطعہ کے خلاف تھے کہ وہ ان کی مسلمہ اقدار و روایات تحفظ و آزادی کے خلاف ہی نہیں بلکہ منافی تھا۔ وہ اس کی مخالفت اس لیے کھل کر نہ کر سکے کہ ان پر حمایت اسلام کا الزام نہ لگ جائے اور قریشی قبائل میں پھوٹ ڈالنے کے مجرم نہ بن جائیں۔ ان دو اسباب فساد سے قریش مکہ بہت گھبراتے تھے اور وہ قریشی اتحاد و یگانگت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ وہ ان کی اصل تھی (ابن ہشام، ابن سعد، طبری زرقانی وغیرہ کی روایات پر مبنی بیان شبلی ۱/ ۲۴۴۔ ۲۴۷ مودودی، ۲/ ۶۱۲۔ ۶۱۵: شبلی نے لکھا ہے کہ "زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔" مولانا مودودی وغیرہ کا یہ بیان صحیح نہیں کہ محصوری کے زمانے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام شعب ابی طالب سے باہر نہ آتے تھے۔ روایات میں وضاحت ہے کہ وہ برابر بیت اللہ آتے تھے اور دعوت دیتے تھے)۔

سماجی مقاطعہ کا صحیفہ باقاعدہ لکھا گیا اور اس کے اعلان و اطلاق کی خاطر اسے بابِ کعبہ سے آویزاں کر دیا گیا۔ ابو طالب ہاشمی بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں خانوادہ ہائے بنو عبد مناف کے مسلمان اور غیر مسلم افراد و ارکان اپنی خاندانی وادی میں چلے گئے۔ اپنے گھروں سے شعبِ ابی طالب / بنی ہاشم میں جانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ بکھرے ہوئے گھروں اور منتشر ارکان کی حفاظت وہاں مشکل تھی۔ اس ابتلاء و آزمائش کا مقابلہ ایک متحدہ و منظم خاندانی

مدافعت کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا تھا اور آلام ومصائب کو اسی کے ذریعہ برداشت کیا جا سکتا تھا۔ سماجی مقاطعہ کی دفعات بڑی ظالمانہ تھیں: بنو ہاشم وبنو مطلب کے کسی فرد سے کسی قسم کا سماجی تعلق نہ رکھا جائے، ان کے ساتھ کوئی لین دین نہ کیا جائے، ان کے ساتھ خرید وفروخت نہ کی جائے۔ حتی کہ ان کو غلہ اور دوسری ضروری چیزیں فراہم نہ کی جائیں اور ان سے شادی بیاہ نہ کی جائے۔ مقاطعہ کی ان دفعات میں سماجی تحفظ کے علاوہ صلہ رحمی، رشتہ داری، قرابت اور دوسری اقدار کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی جو اخلاق عرب کے خلاف تھی۔ اسی لیے متعدد اشخاص جیسے حکیم بن حزام اسدی، ہشام بن عمرو عامری اور ابوالبختری وغیرہ نے محصور خاندانوں کے افراد کی چوری چھپے اور بعض اکابر کے علی الرغم معاشی امداد کی۔ بالآخر ان ہی جیسے پانچ چھ شیوخ قریش نے جو مختلف بطون کے تھے، سماجی مقاطعہ کے صحیفہ کو چاک کر کے بنو ہاشم وبنو مطلب کو محصوری سے نکالا اور ان کو ان کی شخصی، سماجی اور کسی حد تک اقتصادی آزادی دی اور ان کے ان سماجی حقوق کو واپس دلا کر قریشی معاشرہ میں واپس لائے (بخاری، کتاب المناسک، باب نزول النبی صلی اللہ علیہ وسلم؛ مسلم کتاب الحج باب استحباب النزول بالمحصب، فتح الباری کے متعلقہ مباحث۔ شبلی ومودودی وغیرہ کے مذکورہ بالا مباحث۔ اس معاہدہ کو چاک کرنے والے شیوخ قریش تھے: مطعم بن عدی نوفلی، عدی بن قیس، زمعہ بن اسود، ابوالبختری، ہشام عامری، زہیر وغیرہ۔

(مسلمانوں کے ساتھ اس محصوری زمانے میں حسن سلوک کرنے والے تھے: حضرت حکیم بن حزام اسدی، ہشام بن عمرو عامری جو مسلمانوں کو غلہ پہنچاتے تھے اور دوسری اشیاء بھی۔ ان کی حمایت کرنے والے ابوالبختری تھے اور ان میں ابوسفیان اموی کا نام نمایاں اور اہم ہے جو صلہ رحمی کرنے والوں کو قریشی اکابر سے بچاتے تھے)۔

مسلم سماجی تنظیم کا حق:

قریشی اکابر کو بالخصوص اور دوسرے باشندگانِ مکہ کو بالعموم اسلام سے اور رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم سے سب سے بڑا شکوہ یہ تھا کہ انہوں نے خاندان قریش کے سماجی اتحاد اور قومی وحدت ویگانگت کو پارہ پارہ کر دیا اور دین کے اختلاف نے خاندانی نظام کو غتر بود کر دیا۔ ان کا شکوہ بجا تھا اور ان کا قلق واندوہ قابل فہم۔ حقیقت یہ تھی کہ قریش اور مکہ کے تمام خاندان وبطون دو دینی اکائیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ہی خاندان میں بعض مسلمان تھے اور بعض غیر مسلم۔ باپ مسلمان تھا تو بڑا بیٹا غیر مسلم جیسے خاندان ابوبکر صدیقؓ میں ہوا تھا۔ بیٹا مسلمان تھا تو باپ غیر مسلم جیسے ابوبکر صدیق مسلمان تھے اور ان کے باپ ابوقحافہ غیر مسلم۔ اسی طرح شوہر مسلمان تھا تو بیوی کافر یا اس کے برعکس معاملہ تھا۔ خاندانوں کی اس دینی اور مذہبی تقسیم نے قریشی اکابر دافراد کو جن مسائل اندوہ سے دوچار کیا تو کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ایک مسئلہ پیدا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ہر خاندان کے مسلم ارکان اسلام کی بنا پر اپنے خاندان کے سربراہوں کے مظالم کا ہدف بن گئے تھے اور اپنے ہی گھر میں اچھوت تھے (ابن ہشام نے بطور خاص ابن اسحاق کی روایت پر قریشی خاندانوں کے دین اسلام کی بنا پر مختلف حصوں میں منقسم ہوجانے کا ذکر کیا ہے۔ ابن ہشام ۱/۲۶۷۔۲۷۰، سہیلی ۳/۴۶۔۴۷ومابعد: "يفرق به بين المرء وابيه واخيه، وبين المرء وزوجته، وبين المرء وعشيرته"۔ مکی اسوۂ نبوی، ۱۴۵۔۱۴۹ اور مابعد پر مفصل بحث ہے)۔

اس سے زیادہ قریشی خاندانوں اور دوسرے مکی مسلمانوں کے افراد کا سماجی اور نفسیاتی مسئلہ یہ تھا کہ وہ بے گھر بن گئے تھے، وہ اپنے خاندان سے تو کٹ گئے تھے اور کسی دوسرے خاندان سے جڑ کر ان کے فرد ورکن بھی نہ بن سکے تھے کہ بیچ میں دین کی خلیج حائل تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کا حل "اسلامی مواخاۃ" کے طریقے سے نکالا جس کا دارومدار دینی رشتہ اور مذہبی اخوت پر ہے اور جس کا ذکر قرآن وحدیث میں پایا جاتا ہے، اور صرف ذکر ہی نہیں بلکہ اس مذہبی اخوت اور دینی یگانگت کی سماجی قوت وتنظیمی طاقت کا بھی، اسی کو "مکی مواخاۃ" کتب سیرت وحدیث میں کہا گیا ہے جس کا ذکر بالعموم صاحبانِ سیرت اس کے صحیح مقام پر نہ کرکے اس کی

اہمیت ختم کردیتے ہیں۔مکی مواخاۃ کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نیا سماجی نظام برپا کیا تھا اور اخوت اسلامی کا ہمہ گیر اور محبت آگہی نظریہ وعمل دیا تھا۔قریش کے دو خاندانوں کے دو افراد کو ان کے سماجی، معاشی، تہذیبی اور دینی اور بعض دوسری حیثیتوں کو مدنظر رکھ کر ایک دوسرے کا بھائی بنادیا تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ تیمی کو حضرت عمر بن خطاب عدوی کا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کو حضرت عثمان بن عفان اموی کا، حضرت طلحہ بن عبداللہ تیمی کو حضرت زبیر بن عوام اسدی کا، حضرت مصعب بن عمیر عبدری کو حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کا، اور اسی طرح تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا برادر بنایا تھا۔وہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے رفیق وصاحب تھے۔حتی کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک کی موت کی صورت میں دوسرے کو عزیزوں کی موجودگی میں وراثت کا حق بھی رہا تھا۔اس مکی مواخاۃ کا زمانہ ۶ /۶۱۶ بعد نبوت کا زمانہ ہے۔اس کا اثر اتنا دوررس اور عظیم تھا کہ مواخاۃ کے دونوں بھائی ہمیشہ ایک دوسرے کے گہرے رفیق، محبت، آگہی، عزیز اور زندگی کے ساتھی رہے اور اسی نے پہلی بار مکہ مکرمہ میں اخوت اسلامی کی تشکیل کی جس پر بعد میں ارتقاء ہوا (مکی اسوۂ نبوی، ۱۴۹-۱۵۹ پر مفصل بحث ہے نیز ملاحظہ ہو مضمون خاکسار ''مکی مواخات اسلامی معاشرہ کی اولین تنظیم''، معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۹۷-جنوری ۱۹۹۸ء بالعموم تمام جدید سیرت نگار اور بعض؛ بلکہ اکثر قدیم اہل سیر بھی مکی مواخاۃ کا ذکر مدنی مواخاۃ کے ضمن میں کرتے ہیں اور بہت ہی سرسری طریقے سے۔وہ دونوں مواخاۃ کی اہمیت بھی نہیں جانتے ہیں۔مدنی مواخاۃ کا بیان بھی تشنہ ہوتا ہے۔ملاحظہ ہو: شبلی، مودودی، ادریس کاندھلوی، قاضی سلیمان منصور پوری وغیرہ کی متعلقہ بحثیں۔

اقتصادی اور معاشی حقوق:

مکی عہد میں دور جاہلی سے عہد اسلامی کے اواخر تک مسلمان افراد وطبقات اپنے معاشی نظام سے اسی طرح وابستہ رہے۔ہمیشہ سے تقدیر الٰہی کے فیصلہ کے تحت انسانی اقتصاد ومعاش کے چار بنیادی ذرائع رہے ہیں: تجارت، زراعت، حرفت اور مزدوری۔قریش مکہ اور دوسرے

ساکنانِ ارضِ حرم بنیادی طور سے تاجر تھے۔ معمولی پھیری لگانے والوں، دوکانداروں سے لے کر بین الاقوامی تجارت تک۔ وہ یمن اور شام اور ان کے واسطے سے دوسرے ملکوں سے بین الاقوامی تجارت کرتے تھے۔ قریش مکہ کی تجارتی ریڑھ کی ہڈی شام سے تجارت تھی۔ مسلمان تاجرانِ مکہ یمن وشام اور دوسرے اسواق (بازار) عرب میں تجارت کرتے رہے۔ بلکہ اسلامی مکی دور میں ان کی تجارت میں ترقی ہوئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تجارتی نمائندوں یعنی اکابر قریش اور دوسرے تاجروں کو مال دے کر شام وغیرہ سے بعد نبوت بھی تجارت کرتے رہے۔ صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر، عثمان، عبدالرحمٰن زہری، سعد بن ابی وقاص زہری، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، زبیر بن عوام اسدی وغیرہ شامی تجارت میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے مکی اور قریشی تاجروں کی تجارتی کارکردگی کا ذکر ملتا ہے۔ اس تجارت کے مشغلہ سے وابستہ کئی جہات تھے:

(۱) تجارتی لین دین اور شراکت ومضاربت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اسی طرح جاری رہی جیسی عہد جاہلی سے چلی آرہی تھی۔

(۲) بسا اوقات ایک ہی کاروانِ تجارت میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک ہوتے تھے۔

(۳) مسلم تجارت کاروانوں کی ایک ممتاز اور نئی طرح اور ریت قائم ہوئی کہ مسلمان مکی تاجروں نے اپنے خاص کارواں ترتیب دئے۔

(۴) کافر تجارت مسلمان صاحب مال کے ساتھ مضاربت وشراکت کی بنا پر تجارت کرتے تھے اور برعکس بھی واقعہ تھا۔

(۵) تجارتی ندیمی کا رشتہ اختلاف دین کے باوجود مسلمانوں اور غیر مسلم قریشیوں وغیرہ کے درمیان جاری رہا۔

ان کے علاوہ متعدد دوسرے جہات وابعاد تھے۔ ان کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ قریشِ مکہ اور

عرب قبائل نے مسلمانوں کے تجارتی حقوق کو تسلیم کیا تھا۔

زراعت:

اگرچہ مکہ مکرمہ کی سرزمین زراعت کے لیے غیر موزوں تھی تاہم مکی اکابر اور شیوخ قریش کے باغات اور زرعی اموال قریبی عظیم شہر وعلاقہ طائف وثقیف میں موجود تھے جہاں وہ زراعت کرتے تھے اور باغات لگاتے تھے اور ان سے زرعی پیداواریں حاصل کرتے تھے۔ ان میں بعض مسلم زرعی جائدادیں اور اموال تھے۔

صنعت وحرفت:

اس کا ذکر کم ملتا ہے لیکن بعض مسلم خواتین حضرات کی حرفت وکاریگری کا ذکر پایا جاتا ہے، اسی طرح ان کے دوسرے پیشوں کا بھی، ان میں حضرت خباب بن ارت تمیمی لوہاری کا کام کرتے تھے اور مالدار تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص زہری تاجر بھی تھے اور تیر گر صنعت کار تھے۔

مزدوری:

ہاتھ سے کام کر کے کمانے والے بہت تھے اور وہ اپنی مزدوری سے اپنی روزی روٹی کماتے تھے۔
ان تمام معاشی اور اقتصادی پیشوں اور طریقوں سے وابستگی کے حق کو قریش نے تسلیم کیا تھا؛ اگرچہ بعض اوقات وہ زیادتی بھی کرتے تھے جو دوسری چیز تھی (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: مکی اسوۂ نبوی، ۱۶۰۔۱۶۸ کی فصل ''مکی امت اسلامی کی اقتصادی تنظیم'' نیز دوسرے مقالات وکتب خاکسار جیسے غزوات نبوی کی اقتصادی جہات، علی گڑھ ۱۹۹۹ء۔

دینی مساوات وخیر خواہی کا حق:

دینی اخوت اور مذہبی یگانگت بڑی کرشمہ ساز ہوتی ہے۔ وہ خون، وطن، سرحد اور شعور

وادراک کو بھی پار کر جاتی ہیں۔ اسلامی اخوت میں خالص دینی اور مذہبی یگانگت ووابستگی کے علاوہ الٰہی تاثیر اور محبت نبوی کی دلسوز اثر انگیزی بھی شامل ہے۔ توحید کے رشتے نے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس میں فکری صلاحیت وملک کے ساتھ شخصی محبت اور حسی یگانگت کی آگ بھر دی ہے۔ عہد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جیتی جاگتی شخصیت، سحر انگیز سیرت اور اندرونِ خاطر میں تیر نیم کش کی مانند گھس جانے والی محبت وعقیدت نے ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ترین شخصیت بنا دیا تھا تو دوسری طرف ان کے امتیوں کے لیے یکراں محبت پیدا کر دی تھی۔

ان تمام عناصر وعوامل کے ساتھ اقلیت سے وابستگی کا فطری مادۂ ربط وارتباط بھی صحابہ کرام کو ایک دوسرے سے پیوست کرتا تھا۔ رہی سہی کسر کمی مواخاۃ کے کرشمائی طریقۂ نبوی نے ان کو ایک الگ ومنفرد وممتاز امت بنا دینے کا ادراک وشعور بھی بخش دیا تھا۔

حدیث نبوی کہ "مسلمان جسد واحد کی مانند ہیں کہ ایک عضو کی بیماری اور بے خوابی تمام جسم وجان کو مبتلائے آزار کر دیتی ہے۔" کا زمانہ ارشاد وترسیل کچھ بھی رہا ہو اس کی واقعیت ابدی اور آفاقی ہے کہ مسلمان اپنے بھائی کے غم پر دکھی اور مسرت پر خوش ہوتا ہے۔ اس آفاقی محبت وتعلقِ خاطر نے صحابہ کرام کو اور ان سے زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دوسرے سے مواسات وخیر خواہی کا جذبہ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو خیر اپنے دشمنوں اور انجان "قوموں" کی خیر خواہی طلب فرماتے تھے کہ سب ان کے ہی امتی اور ان کے اپنے تھے۔ وہ تمام مسلمانان مکہ وعرب کا ہر وقت اور ہر آن اور ہر مقام پر خیال رکھتے تھے اور صحابہ کرام اپنے ہم دینوں خاص کر کمزوروں کا خیال رکھتے تھے۔ عام حالات کے بعد جب سخت حالات شروع ہوئے اور کمزور مسلمانوں پر بالخصوص "تعذیب وابتلاء" قریش کا سلسلہ ظالمانہ شروع ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور طاقتور صحابہ ان کی مواسات کرتے، ان کو تسلی وتشفی دیتے اور ان کے عذاب کو کم کرنے

کی سبیل نکالتے۔

دینی مواسات وخیر خواہی کا یہ فریضہ تھا صاحبان استطاعت پر اور ان پر کمزور و پریشان مسلمانوں کا حق تھا۔ مکی دور اقلیت میں اسی حق و فریضہ۔ ،مالدار مسلمانوں اور ان کے عظیم الشان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مال کے ذریعہ قید غلامی سے آزاد کرایا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ مال خدیجہ اور مال ابوبکر نے جتنا میرا کام کیا وہ کسی نے نہیں کیا؛ کا مطلب یہی تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرات بلال، زنیرہ، ام عبیس وغیرہ غلامان و کنیزان قوم کو آزاد کرایا اور مال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نہ جانے کتنوں کا دامن مسرت و آزادی سے بھر دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلم غلاموں اور کمزوروں کو صحابہ کے ذریعے آزاد کئے جانے کی واقعیت و حقانیت سے واقف تھے لہذا وہ ان کو مال کے بدلے بیچ دیتے تھے۔ اسی سنت نبوی اور تعامل صحابہ نے مسلمان قیدیوں، اسیروں، غلاموں اور باندیوں کو قید سے چھڑانے اور آزاد کرانے کے احکام جاری کرائے تھے (مکی اسوۂ نبوی کی فصل: ''کمزور طبقات کی شیرازہ بندی''، ۱۵۹۔۱۶۰؛ بالعموم جدید و قدیم سیرت نگاروں نے حضرت ابوبکر صدیق کے مظلوم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی روایات پر ایک واقعہ رسلسلۂ واقعات کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور اس کو ایک اجتماعی کام یا جماعت کی شیرازہ بندی کے منصوبۂ نبوی کے بطور نہیں بیان کیا۔ ملاحظہ ہو: شبلی ۱/ ۲۲۸۔۲۳۱؛ مودودی ۲/ ۵۴۹۔۵۵۱)۔

مکی سماجی زندگی سے وابستگی کا حق:

کوئی بھی اقلیت اپنی اکثریت سے قطعی لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لاتعلقی اور اعتزال کا رویہ نہیں اپنایا، کفار سے علیحدگی اور ''اعتزال'' اور طاغوت سے اجتناب واحتراز'' کا فلسفہ و فکر مطلق نہیں، مشروط ہے اور اسوۂ ابراہیمی سے مطلق استناد غلط۔ تمام گذشتہ رسولوں اور نبیوں کو بالعموم اور سید المرسلین اور خاتم النبیین کو بالخصوص کافروں اور مشرکوں کو دعوت اسلام دینی تھی اور صحابہ کرام کو بھی کار دعوت انجام دینا تھا، لہٰذا وہ ان سے قطعی لاتعلق نہیں رہ سکتے

تھے۔ان سے ہر طرح کا غیر مشرکانہ اختلاط ضروری تھا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے معاشرتی اختلاط، سماجی ربط وضبط اور سیاسی واقتصادی تعاون واشتراک بہر حال جاری رکھا۔ اس کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ قریش کے اکابر ومالدار اشخاص بعد نبوت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی ''امانت'' رکھواتے تھے جو ہجرت تک تحویل نبوی میں رہیں یہ ایک طویل بحث ہے، لہٰذا اس کے خاص خاص نکات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ مکی مسلم اقلیت کے قریشی جاہلی اکثریت کے ساتھ سماجی ارتباط وتعلق کا ایک وسیع منظر نامہ اپنے جامع اور مختصر چوکھٹے میں نظر آجائے (مکی اسوۂ نبوی، ۱۶۸-۱۷۱ بحوالہ بلاذری ۱/۱۱۸-۱۱۹؛ طبری، ۳/۱۰۷؛ شبلی ۱/۲۱۰)۔

مشترکہ خاندان/بطن سے وابستگی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خاندانوں سے ان کے رکن کی طرح وابستہ رہے اپنے اعمام وعمات (چچاؤں، پھوپھیوں) کے علاوہ دوسرے تمام رشتہ داروں سے تمام سماجی تعلقات برقرار رکھے۔ان کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ابو طالب ہاشمی سے قریشی اکابر کے وفود کے واقعات، بنو ہاشم وبنو مطلب کی قومی حمایت اور سماجی مقاطعہ کے واقعات ان کا ثبوت ہیں۔اسی طرح تمام صحابہ کرام اپنے مشترکہ خاندانوں سے وابستہ رہے، غیر مسلم اجداد وآباء کافر ومشرک رشتہ داروں حتی کہ کافر بیویوں سے تعلق رکھا۔مکی دور میں کافر اور مشرک بیویوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے کی اجازت الٰہی ان ہی خاص مصالح کی بنا پر دی گئی تھی۔

کھانے پینے اور سماجی رسوم میں اشتراک:

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف جمحی جیسے دشمنوں کی دعوت طعام تک قبول فرمائی تھی۔وہ اپنے تمام چچاؤں اور پھوپھیوں کے گھروں میں کھاتے پیتے تھے خاص طور سے ابوطالب ہاشمی اور دوسرے اعزہ کا گھران کا طعام گاہ بھی تھا۔ان کی شادی بیاہ میں شریک ہوتے،

ان کے دوسرے رسوم وتقریبات میں حصہ لیتے، اوران کے جنازے اور تدفین میں تشریف لے جاتے تھے۔ متعدد صحابہ کرام کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے کافر ومشرک آباو اجداد کے گھروں میں کھاتے پیتے تھے اور رہتے سہتے تھے؛ تا آنکہ ان پر رزق حرام اور دروازہ بند نہ کردیا گیا۔ مسلمان فرزندوں اور دختروں اور بیویوں نے بالترتیب اپنے والدین، آباء واعزہ اور شوہروں کے تمام سماجی حقوق مکی دور میں ادا کیے۔ ان کے حسن اخلاق نے ان کے ولوں میں جگہ بنائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بوڑھے باپ ابوقحافہ کی دیکھ بھال خاص اپنی ایک بہن کے سپرد کی اور جب ہجرت کی تو بہن کو (مسلم بہن کو) باپ کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے چھوڑ گئے۔ ایسی مثالیں بہت سی ہیں (مذکورہ بالا حوالہ بلاذری ۱/ ۱۳۷۔ ۱۳۸ برائے دعوت ابی بن خلف جمحی۔ ابن ہشام وغیرہ میں مکی سابقین اولین کے اپنے آباء واجداد کے گھروں میں کھانے پینے اور رہنے سہنے کے واقعات مذکور ہیں۔ ابوطالب ہاشمی کے گھر میں نبوی طعام وسکونت ایک مسلمہ واقعہ ہے)۔

سیاسی/قومی معاملات میں اشتراک کا حق:

کوئی اکثریت اپنی قومی زندگی میں اقلیتوں کے تمام معاملات یا دین سے بے تعلق رہ سکتی ہے اور نہ ان کو قومی دھارے سے نکال سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بھی اقلیت اپنی قومی اور سیاسی زندگی اور اس کے مسلمہ ومشترکہ اداروں اور اکائیوں سے اپنے کو بیدخل نہیں کرسکتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اقلیتوں کے حقوق کی بربادی تو ہوتی ہے اکثریتی قومی زندگی بھی توازن کھو بیٹھتی ہے اور ایک بڑے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ جاہلی عرب میں بالخصوص مکہ مکرمہ کے قریش میں ایک سیاسی نظام تھا جو کتنا ہی ڈھیلا ڈھالا رہا ہو بہرحال قومی زندگی کو ایک رشتہ میں باندھ رہا تھا قومی قریشی ''ملأ دمجلس'' کے کم از کم بارہ اہم مناصب وشؤن تھے جن کو موروثی طور سے تمام اہم ترین بطون میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ قیادہ (فوجی قیادت وسالاروں) بنوامیہ میں تھی تو شہسوار فوج وپرچم کی ذمہ داری بنومخزوم وبنواسد کی تھی، سقایہ ورفادہ بھی بنوہاشم اور بنوعبدالدار

وغیرہ نے حجاج کی سہولت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ کلید کعبہ اور حجابت وتولیت بیت اللہ بنو عبدالدار کی تھی اور سفارت قریش کا منصب بنو عدی کے پاس تھا اور مال وانساب اور مفاخرہ ومنافرہ کا منصب بنوتیم کے پاس تھا۔ اسی طرح بنو جمح اور بنوسہم کے پاس مناصب تھے (شبلی ۱؍۲۱۱۔۲۱۳ وغیرہ نے ان مناصب قریش وغیرہ کی تفصیل عقد الفرید یا ابن ہشام جیسے سیرت نگاروں سے لی ہے۔ ان میں بنو امیہ کے منصب قیادہ (قریشی افواج کی سپہ سالاری وکمان) کا ذکر بالعموم نہیں کیا جاتا اگرچہ جنگ فجار وغیرہ کے حوالے سے انھوں نے کیا بھی ہے۔ ازرقی، اخبار مکہ ۶۱، نے ان کی تفصیل اور نسل در نسل ان کی منتقلی زیادہ بہتر طریقے سے کی ہے۔ خاکسار کا مضمون: بنو عبد مناف پر ملاحظہ ہو)۔

ان مناصب مکہ میں سے کم از کم تین مکی مسلمانوں کے پاس ہی رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نسب قریش اور مفاخرہ کا اسی طرح منصبدار رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریش کے قومی سفیر کبیر بنے رہے۔ حتی کہ سخت آویزش کے باوجود مدنی دور میں حضرت طلحہ بن عثمان عبداللہ جب مسلمان ہوئے تو حسب سابق کلید کعبہ کے مالک اور حجابت وتولیت بیت اللہ کے منصبدار بنے رہے۔ امکان ہے کہ اور بھی مسلم منصبدار اپنے عہدے پر قائم رہے تھے۔ اس باب میں دو اہم ترین نکات یا جہات قابل غور ہیں: اول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان مسلمان منصبداروں سے اپنے مناصب چھوڑنے کا حکم نہیں دیا؛ کیونکہ وہ اسلامی طریق سیاست، نبوی سماجی طریقت اور عرب قومیت کے خلاف تھا۔ حجابت کی مثال اہم ترین ہے۔ دوسرے قریش مکہ نے بھی اختلاف دین یا اسلام کے قبول کرنے کے بعد ان منصبداروں کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ قومی اتحاد کے خلاف جاتی، بلاشبہ انہوں نے مسلمانوں اور ان کے امراء وقائدین کو ایسے تمام معاملات سے الگ رکھا تھا جن کا مقصد مسلمانوں کو دینی نقصان پہنچانا تھا۔ سیاست، سماج ومعاشرت، تجارت واقتصاد میں وہ دینی تقسیم اور مذہبی ''اعتزال'' کے خلاف ہی تھے کہ وہ پوری قومی زندگی کو متاثر کرتا۔ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام قریش مکہ کے ساتھ دینی معاملات میں اشتراک کرتے تھے جو ان کے درمیان دین

حنفی ابراہیمی کے سبب مشترک تھے: وہ طواف کعبہ ساتھ ساتھ کرتے، مشرک قریش اور کافر عربوں کے ساتھ حج وعمرہ کرتے، ان کے ساتھ جوار واعتکاف کرتے، ان کے ساتھ نماز چاشت پڑھتے اور دوسرے بہت سے امور ''تحنث'' (تعبد وتبرر) انجام دیتے تھے (مکی اسوۂ نبوی، ۱۷۱میں یہ بحث تشنہ رہ گئی ہے اس پر مزید تحقیق وتفصیل کی ضرورت ہے)۔

ہجرت کا حق وفلسفہ:

ہجرت نبوت کا ایک لازمہ ہے۔ اس واقعیت کا اظہار حضرت ورقہ بن نوفل اسدی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ رسالت محمدی کی تصدیق کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قوم نکالے گی، حیرت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تھا کہ کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟ جواب دیا تھا کہ جو شخص بھی ایسا پیغام لے کر آیا اسے ضرور جلا وطن ہونا پڑا۔ حضرت ورقہ بن نوفل کے اس بیان میں انبیاء کرام کی ہجرتوں کی تاریخ مستور اور واقعیت مضمر وموجود تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مرسل ونبی فرزندوں کی ہجرتوں کی تاریخ وواقعیت سے عرب، قریش اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی واقف تھے (بخاری، کتاب بدء الوحی، نیز مسلم، باب بدء الوحی؛ نیز شبلی ۱/۱۲۹ ومابعد: سلسلہ اسماعیل میں حضرت ابراہیم کی ہجرت وغیرہ نیز مکی اسوۂ نبوی کا باب ہجرت مدینہ وحبشہ)۔

فلسفۂ ہجرت تو یہ ہے کہ کفر وشرک کے غلبہ اور معاندین واعداء کی ستمگری حد سے بڑھ جاتی ہے تو رسول کو وطن سے دور کسی اور زرخیز یا نم مٹی میں ایمان ویقین کا بیج ڈالنے ہوتے ہیں اور اکثر وبیشتر ان کی ہجرت کے بعد ان کا وطن عذاب کی لپیٹ میں آ جاتا ہے کہ ان میں قبول حق کا مادہ ہی نہیں رہ جاتا اور ان کی عداوت دین وحق ان کے لیے غضب الٰہی کو دعوت دیتی ہے۔ انبیاء ومومنین کی ہجرت کا حق تمام انسانی دستوری اور بشری معاشروں نے تسلیم کیا ہے اور ان کو ہجرت کرنے پر اکساتے بھی رہے ہیں یا مجبور کرتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ ہجرت کی راہ میں

مانع دشمن کو عذاب الٰہی نے جلد آ پکڑا جیسے فرعون مصر غرقاب قلزم ہوا تھا (ہجرت انبیاء پر سب سے مستند بیانات قرآن مجید میں ان سے متعلقہ آیات کریمہ میں موجود ہیں۔مکی اسوۂ نبوی، ۲۳۱ بالخصوص)۔

سیرت نبوی اور تاریخ صحابہ کرام میں ہجرت کے متعدد مصالح وعوامل تھے۔ان میں تحفظ وحفاظت کا سبب فوری تھا، ہجرت حبشہ کی روداد سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام میں بعض نے جب یہ دیکھا کہ وہ تو اپنی اپنی قوم کی حمایت کے سبب محفوظ ہیں لیکن بہت سے قریشی خاندانوں کے جوان وبے بس صحابہ اور کمزور مسلمان پنجۂ استبداد میں پھنسے ہوئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔اس اذن نبوی میں اولین اور فوری وجہ یہ تھی کہ حبشہ کا بادشاہ غیر مسلم اور عیسائی ہونے کے باوجود عادل ہے اور اس کی انصاف پسندی سے توقع ہے کہ مسلمان وہاں اپنے وطن سے زیادہ امن وچین سے رہیں گے۔سوسوا سو مسلمان مرد وعورت اور بچے ایک دو ہجرتوں یا مسلسل ہجرت کے ذریعہ مکہ مکرمہ سے حبشہ ہجرت کر گئے اور امان پا گئے۔یہ عجیب مصلحت الٰہی اور حکمتِ تقدیری تھی کہ جو سب سے زیادہ کشتۂ تیغ ستم تھے وہ ہجرت نہ کر سکے کہ کمزوری ہی نہیں غلامی کے بندھنوں کے اسیر تھے۔اکابر قریش میں سے اکثر نے اس ہجرت کو بخوشی یا بھاری دل سے برداشت کیا مگر معاندین کا سخت ترین طبقہ صحابہ کرام کے ایک بڑے نوجوان طبقے کے اس طرح اپنے چنگل سے نکل جانے پر بے چین وبیتاب تھا؛ لہٰذا اس نے ان کی واپسی کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ عادل حکمراں کے منصفانہ طریق سیاست سے مات کھا گئی اور مسلمان مہاجرین نے جب تک چاہا دارالامان میں قیام کیا (ابن ہشام ا/ ۳۴۳-۳۴۴ ومابعد، بلاذری ا/ ۱۹۸ ومابعد؛ مکی اسوۂ نبوی، ۱۰۳-۱۱۷ ومابعد)۔

ہجرت مدینہ:

حبشہ کی ہجرت ۵-۶ نبوی/ ۶۱۵-۶۱۶ء ایک مشکل کا فوری حل اور تحفظ حاصل کرنے کا ایک عارضی معاملہ تھا۔یہ حقیقت سب کو معلوم تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وحی الٰہی اور

حکمت نبوی کا استناد حاصل تھا، مہاجرین اور اکابر قریش کو فراست کا؛ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بہت سے قریشی طاقتور وصاحب استطاعت ومنزلت صحابہ کرام ابھی تک مکہ مکرمہ میں موجود تھے۔ مدتوں سے صحابہ کرام سے زیادہ اکابر قریش اور شیوخ قبائل دیکھتے آرہے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے باہر کسی امن کی تلاش میں تھے؛ خاص طور سے ابو طالب ہاشمی کی وفات کی وجہ سے حمایت بنی ہاشم سے محرومی اور سفر طائف کے سانحہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تمام طاقتور قبائل عرب اور ان کے شیوخ وسادات سے ایمان واسلام کے ساتھ ساتھ نصرت وحمایت کا دوگانہ مطالبہ فرمارہے تھے۔ اس کا مطلب سب پر واضح تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مامن ومستقر فراہم کرنے والے قبیلہ وعلاقے میں جابسنے کا الٰہی منصوبہ وعمل رکھتے تھے، لیکن قبائل عرب میں سے بعض قریشی طاقت سے خوفزدہ تھے، بعض عرب وایران دونوں کی مخالفت کے امکانات سے لرزہ براندام تھے، بعض دوسرے سیاسی اقتدار وحکومت اور دینی بالادستی کی صورت میں اشتراک ووراثت اور جانشینی کے طالب تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور نہ تھا (مودودی، ۲/ ۶۸۳۔ ۶۹۰ ومابعد میں اس پر کافی بحث ہے؛ شبلی ۱/ ۲۵۲ وغیرہ)۔

بالآخر ہجرت سے تین سال قبل ۶۲۰ء میں خزرج کے "چھ سرداروں سے" اتفاقیہ نہیں منصوبہ بندی کے مطابق ملاقات ہوئی، وہ عام حجاج وزائرین نہیں تھے بلکہ اپنے قبیلۂ خزرج کے چھ سربرآوردہ افراد تھے جو اپنے ہم وطن وعزیز قبیلہ اوس کے خلاف قریشی فوجی معاونت حاصل کرنے آئے تھے۔ انھوں نے ہم وطن یہودی علماء کی پیشنگوئیوں اور دوسرے اسباب سے پیغام نبوی فوراً قبول کیا اور نصرت وحمایت کے معاہدہ کی تکمیل کے لیے ایک سال کی مہلت مانگی جو مل گئی۔ یہ ایسی خفیہ ملاقات تھی جس کی سن گن بھی قریش کو نہ مل سکی۔ اگلے سال ۶۲۱ء کے حج کے موقعہ پر اوس وخزرج کے حاجیوں کے قافلے سے چھ خزرجی سرداروں اور تین اوسی شیوخ نے ملاقات کر کے معاہدہ کیا، یہ نکتہ قابل غور اور اہم ترین ہے کہ اولین بیعت عقبہ میں شریک دونوں

محارب قبائل مدینہ کے شیوخ تھے اور وہ ظاہر ہے کہ اولین خزرجی سرداروں کی دینی وسماجی اور سیاسی تدبیروں کی بنا پر ہی باہمی آویزش بھلا کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی وسیاسی قیادت قبول کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ ۶۲۱-۶۲۲ء کی یک سالہ مختصر مدت میں اوس وخزرج کے جوشیلے اور فہیم وفطین سرداروں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ ونقیب حضرت مصعب بن عمیر عبدری کی پیہم کوششوں نے یثرب کو دارالامان سے دارالاسلام بنا دیا اور اس کی آبادی کو مسلم اکثریت میں بدل دیا۔ بیعت عقبہ ثانیہ نے نصرت وحمایت کا معاہدہ پکا کر دیا جس میں قابل ذکر تمام شخصیات نے حصہ لیا اور اس نے ہجرت نبوی وصحابہ کرام کی راہ ہموار کر دی۔ یہ مستقل ہجرت تھی اور تحفظ کا مستقل نظام تھا۔ اسی نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ پہنچایا اور مکی صحابہ کرام کو بھی ایک نیا اور مستقل وطن دیا (مکی اسوۂ نبوی، ۲۳۵-۲۴۲؛ فتح الباری، ۷/ ۳۲۴-۳۲۶ وغیرہ)۔

اسلامی ریاست مدینہ میں اقلیتوں کے حقوق:

۱ھ/ ۶۲۲ء میں ہجرت مدینہ بالخصوص ریاست اسلامی کے قیام کے بعد اقلیتوں کے حقوق کا منظرنامہ خاصا بدل گیا۔ مکہ مکرمہ میں اقلیتی حقوق کے طالب مدینہ منورہ میں ان کے عطا کرنے والے بن گئے۔ اب غیر مسلم بالخصوص یہودی اقلیت میں تھے۔ مسلمان اکثریت میں ہونے کے ساتھ ساتھ حکمراں بن چکے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف معاہدے کئے اور ان کا مجموعہ ''میثاق مدینہ/دستور مدینہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ غیر مسلم طبقات اور قبائل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول آخر الزماں جانتے ہوئے بھی نہیں تسلیم کیا مگر سیاسی قیادت وحکمرانی تسلیم کر لی۔ جغرافیائی سیاست (Geo-Politics) کے فطری اور بے لچک تقاضوں کے سامنے ان کے لیے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ''مدنی مواخاۃ'' اور دوسرے سیاسی ودینی اقدامات کے بعد ایک وسیع تر اسلامی امت کا روز افزوں سلسلہ چل نکلا تھا۔ مکہ مکرمہ میں صرف قریشی قبیلوں اور دوسرے مکی خاندانوں کے افراد وطبقات پر اولین اور اصل امت

اسلامی بنی تھی جو کافی محدود تھی۔ مدینہ منورہ میں اسی ملی دینی بنیاد اور سماجی معاشرتی تنظیم پر ایک وسیع تر امت اسلامی میں مہاجرین وانصار کے دو طبقات کو متحد کیا گیا۔ اس وسیع تر امت اسلامی کی اساس دین اسلام پر تھی لہٰذا وہ اصطلاح ''دستور مدینہ'' کے مطابق تمام انسانوں سے ممتاز و منفرد تھی۔ اس کے ساتھ غیر مسلموں بالخصوص یہودیوں کو امت مسلمہ کا رکن نہیں بنایا جا سکتا تھا کہ ان کے دین و شریعت اور رسول جدا تھے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی بالادستی یعنی اطاعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرے سے بھی خارج تھے؛ لہٰذا ان کو امت اسلامی کا ''شریک و معاہد'' بنایا گیا۔ معاہدوں کے ذریعہ ان کو سیاسی نظام اور انتظامیہ سے وابستہ کیا گیا اور ان کے فرائض وحقوق دونوں متعین وواضح کیے گئے۔

اسلامی ریاست مدینہ کے سیاسی میثاق کے تحت تمام باشندگان حرم مدینہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بالادستی تسلیم کی اور اس کے تحت مدینہ منورہ کو دوسرا ''مقدس حرم'' مانا جس میں جنگ وجدال اور قتال وحرب مکہ کی طرح حرام ٹھہرا۔ ریاست مدینہ کی حفاظت اور باہری حملہ کی صورت میں اس کا دفاع اور جنگ وحرب کی صورت میں مالی اخراجات برداشت کرنا ان کا فرض بنا۔ سربراہ مملکت کی ہر سیاسی اور جنگی معاملے میں اطاعت لازمی قرار دی گئی اور ان کی اجازت کے بغیر کسی کو جنگ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا، بین القومی یا مسلمان وغیر مسلم کے درمیان اختلاف اور لڑائی جھگڑے عدالت نبوی میں لانے اور فیصل کرانے اور ان کو تسلیم کرنے بھی لازمی تھے۔ فوجداری کے معاملات، دشمنوں کو مدینہ میں پناہ نہ دینے اور قریش کی حمایت وغیرہ کرنے کی پابندی عائد کی گئی۔ دیت وقصاص کے معاملات میں حسب دستور قبائل ادا کرنے کی ضمانت لی گئی۔ ایسے ہی مختلف احکام ودفعات کے تحت وہ اسلامی ریاست کے ''ذمی'' بن گئے

(مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول بالخصوص دستور مدینہ پر بحث۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے اہل علم نے بھی یہود مدینہ کو اسلامی امت میں شامل اور رکن بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

اگر اسلامی امت کی اساس دین اسلام تھی تو یہودی اس کے رکن کیسے ہو سکتے ہیں؟ میثاق مدینہ کی اولین دفعہ ہی اسلامی امت کو سارے انسانوں سے ممتاز بتاتی ہے)۔

ذمی یا اہل الذمہ کی حیثیت سے یہودی قبائل وطبقات کو وہ تمام سماجی، دینی، تمدنی حقوق دیئے گئے جو مسلم اقلیت نے مکہ مکرمہ میں قریش سے طلب کئے تھے اور جن کو اس زمانے کے سیاسی دستور اور نظام نے ہر جگہ تسلیم بھی کیا تھا۔ ان میں سب سے اہم جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا حق تھا جو ان کو میثاق مدینہ کی متعدد دفعات نے عطا کیا تھا اور جس پر اسلامی ریاست کا برابر عمل رہا، جن یہودی اشخاص کو قتل کیا گیا وہ ریاست اسلامی کے خلاف غداری کے مجرم تھے یا جنگی مجرم تھے۔ ان کو تورات کے حکم کے مطابق سزا دی گئی۔ ان کے مال وآبرو کی حفاظت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ریاست اسلامی کے خلاف اور ''دستور مدینہ'' کے معاہدہ کے برعکس بنوقینقاع اور بنونضیر کو معاہدۂ جنگ کی شق کے مطابق خود سپردگی کے بعد ان کے تمام اموال منقولہ کے ساتھ لے جانے دیا گیا حتی کہ ان سے اس اسباب کے لے جانے پر بھی تعرض نہیں کیا گیا جو انھوں نے اپنے گھروں، گڑھیوں اور مکانوں، دوکانوں کی غیر منقولہ جائدادوں سے بھی توڑ پھوڑ کر نکال لیا تھا اور ساتھ لادے لے گئے تھے؛ حالانکہ معاہدہ کے مطابق وہ دروازوں اور دیگر سامان کو لے جانے کے مجاز نہ تھے۔ اور سب سے بڑا ثبوت اور تاریخی واقعہ اور ان سے زیادہ معاہد وذمی کے ساتھ اسلامی ریاست کے حسن سلوک اور ان کے حقوق کی مثالی ادائیگی کا یہ ہے کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کو مسلمان قرضداروں سے اپنے قرضوں کی رقم وصول کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی گئی، اس عرصہ میں انھوں نے اپنے اصل مال (راس المال) تمام قرضداروں سے وصول کئے اور سودی رقوم البتہ ان کو شرط نبوی کے مطابق وصول کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ان کا مال ہی نہ تھا بلکہ وہ ان کے مذہبی صحیفہ تورات کی خلاف ورزی اور سماجی استحصال کی رقوم تھیں اور ان کو رسول آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کسی طرح روا نہیں رکھ سکتے تھے کہ وہ بہرحال دین اسلام میں

حرام رہی ہیں (تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول نیز برکات احمد۔ Mohammad & Jews، اردو ترجمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود، نئی دہلی ۱۹۷۹، وما بعد)۔

مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے تیسرے متحارب وغدار یہودی قبیلہ بنو قریظہ کو تورات کے حکم کے مطابق ہی سزا دی گئی کہ وہ اسلامی ریاست کے خلاف سازش وغداری اور جنگ کے مرتکب ہوئے تھے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے معاہدہ مدینہ کو پامال کر چکے تھے، ان کے بارے میں ایک اور مشہور روایتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے تمام بالغ مردوں کو قتل اور ان کے بچوں وعورتوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا اور ان کی تمام اموال واراضی پر قبضہ کر کے ان کے مجاہدین یا مسلمانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ تمام سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ لیکن تجزیہ نگاروں خاص کر ڈاکٹر برکات احمد اور ڈبلو این عرفات کا خیال ونظریہ یہ ہے کہ بنو قریظہ کے سازشی سرداروں کو ہی قتل کیا گیا تھا اور تمام بالغ مردوں کو نہ قتل کیا گیا تھا اور نہ ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر بیچا گیا تھا اور نہ ان کی اراضی پر قبضہ کیا گیا تھا بلکہ معاف کر دیا گیا تھا۔ مآخذ اسلامی کے متعدد واقعات وروایات اور اسلامی اصول عدالت کے منطقی دلائل اور متعدد دوسری چیزوں سے اس کو مدلل کیا گیا ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر زیادہ صحیح لگتا ہے؛ کیونکہ قتل عام کی روایات میں کافی جھول وضعف ہے اور صحیح روایات میں متعدد خاندانوں کے معاف کر دیئے جانے کا واقعہ بھی ہے (مذکورہ بالا)۔

اسلامی ریاست میں ذمی کے حقوق

عہد نبوی میں اسلامی ریاست کے دس سالہ (۱ھ ۶۲۲-۱۱ھ ۶۳۲) ارتقاء کا منظر نامہ خاصا مختلف ہے۔ اول اسلامی ریاست کے شہر مدینہ سے باہر وسیع ہونے اور رفتہ رفتہ مختلف علاقوں کو اس میں مدغم کرنے کا معاملہ ہے جو بالآخر کئی مرحلوں میں کمال کو پہونچا؛ جب وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب پر اس کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ذمی اقلیتوں

کے حقوق ومراعات کا معاملہ بھی اسی طرح کافی مختلف اور متعدد مرحلوں کا پیدا کردہ ہے جو اصول مدنیت وسیاست کے تنوع پر مبنی ہے۔ دس سالہ عہد نبوی میں ذمیوں یا ذمی اقلیتوں کے حقوق ومعاملات کی مختلف سطحیں اور صورتیں ملتی ہیں:

(۱) دستور مدینہ کے تحت عرب اور یہودی قبیلوں سے معاہدے جن کی رو سے ان کو ریاست اسلامی کا شریک کار، فرائض وحقوق میں روایات عرب کے مطابق درجہ دیا گیا تھا۔ اس کا کسی قدر مفصل ذکر اوپر آچکا۔ اسی شراکت کی بنا پر ان سے کبھی جزیہ نہیں لیا گیا۔

(۲) شہر مدینہ کے قرب وجوار میں آباد عرب قبائل — جہینہ، مزینہ، مدلج، ضمرہ وغیرہ سے دفاعی معاہدے کئے گئے۔ یعنی فریقین ایک دوسرے پر حملہ کی صورت میں ایک دوسرے کی فوجی امداد کریں گے ورنہ غیر جانبدار رہیں گے (ان معاہدوں کے متون کے لیے ملاحظہ ہو: محمد حمید اللہ، الوثائق السیاسۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، قاہرہ ۱۹۴۱ء، ۵۱۔۷۱؛ اردو ترجمہ الرسالات النبویہ از نثار احمد فاروقی، نقوش رسول نمبر لاہور ۱۹۸۲ء، ۲/ ۲۳۹۔۲۴۱؛ نیز تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول: عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں محرکات ومسائل اور مقاصد میں مفصل بحث ہے)۔

(۳) عرب قبائل پر بزور شمشیر فتح حاصل کرنے کے بعد نبوی ریاست نے دل جیتنے کی حکمت عملی اختیار کی، نہ ان پر مالی پابندی لگائی نہ ان کے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا، اور اگر بعض حالات میں بنایا تو جلد ہی مصالحانہ طریقہ سے آزاد کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ غیر مسلم ہی نہ رہے۔ اور نہ اقلیت؛ بلکہ اسلامی ریاست مدینہ کے مساوی شہری اور اہل ایمان کے ہم پلہ بن گئے

جیسے قبیلہ بنوالمصطلق وغیرہ (مذکورہ بالا تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول: قبائل عرب کی عداوت پر فصل: بدر، بنوالمصطلق اور حنین وغیرہ کے تمام قیدیوں کی رہائی پر بحث)۔

(۴) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری رضی اللہ عنہ کا غزوۂ دومۃ الجندل (۶/۶۲۸) میں بنوکلب قبیلہ کے غیر مسلم طبقات سے پہلی بار جزیہ وصول کرنا۔ وہ نقد وجنس میں تھا۔ یہ ''جزیہ علی الرقاب'' (گردنوں پر جزیہ کے محصول) کی اولین مثال تھی (ابن سید الناس۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، بیروت ۱۹۸۶ء، ۲/۱۰۵ کا بیان ہے جو ابن سعد کی روایت پر مبنی ہے کہ حکمراں بنوکلب حضرت اصبغ بن عمرو کلبی اسلام لے آئے اور ان کے ساتھ دوسرے بھی بہت سے لوگ اسلام لائے اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے وہ جزیہ عطا کر کے قائم رہے: ''وأقام من أقام علی إعطاء الجزیة۔'' یہ بیان بعض دوسرے قدیم سیرت نگاروں کے ہاں بھی ہے مگر جدید اردو سیرت نگاروں میں سے متعدد جیسے ادریس کاندھلوی، عبدالرؤف داناپوری، صفی الرحمٰن مبارکپوری وغیرہ نے صرف اس ''بیان'' کو چھوڑ دیا ہے)۔

(۵) غزوۂ خیبر اور اس کے ماتحت غزوات فدک، تیماء اور وادی القریٰ کے فتوحات اسلامی کے نتیجہ میں اقلیتوں سے ان کی زرعی اموال کی پیداواروں پر خراج لیا گیا۔ ان کی باہمی رضامندی بلکہ مفتوح قبائل کی اپنی پیشکش پر نصف پیداوار پر صلح کی گئی اور اس سے خراج یا ''جزیہ علی الارض'' کا اولین نبوی عمل اور اسلامی اصول مالیات نکلا اور اس نے نصف کو اعلیٰ شرح قرار دیا (بخاری، کتاب المغازی، غزوہ خیبر؛ فتح الباری ۷/۵۸۵ ومابعد؛ نیز تنظیم ریاست وحکومت، مالی نظام پر باب ابن ہشام، واقدی وغیرہ متعدد اہل سیر نے اور قاضی ابو یوسف، یحییٰ بن آدم جیسے متعدد فقہاء نے اپنی کتب میں اس پر بحث کی ہے۔ ابن سید الناس ۲/۱۴۴ ومابعد میں اہل سیر وعلمائے

فقہ وحدیث کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ تنظیم ریاست میں مفصل بحث ملاحظہ ہو)۔

(۶) غزوۂ تبوک کے زمانے کے دوران دومۃ الجندل کے کندی حکمراں اکیدر بن عبدالملک، ایلہ کا فرمانروا یوحنا بن رؤبہ مقنا، اذرح اور جرباء کے لوگوں سے جزیہ وخراج دونوں کی وصول یابی کی گئی، اور نقد وجنس اور جزیہ وخراج کی شروح مختلف ہیں، کسی سے ایک چوتھائی پیداوار لی گئی اور کسی سے فی کس جزیہ کے علاوہ جنس میں بھی وصولی کی گئی۔ ایلہ والوں سے کل آبادی پر جزیہ وصول کیا گیا (ابن سید الناس ۲/۲۵۹ ومابعد بحوالہ ابن اسحاق، ابن سعد وغیرہ؛ شبلی ۱/۵۶۶ علاوہ ادریس کاندھلوی، عبدالرؤف داناپوری وغیرہ نے بھی اس غزوہ کے دوران شاہ ایلہ اور باشندگان جرباء، اذرح ومقنا وغیرہ کے جزیہ پر رضامندی کا ذکر کیا ہے۔ داناپوری کی بحث خاص ''الجزیۃ'' ۳۰۷-۳۴۷ میں اس کا حوالہ ہے؛ مگر ان کا نظریہ کہ ''جزیہ کی ابتدا تبوک کے بعد ہوئی'' روایات کے خلاف ہے۔ ان کے اس بحث میں الجزیہ پر کافی اختلاف وتضاد بھی ملتا ہے اور فقہی وتاریخی لحاظ سے وہ غلط استنباطات پر مبنی ہے)۔

(۷) جنوب مشرقی قبائل بالخصوص مجوس کی اقلیت سے بھی جزیہ لیا گیا؛ حالانکہ قرآن مجید کے مطابق وہ اہل کتاب پر عائد تھا۔ اسی سے ''شبہ اہل کتاب'' کا تصور اور نظریہ اور اہل کتاب کا توسیعی عمل شروع ہوا۔ وہ فی کس ایک دینار سالانہ تھا۔ بعض روایات کے مطابق مرد وعورت دونوں اس کی ادائیگی کے پابند تھے۔ عہد نبوی میں جزیہ کی مختلف شرحیں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جو بنوتمیم کے نصرانی قبائل نے خود پیش کی تھی کہ وہ مسلمانوں پر عائد زکوۃ کی شرح یعنی ڈھائی فیصد نقد ادا کیا کریں گے کہ وہ بھی عرب ہیں (مذکورہ بالا۔ عبدالرؤف داناپوری نے بنوتغلب سے خلافت فاروقی میں جزیہ طلب کرنے کی بات کہی ہے اور وہ بلاحوالہ ہے۔ ان کا بیان بھی بلاحوالہ اور

دلچسپ ہے: "یہ بات طے پائی کہ ان سے جزیہ میں دوگنی زکوٰۃ لی جائے اور صدقہ کے نام سے لی جائے چنانچہ اسی پر معاہدہ ہو گیا اور چونکہ زکوٰۃ عورتوں سے بھی لی جاتی ہے؛ اس لیے بنی تغلب کی عورتوں سے بھی دونی زکوٰۃ مقرر رہوئی" (۳۷۴)۔ دونی زکوٰۃ کی وصولیابی کا نظریہ دانا پوری، پوری تاریخ اسلامی اور تاریخ ارتقاء صدقات اسلامی میں ایک نئی مثال ہے جسے صرف عجیب وغریب کہا جاسکتا ہے)۔

دراصل یہ بحث اسلامی محاصل جزیہ وخراج کا عہد نبوی میں ارتقاء واطلاق سے زیادہ متعلق ووابستہ ہے حقوق اہل الذمہ سے نسبتاً کم۔ اس کا مختصر حوالہ اس لیے یہاں دیا گیا کہ عہد نبوی میں اقلیتوں کے ساتھ مختلف "سلوک" کیے گئے اور مختلف اصول اپنائے گئے۔ اوران سب کا اطلاقی نتیجہ یہ تھا کہ ان کو اسلامی ریاست میں بطور اقلیتوں کے آباد رہنے کی اجازت دی گئی، ان کی جان، ان کے مال اوران کی آبرو کی حفاظت کی گئی اوراس حفاظت وشہریت کے عوض ان کو اسلامی ریاست کو ایک خاص محصول دینا ہوتا تھا۔ تمام معاملات میں بالعموم ان محاصل اسلامی کا تعین ونفاذ مفتوحہ یا صلح کے تحت مدغم ہونے والی اقلیتوں کے ساتھ "معاہدہ" پر مبنی تھا۔ اسی لیے وہ سب معاہد بھی تھے (جزیہ پر خاکسار راقم کا مقالہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ مفصل بحث کے لیے تنظیم ریاست وحکومت کے ابواب اول وچہارم فی الحال ملاحظہ ہوں)۔

تفصیلات میں جائے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ تمام یہودی، عیسائی، عرب اور مجوسی اقلیتوں کو بنیادی حق کے علاوہ ان کو دوسرے تمام حقوق حاصل تھے جیسے شخصی اور اجتماعی آزادی کا حق، دینی ومذہبی حقوق جن کے تحت وہ اپنے تمام دینی فرائض انجام دیتے اور اپنے معابد ومدارس کا انتظام کرتے تھے۔ سماجی حقوق جن میں نکاح وطلاق اور دوسرے تمام معاشرتی معاملات میں وہ آزاد تھے۔ اقتصادی ومعاشی حقوق جیسے تجارت وزراعت، حرفت واجرت کے علاوہ متعدد دوسرے مشاغل میں وہ اختیار کرسکتے تھے اور کرتے تھے حتی کہ وہ بسا اوقات ان کے تحت محض اپنی مالی برتری

اور بہتر معیشت کے سبب مسلمانوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استحصال تک کرتے تھے، مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے دور حکمرانی میں غیر مسلم اقلیتوں کو مکی مسلمانوں کی اقلیت سے زیادہ حقوق، بہتر مراعات اور وسیع تر آزادی وخود مختاری حاصل تھی۔ محض اس بنا پر کہ اس کے سربراہ رحمۃ للعالمین تھے اور ان کی ریاست ایک فلاحی ریاست تھی (مستشرقین تک نے اعتراف کیا ہے کہ مفتوحہ اقوام وقبائل اور اہل ذمہ کے ساتھ سلوک نبوی اور اسلامی ریاست کی پالیسی احسان پر مبنی تھی ملاحظہ ہو: مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء وغیرہ کا ابواب متعلقہ؛ ڈی سی ڈینٹ جزیہ اور اسلام، (اردو) Conversion & Poll-Tax in Early Islam، کیمبرج ۱۹۵۰ء (انگریزی) کے اولین ابواب)۔

دور حکمرانی میں مسلمان اقلیتوں کا تحفظ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی بعض مقامات پر فتح مکہ تک مسلم اقلیتوں کا مسئلہ بنا رہا۔ ان میں ایک طرف ملکی رعرب مسلم اقلیت تھیں جو قریش مکہ کے درمیان، عرب قبائل جیسے دوس واشعر وغیرہ کے علاقوں میں موجود تھیں۔ دوسری طرف غیر ملکی رمسلم اقلیت تھی جو بحر قلزم کے پار افریقہ کے براعظم کے ملک حبشہ میں آباد تھی۔ ان میں خاص تو عرب مہاجرین تھے جو بیشتر کیا؛ بلکہ تمام تر قریش مکہ کے بطون کے نوجوان وپریشاں حال افراد تھے اور مکہ ہی سے وہاں گئے تھے اور مدتوں سے آباد تھے۔ دوسرے حبشی نژاد مسلم تھے جو اپنے عادل حکمراں کے قبول حق کے باوجود ایک غیر مسلم اکثریت کے درمیان بطور اقلیت رہ رہے تھے۔ وہ مکی مسلمانوں کی طرح اپنے ہی وطن میں اجنبی بن گئے تھے۔ اگرچہ ان کے مسائل دوسرے تھے اور ان میں حقوق اقلیت کا کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ تاہم وہ بعض دینی معاملات، معاشرتی مسائل اور تجارتی یا اقتصادی اور نفسیاتی مشکلات سے ضرور دوچار تھے (مکی اسوۂ نبوی،

باب ہفتم: مسلم اقلیتیں۔اسلامی ریاست کے قیام کے بعد، ۲۴۴-۲۷۶)۔

مکی مسلم اقلیت:

اس کے مسائل ومشکلات خاصی صبر آزما تھیں جو ان کے اقلیتی حقوق کو پامال کر کے پیدا کی گئی تھیں۔ان میں سب سے خطرناک ان کی شخصی آزادی سے ان کی محرومی تھی جو محض دین اسلام قبول کرنے کے نتیجہ میں ان سے چھینی گئی تھی۔ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ عرب کا قدیم قبائلی سماجی تحفظ کا نظام بھی ان کو شخصی آزادی اور دین پر عمل کرنے کا حق دلانے سے قاصر تھا۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کمزور و بےبس اور لاچار مسلمانوں کو ان کے اپنے ہی ماں باپ اور عزیزوں نے قید و بند کا شکار بنا رکھا تھا۔حضرت ابوجندل عامری رضی اللہ عنہ کا معاملہ سب سے نمائندہ مثال ہے کہ وہ اپنے باپ سہیل بن عمرو عامری کے ہاتھوں ہی قید میں ڈالے گئے تھے،اسی طرح ابوجہل مخزومی نے اپنے بھائی حضرت سلمہ بن ہشام مخزومی اور حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی کو اپنی ذاتی قید میں رکھ چھوڑا تھا۔اسی طرح دوسرے قیدی مسلمان تھے جن میں حضرات ہشام بن عاص سہمی، ولید بن ولید مخزومی اور ابوبصیر ثقفی وغیرہ بہت اہم تھے اور سب مقید و پابند زنداں تھے۔

دوسرا مکی مسلم اقلیت کا طبقہ مخلص مسلمانوں پر مشتمل تھا جو مختلف وجوہ سے مدینہ ہجرت نہ کر سکے تھے۔ان میں حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب ہاشمی اور ان کی والدہ ماجدہ کے علاوہ متعدد دوسرے مسلمان مرد وعورت شامل تھے۔

تیسرا وہ اہم طبقہ مسلم تھا جس کو قریش مکہ نے ان کے رفاہی کاموں اور دوسرے اعمال خیر کے سبب ہجرت نہیں کرنے دی۔ان میں حضرت نعیم بن عبداللہ النحام عدوی اور خاندان بنوعدی (حضرت عمر فاروق کے متعدد افراد؛ بلکہ طبقات شامل تھے لیکن ان کا مسئلہ اقلیتی نہیں تھا کہ قریش مکہ نے ان کو تمام حقوق اقلیت وشہریت دے رکھے تھے بس یہ ضرور تھا کہ وہ قطعی آزاد شہری نہیں

تھے (مذکورہ بالا)۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ گرفتار وقید مسلمانوں کا تھا کہ وہ پابند سلاسل ہی نہیں، مظالم وحشیانہ کے شکار بھی تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو حالات کے دھارے پر بے کس ولاچار نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ بطور سربراہ مملکت اسلامی ان کا خاص فرض اور امت اسلامی کا اجتماعی فریضہ تھا کہ ان کی گلوخلاصی کی سبیل نکالے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا اور ایک نیا اصول نکالا، اپنے بعض پرجوش صحابہ کو مکہ مکرمہ بھیج کر ان میں سے بعض کو قیدوبند سے آزاد کرایا اور ان کو مدینہ منورہ بلوایا۔ ان خوش نصیبوں میں حضرات عیاش مخزومی اور ہشام سہمی شامل تھے (مذکورہ بالا بحوالہ ابن ہشام ۲/ ۳ ۶۷۔ ۴ ۶۷؛ بلاذری ۱/ ۲۲۰؛ ابن سعد ۴/ ۲ ۱۱۔ ۱۳۳)۔

حضرت ولید بن ولید مخزومی برادر حضرت خالد بن ولید مخزومی از خود آزادی حاصل کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے۔

حضرت ابوبصیر ثقفی کا معاملہ ایک معاہدہ — معاہدۂ صلح حدیبیہ — نے مشکل بنا دیا تھا۔ قیدوبند سے آزاد ہو کر وہ بھی مدینہ پہنچے، لیکن صلح حدیبیہ کی ایک شرط کے مطابق ان کو ان کے متعاقبوں کے حوالے کر کے مکہ واپس کر دیا گیا، بالکل اسی طرح جیسے صلح حدیبیہ کی شرائط طے ہونے کے بعد مگر معاہدہ کے لکھے جانے سے قبل حضرت ابوجندل عمرو بن سہیل عامری رضی اللہ عنہ کو ان کے والد کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ شرائط تو طے ہو چکی تھی، اگرچہ لکھی نہیں گئی تھیں۔ قریشی نمائندے کے قانونی اعتراض کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا تھا اور اس نے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دی تھی کہ تمام مسلمان صدمے سے دوچار اور بعض تو غضبناک ہو گئے تھے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی پابندی کی اور اسلامی اصول نبھایا۔ ساتھ ہی پیشنگوئی فرما دی کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی دوسری سبیل پیدا کر دے۔ مگر اسی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کے لیے دو قریشی اکابر خویطب بن

عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کی جوار بھی حاصل کر لی تھی کہ ان کو ظلم سے بچائیں گے۔ اور بعد میں وہی ہوا کہ حضرت ابوالبصیر ثقفی نے اپنے متعاقبوں کا خاتمہ کر کے مدینہ منورہ کے باہر ساحل بحر قلزم پر ڈیرہ ڈال دیا اور آزادی حاصل کر لی، ان کی مثال نے حضرت ابو جندل اور دوسرے مجبور و مقید مسلمانوں کو ایک اور مامن وملجا کی راہ دکھائی اور وہ سب ینبوع میں جمع ہو کر قریش کے تجارتی کاروانوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ قریش مکہ نے خود اس ظالمانہ شق کی تنسیخ کی درخواست کی اور ساکنان ینبوع مدینہ پہنچ گئے (مکی اسوۂ نبوی، بحوالہ ابن ہشام ۲/ ۲۷۳۔ ۲۷۴؛ سہیلی، ۶/ ۴۶۳۔ ۴۶۴؛ بلاذری ۱/ ۲۱۱۔ ۲۱۹ ومابعد؛ ابن کثیر ۴/ ۱۶۷/ ۱۷۷۔ قیدیوں کے لیے جوار کی فراہمی کے بارے میں بلاذری ۱/ ۲۲۰ کا بیان اہم ہے: "فردّه رسول الله صلى الله عليه وسلم على أن أجاره حويطب بن عبدالعزىٰ ومكرز بن حفص وضمنا أن يكف أبوه عنه.")۔ اس واقعہ میں چند حکیمانہ پہلو بھی ہیں اور اصول سیاست اور حقوق اقلیت بھی۔

ایک یہ کہ اسلامی ریاست اور اس کے سربراہ کو دوسرے ممالک میں ظالمانہ قید میں اسیر مسلم اقلیت کو آزاد کرانے کا حق ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلم قیدیوں اور اسیروں کو اپنی رہائی کی کوشش کرنے کا حق ہے بشرطیکہ وہ محض دین و ایمان یا استحصال کی بنا پر قید ہوں۔ تیسرے یہ کہ مجبور ولاچار اور مقید مسلم اقلیت کے افراد کو ظالمانہ معاہدہ کی شق منسوخ کرانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا حق حاصل ہے۔ چوتھے یہ کہ مسلم ریاست / ممالک غیر محفوظ و ظالم ممالک کی جیلوں میں اسیر قیدیوں کے رہا کرانے کے پابند ہیں اور ان کی اجتماعی مساعی کی تائید کی بھی۔ پانچویں یہ کہ ظالم اکثریت و ملک کے حکمران اسے اندرونی معاملات اور اپنے شہریوں کا مسئلہ نہیں بنا سکتے۔

ممالک غیر میں مسلم اقلیتوں کے تئیں اسلامی ریاست کی پالیسی:

حبشہ کی عادل حکومت اور منصفانہ انتظامیہ میں مسلمان اقلیتوں کے عہد نبوی میں امن وامان

سے زندگی بسر کرنے اور تمام حقوق اقلیت بلکہ حسن سلوک سے نوازے جانے کے باوجود اسلامی ریاست مدینہ اور حکومت نبوی نے ان کی طرف سے آنکھیں نہیں موندی تھیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور اقلیت میں رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان کے سیاسی قائد کی حیثیتوں سے بھی ان کا خیال رکھا تھا۔ جس طرح بعض اکابر قریش جیسے ابو طالب ہاشمی نے اپنے قبیلہ والوں اور عزیزوں کا بطور خاندانی سربراہ اور بطور پدر و والی لحاظ کیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر قریش دونوں نے اپنے عزیزوں اور قریبوں کو اور عام مسلمانوں کو بسا اوقات مادی اسباب کے ہدایا بھیجے تھے (مکی اسوۂ نبوی، ۲۷۳-۲۷۶ نیز باب سوم: حبشی امت اسلامی، بالخصوص ۱۳۴ و مابعد بحوالہ بلاذری ۱/۱۹۸: "كان أبو طالب يتعهده إلىٰ أن مات باللطف والنفقة"؛ سہیلی ۳/۲۶۰، وغیرہ)۔

مہاجرین حبشہ کو مادی امداد سے زیادہ اخلاقی سہارے کی ضرورت تھی کہ وہ دیار غیر میں اپنوں سے دور غربت کی کلفتیں اٹھائے تھے۔ ابو طالب ہاشمی اور ان جیسے دوسرے بعض اکابر قریش کی اخلاقی امداد خالص خون کے رشتوں اور قبائلی مروت و عصبیت کے دھاگوں سے بندھی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی و سماجی نصرت و حمایت میں دینی قوت اور مذہبی اخوت بھی کارفرما تھی اور ان سے زیادہ خالص الٰہی ولایت بھی۔ اللہ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و دوستی اور نصرت و حمایت کے ساتھ ساتھ ان کو مسلسل کلام الٰہی مختلف طریقوں سے پہنچایا جاتا رہا تھا۔ وہ خود بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکی مسلمانوں کے بارے میں آنے جانے والوں سے دریافت احوال کیا کرتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ متعدد اکابر صحابہ کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں کہ وہ ہر طرح کی اخلاقی، مادی، روحانی، قرآنی اور تشریعی امداد سے ان کو نوازتے تھے۔ اور اشعار و کلام کے ذریعے سے بھی ان کی دلجوئی کیا کرتے تھے جو عرب قومیت کی غالباً سب سے بڑی حسیت تھی (مکی اسوۂ نبوی، ۱۴۳-۱۳۷)۔

مکی دور میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو طالب ہاشمی نے بھی شاہ حبشہ نجاشی کو فرامین وخطوط بھیجے تھے ان میں شاہ نجاشی سے مہاجرین عرب کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنے کی درخواست کی تھی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ (ابن ہشام ار ۳۵۳۔۳۵۷؛ سہیلی، ۳ر ۲۳۰۔۲۳۹ ومابعد) مدنی دور میں فرامین رسالت کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی وفود بھی بھیجے تھے جن میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے وفود اہم تھے۔ روایات میں تو ان کے دو ایک وفود کا ذکر آتا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ مسلسل حبشہ اور دربار نجاشی میں سفارتی کام کیا کرتے تھے، حبشہ اور عرب کے درمیان مدتوں سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور سماجی ومعاشرتی روابط بھی تھے اور دونوں کی مسلسل آمدورفت بھی تھی، ان کے پیش نظر یہ واقعہ لگتا ہے کہ تجارتی کاروانوں، کشتیوں اور انفرادی تاجروں کے ذریعہ بھی باہمی معاشرتی لین دین ہوا کرتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین ایک دوسرے سے خوب واقفیت رکھتے تھے اور مہاجرین کی قسطوں میں واپسی نے بھی ان کے درمیان رشتہ استوار کر رکھا تھا (مذکورہ بالا، ۲۷۴۔۲۷۶: اسد الغابہ میں سوانحی خاکہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری پر نیز اصابہ وغیرہ میں)۔

مختصر تجزیہ:

عہد نبوی میں اقلیتوں کے حقوق کی تعداد مذکورہ بالا سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کا ذکر اختصار کے ساتھ ذیل میں کیا جاتا ہے:

زبان وادب کے تحفظ کا حق:

مکی اقلیت کو اگرچہ اس حق کے تحفظ کی فکر نہیں تھی کہ ان کی اکثریت کی زبان وادب بھی یکساں تھی۔ تاہم حبشہ میں مہاجرین قریش کو اس کا حل تلاش کرنا پڑا۔ کیونکہ وہاں کی اکثریت کی زبان حبشی تھی اور عرب مہاجرین کی عربی۔ ان دونوں میں تصادم تو نہیں تھا تاہم مہاجرین کو اپنی

زبان وادب کے محفوظ و برقرار رکھنے کا مسئلہ ضرور تھا؛ خاص کر اپنے نوزائیدہ بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں۔ یہ ان کے شرف کی بات ہے کہ نہ صرف انہوں نے اپنی زبان برقرار وجاری رکھی، بلکہ اس میں غالباً اولین ہجری عربی ادب کی تاریخ رقم کی، اس کے نمونے موجود ہیں۔اس سے زیادہ سمجھ کی بات یہ کی کہ اپنے نئے وطن کی زبان حبشی سیکھی اور اپنے بچوں وبچیوں کو بھی اس کی تعلیم دی (مکی اسوۂ نبوی، ۳۰۸ و مابعد میں اس پر بحث ہے۔حضرت خالد بن سعید اموی کی دختر نیک اختر حضرت امۃ بنت خالد رضی اللہ عنہا نے حبشہ میں حبشی زبان سیکھ لی تھی: ''وکانت تعلمت لسان الحبشۃ، لانہا ولدت بارضہم۔'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حبشی زبان میں کلام بھی فرمایا تھا جس پر امام بخاری نے عجیب وغریب باب باندھا ہے۔ ''کتاب الجہاد، باب من تکلم بالفارسیۃ۔'' وہ فارسی تو نہ تھی۔ بخاری میں دوسرے ابواب بھی ہیں۔ اور صرف وہی حبشی زبان سیکھنے والی اکیلی خاتون نہ تھیں۔ دوسرے مہاجرین ومہاجرات نے بھی سیکھی تھی۔ زبان کے علاوہ مہاجرین حبشہ نے حبشی ثقافت وتمدن کی عمدہ اور نفیس چیزوں سے بھی استفادہ ہی نہیں کیا؛ بلکہ ان کو اسلامی تمدن میں آمیز کیا تھا)۔

تہذیب وثقافت کا حق:

حبشی مہاجرین کو خاص کر اور مکی اقلیت کو عام طور سے اپنی خاص اسلامی تہذیب وثقافت کو برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ بلاشبہ عربوں کا تمدن اسلامی عہد میں بھی مشترکہ کہا جاسکتا ہے مگر اس میں اسلامی رنگ نیا تھا۔ اسلامی احکام وآداب نے کھانے، پینے، رہن سہن، ملبوسات اور نعلین، ظروف وبرتن اور متعدد دوسری چیزوں میں استعمال کا فرق کر دیا تھا۔ حلال وحرام کھانوں، مشروبوں وغیرہ کی پابندیاں، لہوولعب سے احتراز کی پیش بندیاں، طور طریقوں میں تبدیلی کی گوناگوں اور بہت سی دوسری چیزوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کا خاص رنگ وآہنگ پیدا کر دیا تھا اور وہ خاصا مشترکہ تمدن سے مختلف تھا۔ اس کی حفاظت کا حق بھی ان کو تھا

(اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو: ''اسلامی احکام کا ارتقاء'' اور خاص تمدن کے حوالے سے آئندہ کتاب خاکسار ''عہد نبوی کا تمدن'')۔

اسلام، رسول اور ملت کے خلاف پروپیگنڈے کو روکنے اور اس کا توڑ کرنے کا حق:

غالباً اس عہد میمون میں بھی اتنا ہی اہم تھا۔ قرآن مجید، حدیث شریف اور سیرت مبارکہ میں اس آفاقی اور عالمی حق کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے اور وہ آج بھی امت اسلامی کا ایک مسئلہ ہے۔ قریش مکہ بالخصوص اور دوسرے عرب اور قبائل جیسے یہود و نصاریٰ قرآن مجید، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی امت پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے خود تو کرتے تھے، اور دوسروں سے امداد بھی لیتے تھے جن میں یہودی علماء مدینہ پیش پیش تھے۔ اس سہ گانہ پروپیگنڈے کا بھرپور جواب اور مفصل توڑ بہت سی آیات کریمہ، احادیث شریفہ اور واقعات و روایات تاریخی میں موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس مسئلہ کو خوب حل کیا تھا (مکی اسوۂ نبوی میں ذیلی فصول: دفاعی اقدام کا حق، قریشی پرچار کا توڑ وغیرہ، ۱۷۹۔ ۲۰۸۔ آج بھی یہی الزامات برابر عائد کئے جاتے ہیں)۔

ایسے اور بھی بہت سے حقوق ہیں جو اقلیتوں کو عہد نبوی میں پیش آتے تھے اور ان کا تحفظ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

پس چہ باید کرد:

سیرت نبوی دراصل اسوہ نبوی کی تاریخ ہے۔ اسوۂ نبوی، اللہ تعالی کے فرمان کے مطابق امت کے عمل کے واسطے ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال و تقاریر اور صحابہ کرام کے اقدامات، معمولات اور سنن نے ہر میدان حیات میں امت اسلامی کے لیے نمونہ چھوڑا ہے، اس عالم رنگ و بو اور وسیع کائنات میں تمام مسلمان اقلیتوں کو اپنے اپنے اختلاف

احوال اور تنوع معاملات کے مطابق عمل کرنا ہے۔ ان میں سے کچھ احوال اور معاملات مشترکہ وآفاقی ہیں کہ تمام مسلم اقلیتیں ان کی امین ہیں اور کچھ میں ان کے ظروف واسباب نے فرق پیدا کر دیا ہے۔ حکمت نبوی، فراست ایمانی اور مدنی ومکی دور کی سیرت مبارکہ بتاتی ہے کہ اس جہان رنگ وبو میں مسلم اقلیتوں کا کیا نصاب عمل ہے۔

اول اور اہم ترین معاملہ یہ ہے کہ تمام مسلم اقلیتوں کو اپنے حقوق کا ادراک وشعور ہو اور ان کو اسلامیت کا بھی احساس ہو۔ دوم ان تمام عالمی مسلم اقلیتوں کے پاس ایسا انتظام وطریقہ ہو جس کے ذریعہ وہ اپنے حقوق کو اکثریت سے پرامن طریقے سے حاصل کر سکیں۔ پہلے معاملہ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلامی تاریخ، سیرت نبوی اور قرآن وحدیث کی خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہوں اور اسی کے ساتھ ان کو اپنے اپنے ممالک ودیار کے حقوق اقلیت کے ضابطہ کا بھی علم ہو۔ یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ ان حقوق کی آئینی اور دستوری حیثیت کیا ہے۔ دوسرے مسئلہ کا حل ایک بنیادی اور ناگزیر تعمیر میں مضمر ہے اور وہ ہے امت اسلامی کا اتحاد، ان کی ملکی تنظیم اور ان کی اجتماعی کوشش، اتحاد وتنظیم اور اجتماعیت صرف ایک ہی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے اور وہ ہے ملی یگانگت، اسلامی اخوت، ایک اللہ، ایک رسول اور ایک قرآن اور دین سے کامل وابستگی اور مختلف ملکی اور عقائدی اور فقہی اختلافات کی صحیح نوعیت وصحیح تر اطلاق سمجھنے کی صلاحیت۔

اسی کے ساتھ امت اسلامی کو وہ قوت حاصل کرنی ہے جو ان کے لیے دشمنوں اور حریفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ آج کے دور ہی میں نہیں جیسا کہ بالعموم کہا جاتا ہے بلکہ ہر دور میں اور خاص نبوی عہد میں وہ قوت ضروری تھی تعلیم کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جاہل، اور ان پڑھ قوم عرب کو ایک عالم، پڑھی لکھی، مہذب اور ذہین وفطین امت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور یہ تبدیلی صرف تعلیم سے آئی تھی۔ قرآن ورسول سے واقفیت، اللہ وآخرت کی معرفت اور تمام دین واسلام کی جانکاری کا ایک ہی واسطہ تعلیم تھی۔ اسی لیے علم پر بہت زور ہے۔ اس علم

و تعلیم میں دنیاوی اور دینی کا فرق نہیں تھا اور اسلام میں اب بھی نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ و نمونہ سے ثابت ہے۔ عہد نبوی کی مسلم اقلیت نے اپنے حقوق اسی تعلیم، اتحاد، تنظیم اور اجتماعیت سے حاصل کیے تھے اور آج بھی وہ ہر ملک میں ان ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انفرادی کوششیں، دوسروں کی معاونت، حکومتوں کی مہربانی، رفاہی اداروں کی استمداد جیسی چیزیں صرف امدادی ذرائع ہی ہیں۔ اصل طاقت امت اسلامی کی اپنی ہے جس سے ان کی تقدیر تو بدلتی ہی ہے دوسری اقلیتوں کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے (مکی اسوۂ نبوی کا آخری باب رخطبہ ملاحظہ ہو: ۲۷۷-۳۱۰ ''معاصر مسلم اقلیتوں کے لیے لائحۂ عمل'' جس میں وہ تمام طریقے زیر بحث لائے گئے ہیں جن کے ذریعہ مسلمان اقلیتیں اپنے حقوق ہی حاصل نہیں کر سکتیں؛ بلکہ اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدل سکتی ہیں)۔

☆☆☆

اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں اسلامی اقدار وروایات

مولانا اختر امام عادل قاسمی☆

اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور مسلمان زندگی سے بھرپور آفاقی ضمانت رکھنے والی قوم ہے، انہوں نے تاریخ کے ایک طویل عرصہ پر حکمرانی کی اور دنیا کے مختلف اقوام وملل نے ان کی سیاسی سرپرستی قبول کی، مگر صدیوں پر محیط اس پورے دور میں کبھی کسی اقلیت کے بنیادی مسائل اور ان کے قومی معاملات میں کسی تنگ نظری، حق تلفی یا جانبداری کا احساس نہیں کیا گیا، تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں دکھایا جاسکتا، جس میں کسی مسلم حکمراں نے کسی غیر مسلم اقلیت کے ساتھ اس کے شخصی، مذہبی یا قومی کسی مسئلہ میں غیر عادلانہ برتاؤ کو روا رکھا ہو، حربی پس منظر میں بعض فوجی جرنیلوں یا نیچے درجہ کے افسروں سے کچھ غلطیاں ضرور ہوئی ہیں، لیکن اقتدار اعلیٰ تک جب اس کی اطلاع پہنچی تو پہلی فرصت میں اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی، اسلامی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں، ناممکن ہے کہ اسلام جیسا ہمہ گیر اور بے نظیر نظام حیات کسی قوم کے پاس ہو اور وہ دنیا میں اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ بدسلوکی کرے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ مظلومی کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں، جن میں مسلمانوں کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا، ان کے ساتھ سیاسی استحصال کا برتاؤ کیا گیا، لیکن ایسی کوئی صحیح مثال موجود نہیں، جس میں مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ جبر وتشدد کا معاملہ کیا ہو، ہمیں فخر ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری تاریخ ہماری تعلیمات کی طرح روشن اور بے داغ ہے۔

☆مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور، بہار

یہ بحث بہت حساس اور تفصیل طلب ہے، ہمارے علماء اور مصنفین نے اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے، مستقل کتابیں اور مقالات اس موضوع پر موجود ہیں، خود حقیر راقم الحروف نے بھی اپنی بعض کتابوں (مثلاً ''حقوق انسانی کا اسلامی منشور'' اور ''قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز'' اور مقالات) میں اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، اس مضمون میں اس سلسلہ کی چند اسلامی ہدایات اور ان سے متعلق بعض مسلم حکمرانوں کے ایک دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

اس سلسلہ کی اہم ترین ہدایت وہ ہے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کو فرمائی تھی:

"ألا من ظلم معاهداً أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة" (رواہ ابوداؤد، کتاب الجہاد، مشکوۃ علی المرقاۃ، کتاب الصلح: ۹/۸۹)۔

> ''خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ھ میں نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ فرمایا اور ان پر جزیہ عائد کیا، ان کے بعد ایلہ، اذرح، اذرعات وغیرہ قبائل سے معاہدے ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریری ہدایت کے ذریعہ ان کے لئے درج ذیل حقوق کا تعین فرمایا جو سیر و تاریخ کی مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں:

(۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کرے تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی: "يحفظوا

ویمنعوا'' یعنی ان کی حفاظت کی جائے گی اور دشمنوں کے شر سے ان کو بچایا جائے گا (فتوح البلدان:۵۹)۔

(۲) ان کوان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) جزیہ کی ادائیگی کے لئے ان کو محصل کے پاس جانا نہیں پڑے گا۔

(۴) ان کی جان محفوظ رہے گی۔

(۵) ان کو مذہبی وملی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

(۶) ان کا مال محفوظ رہے گا۔

(۷) ان کے قافلے اور تجارتی کارواں محفوظ رہیں گے۔

(۸) ان کی زمین محفوظ رہے گی۔

(۹) وہ تمام چیزیں جو ان کے قبضے میں تھیں، بحال رہیں گی۔

(۱۰) پادری، راہب اور گرجوں کے عہدیداران اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔

(۱۱) صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

(۱۲) ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۱۳) ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی۔

(۱۴) فکر وعقیدہ کی آزادی ان کو حاصل رہے گی۔

(۱۵) ان کو جو حق پہلے حاصل تھا، ختم نہیں کیا جائے گا۔

(۱۶) جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں، ان قوانین کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔

معاہدہ کے الفاظ کتابوں میں اس طرح نقل کئے گئے ہیں:

ولنجران وحاشیتها جوار الله وذمة محمد النبی صلی الله علیه وسلم

على أنفسهم وملتهم وأرضهم وأموالهم وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وأمثلتهم، لايغير حق من حقوقهم وأمثلتهم ولايغير ما كانوا عليه ولايغير حق من حقوقهم وأمثلتهم، ولايفتن أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانية ولا دافة من دفاهية على ما تحت أيديهم من قليل أو كثير أو ليس عليهم دهق ولا دم بأهلية ولايحشرون ولايعشرون ولا يطأ أرضهم جيش الخ (فتوح البلدان:٦٥)۔

اس طرح کی اور بھی بیش قیمت ہدایات حدیث اور سیر کی کتابوں میں موجود ہیں، جن کی روشنی میں اسلامی حکومت میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے جو حقوق سامنے آتے ہیں، وہ کسی معزز سے معزز شہری کے لئے کافی ہیں، ان ہدایات میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے ظلم وحق تلفی، تحقیر آمیز سلوک یا مذہبی یا فکری دباؤ سے روکا گیا ہے اور باعزت طور پر اسلامی حکومت میں انہیں رہنے کا حق دیا گیا ہے، یہ صرف کتابی نظریہ اور قانونی دفعات کی حد تک نہیں ہے، بلکہ عہد اسلامی کے حکمرانوں نے ان کو عملی طور پر ثابت کیا ہے۔

تحفظ جان کا حق:

کسی بھی شہری کے لئے سب سے اہم ترین مسئلہ اس کے تحفظ جان کا ہوتا ہے، عہد اسلامی میں اقلیتوں کو یہ حق پوری طرح حاصل تھا، مثلاً:

قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو جان سے مار ڈالا، حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو تحریری فرمان بھیجا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ قاتل (جس کا نام حنین تھا) مقتول کے ورثہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ (نصب الرایۃ للزیلعی: ۳۳۵/۴، مطبوعہ دہلی)۔

حضرت علیؓ نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا:

"من كان له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا" (نصب الرایۃ: ۳۳۷/۴)۔

یعنی جو لوگ ذمی ہیں، ان کا خون اور خون بہا ہمارے خون اور خون بہا کے برابر ہے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بھی کسی مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کیا، تو انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے حوالہ کر دیا جائے، مقتول کے ورثہ نے اسلامی مساوات اور حضرت علیؓ کے انصاف سے متاثر ہو کر قاتل کو معاف کر دیا اور حضرت علیؓ کے پاس حاضر ہو کر اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا؟ (نصب الرایۃ: ۴/ ۳۳۷)۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت فیروز نامی شخص کے ہاتھوں ہوئی، جو نسلاً مجوسی اور مذہباً عیسائی تھا، قاتل بھاگ گیا، تو حضرت عمرؓ کے بڑے صاحبزادے "حضرت عبید اللہ" بعض لوگوں کی چشم دید شہادت کی بنیاد پر تلوار ہاتھ میں لیکر نکلے اور فیروز کو نہ پا کر دیگر مشتبہ قاتلوں فیروز کے بیٹے حفینہ اور ہرمزان وغیرہ کو قتل کر دیا، ہرمزان تو مسلمان ہو گیا تھا، مگر باقی عیسائی تھے، حضرت عبید اللہ کو اسی وقت گرفتار کر لیا گیا، حضرت عثمانؓ کے خلیفہ بننے کے بعد پہلا مسئلہ یہی پیش کیا گیا، معاملہ کسی عام شخص کے قتل کا نہیں تھا، بلکہ امیر المؤمنین کی سازش قتل کے مشتبہ ملزموں کا تھا، حضرت عثمانؓ نے صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا، زیادہ تر صحابہ نے مشورہ دیا کہ محض شبہ کی بنیاد پر کسی کا قتل جائز نہیں، اس لئے عبید اللہ پر حکم قصاص جاری ہونا چاہئے، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے قصاص کا حکم جاری فرما دیا، مگر بعض وجوہات کی بنا پر مقتولین کے ورثہ خون بہا لینے پر راضی ہو گئے اور حضرت عثمانؓ نے بیت المال سے ان تینوں (یعنی ایک مسلمان اور دو عیسائی) کا خون بہا برابر برابر ادا فرما دیا۔ (قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز ر ۲۹۳، بحوالہ کتاب الاوائل للمسعودی)۔

تحفظ مال کا حق:

انگریزی میں مال اور جائداد کے حقوق کو "رائٹ آف پراپرٹی" اور "رائٹ آف لینڈ" کہتے ہیں، اسلامی عہد حکومت میں اس باب میں مکمل مساوات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً:

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لئے ایک رمنہ بنانا چاہا، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جو اس وقت بصرہ کے گورنر تھے تحریر فرمایا کہ اگر وہ زمین کسی غیر مسلم اقلیت کی نہ ہو اور نہ اس میں ان کی نہروں اور کنوؤں کا پانی آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے۔ (فتوح البلدان:۳۵۱)۔

حضرت امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ لکھا ہے:

"ولیس له أن یأخذها بعد ذلک منهم وهي یتوارثونها ویتبایعون" (فتوح البلدان:۳۲۸)۔

یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہیں کہ اس کے بعد کسی اقلیت سے زمین چھین لے، وہ ان کی ملک ہے، ان میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اس کو خرید وفروخت کرسکتے ہیں۔

مذہبی آزادی:

مذہبی معاملہ میں اسلامی آئین ریاست کے ہر فرد کو پوری آزادی دیتا ہے، اسلام ایک سچا مذہب ہے، اس کا آئین ایک مکمل آئین ہے، اس کی تبلیغ کی جائے گی، اس کی صداقت پر دلیل وبرہان پیش کیا جائے گا اور اس کی توسیع واشاعت کی پوری حوصلہ افزائی کی جائے گی، لیکن کسی کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اس کے لئے نہ کوئی جنگی اسلحہ استعمال کیا جائیگا اور نہ کوئی سماجی دباؤ ڈالا جائے گا، قرآن کا فیصلہ ہے:

"لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ:۲۵۶)۔

(دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں، حق باطل سے ممتاز ہو چکا ہے)۔

ایک جگہ خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے کہا گیا:

"اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ" (الغاشیۃ:۲۰،۲۱)۔

(اے پیغمبر! آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں، ان پر جبر کرنے والے نہیں)۔

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بھری پڑی ہیں، مسلمانوں نے اس آئین سے کتنی وفاداری برتی، اس کے نظائر بھی تاریخ اسلامی میں بکثرت موجود ہیں، یہاں نمونہ کے لئے صرف ایک واقعہ پیش ہے:

حضرت عمر فاروقؓ کے غلام وسق رومی کا بیان ہے کہ میں حضرت عمرؓ بن خطاب کا غلام تھا، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مسلمان ہو جا، اگر تو اسلام قبول کرلے گا تو میں تجھے مسلمانوں کی امانت کا کوئی عہدہ حوالہ کروں گا، مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا، اس پر وہ کہتے تھے: "لا إکراہ فی الدین" پھر جب ان کی وفات کا وقت آیا، تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ (کتاب الاموال: ۱/ ۱۵۴)۔

تبلیغ میں بھی جارحانہ انداز اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله" (الانعام: ۱۰۸)۔

(جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو)۔

"ولا تجادلوا أهل الکتاب إلا بالتی هی أحسن" (العنکبوت: ۴۲)۔

(اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقہ سے)۔

مذہبی حقوق کا تحفظ:

اسلامی قانون میں اقلیتوں کے مذہبی حقوق کو بھی پورا تحفظ دیا گیا ہے، جیسا کہ معاہدۂ نبوی کی روشنی میں پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، حکومت وقت کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ کسی قوم یا فرقہ کے مذہبی مقامات پر تسلط جمائے یا ان کے مذہبی نظام میں مداخلت کرے، بعض واقعات بطور نمونہ پیش ہیں:

حضرت خالد بن الولیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں جب حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھ کر دیا:

لایهدم لهم بیعة ولا کنیسة ولا یمنعون من ضرب النواقیس ولا من إخراج الصلبان في یوم عیدهم (کتاب الخراج لابی یوسفؒ، ص: ۸۴)۔

(یعنی ان کے گرجے اور عبادت خانے برباد نہیں کئے جائیں گے، نہ ان کو سنکھ بجانے سے منع کیا جائے گا، نہ ان کے تہوار کے دن صلیب نکالنے سے ان کو روکا جائے گا)۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس قسم کے کئی معاہدات کا ذکر کیا ہے (ص: ۸۰، ۸۶)۔

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے کلیسا کے ایک گوشے میں نماز پڑھی، پھر خیال آیا کہ مسلمان میری نماز کو حجت قرار دے کر کہیں عیسائیوں کو نکال نہ دیں، اس لئے ایک خاص وثیقہ لکھ کر بطریق کو دیا، جس کی رو سے کلیسا عیسائیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور یہ پابندی لگادی گئی کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مسلمان کلیسا میں داخل ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ ۱۶۹ھ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا تو حضرت مریم کے گرجا اور چند گرجوں کو منہدم کرادیا، ہادی نے ایک سال کی خلافت کے بعد وفات پائی اور ہارون رشید تخت نشیں ہوا، اس نے علی کو معزول کر کے ۱۷۱ھ میں موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا، موسیٰ نے گرجوں کے معاملہ میں علماء سے استفتاء کیا، اس وقت مصر میں حضرت لیث بن سعدؒ سب سے بزرگ عالم دین تھے، انہوں نے فتویٰ دیا کہ منہدم شدہ گرجے دوبارہ تعمیر کئے جائیں، اس لئے کہ یہ تمام گرجے خود صحابہ اور تابعین نے تعمیر کرائے تھے، چنانچہ سرکاری خزانے سے تمام گرجوں کی تعمیر کرائی گئی۔ (تاریخ مصر للمقریزی: ۲/۵۱۱، النجوم الزاہرۃ واقعات: ۱۷۱ھ، بحوالہ قوانین عالم......۱/۲۹۶)۔

سب سے دلچسپ واقعہ تو دمشق کی جامع مسجد کا ہے، جامع مسجد کے متصل ایک گرجا گھر

تھا جس کا نام "یوحنا کا گرجا" تھا، حضرت امیر معاویہ اور عبد الملک بن مروان دونوں نے اپنے اپنے عہد حکومت میں چاہا کہ عیسائی کسی بھی قیمت پر جامع مسجد کے لئے اس زمین سے دستبردار ہوجائیں، اس لئے کہ جامع مسجد تنگ پڑ رہی تھی، لیکن عیسائی راضی نہ ہوئے، ولید کا زمانہ حکومت آیا تو اس نے اولاً بڑی رقم کی پیش کش کی، لیکن عیسائیوں نے صاف انکار کردیا، ولید نے غصہ میں آکر کہا کہ تم بخوشی نہ دوگے تو میں جبراً لے لوں گا، عیسائیوں نے خواہ مخواہ ولید کو اشتعال دلایا کہ جو شخص کسی گرجا کو نقصان پہنچاتا ہے وہ پاگل یا کوڑھی ہوجاتا ہے، ولید نے اشتعال میں آکر خود کدال ہاتھ میں لی اور گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی اور بالآخر گرجا مسجد میں شامل کرلیا گیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا زمانہ آیا تو عیسائیوں کو انصاف کی امید بندھی اور گرجا کا مقدمہ ان کی خدمت میں پیش کیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دمشق کے گورنر کو تحریری فرمان روانہ کیا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں شامل کیا گیا ہے وہ عیسائیوں کو واپس کردیا جائے، اس پر مسلمانوں کو بیحد رنج ہوا کہ ہم جس مسجد میں نماز پڑھ چکے اور اذانیں دے چکے اس کو کس طرح ڈھا کر شہید کردیں، آخر عیسائیوں کے پاس جاکر خوشامدیں کیں کہ کسی طرح خدا کے واسطے مسجد کو بچالو، عیسائی کہنے سننے پر راضی ہوگئے اور دربار خلافت کو اس کی اطلاع دی گئی، چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جامع مسجد کے مقبوضہ حصہ کی انہدامی کارروائی موقوف کرادی۔ (فتوح البلدان: ۱۲۵)۔

دنیا کا کوئی نظام قانون اپنے عہد حکومت میں توسیع وانصاف کی ایسی شاندار مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف یہ کہ اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا، بلکہ بے شمار نئے بت خانوں اور گرجا گھروں کی تعمیر کی بھی اجازت دی، بلکہ بہت سے حکمرانوں نے ان کی مالی سرپرستی بھی فرمائی اور بہت سی جائدادیں ان کے لئے خاص کیں، اس کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بے شمار ہیں سلطان ٹیپوؒ اور سلطان عالمگیر اورنگزیبؒ جیسے حکمران

جو اپنی مذہبیت کے معاملہ میں شہرۂ آفاق کا درجہ رکھتے ہیں اور جن کی مذہبی عصبیت کو لیکر بعض آزاد مزاج مؤرخین نالاں نظر آتے ہیں، ان شدت پسند حکمرانوں نے بھی اپنے اپنے عہد حکومت میں بت خانوں اور مندروں کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا، بلکہ ان کو بڑی جاگیریں عطا کیں، ان پر اقلیتوں کے خلاف جو الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے احقر کی کتاب قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز ار ۲۹۷ تا ۳۲۸)۔

مسلمانوں نے عبادت خانوں کے عہدوں اور ان کے اوقاف سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا اور ان کو علی حالہ چھوڑ دیا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدۂ نجران کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

غیر مسلم اصحاب کمال کی توقیر:

عموماً حکمراں قوم مفتوح قوموں کو جانوروں سے زیادہ درجہ نہیں دیتی، ہندو آرین ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح خاک میں ملا دیا کہ خود ان کو بھی شودر کے لقب سے عار نہ رہا، رومن نے تمام مفتوحہ قوموں کو گویا غلام بنا رکھا تھا، مگر اسلامی حکومتوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کو مساوی حیثیت دی۔

اگر کوئی غیر مسلم بھی صاحب کمال ہوتا تو اسلامی عہد حکومت میں اس کا اعتراف کیا جاتا تھا، اس کی قدر افزائی ہوتی تھی اور محض مذہبی اختلاف اس کی تحسین وتعریف میں مانع نہ بنتا، یہاں تک کہ اسلامی تاریخوں میں بھی جہاں ان کے بعض اہل کمال کا نام آیا ہے، تو بڑے احترام کے ساتھ لیا گیا ہے کہ ناواقف آدمی جو ان کے مذہب سے واقف نہ ہو بادی النظر میں ان کو مسلمان فاضل تصور کرلے، مثلاً بختیشوع، جبریل، سلمویہ، حنین بن اسحاق، یوحنا بن ماسویہ، ابواسحٰق صابی کا تذکرہ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں بڑی عظمت سے لیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: ''اسلام اور مستشرقین: ۴ر ۱۷۴، علامہ شبلی نعمانیؒ)۔

سرکاری عہدے اور مناصب:

سرکاری اعزازات اور عہدوں میں بھی کبھی ذمیوں کے ساتھ امتیازی سلوک روانہیں رکھا گیا، بلکہ بعض اسلامی حکومتوں نے مروت ومراعات کا ریکارڈ قائم کردیا، مثلاً:

خلافت عباسیہ کے دربار کا خاص آئین یہ تھا کہ کسی شخص کا نام دربار میں لقب یا کنیت کے ساتھ نہیں لیا جاسکتا تھا اور اس قاعدہ سے کوئی بہت زیادہ ہی بڑی عزت ومرتبہ کا آدمی مستثنیٰ ہوسکتا تھا، اکثر بڑے بڑے علماء بھی اس آئین سے مستثنیٰ نہیں تھے، اس کے باوجود مامون الرشید جبریل بن بختیشوع کا نام دربار میں کنیت کے ساتھ لیتا تھا، اس کو دربار میں خاص الخاص مقام حاصل تھا، مامون نے کہہ رکھا تھا کہ مجھ تک کوئی عرضی جبریل کے توسط ہی سے پہنچ سکتی ہے۔

المعتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء وامراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے، صرف وزیراعظم اور ایک صابی ثابت بن قرۃ کو بیٹھنے کی اجازت تھی، ایک دن معتضد باللہ ثابت بن قرۃ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہل رہا تھا دفعۃً معتضد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ثابت خوف سے کانپ اٹھا، معتضد نے کہا ڈرو نہیں میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا، لیکن چونکہ تم علم وفضل میں مجھ سے بڑھ کر ہو اس لئے تمہارا ہاتھ اوپر ہونا چاہئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں "ابن آثال" ایک عیسائی حمص کا فائنانشیل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر رہا۔ (قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز ار۳۰۱، بحوالہ تاریخ یعقوبی)۔

ہندوستان میں عہد مغلیہ میں ہندوؤں کو بڑے اونچے فوجی عہدوں سے نوازا گیا اور اس میں صرف "اکبر" کی ہی خصوصیت نہ تھی، بلکہ جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر سب نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیے، شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑا منصب نو (۹) ہزاری تھا، یعنی وہ ارکان سلطنت جن کو نو ہزار سواروں کو رکھنے کی اجازت تھی، اس سے نیچے ہفت ہزاری تھا، اس عہدہ پر مہابت خان خانخانان ممتاز تھا، اس کے نیچے پنجہزاری و چار ہزاری وغیرہ

تھے، اس درجہ کے مناصب پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد قریب برابر تھی، شاہ جہاں نامہ میں جن ہندو عہدیداروں کا ذکر آیا ہے، ان میں بعض حسب ذیل ہیں:

پنج ہزاری منصب پر درج ذیل ہندو فائز تھے:

راجا جگت سنگھ، گج سنگھ، راؤ ڈا، جھجار سنگھ، مالوجی رام وغیرہ۔

چار ہزاری کے منصب پر یہ لوگ تھے: راجہ پتھل دا، بھارت بندیلہ، راؤ سور، جگدیو رائے، ہمیر رائے وغیرہ۔

گیارہ ہندو افسر دو ہزاری، بارہ ڈیڑھ ہزاری، سولہ ایک ہزاری، آٹھ نہ صدی، گیارہ ہشت صدی اور آٹھ ہفت صدی تھے، اور ان سے نیچے عہدیدار تو بے شمار تھے۔ (قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز)

آخری نظام حیدر آباد کے عہد حکومت میں مہاراجہ کشن پرشاد کو وزیر اعظم کا بلند ترین مقام حاصل تھا، اور بھی دیگر اسلامی حکومتوں کا یہی حال تھا، مسلم حکمرانوں کے یہاں کبھی تنگ نظری نہیں رہی، غیر مسلموں کے حق میں یہ ہمیشہ فراخ دل رہے، حتی کہ جن لوگوں نے ان کو اذیتیں دیں، بے آبرو کیا، ان کو گھروں سے نکالا، ان کا قتل عام کیا، ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ منصفانہ رہا، اس کا اعتراف خود یورپی مصنفین نے بھی کیا ہے۔

مشہور مستشرق منٹگری واٹ لکھتا ہے:

''غیر مسلم اقلیتوں سے سلوک کے معاملہ میں اسلامی ریاستیں بحیثیت مجموعی بہترین ریکارڈ رکھتی ہیں، ان کے ساتھ حسن سلوک مسلمانوں کے لئے ایک اعزاز کی بات تھی، خلفاء راشدین کے زمانہ میں ذمیوں کے تحفظ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، ہر غیر مسلم اقلیت بیت المال کو مال یا نقدی کی صورت میں معاہدہ کے مطابق سالانہ جزیہ ادا کرتی، اسے تقریباً اتنا ہی فی کس محصول بھی ادا کرنا پڑتا، اس کے بدلہ اسے بیرونی دشمنوں سے تحفظ ملتا اور وہ ان داخلی جرائم سے

بھی تحفظ کی مستحق بن جاتی جو خود مسلمانوں کو حاصل ہوتا۔ ہر اقلیت اپنے داخلی معاملات میں خود مختار تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جتنے معاہدات ہوئے، ان سب میں واضح طور پر اس امر کی ضمانت دی گئی کہ ہر ذمی اقلیت کو اپنے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہوگی اور یہ آزادی بعد کے زمانوں میں بھی برقرار رہی۔" (دی مجسٹی ویٹ واز اسلام شدک اینڈ جیکسن، لندن ۱۹۴۷ء، بحوالہ بنیادی حقوق: ۹۷)۔

آج بعض واقعات کا سہارا لیکر مسلم امت، مسلم ممالک اور در پردہ اسلام کو بدنام کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں اور مختلف غیر اسلامی تنظیمیں اپنے اپنے انداز میں حقوق انسانی کی دہائی دے رہی ہیں، حالانکہ اسلام حقوق انسانی کا اولین علمبردار ہے، دنیا نے حقوق انسانی کا درس اسلام اور پیغمبر اسلام سے لیا ہے، ساری دنیا اس باب میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلام ہی کی خوشہ چیں ہے، مسلمانوں کے یہاں حقوق انسانی کا مکمل آئین اور نظام اس وقت سے موجود ہے، جب دنیا اس کے تصور سے بھی نابلد تھی اور جانتی بھی نہیں تھی کہ انسانی حقوق کا مفہوم اور اس کا دائرہ عمل کیا ہے؟ عام دنیا میں یہ چیز مغرب کے وسیلہ سے آئی اور خود مغرب میں اس کی تاریخ ۱۳۰۷ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۰؍ دسمبر ۱۹۴۸ء میں جاکر پوری ہوتی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حقیر مرتب کی کتاب "حقوق انسانی کا اسلامی منشور"، ۵ تا ۹)۔

جبکہ اسلامی تاریخ میں اس کا آغاز خود پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ حجۃ الوداع اس باب میں انسانی تصور کی معراج ہے اور آج دنیا اس قدر ترقی کر لینے کے باوجود اس سے بہتر منشور پیش نہیں کرسکتی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے لئے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں ۱۰؍ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا جو منشور جاری کیا وہ اسلامی منشور کے سامنے طفلانہ نظر آتا ہے، جب کہ اس نے بڑی حد تک اسلامی منشور سے بھی ضرور استفادہ کیا ہے، اسی لئے اس منشور کے حق میں روس سمیت ۸ ممالک نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا اور متعدد یورپی مبصرین نے اس کو ایک تشنہ و نامکمل منشور

قرار دیا، نمونہ کے لئے صرف ایک مفکر کا حوالہ پیش ہے:

ہینز کیلس تبصرہ کرتا ہے:

"خالص قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو منشور کی دفعات کسی بھی ملک پر انہیں تسلیم کرنے اور منشور کے مسودہ یا اس کے ابتدائیہ میں صراحت کردہ انسانی حقوق اور آزادیوں کو تحفظ کی پابندی عائد نہیں کرتیں، منشور کی زبان میں کسی ایسی تعبیر کی گنجائش نہیں ہے، جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ رکن ممالک اپنے شہریوں کو انسانی حقوق اور آزادیاں دینے کے قانونی طور پر پابند ہیں۔ (دی لاء آف یونائیٹڈ نیشن لندن: ۱۵/۰ ۱۹۵ء)۔

آج آزادی رائے کے حق کا جس طرح غلط استعمال ہو رہا ہے اور اس کے مفہوم کو جس طور پر مسخ کیا جا رہا ہے اس کی کوئی مثال پچھلے ادوار میں نہیں ملتی، حالانکہ اظہار خیال کی آزادی اسلامی آئین بھی دیتا ہے اور اس سلسلہ میں جتنا توسع اسلامی نظام میں ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا، قرآن نے حکم دیا ہے:

"تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر" (آل عمران: ۱۱۰)۔

(تم بھلائی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو)۔

لیکن اسلام اس حق کے منفی استعمال کی اجازت نہیں دیتا، اسلام معاشرہ کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ اس آزادی کو خیر کے خلاف یا شر کی اشاعت کے لئے استعمال کرے، قرآن نے اس کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے:

"يامرون بالمنكر وينهون عن المعروف" (التوبۃ: ۶۷)۔

(یہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں)۔

یہ حق آزادی کا غلط استعمال ہے کہ کسی مذہب یا اس کی کسی محترم شخصیت کے خلاف توہین آمیز انداز اختیار کیا جائے، قرآن نے اہل اسلام کو اس سے روکا ہے:

"ولاتسبوا الذین یدعون من دون الله" (الانعام:۱۰۸)۔

(جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں برا نہ کہو)۔

انہی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال ایسی پیش نہیں کی جاسکتی، جس میں کسی مذہب کی محترم شخصیات کے خلاف توہین یا بے احترامی کا سلوک کیا گیا ہو، مسلم امت کا سواد اعظم اس سفلی جذبہ سے پاک ہے جو ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات کی جامعیت کا صدقہ ہے، اسلام ایک حق دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے منفی پہلو پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔

اقوام متحدہ نے جو عالمی منشور تیار کیا اس میں آزادئ اظہار کا تو حق دیا گیا، مگر اس کے دوسرے منفی پہلو سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، یہ اس منشور کے نامکمل ہونے کی علامت ہے۔

دراصل یہ پروپیگنڈہ کا دور ہے اور اس میں سب سے بڑا کردار میڈیا کا ہے اور آج میڈیا اسلام مخالف قوتوں کے ہاتھ میں بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے اور اس کو جنگی اسلحہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، جو کام پہلے صلیبی دور میں ہتھیاروں سے لیا جاتا تھا وہ آج میڈیا سے لیا جا رہا ہے، آج اسلام اور مسلمانوں کی منفی تصویر پیش کی جا رہی ہے، اسلامی تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے، یوں پروپیگنڈوں کا یہ سلسلہ بہت قدیم ہے، صرف انداز اور ہتھیار تبدیل ہوا ہے، شکلیں نئی ہیں، جذبہ نیا نہیں ہے، یہ وہی تسلسل ہے جو اسلام کے خلاف قبل سے چلا آرہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس لئے آج بھی ہمیں وہی طریقۂ عمل اختیار کرنا ہوگا جو ایسے موقعہ پر ہمارے سلف نے اختیار کیا تھا، ہمیں منفی اور جذباتی ہونے کے بجائے مثبت اور سنجیدہ طرز عمل اختیار کرنا ہوگا، اسلامی تعلیمات کی معنویت اپنے ذرائع ابلاغ سے دنیا کے ایک ایک انسان تک پہنچانی ہوگی،

ہمیں جدید ذرائع ابلاغ اور وسائل جنگ تک خود رسائی حاصل کرنی ہوگی، عام انسانی برادری کے حق میں ہمیں اپنا رویہ ہمدردانہ، داعیانہ اور فراخدلانہ رکھنا ہوگا، اور باہمی رواداری اور محبت کی ہماری جو زرّیں تاریخ رہی ہے، اس سے ہمیں روشنی حاصل کرنی ہوگی، حضرت امام مالکؒ کا یہ ارشاد آج کے دور میں بڑا معنی خیز ہے:

لایصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح أولها۔

(اس امت کے آخری دور میں بھی وہی طریقۂ اصلاح کارگر ہوگا جو اس امت کے اولین دور میں اختیار کیا گیا)۔

خراب جان کر جس کو بجھا دیا تو نے
وہی چراغ جلاؤ تو روشنی ہوگی

☆☆☆

مسلم اور غیر مسلم حکومتوں میں اقلیات کے حقوق اور ان کا تحفظ تقابل کے آئینہ میں

مولانا نعمت اللہ ندوی ☆

تمہید:

یوں تو ابتدائے آفرینش ہی سے حق و باطل کے درمیان جنگ، اندھیرے اور اجالے کے درمیان مقابلہ اور توحید و شرک کا برسرِ پیکار ہونا چلا آ رہا ہے، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری ازل سے تا امروز مسلسل جاری ہے، جہاں ابراہیم ہیں وہاں نمرود ہے، جہاں موسیٰ ہیں وہاں فرعون ہے، جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہاں ابوجہل وابولہب ہیں، ایک طرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار ہے، تو دوسری طرف یہود و نصاریٰ کی شرارت و نفرت ہے، جہاں مشرق کا اعلان توحید ہے، وہاں مغرب کا طوفانِ ظلمت ہے۔

مختصر یہ کہ خدائی نظام، توحید سے سرشار اور ابلیسی نظام شرک میں غرقاب ہے، دونوں میں زبردست تضاد اور دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے ہیں، یہی سبب ہے جس کی وجہ سے مشرک معاشروں میں مسلم اقلیت ظلم کا شکار، انصاف سے دور اور اپنے حقوق سے محروم نظر آتی ہے اور بعض اوقات اپنے وجود و بقا کے لئے بھی دوسروں کی رہین منت ہے۔

☆ استاذ حدیث ادب دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی بنیاد پر بننے والا معاشرہ کبھی بھی خدا پرست لوگوں کو جینے کا حق دینے کو تیار نہیں، چنانچہ نمرودی حکومت میں ایک چھوٹی سی ابراہیمی اقلیت پر زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ و تاریک ہے، فرعونی حکومت میں خدا پرست موسیٰ کا اقلیتی گروہ سرزمین مصر میں دانے دانے کو محتاج، بے روزگاری کا شکار، غلامی کی زندگی جینے پر مجبور ہے، آئے دن شب خون مارنے کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے، گھربار ان کے محفوظ نہیں، قانون ان کا محافظ نہیں اور کوئی ان کا فریادرس نہیں۔

یہی حال کم وبیش ہر مشرک معاشرہ کا ہے، اس پر تعجب نہ کیجئے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ بس ان کو صرف اس بات کا ڈر ہے کہ کوئی موسیٰ پیدا نہ ہونے پائے، جو ان کا تاج وتخت چھین لے، حقیقت میں ڈر وخوف کی یہی کیفیت ہے، جو ان کو اہل اسلام پر اکثر ظلم کرنے پر آمادہ کرتی ہے، مکہ کا مشرک معاشرہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ ظلم کا رویہ اپنائے ہوئے تھا، تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ توحید پرستوں کو جینے کے حقوق اگر دیدیئے گئے، تو ہماری بت پرستی اور بتوں کی خدائی خاک میں مل جائے گی۔ کفارِ مکہ بہت جلد سمجھ گئے تھے کہ مکہ کی مسلم اقلیت اور اس کے سربراہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پاگل دیوانے نہیں ہیں، وہ جو دین پیش کررہے ہیں، وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہے۔ ابتداء میں تعجب ہوا تھا کہ اتنے معبودوں میں ایک خدا کی پرستش عجیب چیز ہے، "إن هذا لشيء عجاب" پھر ذرا غور کرنے کے بعد کہنے لگے "ان امشوا واصبروا على آلهتكم، إن هذا لشيء يراد" کہنے کے بعد اسلام اور اس کے پیغمبر کا راستہ روکنے کے لئے ڈٹ گئے، حامیان اسلام پر ان کا عرصۂ حیات تنگ کردیا، سماجی بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کردیا، تین سال شعب ابی طالب میں قید وبند کی سختیاں جھیل کر درختوں کے پتے چبانے پر مجبور ہوگئے، یہ اس وقت ہو رہا تھا کہ کفر اکثریت اور Majority میں تھا اور اہل اسلام اقلیت اور Minority میں تھے۔

کفر کی تاریخ یہی رہی ہے کہ وہ اپنے ہی ملک و وطن کے رہنے والوں کو تمام حقوق سے محروم رکھنا چاہتی ہے اور کفر کا خاصہ ہی ظلم کرنے کا ہے۔

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے، کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی، انسان سے انساں ٹکرائے

اس موقع پر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی اس شاہکار عبارت کو نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جس میں مولانا نے "اقلیت اور اکثریت" کی حقیقت کو نہایت ہی مدلل اور جامع انداز میں پیش فرمایا ہے، مولانا کی یہ تحریر ۱۹۴۷ء سے قبل کی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی تہذیب اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لئے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت واکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے اور اس کے لئے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں، تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں؟

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ وہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے، اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے؟ یہ اپنے دین کو ایک کند ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک "قوم" سمجھ رہا ہے، اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے، اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں، اور وہ

جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ ومسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے، تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی، اس کے لئے اکثریت واقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا، بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت وقلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے، ''جماعتوں'' کے لئے نہیں، جو جماعتیں کسی طاقت ورنظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں، روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت 32 ر لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی، مگر اس نے 17 ر کروڑ انسانوں کو مسخر کرلیا، مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف 4 ر لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت 3 لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی، یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ (یہ بات مولانا سید الاعلیٰؒ نے 47ء سے پہلے فرمائی تھی)، اگر قدیم زمانہ کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں، تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے، لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمراں بن سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے اور محدود اغراض کے لئے لڑنے کے بجائے ایسے اصول کے لئے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لئے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہدہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے، لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں،

نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوتِ تسخیر چھپی ہوئی ہے، ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہوسکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لئے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالہ کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔" (تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم: ۳۶، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)۔

غیر مسلم حکومتوں میں مسلم اقلیتیں

ڈنمارک:

ڈنمارک ایک غیر مسلم ملک ہے، وہاں وقفہ وقفہ سے ناموس رسول کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور آپ کی ذات بابرکات کی توہین کی جاتی ہے، پانچ سال قبل اور اس کے بعد ابھی ایک سال قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کی بے عزتی کی گئی تھی، جس نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور پوری دنیا میں اس کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج بھی کیا تھا اور بڑے بڑے جلوس نکالے گئے تھے، جلسے بھی ہوئے، ریزولیوشن پاس بھی کئے گئے، توہین کرنے والے اخبار اور اس کے ایڈیٹر کو سزا دینے کے لیے ڈنمارک کی حکومت کو مجبور کیا گیا، لیکن مسلم اقلیت کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکل سکا، صرف اتنا کہہ دیا گیا کہ ہر ایک کو اپنی بات پیش کرنے کی آزادی ہے، آزادی کے اختیار کا حد سے زیادہ تجاوز کرنے والا انداز غور کرنے کی چیز ہے۔

امریکہ کا نائن الیون کا حادثہ:

امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو جس طرح امریکہ اور اس کی یہودی لابی نے تباہ کر ڈالا اور اس کو اسلامی دہشت گردی سے جوڑ دیا، پھر کیا تھا کہ القاعدہ نام کی نام نہاد تنظیم راتوں رات وجود میں آگئی اور امریکہ نے اسلام اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا، خود امریکہ میں ہزاروں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا، ان کے مکانات اور مساجد پر حملے کیے گئے، پھر امریکہ نے اپنے ناپاک عزائم کو اس طرح پورا کیا کہ افغانستان کو مجرم قرار دے کر طالبان اور اس کے سربراہ ملا عمر اور ان کے ساتھ اسامہ بن لادن کو شامل کر کے افغانستان کی آبادی پر خطرناک بمباری کی، لاکھوں بے گناہ لوگوں کو شہید کر دیا اور جو گرفتار ہوئے ان کو جیلوں میں اذیت ناک سزائیں دیں، جس سے پوری انسانیت چیخ اٹھی، اس حملہ میں امریکہ کا ساتھ کئی ملکوں نے دیا، جیسے برطانیہ، آسٹریلیا، فرانس، جاپان، ترکی، پاکستان اور ہندوستان، پھر اس سے بھی امریکہ کی پیاس نہ بجھی تو اس نے صدام حسین کی جارحیت کا بہانہ بنا کر عراق پر حملہ کر دیا۔ لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے، ہزاروں گرفتار ہوئے اور اس کے صدر صدام حسین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور دنیا کے تمام مسلم وغیر مسلم خاموش تماشائی بنے رہے، امریکہ نے یہ اعلان کیا کہ میں مسلم دہشت گردوں کا خاتمہ کر کے رہوں گا اور اس مقصد کی خاطر اس نے ہزاروں فوجیں افغانستان اور عراق بھیج دیں اور حلیف ممالک کو مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی فوجیں افغانستان اور عراق میں پہنچائیں، لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا، اب امریکہ اور اس کے حلیف ممالک عزت کے ساتھ افغانستان سے بھاگنے کے راستے تلاش کر رہے ہیں، تا کہ افغانستان امریکہ کا قبرستان نہ بن جائے، اس طرح بش نے اپنی یہودی دشمنی کا بدلہ اسلام سے خوب خوب لیا، اس پورے واقعہ پر گہرائی سے نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

فرانس:

ایک عرصہ سے فرانس میں مسلم اقلیت ظلم کا شکار ہے اور آئے دن مسلم طالبات کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور برقعہ پہن کر شرعی دائرہ میں رہتے ہوئے طالبات اسکولوں میں تعلیم حاصل نہ کریں، اس پر پابندی عائد کردی اور ان کو طرح طرح سے مطعون کرنے کی کوشش کی گئی، اور ان تمام باتوں میں اسلام اور مسلمان ہی نشانہ بنے، مزید اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات سے ہر وقت فرانس خائف نظر آتا ہے، فرانس کے اس رویہ اور اس کے اسباب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

انگلینڈ:

انگلینڈ تقریباً دوصدی سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے ذہنی وجسمانی تکلیف کا باعث بنا ہوا ہے اور اس ملک میں رہنے والی مسلم اقلیت پر برابر مظالم ڈھائے چلا جارہا ہے، دنیا میں جمہوریت اور آزادی کا خواہشمند یہ ملک اپنے ہی ملک میں اقلیتوں کو اس نے جمہوری اقدار سے محروم کررکھا ہے اور آزادی کے دروازے اقلیتوں کے لئے اس نے بند کردئے ہیں، خاص طور سے مسلمان اسلامی شعار کو اپنا کر مذہبی اصولوں پر عمل کریں، اس سے انگلینڈ کو اندیشے اور فکر لاحق ہوجاتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام کا ابر کرم انگلینڈ کی آبادی کو اسلام کے قدموں پر ڈال دے، تو اس نے ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور غلط فہمیوں کے پردے ڈالنے کی کوشش برابر جاری رکھے ہوئے ہے نیز اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں سازشوں اور ناپاک منصوبوں کے لئے مرکزی رول ادا کررہا ہے، وہاں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔

فلسطین:

درندگی وسفاکیت کا جس ملک میں سب سے زیادہ مسلمان نشانہ بنے وہ فلسطین میں یہودیوں کے ذریعے بنے جو اسلام کے ازلی دشمن ہیں، دوسری جنگ عظیم کی کامیابی کے بعد امریکہ، برطانیہ اور روس نے مل کر عربوں کے سینے میں چھرا گھونپ کر 67ء میں اسرائیل نام کا ناجائز بچہ وجود میں لایا، اس وقت سے آج تک لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا جا چکا ہے، نوجوانوں کا گولیوں اور بموں سے خاتمہ کر دیا گیا ہے، ان کے گھر بار اجاڑ دئے گئے ہیں، ان کی عورتوں کی عمومی طور پر بے آبروئی کی گئی ہے اور ہزاروں نوجوانوں کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا ہے اور دنیا اس کی بربریت کے اس ننگے ناچ کو دیکھتی رہی، امریکہ اپنے ناجائز بچہ کی محافظت کرتا رہا اور کر رہا ہے، اللہ کے بھروسہ پر عورتیں اور بچے توپوں کا مقابلہ پتھروں سے کر کے دنیا کے سامنے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ جب تک جان میں جان ہے، فلسطین سے یہودیوں کو بھگا کر دم لیں گے اور ان کے ناپاک وجود سے سرزمین مقدس کو پاک کر دیں گے، یہودیوں کے ظلم کی اس تاریخ کو نظر میں رکھئے۔

ہندوستان:

ہندوستان کے موجودہ ماحول میں ہندوتو کے علمبردار مسلم اقلیت کے ساتھ جس ظلم وبربریت کا ننگا ناچ کر رہے ہیں، وہ بھی دراصل اسلام فوبیا ہے، یہ جلتے ہوئے مکانات، یہ جھلستی ہوئی لاشیں، یہ لٹنے والا مال واسباب، یہ سنگینوں پر اچھالے جانے والے ننھے منے بچے، یہ حاملہ عورتوں کے چاک کئے جانے والے پیٹ، یہ پولیس کی گولیوں سے مرنے والے نوجوان، یہ ماؤں کی لٹتی ہوئی آبروئیں، یہ ہوس پرستوں کا ہجوم، یہ شہید ہونے والی مساجد، یہ اکھاڑے جانے والے مقابر، یہ بے روزگاری کا علانیہ کھیل، یہ نہ ختم ہونے والا افلاس، یہ نہ ختم ہونے والی درندگی،

یہ انصاف کے متوالوں سے صادر ہونے والے ظالمانہ فیصلے، یہ پرسنل لا میں مداخلت کرنے کا کھلم کھلا اعلان، یہ یکساں سول کوڈ کی لٹکتی تلوار، یہ مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ بتانے والے لوگ، آتنک واد کے نام پر نوجوانوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھے جانے کا غیر قانونی اقدام، یہ ملت اسلامیہ کو مجموعی طور پر تعلیم سے محروم رکھنے کا خفیہ منصوبہ ہے

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

گزشتہ ساٹھ سالوں سے ہندوستان کی مسلم اقلیت کے ساتھ یہ ظلم ہورہا ہے، آزادی کے بعد سے ہی ہندوتو کے علمبرداروں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرلیا تھا، ان کے ارادہ ومنشا کو پورا کرنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا تھا، جبلپور کا وہ خونیں منظر کس کو یاد نہیں؟ مرادآباد میں عین عید کے موقع پر شہید ہونے والے ہزاروں بچوں کو کوئی بھول سکتا ہے؟ بھیونڈی میں کارخانوں میں آگ لگانے والوں کو کوئی معاف کرسکتا ہے؟ میرٹھ کے فساد میں خود پولس کے ذریعہ دریا میں بہائی جانے والی مسلم نوجوانوں کی لاشوں کو کوئی فراموش کرسکتا ہے؟ جمشید پور میں کام کرنے والے مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے کی کہانی کو کیا بھلایا جاسکتا ہے؟ اور گجرات میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو آگ میں زندہ جلادئے جانے کا واقعہ کیا تاریخ سے مٹایا جاسکتا ہے؟ ’’ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها‘‘ کی صدائے احتجاج کیا ہمارے کانوں سے نہیں ٹکرا رہی ہے؟۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کہاں گیا وہ دستوری تحفظ؟ کہاں گئے اقلیتوں کے حقوق کے تئیں وہ آئینی قوانین؟ اور کہاں غائب ہوگئیں وہ ہندوستان کے تمام باشندوں خاص طور پر اقلیتوں کو ان کے مذہب پر چلنے، عمل کرنے اور ان کے بنیادی حقوق کے تحفظات کی یقین دہانیاں؟۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ ــــ ایک جائزہ:

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے جہاں مسلم اقلیت کی بے شمار بدحالیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے، وہیں اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں، اسی رپورٹ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا تعلیم میں پچھڑنے کا یہ عمل گزشتہ ساٹھ سالوں سے چل رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جہالت وفساد بڑھتا ہی جا رہا ہے، ان کا معیار زندگی گھٹتا ہی جا رہا ہے، ان میں نت نئی برائیاں پنپ رہی ہیں، وہ گزرنے والے شب وروز سے سبق نہیں لے رہے ہیں، جہالت کی وجہ سے ان کی سوچ انتہائی درجہ تک گر چکی ہے، وہ ہر برائی کی آماجگاہ بن چکے ہیں، اپنے ماضی سے ان کا رشتہ کمزور ہو چکا ہے، حال سے وہ ناآشنا ہیں، مستقبل کے منصوبوں سے وہ بے خبر وغافل ہیں۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں میں تعلیم کی شرح سب سے کم ہے، کسی بھی سطح پر وہ ملک کی اکثریت کے مقابل نہیں ہیں، اس لئے جب تک وہ ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے مقابل نہیں ہو جائیں گے، ان کی ترقی نہیں ہو سکتی ہے، تعلیمی پسماندگی کے سبب مسلمان ملک کی معاشی ترقی میں بھی حصہ نہیں لے سکتے ہیں، سرکاری ملازمتوں میں بھی اکثر ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے، جس کے سبب حکومتی ملازمت میں ان کی مناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے، حتیٰ کہ نچلی سطح کی سرکاری نوکریوں میں بھی مسلمان پیچھے ہیں، جہاں تعلیم کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی ہے، سماجی طور پر وہ اتنے مفلوج ہو گئے ہیں کہ وہ حکومت کی مدد کے خواہاں ہیں، حکومت نے گرچہ سچر کمیٹی کی سفارشات کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے مخصوص اقدامات کا بھی اعلان کیا ہے، لیکن ان پر کہاں تک عمل درآمد ہوتا ہے، یہ تو دن گزرنے کے ساتھ ہی دیکھا جا سکے گا، سماجی اور معاشی طور پر مسلمانوں کے ساتھ عرصہ سے جو سوتیلا پن کا سلوک کیا جا رہا ہے، اس کے

پیش نظر مسلم نوجوانوں کا سسٹم سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور وہ اپنے مستقبل کے تئیں مایوس ہو چکے ہیں، اس لئے حکومت کو ان کے لئے جلد از جلد خصوصی اقدامات کرنا ضروری ہے، تا کہ ان کا سسٹم پر اعتماد ہو جائے، حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرے جہاں سے وہ اپنے مسائل اور تکالیف کا اظہار کرسکیں، مزید یہ کہ ایسے اقدامات کئے جائیں، جس سے وہ مین اسٹریم ترقی میں اپنا رول ادا کرسکیں، تعصب، تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی نے مسلمانوں کو اپنے روشن مستقبل کے تئیں بہت مایوس کیا ہے، اگر عدل وانصاف کے ساتھ انہیں پھر شہری اور ملکی حقوق مہیا کرائے جائیں تو وہ بھی ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لائق بن سکتے ہیں، اگر ہم دستور کی دفعہ 341 کا سہارا لیں تو حکومت کو قدم اٹھانے پر مجبور کرسکتے ہیں، اس کی دفعہ 14، 15، 16 میں کہا گیا ہے کہ ملک میں کسی بھی شہری کے ساتھ جنس، ذات، مذہب یا کسی اور چیز کی بنیاد پر کوئی تعصب نہیں برتا جانا چاہیے، اس دفعہ کے تحت مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعصب برتنا بھی خلاف قانون اور دستور کی پامالی ہے، ملک کے کل او بی سی میں مسلمان بھی ایک تہائی ہیں، لیکن غیر مسلم او بی سی کے مقابلہ میں مسلم او بی سی کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے، دراصل مسلمان اتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ جب تک ان کے لئے خصوصی بندوبست نہیں کیا جائے گا وہ دوسرے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ نہیں چل سکیں گے، دوسری چیز جواب انتہائی اہم ہوگئی ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ کو یقینی بنانا ہوگا، انہیں جب تک اپنے جان ومال کا ڈر ہوگا وہ ترقی نہیں کرسکیں گے، مسلمانوں کو بے جا ہراساں کرنا اور دہشت گردی کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے عمل کو بھی روکنا ہوگا، اب بھی سینکڑوں نوجوان بلاوجہ دہشت گردی کے جھوٹے کیس میں جیلوں میں قید ہیں، یہ نوجوان دراصل قوم کا اثاثہ ہیں، لیکن انہیں زبردستی فرضی کیس میں پھنسا کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے درحقیقت ہمیں جگا دیا ہے اور چونکا دیا ہے، ہونا تو یہ چاہیے

تھا کہ ہم زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیتے، اس لئے کہ زندہ قوموں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنا جائزہ لیتی ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کر سکے اور دوسروں نے آکر ہمیں بیدار کیا، اب بیداری کے بعد دوبارہ سوجانا اچھی علامت نہیں ہے، یہ ایک بڑا اور سنگین مسئلہ ہے، جس سے ہم ہندوستان میں دوچار ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسلامی دہشت گردی کا ہوا ہے، جو ہمارے ملک میں جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہے، غالب قومیں اور خصوصاً یہودی قوم اسلام اور مسلمانوں کے لئے مختلف الفاظ والقاب سے موسوم کر کے ہمیشہ مطعون کرتی رہی ہیں، کبھی بنیاد پرستی کے نام سے تو کبھی رجعت پسندی کے نام سے اور اب الفاظ کو فرسودہ مان کر ان کی جگہ اسلامی دہشت گردی کو بٹھادیا گیا ہے، پھر کیا تھا قیامت برپا ہوگئی اور پھر تو وہ ملک بھی دہشت گرد کہلائے جو اسلام کی بات کرتے ہیں، وہ مدرسے بھی دہشت گرد قرار دئے گئے، جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے، وہ بچے بھی دہشت گرد کے نام سے ملقب کئے گئے، جو وہاں ایک اچھے انسان بنتے ہیں، ان تنظیموں کو بھی دہشت گرد کا نام دیدیا گیا، جو اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی پیش کرنا چاہتی ہیں، وہ معاشرہ بھی دہشت گرد کہلایا جو اسلام کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا ہو، جبکہ علماء اسلام بار بار اس کی تردید کر چکے ہیں کہ اسلام دہشت گرد مذہب نہیں ہے، نہ وہ دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے، وہ تو سراسر رحمت ہی رحمت ہے، لیکن باطل نے ایک نہ سنی، نوجوانوں کی گرفتاریاں جاری ہیں، ان کا انکاؤنٹر کیا گیا اور اعلان یہ کیا گیا کہ ہمیں ان اسلام پسندوں سے ڈر لگتا ہے، ان کی بنیاد پرستی سے ہمارے اندر لرزہ پیدا ہوجاتا ہے، بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں تو اس اسلام سے ہی خوف ہے جو خدا کے ایک ہونے کا پیغام دیتا ہے، یہ پیغام، یہ تصور اور یہ دعوت ہمارے مشرک معاشرہ، لادینی سماج اور ملحد حکومت کے خاتمہ کا اعلان ہے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت جن طوفانوں سے دوچار ہوئی ہے، اس کی جگہ کوئی دوسری قوم اگر ہوتی تو اب تک صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی، یا اپنا وجود کھو بیٹھتی، لیکن بقول اقبال ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

مسلمانوں نے بھارت کی آزادی کے لئے جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں، ان کی قربانیوں کے سبب ہی بھارت نے آزادی کا سورج دیکھا ہے، تقریباً 36 ہزار علماء نے شہادت کا جام پیا ہے اور لاکھوں مسلمان زبردست تباہی کا شکار ہوئے ہیں، انگریزوں نے ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک اس لئے کیا کہ سلطنت مغلیہ ان ہی سے چھینی تھی، تو وہی انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن تھے، پھر جب 47ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور کانگریس کی حکومت بنی تو مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا گیا، ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے، پولس اور فوج میں بھرتی کرنے سے روک دیا گیا، اردو زبان کے لئے زمین تنگ کر دی گئی، تعلیم کے میدان میں وہ پیچھے ڈھکیل دیے گئے، روزگار کی راہیں ان کے لیے بند کر دی گئیں ۔

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
جب بہار آئی تو کہتے ہیں تیرا کام نہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ بھکمری کے ناگ نے ان کی زندگیوں کو نگل لیا، اس پر ستم یہ کہ پورے ملک میں ہندوتو کی لہر چلائی گئی، فسادات کی آگ جنگل کی طرح پھیلی، بڑے بڑے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، سکون واطمینان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، فسادات نے مستقبل کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا، ان کے ذہن وفکر کو الجھانے کے لئے نت نئے مسائل پیدا کر دیئے گئے، کبھی مسلم پرسنل لا میں مداخلت کر کے، کبھی وندے ماترم تو کبھی سوریہ نمسکار کے ذریعہ، کبھی دہشت گردی کا الزام لگا کر تو کبھی عمرانہ کے قضیہ کو ہوا دے کر، کبھی بدنام زمانہ تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی کو سہارا دے کر، کبھی مالیگاؤں کا بم دھماکہ ہے تو کبھی بٹلہ ہاؤس کا انکاؤنٹر، کبھی ممبئی

حملہ ہے تو کبھی گودھرا ٹرین کا فرضی وجعلی واقعہ، اوراس سے بھی پہلے چاندمل چوپڑا کا قرآن کی 24 آیتوں کے خلاف مقدمہ، کبھی سیمی کے نام پر بے قصور مسلم نوجوانوں کو جیلوں میں بند کرنے کی سازش تو کبھی داڑھی کا مسئلہ اور کبھی برقعہ کا موضوع، کبھی دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی عظیم دینی درسگاہوں پر حملہ اور کبھی بابری مسجد کی شہادت کا عظیم سانحہ۔

اوراب مرکزی مدرسہ بورڈ کے نام سے ایک تجویز سازش کے تحت دینی مدارس کے خلاف تیار کی گئی ہے، جس کو ہمارے علماء نے نامنظور کردیا ہے۔

مرکزی مدرسہ بورڈ کا حقیقی چہرہ:

دستور کی دفعہ 30 کے تحت کسی بھی اقلیت کو اپنے ادارے قائم کرنے، بڑھانے اور اس کے نظم کو قائم رکھنے کا حق ہے، اسی دفعہ کی بنیاد پر یہ مدارس آزادانہ کام کررہے ہیں۔

اگر واقعی ان کی نیت مسلمانوں کے تئیں نیک ہے، تو پہلے وہ ہماری تعلیمی، معاشی اور سماجی حیثیت کو دور کرنے کے لئے اقدام کرے، اقلیتوں کے لئے اسکول اور کالجوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طرز پر یونیورسٹیاں قائم کرکے ہماری تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرے، بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزی روٹی کے ذرائع فراہم کرے، جہاں تک مدارس اسلامیہ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی مقصد وہاں سے ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس، یا آئی پی ایس سائنسداں پیدا کرنا نہیں، بلکہ ہم اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے ہمکنار کرکے حفاظ، علماء، مولانا، مفتی اور قاری بنانا چاہتے ہیں، اس لئے ہم اپنے بچوں کو مدرسوں میں بھیجتے ہیں، مرکزی مدرسہ بورڈ کے پیچھے حکومت کا منشا کیا ہے، یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن محض 4، 5 فیصد مدرسوں میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے ان کے سینوں میں اتنا درد کیوں ہورہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے نام پر ہماری خالص دینی درسگاہوں کو ان کے حقیقی مقاصد سے ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے، جس طرح

صہیونی طاقتیں یہ نہیں چاہتیں کہ دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو اور پوری دنیا میں مدارس اسلامیہ کا پرچم لہرائے، یہی وجہ ہے کہ مدارس ان کی آنکھوں میں کنکری کی طرح چبھ رہے ہیں۔

اگر واقعی حکومت مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے 4،5 فیصد بچوں کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہے، تو مدارس اسلامیہ سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے طلباء کے لئے ان کی تعلیم کے اعتبار سے ان کے لئے روزی روٹی کا بندوبست کیا جائے، تب یہ بات کسی حد تک مانی جاسکتی ہے کہ آپ واقعی نیک نیتی سے ہماری ترقی چاہتے ہیں، ورنہ سچر کمیٹی رپورٹ نے جس طرح سے آپ کو سچائی کا آئینہ دکھایا ہے، اس کے بعد بھی ہم آپ پر بھروسہ کریں یہ ممکن نہیں، اس لئے کہ جو اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں وہ نہ ہی مسلمانوں کے لئے نیک نیتی سے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ مدارس اسلامیہ کی بھلائی چاہتے ہیں، دراصل ہماری تعلیمی درسگاہوں کو یرغمال بنا کر اس کو پامال کرنا اور مدارس اسلامیہ کو ان کے بنیادی مقاصد سے دور کرنا ہی ان کا مقصد ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی پر بھی حکومت اسی طرح مہربان ہوئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کا اقلیتی کردار ختم کر دیا گیا، اس کے بعد بھی ہم ان پر بھروسہ کریں، کیا یہ ممکن ہے؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار عظیم مسائل ہیں، جن میں ہندوستانی مسلم اقلیت جھلس رہی ہے اور جل رہی ہے، پھر اس پر مستزاد یہ کہ میڈیا نے ملک میں پیش آنے والے ہر اتفاقی حادثہ میں شک کی سوئی مسلم نوجوانوں کی طرف ہی گھمائی ہے۔ اخبارات نے بھی اس کے زخمی جسم سے ہمیشہ کھلواڑ کیا ہے، ان ناگفتہ بہ حالات میں مسلم اقلیت افتاں وخیزاں چلتی رہی اور اپنے دین وایمان کو گلے لگا کر اپنے وجود کا اعلان کرتی رہی۔

تو تیر آزما میں جگر آزماؤں

اور بقول عامر عثمانی ؎

کوئی اور زخم تازہ کوئی اور ضرب کاری

دوسری طرف ہندوستان کے سیاسی لیڈران کو اپنا ووٹ بینک سمجھ کر جھوٹی تسلیوں،

جھوٹے وعدوں اور جھوٹے سہاروں پر چلاتے رہے، وہ ووٹ مانگتے رہے اور ہم ووٹ دیتے رہے، درمیان میں وقتاً فوقتاً مسلم اقلیت کی حمایت میں آوازیں ضرور اٹھیں اور کچھ ان کی فلاح وبہبودی کے منصوبے بھی بنے اور کچھ سفارشات بھی منظور ہوئیں، لیکن وہ سب ٹھنڈے بستہ میں چلی گئیں، گویا ہم جہاں سے چلے تھے آج وہیں کھڑے ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد علماء کی طرف سے مسلم قوم کے لئے اقدامات:

ان تمام گھٹاٹوپ اندھیروں اور مایوس کن حالات کے باوجود ان ساٹھ سالوں میں آزادی کے بعد علماء ہند نے ملت اسلامیہ کو مایوس کن حالات سے نکالا، ان کے اندر حوصلہ وولولہ پیدا کیا، ان کی ہمت کو بندھایا، ان کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی اور پھر منظم طور پر متحدہ کوششوں سے اسلام کو اقدامی پوزیشن میں لانے کی کوشش کی، انہوں نے مدرسے قائم کئے، دینی اداروں کا قیام کر کے علوم دینیہ وعلوم قرآن سے ان کو وابستہ کیا، مساجد کی تعمیر کی اور ان میں مدارس کی بنیادیں ڈال کر قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں ان میں بلند کیں، دینی تنظیموں نے اپنے اپنے پلیٹ فارموں سے ملت کو آواز دی اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی طرف پیش رفت کی، مدارس دینیہ نے علم کو پھیلایا، تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کو کلمہ ونماز سے جوڑا، جماعت اسلامی نے مکمل اسلام کی دعوت دی اور اقامت دین کی جدوجہد کے لئے ذہنوں کو تیار کیا، جمعیۃ علماء نے ملت کے سیاسی وسماجی مسائل کی طرف توجہ دی، مسلم پرسنل لا بورڈ نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی خدمت اجتماعی طور پر انجام دی اور ملت کے مختلف مکاتب فکر ومسالک کو شامل کر کے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ ان کے پرسنل لا میں کسی بھی قیمت پر مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی اور یہ بتایا کہ ان کے وجود وبقا کا انحصار پرسنل لا کے تحفظ پر مبنی ہے، دینی تعلیمی کونسل یوپی نے عملی جدوجہد کر کے دینی مدارس کا جال پھیلایا، مسلم لیگ نے ان کا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کرنے کی سعی جمیل کی، یہ الگ بات ہے کہ مسلم لیگ اپنا سیاسی وجود برقرار نہ رکھ سکی، تعمیر ملت حیدرآباد نے

مسلمانوں کے اندر دینی شعور بیدار کر کے ان کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ دیا، مسلم مجلس مشاورت نے ملت اسلامیہ ہند کی نشأۃ ثانیہ کے لئے کارہائے نمایاں انجام دئے اور اب ملی کونسل اسی مقصد کو لیکر کام کر رہی ہے، بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے بابری مسجد کے لئے سرفروشی کا جذبہ بیدار کیا، علماء ہند نے دینی جلسوں، سیرت کے جلسوں کے ذریعہ شہر شہر، دیہات دیہات اور قریہ قریہ رات دن اپنے آرام وسکون کو قربان کر کے اسلام، قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے اور اس پر چلنے کو باعث عزت قرار دیا، جماعت اسلامی نے ایک اور زبردست کارنامہ یہ انجام دیا کہ ہندوستان کی 14 رزندہ زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کر کے قرآن کے پیغام کو عام کیا اور اسلام کی تعلیمات کو لٹریچر کی شکل میں علاقائی زبانوں میں منتقل کرایا، تاکہ ہندوستانی باشندے اسلام کو خود ان کی زبانوں میں سمجھیں اور "**وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه**" کے ذریعہ اسلام کو قابل فہم بنایا۔

تیسری طرف اسلام کے داعی ومبلغین، ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے اور انہوں نے داعیانہ کردار ادا کیا۔

مذکورہ بالا جائزہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کام جو ہزار سال میں بھی انجام نہ دیا جاسکا تھا، وہ ساٹھ سالوں میں انجام دیا گیا، جو کام مغلیہ حکومت کے بڑے بڑے بادشاہ نہ کر سکے وہ ضعیف وناتواں ملت نے کر کے دکھایا۔

یہ مختصر جائزہ غیر مسلم ملکوں میں رہنے اور بسنے والی اقلیات کا ہے، اب ذرا آیئے ان ملکوں کا جائزہ لیں، جہاں مسلمانوں کا اقتدار ہے یا جہاں مسلم حکومتیں ہیں اور غیر مسلم اقلیت میں ہیں۔

یہ ملک سعودی عرب ہے کہ جہاں ہزاروں دوسرے ممالک کے دانشور ہندو ملازمتیں کر رہے ہیں، سینکڑوں غیر مسلم نوجوان اپنی لیاقت وقابلیت اور اپنے ہنر وفن کے ذریعہ سعودی

حکومت کے بڑے پروجیکٹوں میں مددگار بن کر خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کو نہ کسی فساد کا اندیشہ ہے نہ گھربار کے لٹنے کا خدشہ، جان و مال پوری طرح ان کا محفوظ ہے، بچے محفوظ ہیں اور عزت و آبرو محفوظ ہے، ایماندارانہ طرز عمل ان کی ملازمتوں کے تحفظ کا ضامن بنا ہوا ہے۔

یہ لیبیا ہے کرنل قذافی کا دیش، اس میں بھی ہندو ڈاکٹر بے شمار ہیں اور اپنے علم وفن سے اس ملک کے عوام و خواص کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، نہ ان کو کسی حملہ کا ڈر ہے اور نہ عزتوں کا خطرہ، نہ جان و مال کی بربادی کا خوف ہے نہ اپنے اہل وعیال کی ناموس کی فکر۔

یہ پاکستان ہے، برسوں سے تقسیم کے بعد غیر مسلم وہاں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں اور وہاں کے شہری بن کر بے خوف زندگی گزار رہے ہیں، کبھی ان کو فرقہ وارانہ فسادات سے واسطہ نہیں پڑا، نہ ہی وہ اس سے دوچار ہوئے، جبکہ تقسیم کے بعد اگر پاکستان سے چل کر مسلمان ہندوستان آئے ہیں تو زیادہ صحیح پھر بھی کافی غیر مسلم بھی پاکستان پہنچے ہیں، پھر وہاں کی قدیم غیر مسلم آبادی بالخصوص پنجابی اور سندھی اپنے اپنے مذہب پر چلتے ہوئے کاروبار کر رہے ہیں، نہ ان کو مذہب کا خطرہ ہے اور نہ جانوں کے تلف ہونے کا، نہ آبادی سے دور مکان بنا کر رہنے کی فکر دامنگیر ہے، وہ جہاں چاہیں جیسے چاہیں قیام کر سکتے ہیں اور سکون سے رہ سکتے ہیں۔

تو اس طرح کی سینکڑوں مثالیں آج کی مسلم دنیا میں غیر مسلم اقلیت کے ساتھ رواداری اور انصاف کی ہم کو دیکھنے کو ملتی ہیں، اب سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم اقلیتیں کیوں محفوظ ہیں اور ان کے ساتھ روادارانہ سلوک و برتاؤ کیوں ہے؟ تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اسلام نے یہ سبق اپنے ماننے والوں کو پڑھایا ہے کہ "**الخلق کلهم عیال الله**" اور "**کلکم بنو آدم و آدم من تراب**"۔ اسی تصور نے ان کے ذہنوں کو رنگ و نسل، ملک و وطن اور لسانی و علاقائی تعصب سے ہمیشہ پاک رکھا ہے اور بلاتفریق مذہب و ملت ان کو انصاف و رواداری پر قائم رہنے پر مجبور کیا ہے۔

اسی طرح کی رواداری کے روشن اور تابناک نمونے ہم کو قرن اول یعنی عہد رسول اور پھر خلافت اسلامیہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں بہتر طور پر نظر آتے ہیں، آیئے ہم اسلام کی اس درخشان تاریخ پر عہد بعہد نظر ڈالیں:

سب سے پہلے "محسن انسانیت اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک" کے اس بے مثال اور بے نظیر واقعہ کو دیکھیں جس کو تاریخِ انسانی آج تک پیش کرنے سے قاصر رہی ہے:

"اقتدار ملنے کے بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رحم وکرم فتح مکہ میں جلوہ گر ہوتا ہے، دنیا نے اقتدار ملنے کے بعد رحم وکرم کی مثالیں کم ہی دیکھی ہوں گی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلفاء میں رواداری اور غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کی مثالیں بیشمار ملتی ہیں اور یہ سب کچھ اسلام کے عقیدۂ توحید کی دین ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی مثال فتح مکہ کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ میں مکہ میں دس ہزار فوجوں کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے تھے، اس وقت آپ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تک کوئی شخص خود ان پر حملہ آور نہ ہو وہ کسی پر تلوار نہ اٹھائیں، اور مکہ میں داخلہ کے بعد اعلان عام کر دیا کہ جو شخص حرم میں چلا جائے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا وہ مامون ہے۔"

اس کے بعد عہد صدیقی پر نظر ڈالئے:

عہد صدیقی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت ذمیوں (غیر مسلموں) کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، اس لئے حضرت ابوبکرؓ ان کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، عہد رسالت میں ان کے حقوق متعین ہو چکے تھے، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں وہ پوری طرح قائم رہے اور آپ نے ان کی تجدید وتوثیق فرمائی اور نئے ذمیوں کو بھی وہی حقوق عطا فرمائے، چنانچہ حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے:

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کئے جائیں گے اور نہ ان کا کوئی ایسا قصر گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔"

جزیہ کی شرح نہایت آسان تھی اور اس سے بھی بکثرت ذمی مستثنیٰ کر دیئے جاتے تھے، چنانچہ حیرہ کے سات ہزار باشندوں میں ایک ہزار بالکل مستثنیٰ تھے اور باقی سے دس دس درہم سالانہ لیا جاتا تھا اور اپاہج اور نادار ذمیوں کی کفالت کا بیت المال ذمہ دار تھا۔ (کتاب الخراج: قاضی ابو یوسف)۔

عہد فاروقی:

کسی حکومت کے عدل و مساوات کے جانچنے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ غیر قوموں کے ساتھ اس کا طرز عمل کیا ہے اور اس کو اس حکومت میں کیا حقوق حاصل ہیں، اس معیار سے فاروقی عہد، عدل و مساوات کا نمونہ تھا۔

عرب کی ہمسایہ دو حکومتیں تھیں، روم اور فارس، یہی دونوں حکومتیں فاروقی عہد میں اسلام کے زیر نگیں ہوئیں، ان دونوں حکومتوں کا طرز عمل خود اپنی ہم قوم رعایا کے ساتھ غلاموں سے بدتر تھا، تو دوسری اقوام کا کیا ذکر؟ لیکن جب یہی قومیں اسلام کے زیر نگیں ہوئیں تو دفعۃً ان کی حالت بدل گئی اور انہیں ہر طرح کے جائز حقوق اور جائز آزادی عطا کی گئی۔

کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں، جان، مال اور مذہب، ان کے سوا اور جتنے حقوق ہیں وہ سب انہی کے تحت آتے ہیں، حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ قوموں کے ان تینوں بنیادی حقوق کو محفوظ قرار دیا، بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ جو حقوق دیے وہ یہ تھے:

"یہ وہ امان ہے، جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہل ایلیا کو دی، یہ امان جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذہب کے لئے ہے، نہ ان کے گرجا میں

سکونت اختیار کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اوران کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔" (طبری۔ حالات فتح بیت المقدس)۔

یہ حقوق صرف اہل ایلیا کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ تمام اقوام کو دئے گئے، جو ان کے عہد ناموں میں موجود ہیں، اہل جرجان کے معاہدہ کے الفاظ یہ ہیں کہ "ان کی جان، مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے، ان میں سے کسی شئے میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا۔"

آذر بائیجان کے معاہدہ میں ہے کہ "جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے۔" موقان کے معاہدہ کے الفاظ بھی یہی ہیں۔ حضرت عمرؓ وقتاً فوقتاً عمال کو ان معاہدوں کی پابندی کی تاکید لکھتے رہتے تھے، حضرت ابوعبیدہؓ فاتحِ شام کو لکھا:

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کا مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں کی گئی ہیں ان کو پوری کرو۔"

اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کا قتل کر دیتا تھا تو حضرت عمرؓ اس سے قصاص لیتے تھے، ایک مرتبہ قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا، تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالہ کر دیا، انہوں نے اسے قتل کر دیا۔

ذمیوں کی املاک کو کوئی نقصان پہنچتا تھا تو اس کا معاوضہ دلاتے تھے، ایک مرتبہ فوج نے شام کے ایک ذمی کی زراعت پامال کر دی، حضرت عمرؓ نے اس کو بیت المال سے دس ہزار معاوضہ دلایا۔

جزیہ کی بحث:

اس سلسلہ میں ذمیوں سے جزیہ ایک ٹیکس ایسا ضرور لیا جاتا تھا، جو مسلمانوں سے نہیں لیا جاتا تھا، لیکن یہ ان کی حفاظت اور جنگی خدمات کا معاوضہ تھا، ذمی جنگی خدمات سے مستثنیٰ تھے

اور مسلمان اس کے لئے مجبور تھے، اس لئے مسلمانوں سے اس کے لینے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ مال کے بجائے جان دینے پر مجبور تھے، اکثر معاہدوں میں اس کی تصریح ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا ٹیکس تھا، چنانچہ اہلِ جریان سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ہمارے ذمہ اس شرط پر تمہاری حفاظت ہے کہ تم کو بقدرِ استطاعت سالانہ جزیہ دینا ہوگا، اور اگر ہم تم سے مدد لیں گے تو اس کے بدلہ میں جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔"

آذر بائیجان کی فتح میں یہ معاہدہ لکھا گیا:

"جو لوگ کسی سال فوج میں کام کریں گے، تو اس سال کا جزیہ ان سے نہ لیا جائے گا۔"

چنانچہ جب کبھی ذمیوں سے فوجی خدمت لی جاتی تھی، تو ان کا جزیہ چھوڑ دیا جاتا تھا، ایران کی فتوحات کے سلسلہ میں جب اس قسم کے مواقع پیش آئے تو حضرت عمرؓ نے افسرانِ فوج کو لکھ کر بھیجا کہ "جن ذمی سواروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو ان سے مدد لو اور ان کا جزیہ چھوڑ دو۔"

یرموک کے معرکہ کے سلسلہ میں جب مسلمان ذمیوں کی حفاظت سے معذور ہو گئے تو جزیہ کی کل وصول شدہ رقم واپس کر دی گئی، حضرت ابو عبیدہؓ سپہ سالارِ افواجِ شام نے تمام مفتوحہ اضلاع کے حکام کو لکھ بھیجا کہ جتنا جزیہ وصول ہو چکا ہے سب واپس کر دیا جائے۔

عہدِ مرتضیٰ

ذمیوں کے ساتھ نرمی:

حضرت علی مرتضیٰؓ ذمیوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھتے تھے، عمال کو ان کے ساتھ نرمی اور حسنِ سلوک کی ہدایت فرماتے تھے، اپنے ایک عامل عمرو بن مسلمہ کو جن کی درشت مزاجی کی

ذمیوں کو شکایت تھی، حضرت علیؓ نے لکھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقہ کے ذمی دہقانوں کو تمہاری درشت مزاجی کی شکایت ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، تم کو سختی اور نرمی دونوں سے کام لینا چاہیے، لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک، ان پر جو مطالبہ ہے اسے وصول کیا کرو، لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔"

ذمیوں کی آبپاشی کی ایک نہر پٹ گئی تھی، یہاں کے عامل قرظہ بن کعب انصاری کو لکھا:

"تمہارے علاقہ کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر پٹ گئی ہے، جس کا بنانا مسلمانوں کا فرض ہے، تم اسے درست کرا کے آباد کرا دو، میری عمر کی قسم! مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ ہو جائیں یا ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔"

اہل عجم کے ساتھ اس لطف و کرم کا برتاؤ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اس عربی نے نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی۔

عدل و مساوات:

آپ کے ایوانِ عدالت میں بلا امتیاز مذہب و ملت خویش و بیگانہ، امیر و غریب سب برابر تھے، اگر خود آپ کسی مقدمہ میں فریق ہوتے تھے تو قاضی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا، اور اگر ثبوت نہ ہوتا تو مقدمہ آپ کے خلاف فیصل ہوتا، ایک مرتبہ آپ کی زرہ گر پڑی اور ایک نصرانی کے ہاتھ لگی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچانا اور قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی زرہ ہے، قاضی نے حضرت علیؓ سے پوچھا: آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ دیا، اس فیصلہ سے یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا اور کہا: یہ تو انبیاء کے جیسا انصاف ہے کہ امیر المومنین مجھے اپنی عدالت

کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔

امیرِ معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ذمیوں کے مال وجائداد کی حفاظت اور ذمہ دار عہدوں پران کا تقرر:

خلفائے راشدین کو ذمیوں کے حقوق کی حفاظت میں بڑا اہتمام تھا، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بھی اس کالحاظ رکھا گیا، ان کے معاہدہ کا پورا احترام کیا جاتا تھا، عقبہ بن عامر الجہنی کو جو مصر کے گورنر تھے، تھوڑی سی زمین کی ضرورت تھی، امیر معاویہؓ کی اجازت سے انہوں نے ایک پرتی زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی، انتخاب کی، ان کے نوکر نے کہا کوئی عمدہ قطعہ پسند کیجئے، انہوں نے جواب دیا: یہ نہیں ہوسکتا، ذمیوں سے جو معاہدہ ہے، اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کی زمین ان کے قبضہ سے نہ نکالی جائے گی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یوحنا کے گرجے کے پاس مسجد تعمیر ہوئی تھی، امیر المؤمنین معاویہؓ نے گرجے کو بھی شامل کر لینا چاہا، لیکن عیسائی راضی نہ ہوئے، اس لئے یہ خیال ترک کر دیا۔

ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر:

• فوج میں تو غیر مسلم حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ سے بھرتی کر لئے جاتے تھے، لیکن اس زمانہ میں انہوں نے اعتماد نہ پیدا کیا تھا، اس لئے ذمہ داری کے عہدوں پر ان کا تقرر نہ ہوتا تھا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں متعدد غیر مسلموں کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا، چنانچہ ابن آثال نصرانی کو حمص کا کلکٹر مقرر کیا اور سرجون بن منصور رومی کو کاتب (پرائیویٹ سکریٹری) بنایا (طبری: ۷ر ۵۰۲)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ:

کسی حکمراں کے عدل وانصاف اور ظلم وجور کے جانچنے کا سب سے بڑا معیار دوسری ماتحت قوموں اور اہل مذہب کے ساتھ اس کا سلوک اور طرز عمل ہے، اس معیار سے حضرت عمر بن

عبدالعزیزؒ کا دور سراپا عدل تھا، انہوں نے ذمیوں کے حقوق کی جیسی حفاظت کی اور ان کے ساتھ جو نرمی برتی اس کی مثال عہد فاروقی کے علاوہ تاریخ اسلام کے اور کسی دور میں نہیں مل سکتی، ذمیوں کی اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت میں سرمو فرق نہیں کیا، ان کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی، جزیہ کی وصولی میں نرمی اور سہولت پیدا کی، ان کے لئے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کیں، عمال کو وقتاً فوقتاً اس کے متعلق احکام لکھتے رہتے۔

عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ: "ذمیوں کے ساتھ نرمی برتو، ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے، اس کی کفالت کا انتظام کرو، اگر اس کا کوئی صاحب حیثیت رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو، ورنہ بیت المال سے کفالت کا انتظام کرو، جس طرح اگر تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے، تو اسے یا تو آزاد کرنا پڑے گا یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی" (ابن سعد: ۵/ ۲۸۰)۔

ذمی کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر قرار دی، ایک بار حیرہ کے ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حیرہ کے حاکم کو لکھا کہ قاتل کو فوراً مقتول کے ورثہ کے حوالہ کر دو، وہ چاہیں تو قتل کریں، چاہیں تو معاف کر دیں، چنانچہ اس حکم پر قاتل حوالہ کر دیا گیا اور مقتول کے ورثہ نے اسے قتل کر دیا (نصب الرایہ: ص ۲۶۰)۔

کوئی مسلمان ذمیوں کے مال پر دست درازی نہیں کر سکتا تھا، جو ایسا کرتا تھا اسے پوری سزا ملتی تھی، ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شعوذی نے ایک سرکاری ضرورت سے ایک نبطی گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو چالیس کوڑے لگوائے (ابن سعد: ۵/ ۲۷۶)۔

عیسائی رعایا اندلس میں:

اسلامی فتح کے ابتدائی دور میں امن وامان قائم ہو جانے کے بعد مسلمان والیان نے مسلم وغیر مسلم رعایا میں کوئی فرق نہیں کیا، جس طرح انہوں نے مسجدوں اور مکتبوں کا انتظام کیا،

اسی طرح ان کے کلیساؤں کے لئے بھی نظم وضبط کے اصول بنائے، ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل رہی، ان کے اساقفہ کے عہدوں کو سرکاری حیثیت سے تسلیم کیا گیا، وہ اساقفہ گویا عیسائی رعایا اور اسلامی حکومت کے درمیان رابطہ کا کام دیتے تھے اور ان کے مذہبی امور کی نگہداشت کرتے تھے، مسیحی مجالس کے انعقاد کی عام اجازت حاصل تھی اور گرجاؤں کے متعلق ہر شہر میں اس کی فتح کے موقع پر عیسائی رعایا سے جو شرائط طے پاتے تھے، ان کی پابندی کی جاتی تھی۔

محاصل:

اس کے ساتھ اسلامی حکومت نے عیسائی رعایا کے حق کاشت کو محفوظ رکھا، اسلامی حکومت سے پہلے جو جس زمین کا کاشتکار تھا، اسلامی عہد میں بھی وہ زمین اس کے پاس رہی، البتہ اس کے سرکاری محاصل اور زمینداری کے حقوق مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گئے، پچھلے اصولوں کے بموجب وہ زمین میں کاشت کرتے، پیداوار کے چند حصے کئے جاتے، مختلف زبانوں میں مختلف اعتبار سے وہ حصے کاشتکار اور زمیندار میں تقسیم ہوتے، شاہی زمینوں کی پیداوار کا صرف ایک تہائی حصہ وہ حکومت کو دیتے اور دو تہائی ان کے پاس رہتا تھا، یہ شاہی زمین ان عیسائی زمینداروں کی تھی، جو اسلامی فتح کے وقت یا تو مارے گئے تھے، یا فرار ہو گئے تھے، ان زمینوں کی پیداوار ابتداءً بیت المال میں جمع ہوتی تھی، پھر جب عرب قبائل ملک کے مختلف حصوں میں آکر آباد ہوئے، تو ان کے حوالہ کردی گئیں، اس کے معاوضہ میں وہ فوجی خدمات انجام دیتے تھے، بعض شہروں کے باشندوں سے ایسی نرم شرطوں پر صلح ہوئی تھی کہ وہاں کے باشندے اسلامی دور میں نہایت مرفہ الحال رہے، مثلاً ناروہ کا پورا علاقہ واگذار رہا، صرف کلیسا کے بعض اوقاف جن کے پادری باقی نہیں رہے تھے، اسلامی ملک میں داخل ہوئے تھے یا بعض اور دیگر علاقوں کو صرف خراج کی شرط پر چھوڑ دیا گیا تھا اور عیسائی کاشتکاروں کو اپنی جائدادوں کے بیچنے اور خریدنے کا حق بھی حاصل تھا، اس طرح وہ گویا ان زمینوں کے اصل مالک تھے۔ (تاریخ اندلس۔ از مولانا

ریاست علی ندوی)۔

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں:

ہندوستان میں فرمانروایان اسلام نے جو بڑے بڑے مدارس قائم کئے وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے، البتہ مکاتب میں معمولی نوشت وخواند اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے ہندو بھی ان میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور قیاس یہ ہے کہ سکندر لودھی کے زمانہ میں جب ہندوؤں نے فارسی زبان کی تعلیم شروع کی تو انہی مکاتب سے فائدہ اٹھایا ہوگا، مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کی تعلیم وتربیت کے لئے مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی اور ان کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی بخشی اور سنسکرت سیکھنے وسکھانے کا با قاعدہ انتظام کیا۔ (ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک۔ از:۔۔۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن)۔

ہندوؤں کی تعلیم سلاطین دہلی کے زمانہ سے ہی شروع ہو چکی تھی اور ہر دور میں ان میں ایسے صاحب علم وکمال پیدا ہوتے رہے جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوئے، لیکن ان کی تعلیمی ترقی کا اصلی دور تیموریوں کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، انہوں نے تعلیم کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے عربی مدارس کے مروجہ مذہبی نصاب کے علاوہ ایک مشترک نصاب بھی بنایا، جس کو ہندو مسلمان دونوں پڑھ سکیں، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں حسب ذیل فنون تھے، جن کو کسی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔

اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبیعیات، الٰہیات اور تاریخ، ہندوؤں کو ان کے علاوہ سنسکرت، صرف، نحو، ہندو تصوف، اخلاق اور ہندو فلسفہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کے بدولت تمام سلطنت آراستہ ہوگئی۔

اس کے علاوہ تیموریوں نے مختلف طریقوں سے ہندوؤں کی تعلیمی ہمت افزائی کی، وہ اپنے درباروں میں مسلمان فضلاء کے پہلو بہ پہلو ہندو فضلاء اور اصحاب کمال کو بھی جگہ دیتے تھے۔

جہانگیر نے بھی ہندو ارباب کمال کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے زمانہ میں ایک مشہور پنڈت تھا، جہانگیر خود اس کی ملاقات کو جاتا تھا اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا تھا، داراشکوہ خود ہندوؤں کے علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، اس کا دربار ہندو فضلاء سے بھرا ہوا تھا، اس کے دربار کا نامور شاعر جس کو ملک الشعراء کہنا چاہئے چندر بھان برہمن تھا، اس کا فارسی دیوان اب تک موجود ہے۔

تیموریوں کی اس قدر افزائی کی وجہ سے ان کے زمانہ میں ہندوؤں نے تعلیم میں بڑی ترقی کی، بیشتر ہندو شرفاء فارسی زبان و ادب، خوشخطی و خطاطی اور دوسرے مروجہ فنون میں پورا اوراک رکھتے تھے۔ (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی کارنامے۔ از:— مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن)۔

ہندوستان کی نوابی ریاستوں اور مسلم بادشاہوں کی رواداری:

ہندوستان کی نوابی ریاستیں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ رواداری، انصاف پروری، مساوات، امن و سلامتی، صلح و آشتی، الفت و محبت، مودت و رحمت کا معاملہ کرتی تھیں، ان کو مذہبی آزادی، پوجا پاٹ، مذہبی رسومات، شادی بیاہ، رہن سہن، کھان پان، من پسند لباس پہننے اور تہوار منانے کی پوری آزادی تھی، کسی بھی قسم کی روک ٹوک کا کوئی سوال ہی نہ تھا، اس کے علاوہ ان کی جان، مال، آبرو اور ان کی تجارتیں پوری طرح محفوظ تھیں، ریاست کا نظم و نسق چلانے میں مددگار بھی ہوتے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز بھی کئے جاتے، ان کی تعلیم کا مکمل بندوبست ہوتا تھا اور کسی بھی قسم کا کوئی تعصب ان سے نہیں برتا جاتا تھا، نہ زبان میں، نہ تعلیم میں اور نہ کسب معاش میں، فوج اور پولس میں ان کی بھرتی ضرور کی جاتی تھی، یہاں تک کہ فوج کے کمانڈر بھی غیر مسلم

ہوتے تھے، مشہور بات ہے کہ اکبری فوج کا کمانڈر انچیف مان سنگھ تھا، یہی حال ہندوستان میں قائم ہونے والی تمام ریاستوں کا بھی تھا، چاہے وہ ریاست بھوپال ہو یا حیدر آباد، ریاست میسور ہو یا رامپور، ریاست ٹونک ہو یا جونا گڑھ، ہر جگہ غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک و برتاؤ کیا جاتا تھا، وہ تنگ ذہنی و تنگ نظری کا شکار نہیں ہوتے تھے۔

قانون سب کے لئے برابر تھا، عدالتوں سے انصاف سب کو ملتا تھا، سرکاری ملازمتیں سب کو دی جاتی تھیں، ریاستوں کے نواب غیر مسلموں کی خوشحالی سے خوش ہوتے تھے، ان کی مالی قوت کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا، نہ کلکٹر سے نہ پولس سے، نہ کسی عام مسلمان سے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی ریاستوں میں کوئی فرقہ وارانہ فساد رونما نہیں ہوا، نہ گھر جلے، نہ دوکانیں لٹیں اور نہ کسی فیکٹری میں آگ لگی، الغرض ان کے شب و روز سلامتی کے ساتھ گزرتے تھے۔

مغلیہ سلطنت میں مذہبی رواداری کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی، بلکہ یہ سلطنتیں اسی رواداری پر ہی ٹکی ہوئی تھیں، یہ سچ ہے کہ انصاف قوموں اور حکومتوں کو امر کر دیتا ہے، ان کو دوام عطا کرتا ہے، راجا مہاراجا اور نوابوں کا یہ کردار خدا پر یقین اور ایشور پر آستھا رکھنے سے بنتا تھا، ان کا وشواس ایشور پر سچا ہوتا تھا، نوابوں کا خدا کی ذات پر ایمان پختہ نہ سہی کمزور حالت میں اپنا کام کر جاتا تھا کہ میری سلطنت میں رعایا سلامتی کے ساتھ سوئے اور سلامتی کے ساتھ اٹھے، لیکن موجودہ سیاستداں اور حکومت کے ذمہ دار اپنی رعایا کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں، ان کو آپس میں لڑواتے ہیں، ان کی سیاست ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے اصول پر چلتی ہے، اس لئے عدل وانصاف میں وہ ناکام نظر آتے ہیں، مغربی جمہوریت کی یہ ناپاک سیاست کبھی بھی پاک نہیں ہوسکتی، جب وہ سیاست گندی اور ناپاک ہے، تو اس پر بننے والے حکومت کے شعبے بھی ناپاک ہیں، ان میں کام کرنے والے ذہن بھی ناپاک ہیں، اس پر بننے والے اسکول و کالج بھی ناپاک،

ان میں تعلیم دینے والے بھی ناپاک کردار وعمل کے مالک، شاید اسی لئے بار بار یہ بات دوہرائی جاتی ہے کہ آج کی حکومتوں سے نواب، راجا اور مہاراجا کی وہ حکومتیں بہتر تھیں کہ جن میں رعایا سکھ وچین سے زندگی بسر کرتی تھی۔

مسلم اقلیت کے مسائل کے حل کے لئے لائحۂ عمل

(ا)- سب سے اہم پہلو "تعلیم" ہے:

جب مسلمان ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی سربراہی میں انگریزوں کے مقابلہ میں آخری اور فیصلہ کن جنگ ہار گئے اور انگریزوں کا پورے ہندوستان پر تسلط ہو گیا تو وقت کے علماء سر جوڑ کر غور وفکر کے لئے بیٹھے کہ اب کیا کریں؟ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سرپرستی میں مشورہ ہوا اور پھر سب کا اتفاق ہوا کہ سیاسی محاذ پر شکست کھانے کے بعد تعلیمی محاذ پر منظم طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس مقصد کو لے کر ۱۸۶۶ء میں اسلام کا قلعہ "دارالعلوم دیوبند" کا قیام عمل میں آیا، تقریباً پندرہ سال کے بعد ۱۸۹۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنیاد ڈالی گئی، اس کے بعد داعیانِ اسلام، ہندوستان کے کونے کونے میں علم کا چراغ روشن کرنے کے لئے بھیجے گئے، انہوں نے شہر شہر دینی مدرسے کھولے اور مسلمانوں کو قرآن وعلم دین سے جوڑا تا کہ وہ اسلام پر قائم ودائم رہیں اور وقت کی عیسائی مشنریز کے جال میں گرفتار نہ ہوں، دوسری طرف ہندو دیو مالائی نظام کے پھیلنے سے ان کے عقائد خراب نہ ہوں، بڑی حد تک علماء ہند اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں بھارت آزاد ہوا، لاکھوں مسلمان پاکستان چلے گئے اور لاکھوں پاکستان سے ہندوستان آئے، کشت وخون کا بازار گرم ہوا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کا چراغ

ہندوستان میں گل ہوجائے گا اوران کا مستقبل تاریک ہوجائے گا، ایک بار پھر علماءِ ہند ورہبرانِ ملت غور وفکر کے لئے بیٹھے، وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے، انہوں نے دینی مدرسوں کو ایڈ دینے کی پیشکش کی، آپ نے فرمایا: گورنمنٹ کی طرف سے سالانہ گرانٹ دی جائے گی، تو ہمارے یہ دینی مدرسے باقی رہیں گے، لیکن دونوں بڑے دینی اداروں نے اس تجویز وپیشکش کو نامنظور کردیا (جیسا کہ ابھی مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کو اور اس کے تحت مدارسِ دینیہ کو گورنمنٹ کی طرف سے عطا کی جانے والی گرانٹ کی منظوری کو دارالعلوم دیوبند اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ندوی نے نامنظور کردیا ہے)۔ علماء ہند نے اللہ کے بھروسہ پر دینی مدرسوں کو چلانے کا ارادہ اور فیصلہ ظاہر فرمایا، الحمدللہ دینی مدرسے خدا کی توفیق سے زندہ ہیں اور برابر چل رہے ہیں، روز بروز ان میں اضافہ بھی ہورہا ہے، ملت اسلامیہ کے ناتواں کاندھے اس دینی ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم پر علماء وقائدین نے اتنی توجہ نہ دی جتنی دینی چاہئے تھی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بالکل نہیں دی، لاکھوں نوجوان تعلیم سے محروم رہے، گھر وخاندان عصری علوم میں ترقی کرنے سے کوسوں دور ہوگئے، اس کے تین نقصانات سردست سامنے آئے: (۱) پہلا یہ کہ مسلم نوجوان سرکاری ملازمتوں سے کٹ گئے، اقتصادی حالت بد سے بدتر ہونے لگی، افلاس اور فقر وفاقہ نے تسلط جمالیا، ضروریات زندگی کا پورا کرنا مشکل ہوگیا، خوشحال زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، بھکمری نے عائلی وخاندانی زندگی کی چولیں ہلادیں، بچوں کی پرورش اور گذارہ کے لئے چھوٹی موٹی تجارت، دستکاری، لوہاری ودیگر معمولی پیشے اختیار کئے گئے۔ (۲) دوسرا نقصان یہ ہوا کہ عصری تعلیم سے محرومی نے ان کا سیاسی کردار بھی ختم کردیا، عملی سیاست سے دوری نے قائدانہ رول ادا کرنے سے ان کو علیحدہ کردیا، حکومت کے بڑے بڑے مناصب کے وہ قابل نہ رہے، ان تک پہنچنا مشکل ہوگیا، تو بیس کروڑ مسلم اقلیت والا دیش

ہندوستان ان کے لئے حسرت ویاس کا دیش بن گیا، تھوڑے بہت مسلم لیڈر اگر سر مار کر ودھان سبھا اور پارلیمنٹ تک پہنچ بھی گئے تو ان کا رول صفر رہا، وہ مؤثر رول ادا نہ کرسکے۔ (۳) تیسرا نقصان تعلیم سے محرومی کا یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر وہ لیاقت وقابلیت نہیں رہی جو مطلوب تھی، ان کا معیار زندگی گر گیا، اخلاق ان کے خراب ہوگئے، زبانیں ان کی بگڑ گئیں، بہتر سلوک وبرتاؤ سے عاری ہوگئے، برابری پر بیٹھنے کا خواب چکنا چور ہوگیا، اغیار نفرت کرنے لگے، محلّہ وبستی کا ماحول زوال کا شکار ہوگیا، معاملات کی خرابی میں بھی وہ مبتلا ہوگئے، جس کے نتیجہ میں اپنوں اور غیروں کے درمیان اعتماد کھو بیٹھے، غرض تعلیم سے محرومی نے ہمیں قعر مذلت میں گرا دیا۔

تعلیمی زوال کے دو اسباب: داخلی وخارجی:

اس تعلیمی زوال کے اسباب داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ داخلی اسباب یہ ہیں کہ مسلم قائدین دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے مسلم اقلیت کو مزین کرنے سے قاصر رہے، انفرادی کوششیں ضرور ہوئیں، لیکن وہ زیادہ اثر انداز نہ ہوسکیں، ہمارے قائدین ورہنما ابتدا سے اس مسئلہ کو اگر سنجیدگی سے لیتے تو یہ صورت حال نہ ہوتی، سرسید کی طرح جانفشانی کرتے، جدوجہد کرتے، عزم وحوصلہ کا اظہار کرتے، راتوں کی نیند، دن کا سکون حرام کرتے تو ملت اسلامیہ کے نوجوان عصری علوم سے سرفراز ہوکر ممتاز مقام کے حامل ہوتے، دینی درسگاہوں سے علم قرآن کے چشمے پھوٹتے اور عصری درسگاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیز سے مروجہ علوم کے ماہرین پیدا ہوتے، دونوں کا آمیزہ تیار ہوتا تو نہ دین جاتا اور نہ دنیا جاتی، بلکہ صحیح الفاظ میں پورے کا پورا دین ہوتا، وہ ڈاکٹر نہ ہوتے بلکہ مسلم ڈاکٹر ہوتے، انجینئر نہ ہوتے بلکہ مسلم انجینئر ہوتے، لیڈر نہ ہوتے بلکہ مسلم لیڈر ہوتے، لیکن آج ہر طرف ماتم بپا ہے، مسلمان تعلیم کے فقدان سے زوال کا شکار ہوچکے ہیں، تعلیم کا تناسب ان کے اندر دو فیصد رہ گیا ہے، شورِ نشور ہوا کہ یہ ملت اب گئی تب

گئی، مزید یہ کہ سچر کمیٹی نے آنکھیں کھول دینے والی رپورٹ پیش کر دی، افسوس صد افسوس۔

افسوس جس امت مسلمہ کی ابتدا ''اقرأباسم ربک'' سے ہوئی تھی اور وحی کے نزول سے علم حقیقی کا نزول ہوا تھا، معرفت حق کی بارش ہوئی تھی اور قرآن کے نزول سے ہی دنیا کا آغاز ہوا تھا، نئے دور کی ابتدا ہوئی تھی، نشأۃ ثانیہ کا اعلان ہوا تھا اور دنیا میں انقلاب کا بگل بج گیا تھا، تو اب کرنے کا کام یہ ہے کہ علماء وفضلاء، ادباء ودانشوران، سیاسی قائدین، سماجی رہنما اور مصلحین سب مل کر دینی وعصری علوم سے ہندوستانی مسلمانوں کو آراستہ و پیراستہ کریں، تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کریں، غریب بچوں کی عمومی طور پر مدد کریں، لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی رہبری کریں، خصوصا لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں، تا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طریقہ سے ادا کر سکیں نیز ان کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار ہو جو اسلام کی آبیاری کر سکے اور اس کی سچی ترجمانی وحقیقی نمائندگی کا فریضہ انجام دے، جگہ جگہ مدرسے کھولیں، اسکول اور کالج قائم کریں، کوششوں کی ترکیز کر کے ملت کے نوجوانوں کو علم سے بہرہ ور کریں، مایوسی اور غفلت کی چادر کو چاک کر دیں، عام تعلیمی بیداری کے فریضہ کو انجام دیں اور ان کو یہ بتائیں کہ تعلیم انسان کا زیور ہے، تعلیم سے ہی عروج وبلندی عطا ہوتی ہے۔ اس طرح انشاء اللہ خدا کی توفیق سے وہ دن دور نہیں جب مسلم گھرانے علم کی روشنی سے منور ہو جائیں گے اور تعلیم کا تناسب دو فیصد سے سو فیصد ہو جائے گا۔

اس کے لئے ہمیں مختلف مقامات پر کیمپ اور تعلیمی ورکشاپ بھی لگانا ہوں گے، بچوں اور ان کے والدین کو مدعو کر کے ان کے ذہن وفکر کو تیار کرنا ہوگا، شاہ خرچیوں اور فضول خرچیوں کو چھوڑ کر تعلیم کے مقصد میں اپنی قیمتی رقومات کو لگانا ہوگا، شادی بیاہ کی فضول خرچیوں کو بھی روکنا ہوگا، جہیز کی لعنتِ بد کو سماج سے دور کرنا ہوگا، اس طریقہ کو اپنا کر منزل مقصود قریب ہوگی اور جہالت کافور ہوگی ؎

راہ ہے تو یہی ہے منزل ہے تو یہی ہے

خارجی اسباب:

آزادی کے بعد حکومت نے چاہے وہ کانگریس کی ہو یا بھارتی جنتا پارٹی کی، وی پی سنگھ کی ہو یا چندر شیکھر کی، یا موجودہ یو پی اے کی سرکار ہو، سب نے مسلم اقلیت کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا، ان کو آگے بڑھانے، ترقی دینے، تعلیم سے مزین کرنے اور ان کی غریبی وجہالت دور کرنے میں سنجیدہ رول ادا نہیں کیا، ان کے لئے منظور کی گئی سفارشات کو عملی جامہ نہیں پہنایا، متعصب ذہنوں نے جان بوجھ کر ان کو تعلیم سے دور رکھنے کی ناپاک کوشش کی، ملازمتوں اور سرکاری نوکریوں کے دروازے ان پر بند کردئے، فوج اور پولس میں ان کی بھرتی پر روک لگائی گئی، جس نے مسلم اقلیتوں کی امیدوں پر پانی پھیرنے کا کام کیا، ان کے روشن مستقبل کے منصوبے خاک میں مل گئے، ناامیدی کے بادل ان پر چھا گئے، فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکا کر ان کی تمناؤں وآرزوؤں کا خون کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان کم ہوگیا۔

(۲)-دعوت اسلامی:

"ومن أحسن قولا ممن دعا إلى الله وعمل صالحا وقال إنني من المسلمين"۔

جب ہم ظلم وستم کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں، تو اس کی تہہ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر جو چیز نظر آتی ہے، وہ ہے "خود فراموشی اور خدا فراموشی"، ان ہی دونوں کی کوکھ سے ہر طرح کی برائیاں جنم لیتی ہیں، خوف خدا اور تصور آخرت سے عاری قومیں ہر ظلم کو روا رکھتی ہیں، انصاف کے دروازوں کو بند کردیتی ہیں، پھر قتل وغارتگری کا سیلاب امنڈ پڑتا ہے، حقوق پامال کئے جاتے ہیں، آدمیت رسوا ہوجاتی ہے، انسانیت تڑپنے لگتی ہے، ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، کمزوروں کا لہو چوس لیا جاتا ہے، مادیت کی دیوی کی پوجا کی جاتی ہے، اس طرح سارا عالم ظلم

وفساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں عقیدۂ توحید سے بننے والا ذہن اور بننے والا معاشرہ وسیع القلبی کا ایک بحر بیکراں، امن وشانتی کا نقیب، عدل وانصاف کا پیامبر، مودت ورحمت کا چشمۂ صافی، ظلمتوں کے بیاباں میں قندیل رہبانی، آفتاب کی تابانی، مہتاب کی ضیاپاشی، ستاروں کی جگمگاہٹ، گلشن کی مہک اور گلوں کی خوشبو، درختوں کی سایہ فگنی، بادنسیم کے پرلطف جھونکوں اور نورانی ماحول کا مظہر ہوتا ہے، جس کی آغوش میں انسانیت ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔

لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ حاملین اسلام، تعلیمات اسلام سے آراستہ ہوکر اسلام کے لئے سچا نمونہ بنیں، اپنے لئے بھی رحمت بنیں اور دوسروں کے لئے بھی رحمت ثابت ہوں، اور یہ تبھی ممکن ہے جب وہ "**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن**" کو مدنظر رکھ کر دعوت الٰہی سے سرشار ہوں اور عمل کا پیکر بن کر اہل وطن کے سامنے منارۂ نور بن جائیں تاکہ بھٹکتی ہوئی انسانیت اس کو دیکھ کر سمت سفر کا تعین کرلے۔

اس طریقہ پر کاربند ہوکر اسلام کو فروغ ملے گا، اقلیت، اقلیت نہ رہے گی، اکثریت، اکثریت نہ رہے گی، مغربی تہذیب کا دیا ہوا یہ لفظ اور دیا ہوا یہ تصور خاک وخون میں مل جائے گا، لیکن یہ کام پتہ ماری کے بغیر ممکن نہیں ہے، یہاں وہی لوگ ثابت قدم رہ سکیں گے جن کی شریانوں میں توحید الٰہی ودعوت اسلامی رچ بس گئی ہو، اس میدان میں ہم کو کبھی طائف میں لہولہان ہونے والے قدم، شعب ابی طالب کی قیدوبند، غار ثور کی بے چین گھڑیاں، دارارقم کی روپوش راتیں، کفر کا ظالمانہ سلوک، بلالی ثابت قدمی اور ہجرت کے دلدوز منظر سے دوچار ہونا پڑے گا، اس کوچہ میں وہی لوگ قدم رکھیں، جن کو جلتے ہوئے مکانات، تڑپتی ہوئی لاشیں، بلکتے ہوئے معصوم بچے، سسکتی ہوئی عورتیں اور تجارت کی بربادی، مشتعل نہ کرسکے اور ان کے پایۂ ثبات میں تزلزل پیدا نہ کرسکے، جسم وجان کی پرواہ کئے بغیر پروانہ وار دعوت اسلامی کے فریضہ کو

انجام دینے میں لگے رہیں۔

اگر ہم نے ایسا کرلیا تو انشاء اللہ کامیابی قدم چومے گی، تمام مسائل حل ہوجائیں گے، شکوے کی زبان بند ہوجائے گی، مصائب کا سدباب ہوجائے گا، فرقہ وارانہ فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوجائے گی اور وہی افراد محافظ بن جائیں گے جو کل تک راہزن تھے، کیونکہ انقلابات کا خاصہ یہ ہے کہ افراد باہر سے نہیں آتے ہیں، نہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں، افراد وہی ہوتے ہیں، لیکن ان کے افکار ونظریات بدل جاتے ہیں، جس طرح ہم کو مکی زندگی میں نظر آتا ہے کہ جو لوگ خون کے پیاسے تھے، بعد میں وہی لوگ شجر اسلامی کی آبیاری میں لگ گئے، اس لئے ہمیں بھی سرزمین ہند میں وہی طریقہ اور اسوہ اختیار کرنا پڑے گا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اپنایا تھا۔ "لن يصلح أخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها۔"

افسوس تو اس بات پر ہے کہ امت کا سوادِ اعظم دعوت الی اللہ کے فریضہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ باطل کے پیدا کردہ مسائل میں الجھا ہوا ہے اور انہی کو حل کرنے میں اپنی تمام تر توانائی صرف کررہا ہے۔ "یالیت قومی یعلمون۔"

(۳)-اعتدال پسندی:

دوسرا اہم پہلو جو سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہے "اعتدال پسندی"، اعتدال کی صفت اور اعتدال کی راہ وہ شاہِ کلید ہے جو ظلمتوں کو کافور کرتی ہے، تعب وتھکن سے بچاتی ہے، زود اثری وعجلت پسندی کے فکر وخیال سے دور رکھتی ہے، اس لئے داعی گروہ کو صبر وتحمل، سنجیدگی ومتانت، وقار وتمکنت کی صفت سے مزین ہوکر دعوتی سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہیے، ذرا سی بے اعتدالی منزل سے کوسوں دور کرسکتی ہے اور مقصد حقیقی تک پہنچنا مشکل ہوسکتا ہے۔

امت مسلمہ نے گزشتہ سالوں میں جس بے اعتدالی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے امت کی شبیہہ بہت مجروح ہوئی ہے، اغیار نے اسلام اور اہل اسلام کو ہدف ملامت بنایا ہے، جوش کو اگر

ہوش کی لگام نہ دی جائے، جذبہ کو حکمت کے تابع نہ کیا جائے، غصہ کو اگر صحیح رخ نہ دیا جائے تو نتائج برعکس ظاہر ہوتے ہیں۔

مصلحین امت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رہبری ورہنمائی کا فرض ادا کرتے ہوئے بے لگام سیاست، غیر دانشمندانہ اقدام، قوت کا بیجا استعمال نہ کرنے دیں، اپنے ماضی سے سبق لیتے ہوئے حال کی تعمیر کریں، مستقبل کے منصوبے بنائیں، انشاء اللہ امت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہوگا اور مسائل حیات حل ہوجائیں گے۔

(۴)-اتحاد باہمی:

تیسرا اہم پہلو مسلم اقلیت کے لئے اتحاد باہمی ہے، ہم اسلام کی کشتی کو اتحاد واتفاق کے ذریعہ ساحل مراد تک لانے کی کوشش کریں، ہر قسم کے مسلکی اختلافات سے بلند ہوکر سوچنے کی عادت ڈالیں، ماضی قریب میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے اتحاد سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام مکاتب فکر اور تمام مسالک کے ماننے والوں نے جب اپنے جزوی مسائل کو بالائے طاق رکھ کر اجتماعی مسائل پر توجہ دی تو باطل تھرتھرا اٹھا اور اس کے ایوان میں لرزہ طاری ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں میں بسنے والی مسلم اقلیت اس نسخۂ شفا کو حرز جاں بنالے تو ہماری تمام پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(۵)-مغرب کے تعلق سے مسلمانوں کا رویہ:

جدید مغرب اس وقت دنیا کی ایک غالب قوت ہے، اس نے اسلام اور مسلمان کو اپنا

اصل دشمن قرار دے دیا ہے، اسلام بھی مغرب کی خواہش کے مطابق اپنی تشکیل نو یا تحریف کرنے کا روادار نہیں، دونوں کی فکری اور عملی راہیں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں جارہی ہیں، اسلام اللہ پر، روحانی امور پر اور آخرت پر غیر متزلزل یقین کا علمبردار ہے، وہ حق وصداقت کے مستقل اقدار اور وجود کو تسلیم کرتا ہے، جبکہ مغرب مادہ پرستی، خدا بیزاری اور دنیا کی زندگی ہی کو اپنی فکری اساس کے طور پر تسلیم کرتا ہے، وہ حق وصداقت کو نا قابل التفات سمجھتا ہے یا پھر اضافی قدر کے طور پر تسلیم کرتا ہے، اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ مغرب کے تعلق سے کیا ہو؟

تو مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہئے کہ ان کا ایک جامع وہمہ گیر عالمی منصوبہ ہو، اس کے تحت تمام مسلم ملکوں اور گروپوں کو جوڑنے اور قریب کرنے کی کوشش کی جائے، مسلمان اپنے ذیلی پروگرام کے تحت مظلوم اقوام سے رشتے استوار کریں، انسانی فلاح کے اسلامی اصولوں اور علم حقیقی کے ذرائع کی صحیح تفہیم وتبلیغ ہو، محض دعوی و پروپیگنڈہ نہیں، زندگی کے ہر شعبہ کے حقیقی مسائل اور ان کے حل کے لئے علمی اور عملی پروگرام چلائے جائیں، پوری انسانی برادری کو اپنا کنبہ سمجھ کر اس سے ہمدردی اور جذبہ ایثار کے ساتھ تعلقات استوار کئے جائیں، نچلی سطح کے عام انسانوں کو بھی بیدار کیا جائے، خصوصاً مسلمانوں کو اس کا خوگر بنایا جائے، فرقہ پرستی اور مسلکی تعصب پیدا کرنے والوں کو کوئی مہلت نہ دی جائے، ان کو سماج میں بے نقاب کرکے صحیح رخ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، غلط رخ پر توانائیوں کو ضائع کرنے اور مصنوعات فاخرہ کو استعمال کرنے کی جگہ فطری اور سادہ زندگی گزارنے کا چلن عام کیا جائے، فقہی اسکول اور جامد تقلید کی پابندی کو جہاں تک ممکن ہو کم کیا جائے اور نئی راہوں کی تلاش ہو۔

لیکن یہ سارے کام اتنے آسان نہیں ہیں کہ بغیر قربانی اور دشمنوں کی رخنہ اندازیوں سے بچ کر انجام دئے جاسکیں، ہمارے اندر بھی ان کے ایجنٹ ہیں اور باہر سے بھی شکنجہ کسا ہوا ہے، اس لئے حق کی راہ پر صبر وثبات کا مظاہرہ کرنا ہوگا، جہاں قربانی کی ضرورت ہوگی وہاں وہ

قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔

حق پرست لوگ اگر حق وانصاف کی دعوت لے کر نہ اٹھیں گے تو حالات اس سے بھی بدتر ہوں گے، اس لئے حالات کا صحیح جائزہ لے کر پوری ملت اسلامیہ ہند کو میدان عمل میں آنا چاہئے، دعوت وتبلیغ کی راہ میں جو مشکلات سامنے آئیں انہیں متحدہ طور پر جھیلنا چاہئے، عالمی سازش کے تحت انہیں بھی جنگ کی آگ میں جھونکنے اور اسپین کی طرح انخلاء کے منصوبے تیار ہورہے ہیں، اس لئے دفاعی حکمت عملی سے غفلت نہیں برتی جاسکتی۔

ظلم کے انتقام میں یا نفرت کی آڑ میں کوئی بھی کارروائی کرنے سے مکمل پرہیز کرنے کے ساتھ ساتھ انبیائی تعلیم پر کاربند رہ کر کام کرنا ہوگا، جان ومال اور وقت کی قربانی کے لئے عزم وحوصلہ پیدا کرنا ہوگا، یہ صبرآزما مرحلہ کافی طویل ہوگا، جس گرداب میں ملت پوری طرح پھنس چکی ہے اس سے نکلنے کا کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہے۔

ہماری ہمہ جہتی جدوجہد صرف عدل وانصاف کے لئے اور انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو، کبھی بھی کسی مخصوص گروہ یا ذاتی مفاد کے لئے ہمارا ہاتھ نہ اٹھے، پرامن طریقہ سے اپنے مقصد کے حصول کے لئے بھرپور جدوجہد ہو اور خدا کی ذات پر یقین کرتے ہوئے ہم حق کی فتحیابی کے لئے پرامید ہوں: "وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" (تم ہی کامیاب وسربلند رہو گے اگر تم صداقت پر ایمان رکھتے ہو)۔ (دعوت، خصوصی اشاعت۔ مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام از: مولانا ثناء اللہ صاحب، جامعہ نگر، نئی دہلی)۔

(۶)۔تعلیم کا یکساں حق:

اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ علم کو عام کرنا چاہتا ہے، چنانچہ ان لوگوں کو سخت وعید سنائی ہے، جو علم کو چھپاتے ہیں، اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسانی آبادی میں خواندگی عام ہو، علاوہ ازیں یہ ضروری ہے کہ دین کی اساسی معلومات تمام افراد کو دی جائے، نیز ہر فرد کو یہ مکمل

آزادی حاصل ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکے اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے، عموماً مذاہب کا مزاج ''فروغِ علم'' سے مناسبت نہیں رکھتا، یہ خیال پایا جاتا ہے کہ علم کی روشنی پھیلے گی تو مذہب سے وابستگی میں اضافہ ہوگا، جو لوگ علم حاصل نہیں کرتے ان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ دوڑ دھوپ کر کے علم حاصل کریں، اسی طرح جو ''اہل علم'' ہیں، ان کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ آبادی میں علم پھیلائیں۔ اس عام ''علمی تحریک'' کا یہ نتیجہ لازماً نکلنا چاہئے کہ علم اور معلومات پر کسی فرد یا طبقہ کی اجارہ داری باقی نہ رہے، پورے سماج کی ''علمی پسماندگی'' ختم ہو اور اس پہلو سے سماج میں ''مساوات'' قائم ہو جائے، سماج میں پائی جانے والی ''ناہمواریوں'' کا ازالہ صحیح معنوں میں مساوات کے قیام کے لئے ناگزیر ہے۔

(۷)-اظہار رائے کی آزادی:

اسلام اس پہلو سے بھی مساوات قائم کرتا ہے کہ اسلامی نظام میں اظہار رائے اور تنقید کی آزادی ہر فرد کو حاصل ہے، ہر مسلمان یہ حق رکھتا ہے کہ وہ کسی علمی یا عملی مسئلہ کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کر سکے اور اس رائے کو عام کر سکے، اس حق پر تحدید صرف اتنی ہے کہ شائستگی اور اخلاق کی حدود کے اندر رائے کا اظہار کیا جائے، کسی شخص کی زبان بند کرنے کا اختیار حکومت کو حاصل نہیں ہے، ایک ''علمی استدلال'' کے ذریعہ تو رد کیا جا سکتا ہے، لیکن بہ جبر کسی شخص کو اپنے دلائل پیش کرنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا، اسی طرح ہر شخص کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اہل حکومت کے کاموں پر گرفت کر سکے اور تنقید کر سکے، ان اقدامات کے ذریعہ اسلام ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جہاں تمام افراد معاشرہ اور حکومت کے نظام کو چلانے میں عملاً شریک ہو جاتے ہیں نیز ''حکمرانوں اور عوام'' کے درمیان عموماً پائی جانے والی وسیع خلیج مختصر ہو جاتی ہے، اس خلیج کو بالکل پُر کر کے مکمل مساوات قائم کرنے کا کام بالآخر ''حریت'' کی وہ روح انجام دیتی ہے، جو اسلام افراد کے اندر پیدا کرتا ہے، اسلامی اقدار کے علمبردار افراد اپنے بیدار ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے

ہوئے حق بات علی الاعلان کہتے ہیں اور اس ''حریت پرور'' ماحول میں حکمرانوں کو عموماً یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ زیادتیاں کرسکیں۔ (دعوت۔ خصوصی اشاعت: مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام۔ از:۔۔۔ ڈاکٹر محمد رفعت صاحب، جامعہ نگر)۔

آخر میں دو لفظ:

دنیا کی کوئی تاریخ اپنے ہیروز کے ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اس پہلو سے مسلم تاریخ ہند بھی بے شمار ایسی انقلابی شخصیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جن کا تذکرہ اسلام اور مسلمانوں کو زندگی عطا کرتا ہے، ان میں قابل ذکر مولانا سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کار مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مفتی کفایت اللہ، مولانا سید ابوالأعلی مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ہیں۔

☆☆☆

عالم اسلام میں اقلیتوں کے حقوق اور اسلام

مولانا محمد ارشد مدنی ☆

عالم اسلام جب بولا جاتا ہے تو اس کے دو مفہوم سمجھے جاتے ہیں۔ایک اس کا مفہوم عام ہے،جس کا اطلاق دنیا کے ان تمام خطوں پر ہوتا ہے،جہاں مسلمان کم یا بڑی تعداد میں آباد ہیں،قرآن کریم کی آیت:"وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا" سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔عالم اسلام کا خاص مفہوم جو سمجھا جاتا ہے،وہ یہ ہے کہ وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ان کی حکومت قائم ہے۔

میرے اس مقالہ میں اس کا عمومی مفہوم پیش نظر ہے اور اسی مفہوم کو سامنے رکھ کر گفتگو کی گئی ہے۔بلاشبہ اس وقت عالم اسلام کو چہار جانب سے فکری،تہذیبی،اقتصادی اور سیاسی تحدیات کا سامنا ہے،عالم اسلام کے خلاف یہود ونصاری،مستشرقین اور کمیونسٹوں کی سازشیں خفیہ وعلانیہ طور پر خوب کام کر رہی ہیں۔

یہود ونصاری کی سازشیں جو عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں وہ ہیں: مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ بھڑکانا،شراب نوشی،جوئے بازی،بدفعلی اور شہوت رانی کی ترویج،سور کے گوشت کے استعمال کی ترغیب،سود اور حرام سودے بازی کو عام کرنے کی کوشش اور سود کی تحریم سے متعلق آیات کی غلط تفسیر،اور یہ باور کرانا کہ قرآن نے جس سود کو منع کیا ہے وہ سود مرکب (سود در سود) ہے ورنہ عام سود میں کوئی قباحت نہیں۔

☆ نائب رئیس جامعہ امام ابن تیمیہ،چمپارن،بہار

علمائے دین اور عوام کے درمیان دوستی اور احترام کی فضا کو آلودہ کرنا، اس کام کے لئے ایسے اساتذہ کو مامور کرنا جو یہود کے تنخواہ دار ہوں۔

وجوب جہاد کے عقیدے میں تزلزل پیدا کرنا اور یہ ثابت کرنا کہ جہاد صدر اسلام کے لئے تھا، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

عورتوں کی بے پردگی پر یہ دلیلیں پیش کرنا کہ پردہ کا رواج بنوعباسیہ کے دور سے ہوا، اسلام کی سنت نہیں ہے اور نوجوان نسل کو غیر مشروع جنسی روابط کی ترغیب دینا اور اس کے لئے پیشہ ور عورتوں کی خدمت لینا۔

انسانی آبادی کے بے تحاشہ اضافہ کو کنٹرول کرنے کے لئے مختلف وسائل وذرائع فراہم کرنا اور انہیں اختیار کرنے کی ترغیب دینا اور مردوں کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے پر اعتراض کرنا، اور اس کی اجازت نہ ہونے کی کوشش کرنا اور نئے قوانین وضع کر کے شادی کے مسئلہ کو دشوار بنانا۔

مساجد، مدارس، تربیتی مراکز اور صلاح وخیر کی دعوت کے لئے قائم ہونے والی تنظیموں کو متہم کرنا نیز اسلام کی تمام سنتوں کو کالعدم یا کم ازکم ناقابل عمل بنانا، اور ایسی کتابوں اور رسالوں کو شائع کرنا جن سے لوگ گوشہ نشینی کی طرف مائل ہوں۔

بدگمانی اور سوئے تفاہم کے ذریعہ شیعہ اور سنی مسلمانوں میں مذہبی اختلاف پیدا کرنا اور یہ کہنا کہ اسلام مساوات چاہتا ہے؛ لیکن آج اس کے برخلاف ہے۔

مستشرقین کی کوششوں سے آپ واقف ہیں۔ مغربی اقوام نے اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ دینے کے لئے جتنا مطالعہ اسلام اور مسلمانوں کا کیا ہے ہم نے نہیں کیا ہے۔ انہوں نے جاننا چاہا کہ ہماری قوت کا راز کیا ہے، ہماری حیات کا سرچشمہ کہاں ہے۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ ہمارے سرچشمے بند ہو جائیں، وہ طویل مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ تین ایسی چیزیں ہیں جن

میں ہماری قوت کا راز پنہاں ہے۔ تقریب فہم کے لئے ہم انہیں چار کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ان چار امور کو جو مسلمانوں اور مسلم معاشرے کی اساس تھے شدید تنقید کا نشانہ بنایا، ان کی تنقیص کی، انہیں مختلف فیہ بنانے کی جدوجہد کی۔ انہوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کے مابین بحث کا موضوع بن جائیں۔

ان چار عناصر میں پہلا کتاب اللہ ہے: ان کی رائے یہ ہے کہ اگر قرآن کو مقام حجت سے ہٹا کر قابل بحث بنا دیا جائے تو اسلام کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ چنانچہ مستشرقین کی کھیپ کی کھیپ اس کام میں منہمک ہونے لگی، سینکڑوں ہزاروں لوگ اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ قرآن کے سلسلے میں جس طرح بھی ہو ایسی باتیں سامنے لائی جائیں تاکہ قرآن حجت اور فرقان رہنے کے بجائے قابل بحث ہو جائے۔

دوسرا عنصر ذات رسول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات کو قابل بحث بنانے کی کوشش کی گئی، اور اس بات کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے کہ آپ کی شخصیت مسلمانوں کے درمیان مجروح ہو جائے اور ان کی حیثیت وہ باقی نہ رہے۔

تیسرا عنصر رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ ہے جو امت کے لئے اسوہ ہے۔ مستشرقین نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ سنت رسول اللہ ﷺ امت مسلمہ میں مضحکہ خیز اور حقیر ہو جائے۔ انہوں نے سنت کو ہر طرح کی تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا۔ اسے تقلید جامد، خلاف عقل اور دقیانوسی قرار دیا۔ انہوں نے سنت پر سختی سے عمل کرنے والوں کا مذاق اڑایا، ان پر طعنے کسے کہ وہ عہد وسطی کی جہالت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

چوتھا عنصر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مغرب پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا ہے: چنانچہ انہوں نے اسے بدنام کرنے اور اسے ایک وحشیانہ فعل قرار دینے کی بھرپور کوشش کی، طرح طرح کے حربے آزمائے، انہوں نے خود مسلمانوں کے مابین ایسے افراد کو شہرت دی جو جہاد کو

باطل قرار دینا چاہتے تھے۔

کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیاں بھی سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور فکری ہیں۔ چنانچہ اس کی مثال اس وقت ویت نام میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ویت نام کے مسلم باشندوں کے ساتھ اس وقت نسلی، قومی، اور مذہبی تفریق وتمیز برتی جاتی ہے۔ حکومت میں مسلمانوں کو کوئی جگہ نہیں ملتی، سرکاری ملازمت، فوج میں شمولیت اور دیگر وظائف سے محروم رکھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مسلم بچوں اور بچیوں کو سرکاری اسکولوں، کالجز اور یونیورسٹیوں میں داخلہ نہیں ملتا، کیمونسٹوں کی مسلم دشمنی اس شرمناک حد تک پہنچ چکی ہے کہ مسلم علاقوں، بستیوں اور قصبوں میں غلوں، سبزیوں اور دیگر لوازمات زندگی کی سپلائی تک نہیں ہونے دیتے تاکہ مسلمان مجبور ولاچار ہوکر مہاجرت اختیار کرلیں۔

ویت نامی مسلمانوں کے خلاف کیمونسٹوں اور بدھسٹوں کے چوطرفہ حملے سے ان کی فکری وروحانی حالت مجروح ہوکر رہ گئی ہے۔ ان میں مذہبی بیزاری عام ہونے لگی ہے۔ نئی مسلم نسل کی غالب اکثریت دین اسلام اور اس کے مبادی واصول سے کچھ بھی واقف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے اور بوڑھے بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس ہونے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے وسنوارنے پر جاری پابندیوں کے نتیجہ میں اسلام اور اس کی تعلیمات سے برگشتہ ہوکر کیمونزم اور بدھ ازم سے متاثر ہورہے ہیں۔ اگر بعض شرعی امور کی انجام دہی بھی کرتے ہیں، تو اس میں بدھ ازم کی عادات واطوار بھی از خود شامل ہوجاتے ہیں۔

اس وقت قرآن کریم کے خلاف جو جنگ اہل مغرب نے چھیڑ رکھی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، یہود ونصاریٰ کے شرپسند عناصر پوری طرح بے نقاب ہوکر اسلام اور مسلمانوں کو بزعم خویش اس صفحہ ہستی سے مٹادینے کے لئے بڑی منصوبہ بندی سے کام کررہے ہیں۔ فلسطین، افغانستان، عراق اور دیگر مقامات پر جو کچھ کررہے ہیں وہ ناقابل بیان ہے، گذشتہ دنوں کیوبا کی

گوانتاناموبے جیل میں موجود مسلم قیدیوں کو جسمانی اذیت کے ساتھ ذہنی اذیت پہونچانے اور ان کے مسلمان ہونے کا انتقام لینے کی خاطر امریکی فوجیوں نے قرآن کریم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ درحقیقت ایک طویل مجرمانہ وحیشانہ منصوبوں کی ایک کڑی ہے۔اس طرح کے ایک دو چھوٹے موٹے واقعات کی بازگشت کبھی کبھی میڈیا والوں تک پہونچ جاتی ہے تو عام لوگوں کو بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کے خلاف چھیڑی گئی جنگ کا ایک اور نمونہ ''الفرقان الحق'' نامی وہ محرف کتاب بھی ہے جس کا میڈیا میں بہت چرچا ہوا۔مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے دور رکھنے اور کتاب الٰہی سے انسان کا رشتہ منقطع کر دینے کی یہ کتاب بدترین کوشش ہے۔

آج پوری دنیا میں مسلم اقلیت جن مسائل سے دوچار ہے،اس کو سمجھنے کے لئے مذکورہ بالا اجمالی سطور کافی ہیں، آج مغربی طاقتیں مضبوط ہیں اور مسلمان پسماندہ وکمزور، مگر ایسے زمانے بھی گزرے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کی طاقت وقوت مضبوط تھی،لیکن اسلام کے ماننے والوں نے اس قوت وطاقت کا ناجائز فائدہ کبھی نہ اٹھایا، بلکہ ہمیشہ دوسری اقلیت کے حقوق کا پاس ولحاظ کیا، یہ زبانی وقلمی دعوی نہیں ؛ بلکہ تاریخ گواہ ہے۔

اسلام کے نزدیک ایک سیاسی ڈھانچہ میں رہنے والے خواہ وہ کسی بھی رنگ، نسل یا علاقہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ ایک ہی وحدت سے منسلک ہوتے ہیں، اگر وہ مسلمان ہیں تو چاہے عربی ہوں یا عجمی، آریائی نسل سے ہوں یا سامی، کالے ہوں یا گورے، ملکی باشندہ ہونے اور ملکی شہریت کے اعتبار سے سب برابر کے شہری ہیں، البتہ اگر مسلم حکومت کے علاقے میں کچھ غیر مسلم آباد ہوں خواہ وہ نسلاً بعد نسل ہی اس علاقہ میں رہ رہے ہوں، انہیں اقلیت میں شمار کیا جائے گا،لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی بھی طرح دوسرے درجے کا شہری ہے۔ بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ مسلم اکثریت سے بھی زیادہ محترم ہے۔ کیونکہ اسلام تمام مسلمانوں کو خواہ وہ

رعایا ہوں یا حکمراں اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ غیر مسلم کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کریں، ان کے مذہب سے کوئی تعرض نہ کریں، ان کے معابد و رسومات عبادت میں کسی قسم کا دخل نہ دیں۔ (اسلامی حکومت میں اقلیتیں / ۱۲۔ ۱۳)

قرآن کریم جو مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے، اس کی ساری تعلیمات احترام انسانیت وتوقیر مذاہب پر مبنی ہیں، اس کتاب الٰہی نے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے: " **ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله** " (انعام / ۱۰۹) پیغمبر اسلام محمد ﷺ جو پوری دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، ان کے ارشادات میں کہیں بھی غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو پامال کرنے کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ہر جگہ ان کے ساتھ حسن سلوک اور بہترین معاملہ کرنے کی تاکیدات وتعلیمات ملتی ہیں۔ آپ کی حدیث ہے: " **ألا من ظلم معاهدا أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة** " (خبردار! جس کسی نے معاہد (اقلیتی فرد) پر ظلم کیا یا اس کا حق مارا یا اس کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس سے کوئی چیز اس کی خوشی کے بغیر لی تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے جھگڑوں گا۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں جزیرۃ العرب میں آباد غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کئی معاہدے کئے، ان معاہدوں کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، کہیں بھی اس بات کا سراغ تک نہیں ملتا کہ آپ کی جانب سے ہوئے معاہدوں کی دفعات میں سے کسی دفعہ میں بھی غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کسی بھی طرح کی زیادتی کو روا رکھا گیا ہو۔

رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ابوبکر الصدیق، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا دور آیا، اس طویل دور خلافت میں ہر ایک خلیفۂ راشد کو غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ معاہدے کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر ایک کے زمانے

میں غیر مسلم اقلیت نے مسلم ریاست میں بود وباش اختیار کی۔ کہیں بھی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ ان کے ادوار میں غیر مسلم اقلیت کے ساتھ کسی بھی طرح کا غیر انسانی سلوک برتا گیا۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کس قدر محفوظ تھے اور ان کو ہر قسم کی مذہبی واخلاقی وغیرہ کی آزادی حاصل تھی، اس کا اندازہ عمر رضی اللہ عنہ کے تاریخی تحریری معاہدہ سے کیا جاسکتا ہے، جو انہوں نے بیت المقدس (فلسطین) کے عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ معاہدہ تھا: ''یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایلیا کی عوام کو دیا، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور تمام مذہب والوں کے لئے ہے ،اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت اختیار کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ہی ان کے احاطہ کو کوئی نقصان پہونچایا جائے گا۔ مذہب کے بارے میں ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو تکلیف دی جائے گی۔۔۔۔ ان پر خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عبد الرحمٰن بن عوف، اور معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہم) گواہ ہیں، اور یہ معاہدہ ۱۵ھ میں لکھا گیا'' (تاریخ طبری: فتح بیت المقدس)۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دور کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کا قتل کر دیا، معاملہ خلیفۂ وقت علی رضی اللہ عنہ تک پہونچا، انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے گھر والوں کے حوالہ کر دیا جائے، بعد میں مقتول کے گھر والوں نے دیت قبول کر کے قاتل کو چھوڑ دیا، اس کی اطلاع جب علی رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے مقتول کے گھر والوں کو بلا کر پوچھا کہ کہیں ان پر دباؤ تو نہیں ڈالا گیا (دیکھئے زیلعی تخریج ہدایہ ۲۸)۔

خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار میں بھی اسلامی تعلیمات کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا گیا اور مسلم حکومت وسلطنت میں غیر مسلم اقلیتوں کو ہر طرح کا مکمل تحفظ فراہم کیا گیا۔ خلافت بنو امیہ کی تاریخ میں کثرت سے یہ باتیں ملتی ہیں کہ ان کے دور میں نہ صرف غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق

محفوظ تھے، بلکہ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب دیئے گئے تھے۔ مامون کے عہد میں جبریل نامی عیسائی کو اس قدر پذیرائی حاصل تھی کہ اس نے یہ عام حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص کسی ملکی عہدہ پر مقرر کیا جائے پہلے جبریل کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس نے خراسان میں جو کالج بنوایا تھا اس کا پرنسپل یسوع نامی عیسائی کو بنایا تھا۔ خلافت بنو عباسیہ، عثمانیہ اور بعد کے تمام ادوار میں بھی اسلامی ریاستوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو مذہبی وغیرہ ہر قسم کا تحفظ فراہم تھا۔

مگر افسوس کہ آج یورپی و امریکی بلکہ تمام غیر مسلم ملکوں میں مسلم اقلیت اپنے تمام تر حقوق سے محروم ہیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کا غیر انسانی سلوک برتا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں پوری اسلامی تاریخ میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ برتی گئی رواداری کو ہر زبان میں عام کرنے اور یورپ و امریکہ نیز ہر غیر مسلم حکومت تک پہونچانے کے ساتھ ساتھ ان کو مسلمانوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے اور ان کو ہر نوع کا حق فراہم کرنے کی دعوت دی جائے؛ کیونکہ دعوت کے اندر وہ قوت وطاقت ہے جو خطرناک ترین میزائلوں کے اندر بھی نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں تاتاریوں نے عالم اسلام کو غیر معمولی نقصان پہونچایا، وحشی اور خونخوار تاتاریوں کی طاقت بظاہر ناقابل شکست بن گئی تھی، مگر اس کے بعد اسلام کی دعوتی طاقت ظاہر ہوئی، اس نے تاتاری قوم کو مسخر کرلیا۔ اس کا اعتراف مستشرقین نے بھی کیا اور کہا کہ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی، جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق بخشے، آمین!

☆☆☆

اسلام اور رواداری

مولانا عبدالرب اعظمی ☆

اسلام کی روشن تعلیمات میں امن وسلامتی، شفقت ومحبت، الفت ومودت، ہمدردی وخیرخواہی، انسان دوستی وخیرسگالی، انصاف پروری وعدل گستری، فراخ دلی ورواداری کا واضح پیغام ملتا ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان پاکیزہ صفات سے معمور ہے اور یہ خصوصیات اسلام کے بنیادی اصولوں میں ہیں، اسلام روز اول ہی سے ان کا داعی رہا ہے، چنانچہ ہر دور میں مسلم حکمرانوں نے انہیں عملاً برت کر دکھایا ہے۔

مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اہل کتاب پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، ان کے یہاں ہدیہ بھیجنا اور ان کے ہدیہ کو قبول فرمانا، آپ کے معمول میں تھا، حبشہ کے نصاریٰ کا وفد آیا، تو آپ نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور خود ان کی خدمت وضیافت کی۔

ایک مرتبہ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد آیا تو آپ نے ان کو بھی مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور انہیں اپنی نماز قائم کرنے کی اجازت دی، لہٰذا مسلمان اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے ایک حصہ میں نماز ادا کرتے تھے اور دوسرے حصہ میں وہ، اور جب انہوں نے اپنے دین کے دفاع میں آپ سے مباحثہ کرنا چاہا، تو آپ نے ان کی باتیں سنیں اور نہایت نرمی ومہربانی اور ادب واخلاق کے ساتھ ان کے جوابات دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے

☆ ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ انوار العلوم، جہانا گنج، اعظم گڈھ

عیسائیوں کو پوری مذہبی آزادی دے کر اسے قانونی حیثیت بخش دی، جس پر ہمیشہ عمل ہوا، معاہدہ کے الفاظ ہیں، جو والی یمن عمرو بن حزمؓ کو لکھے گئے:

"ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي على أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير لا يغير أسقف من أسقفته ولا راهب من راهبتيه ولا كاهن من كهانته"۔

عہد فاروقی میں جب رومیوں کے حملہ کی خبر ملی تو اسلامی فوج نے ذمیوں کا جزیہ واپس کر دیا کہ ہم تمہاری حفاظت سے معذور و مجبور ہیں، اس پر غیر مسلموں نے کہا: خدا تمہیں پھر واپس لائے اور تمہیں کامیاب کرے، رومی تو ہمیں دیتے کیا جو کچھ ہے وہ سب چھین لیتے۔

"قالوا: ردكم الله علينا ونصركم عليهم فلو كانوا هم لم يردوا علينا شيئا وأخذوا كل شئ بقي لنا حتى لايدعو شيئًا" (کتاب الخراج: ۸۱/)۔

حضرت حسن نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا کہ جزیہ دے کر وہ مذہباً آزاد ہوں گے۔

إنما بذلوا الجزية ليتركوا ما يعتقدون۔ (الخراج: ۴۱)۔

آپؐ کے بعد خلفائے راشدین بھی اسی مذہبی رواداری اور خیر خواہی پر عمل پیرا رہے، اسلام نے غیر مسلم رعایا کی جان و مال، عزت و مذہب کا جس قدر تحفظ کیا اس کی مثال نہیں مل سکتی، کتاب و سنت میں صراحت کر دی گئی کہ وہ اپنے مذہبی معاملات میں آزاد رہیں گے، امام شاطبی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے روم و عجم کی فتح کے بعد ان کے باشندوں کو ان کے مذہب پر باقی رکھا۔

"وأقر أهلها فيها على ملتهم وشرائعهم الأولى فهم أحرار في شهاداتهم ومناكحتهم ومواريثهم وجميع أحكامهم" (الموافقات: ۱۰۱/۱)۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے سرکاری گورنروں کے نام لکھا تھا: ذمیوں کے معاملات ومفاد سے آپ کو دلچسپی لینی چاہئے، آپ کے ذمہ جو ان کے حقوق ہیں ان کو دیجئے (طبری:۵/۴۴)۔

معاہدۂ بیت المقدس میں ان کے ساتھ جو نرم پالیسی اختیار کی گئی، وہ اسلامی رواداری کا وہ ماڈل اور عملی نمونہ تھا، جس کی مثال دنیا پیش کرنے سے عاجز ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادے نے کسی ذمی کو مارا اور کہا کہ میں تو معزز والدین کا بیٹا ہوں، اس کی شکایت پر عمروؓ بن العاص اور ان کے بیٹے بلائے گئے اور ان سے خطاب ہوا کہ تم نے لوگوں کو غلام کب سے سمجھ لیا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔

"متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحراراً"۔

پھر ذمی کو آپ نے مارنے کا حکم دیا کہ اس صاحبزادے سے بدلہ لے لو۔

"اضرب بها ابن الاكرمين كما ضربه"۔

حضرت ابن عباسؓ کے واقعہ سے بھی اس عہد کے مساویانہ برتاؤ اور رواداری کا پتہ چلتا ہے، ایک بار انہوں نے اپنے پڑوسی یہودی کے یہاں ہدیہ بھیجنے کی تاکید بار بار کی تو اس نے کہا کہ آپ کتنی بار کہیں گے، آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پڑوسی کا حق اتنا جتایا تھا کہ ہم سمجھنے لگے تھے کہ وہ میراث میں بھی شریک ہو جائے گا۔

"لا تنس جارنا اليهودي ثم كررها حتى قال له الغلام كم تقول هذا، فقال: إن النبي قد أوصينا بالجار حتى خشينا أنه يورثه"۔

دور فاروقی ہی کا واقعہ ہے کہ آپ نے بوڑھے عیسائی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے اپنے ساتھ بیت المال لے جا کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور دوسرے نادار ذمیوں کے جزیہ کی معافی کا حکم دیا، اس عیسائی سے آپ نے جو ہمدردانہ جملے کہے وہ انسانیت کا لائحۂ عمل بننے کے لائق ہیں کہ ہم

اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں لاوارث چھوڑ دیں، تو یہ انصاف نہیں ہوگا۔

"فو الله ما أنصفناه إن أكلنا شبيبته ثم نخذله عند الهرم" (کتاب الخراج للامام ابی یوسف: ۷۲)۔

انہی کے دورِ حکومت میں مصر کی ایک مسیحی عورت ان سے شکایت کرتی ہے کہ مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ نے اس کے گھر کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی مسجد میں شامل کر دیا ہے، حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ سے پوچھتے ہیں، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی ہے، ان کے لئے مسجد تنگ پڑ رہی تھی، اس مسجد کے بازو میں اس عورت کا گھر ہے، انہوں نے اس کو بہت زیادہ قیمت دینا چاہا، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا، تو مجبوراً اس کے گھر کو منہدم کر کے مسجد میں شامل کر دیا، اس کی قیمت بیت المال میں رکھ دی وہ جب چاہے اسے لے سکتی ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمارے موجودہ قوانین میں مباح ہے، حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے اس عمل میں معذور ہیں، لیکن پھر بھی حضرت عمرؓ نے مسجد کی نئی تعمیر کو منہدم کیے جانے اور اس عورت کے گھر کو اس کی سابقہ حالت میں لوٹانے کا حکم دیا، یہ اسلامی رواداری کی ایک ایسی نایاب مثال ہے، جس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔

اب ہم تاریخ اسلام سے اس کا تاریخی ثبوت بھی پہنچانا چاہتے ہیں، اگرچہ یہ طے ہے کہ اکادکا واقعات کے سوا عام طور پر تاریخ اسلام میں غیر مسلموں کا ہر قسم کا تحفظ کیا گیا، سلطان محمد فاتح (م: ۱۴۸۱ء) جب ۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء میں ۴۰ دن کے شدید محاصرہ کے بعد خشکی کے راستہ پر کشتی چلا کر قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو خلاف توقع اس نے مفتوح عیسائیوں سے کوئی بدلہ نہیں لیا اور نہ انتقامی کارروائی کی، بلکہ اس کے برعکس انہیں اذن عام اور اسلامی حکم کے مطابق ان کے پادریوں کو مذہبی اور قانونی آزادی ہی نہیں بلکہ سیاسی اصطلاح میں "حکومت در حکومت" جیسی انہیں رعایت دی، کیتھولک اور قدامت پسند کو ہر طرح کی آزادی دی گئی، جس کی وجہ سے عیسائی

رعایا اسلامی فاتحوں کو رومی حاکموں پر ترجیح دینے لگی، جو بے جا مداخلت کرتے رہتے تھے (من روائع حضارتنا: ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی: ۸۵)۔

ہارون خان شروانی لکھتے ہیں کہ سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کر کے ہر ایک کو مذہبی معاملات بلکہ بعض دنیوی امور میں بھی آزادی دی اور یہ آزادی ۱۹۲۳ء کے صلح نامہ لوزان تک مسلسل جاری رہی۔

عہد اسلامی میں مساجد کے پڑوس میں گرجا گھر ہوا کرتے تھے اور اس کے ذمہ داروں کو دینی امور میں رعایا پر پورا حق و اختیار ہوا کرتا تھا، حکومت کو ان کے آپسی اختلافات دور کرنے اور ایک دوسرے کو حق و انصاف دلانے کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں ہوتا تھا اور نہ دینی امور میں حکومت دخل اندازی کرتی تھی، مسلمانوں نے جب مصر کو فتح کیا تو قبطیوں کو ان کے گرجا گھر حوالہ کر دیا۔ اسلام کی اس رحمدلی، انصاف پروری، عدل گستری، فراخ دلی اور مذہبی رواداری کے نتیجہ میں عیسائیوں نے اسلامی عہد حکومت میں ایسی آزادی محسوس کی اور اس سے پانچ سو سال تک مستفیض ہوتے رہے، جیسی آزادی ان کو اپنے رومی عہد حکومت میں کبھی حاصل نہیں رہی۔

اسلامی فتوحات کے ابتدائی عہد میں بہت سے ایسے گرجا گھر تھے، جن میں عیسائی اور مسلمان بہ یک وقت نماز ادا کرتے تھے، لیکن دونوں کا قبلہ الگ الگ ہوتا تھا، مسلمان قبلہ کی طرف اور عیسائی مشرق کی طرف رخ کرتے تھے۔

ہندوؤں کو مذہبی آزادی:

اسلامی ہندوستان میں بھی اسلامی رواداری کا اصول جاری رہا، مسلمانوں نے ہندوستانی باشندوں کو مذہبی آزادی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی اندرونی خودمختاری دے رکھی تھی، ہر

بادشاہ کے عہد میں راجے، مہاراجے، جاگیردار اور زمیندار موجود رہے۔

محمد بن قاسم کے بارے میں ہر مؤرخ لکھتا ہے، اس نے ہندوستانیوں سے قابل تعریف سلوک کیا، ایک مؤرخ لکھتا ہے:

اس نے رعایا کی مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور برہمنوں کو بلا کر حکم دیا کہ اپنے مندر تعمیر کرالیں اور ملک کے محاصل سے ۳ر فیصد جو ہمیشہ سے مندروں کے خرچ کے لئے ملتا تھا وہ جاری رہے گا (تاریخ ہندوستان: مولوی ذکاء اللہ)، ڈاکٹر تاراچندر نے بھی اپنی تاریخ ہند میں تفصیلاً لکھا ہے۔ بلاذری کہتا ہے کہ ابن قاسم جب قید ہوا تو ہندو روتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی طرف سے مندروں کے لئے وقف اراضی اگرچہ شاذ تھا لیکن معدوم نہ تھا (مارکوپولو ۱۰۳ر ۲ بحوالہ امراء ہنود ر ۶)۔

عالمگیر کا عہد بدنام ہے، لیکن اس نے بھی مندروں کے لئے جاگیریں دیں، علی گڑھ، متھرا اور بنارس کے مندروں کے پروہتوں کے پاس آج بھی اس کے فرامین موجود ہیں (فرامین شاہی: مولوی بشیرالدین)۔

صاحب مآثر الامراء نے ہندو راجاؤں اور منصب داروں کی جو تفصیل دی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ منصب ہفت ہزاری پر عالمگیر کے عہد میں زیادہ تعداد میں ہندو تھے، جن کی تعداد ۶۷ر تک پہنچتی ہے۔

علی گڑھ میں عالمگیر نے ایک اہم عہدہ پر ایک ہندو کو فائز کیا، تو کسی نے اعتراض کیا، جس پر عالمگیر نے وہ خط لکھا جس میں اس کی بے تعصبی پوری طرح نمایاں ہے، اس میں اس نے قرآن کا حوالہ دیا ہے کہ مذہب کے بارے میں آزادی ہے۔ لكم دينكم ولي دين (دعوت اسلام آرنلڈ: ۲۸۷)۔

مسلمان بادشاہوں کے دربار میں ہندو فاضلوں کو خاص مقام دیا جاتا تھا اور ان سے

ان کے مذہبی معلومات حاصل کیے جاتے تھے، ایک تاریخ نگار لکھتے ہیں:

عالمگیر کے دربار میں سندر نام کا ایک برہمن کب رائے کے خطاب سے موصوف تھا، غرض کوئی دربار ایسا نہ تھا، جس میں ہندو فاضل اعزاز وتوقیر کے ساتھ موجود نہ ہوں (امرائے ہنود: رفیق مارہروی ر ۳۲)۔

مزید تفصیلات مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆

چوتھا باب

اقلیتوں کے حقوق

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر

اقلیتوں کے حقوق -قومی اور بین الاقوامی تناظر میں

محمد عبدالرحیم قریشی ☆

آج ہمارے ذہنوں میں لفظ ''حق'' یا ''حقوق'' سے جو تصور ابھرتا ہے ایسا کوئی تصور زمانہ قدیم میں نہیں پایا جاتا تھا۔زمانہ قدیم میں کئی تہذیبیں ابھریں اور پھر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں، کئی سلطنتیں وجود میں آئیں، عروج پائیں اور پھر زوال کا شکار ہو کر بے نام و نشان ہو گئیں۔ان تہذیبوں، تمدنوں اور سلطنتوں میں بجز رشتوں کے فطری حقوق کے، حقوق کے تصورات نظر نہیں آتے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان تہذیبوں اور تمدنوں میں انسانی مساوات مفقود تھی، انسانوں اور خود اپنے شہریوں کو کئی طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا، ماضی میں بعض طبقات حقوق سے بالکل محروم تھے۔یونانی تہذیب میں غلاموں کو جانوروں کی سطح پر رکھا گیا تھا، جنہیں کوئی حق حاصل نہیں تھا مصری تہذیب میں حکمراں طبقہ سے تعلق نہ رکھنے والے افراد پر ہر طرح کی ظلم و زیادتی روا تھی اور اس کے خلاف احتجاج کا کوئی حق نہیں تھا، رومن ایمپائر میں صورتحال کچھ بہتر تھی مگر اس ایمپائر کی وسعت کے ساتھ اصل رومی شہری اور رومیوں کی رعایا کے درمیان فرق ابھرنے لگا اور ایسے طبقات وجود میں آتے گئے جنہیں حقوق سے عاری قرار دیا گیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انسان کے کسی حق کے بارے میں سوچ رومن ایمپائر میں عیسائیت کی تبلیغ اور ترویج سے شروع ہوئی۔عیسائیت کے پھیلنے کے ساتھ بائبل کے مطالعہ کا رجحان پیدا ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کردہ احکام

☆ اسسٹنٹ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

عشرہ (TEN COMMANDMENTS) میں انسانی قتل کی ممانعت نے بڑی تبدیلی لائی۔ ''توکسی کونہیں مارے گا'' (THOU SHALL NOT KILL) کے حکم نے انسان اور انسان کی حیات کے تقدس واحترام کے جذبہ کو ابھارا۔ عیسائی چرچس کے تحت قائم عدالتوں نے اور ان کے ذریعہ نافذ کئے گئے ضابطوں نے حیات انسانی کی عظمت اور شخصیت انسانی کے احترام کے تصورات کو آگے بڑھایا، گوان چرچس کو بہت سخت دشواریوں سے گزرنا پڑا اور بعض اوقات حکمراں طبقہ وجاگیرداروں کی مراعات (PRIVELEGES) کے سامنے سر جھکانا پڑا، اس کے باوجود حیات انسانی کے تقدس کا تصور بتدریج سماجی جذبات کا حصہ بنتا گیا، مگر معاشرہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے تصورات کے غلبہ کو ختم نہیں کیا جاسکا۔

جب بھی انسان کے حقوق کی بات ہوتی ہے تو برطانیہ کے اعلامیہ ''میگنا کارٹا'' (MAGNA CARTA) کو ایک تاریخی کارنامہ اور اہم سنگ میل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ اس اعلامیہ میں برطانیہ کے عام شہریوں کو نہ کوئی حق دیا گیا ہے اور نہ ان کے تعلق سے کوئی بات کہی گئی ہے۔ یہ اعلامیہ جاگیرداروں اور امراء کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور برطانیہ کے بادشاہ کے روایتی حقوق کو محدود کرتا ہے۔ اس کا موضوع نہ انسان ہے نہ عام شہری بلکہ جاگیردار وامراء بمقابلہ شاہ برطانیہ ہے، انسان اور انسانی تاریخ کو بڑا سفر طے کرنا پڑا، دوخون ریز اور تباہی خیز عالمگیر جنگوں کے دوران اور ان کے بعد دنیا میں انسانی حقوق کا سوال ابھرا اور ان تصورات کی تشکیل کا آغاز ہوا۔

اب حقوق کے تصورات کی تعریف اور تشکیل کے دور میں ان حقوق کی بات بھی نکلی جن کو اقلیتوں کے حقوق کہا جاتا ہے۔ یہاں اقلیت سے مراد سیاسی اقلیت یا وہ سیاسی جماعتیں نہیں ہیں جو قانون ساز اداروں میں اکثریت حاصل کرنے یا اکثریتی مخلوطہ (COALITION) کا جزبننے میں ناکام رہتی ہیں، کیونکہ ان کی اقلیتی نوعیت دائمی نہیں ہوتی اور ان کے اکثریت

یا اکثریتی مخلوطہ کا جز بننے کے احکامات موجود رہتے ہیں۔ یہاں اقلیت سے مراد وہ گروہ ہیں جو مستقلاً یا دائمی طور پر اقلیت میں رہتے ہیں اور ان میں اور اس گروہ میں جو آبادی اور تعداد میں ان سے زیادہ ہوتا ہے کوئی ایسا فرق ہوتا ہے جس کی نوعیت مستقل یا دائمی ہوتی ہے اور اس فرق کی بنیاد پر ان کی شناخت بنتی ہے یہ فرق نسل، رنگ اور مذہب کا ہوتا ہے اور یہی ان کی مخصوص تہذیب وتمدن اور طرز زندگی کی اساس ہوتا ہے، اور ان گروہوں کو اپنی مخصوص تہذیب وتمدن اور طرز زندگی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے آئینی اور قانونی تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی حقوق کے فروغ کے نظریے کے ساتھ اپنی زبان، اپنی نسلی خصوصیات، اپنے مذہب، اور اپنے کلچر پر قائم رہنے اور فروغ دینے کے حقوق کو اقلیتوں کے لئے تسلیم کیا جانے لگا، یہی حقوق، اقلیتی حقوق کہلاتے ہیں، اب وہ دور تقریباً ختم ہو چکا ہے جبکہ دوسرے گروہوں پر اکثریتی تہذیب وتمدن، زبان ورسم خط، مذہب وعقیدہ کو مسلط کرنا اس ملک کی شہریت دینے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ (U.S.A.) میں اب تک اینگلو سیکسن ANGLO-SAXON ہی کو یورپ سے آنے بسنے اور شہریت حاصل کرنے کی اجازت تھی حتیٰ کہ یورپ کے دوسرے سفید فام گروہوں کو بھی اس کی اجازت نہیں تھی مگر بتدریج یہ ذہنیت ختم ہوتی گئی، یو ایس اے نے اپنے ملک کو پگھلانے والی دیگ (MELTING POT) قرار دے کر غیر اینگلو سیکسن افراد کے لئے بھی آباد ہونے کا راستہ کھول دیا، اور کینڈا نے جہاں کیوبک کے علاقہ میں فرانسیسی زبان وتمدن کا اور باقی علاقہ میں انگریزی زبان اور تمدن کا تسلط اور راج تھا، تمدنی تعدد (CULTURAL PLURALISM) کی پالیسی کو اپنانے کا اعلان کیا۔ ان تبدیلیوں کے باوجود دنیا کے ان علاقوں میں جن کو یورپ کے سفید فاموں نے نو آباد کیا غیر سفید فاموں ایشائی اور افریقی نژادوں کی آبادکاری پر آج تک پابندیاں عائد ہیں، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں سفید فام یورپی کو آباد ہونے کی آزادی ہے جبکہ غیر یورپی کے لئے کوٹہ مقرر کیا جاتا ہے، ابھی

ساری دنیا نے تمدنی تعدد (CULTURAL PLURALISM) کو قبول نہیں کیا ہے اور نسل، رنگ، زبان اور مذہب کے فرق کی بنیاد پر امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقلیتی حقوق کا مکمل احترام اور نفاذ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ان حقوق کو تسلیم کرنے والی عالمی ریاست (WORLD STATE) قائم ہو یہ ایک ایسا خواب ہے جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ حقوق فرد کو نہیں بلکہ اقلیتی جماعت یا گروہ کو حاصل ہوتے ہیں، ان کی نوعیت تیقنات اور تحفظات (SAFE GAURDS) کی ہے اور ان حقوق کو تسلیم کرنے اور آئین و دساتیر اور قوانین میں ان کے تعلق سے گنجائش فراہم کرنے اور دفعات شامل کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے، اور اس کو مہذب ریاست (CIVILISED STATE) کی ایک خصوصیت قرار دیا جا رہا ہے۔

اقلیتی حقوق کی عملی صورت گری کے لئے رواداری (TOLERANCE) اور بقائے باہم (MUTUAL CO- EXISTENCE) کا ماحول ضروری ہے، اگر رواداری نہ ہو تو سارے تیقنات بے کار اور بے سود ہو جاتے ہیں۔ نسل، رنگ، زبان، کلچر اور مذہب وعقیدہ کے فرق کو برداشت کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانا اور اقلیتی گروہوں کے ساتھ مل کر رہنے ان کے حقوق کا احترام کرنے اور ساتھ مل کر اپنے ملک اور عوام کی ترقی اور بہتری کے لئے کام کرنے کے جذبات کو فروغ دینا ضروری ہے، ان احساسات، جذبات اور نظریات کو پروان چڑھانا اور عملی حقیقت بنانا ضروری ہے، ایسے ماحول کے بغیر اقلیتی حقوق کی عملی صورت گری بہت مشکل ہے، اس کے لئے عدم رواداری کے احساسات کو پروان چڑھانے کی کوششوں کے خلاف قانونی کارروائی اور سخت اقدامات کی ضرورت ہے کہ رواداری اور اختلاف نسل ورنگ، زبان ورسم خط اور مذہب وعقیدہ کو برداشت کرنے کا مزاج ہر کلچر کی نمایاں خصوصیت بن جائے" اس نشانہ کو

حاصل کرنے کی کوشش ہر ریاست، ہر معاشرہ اور ہر گروہ کو کرنی چاہیے، تب ہی دنیا اقلیتی حقوق کی مکمل تنفیذ اور مکمل احترام کو عملی شکل میں دیکھ سکتی ہے۔ یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ اقلیتوں کے حقوق دراصل اکثریت کی ذمہ داری (OBLIGATION) ہے، جہاں اکثریت اس ذمہ داری کو نبھاتی ہے اور رواداری اور باہمی مفاہمت کا عملی مظاہرہ کرتی ہے وہاں اقلیتوں کے حقوق کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوتا ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کی عملی صورت گری کے لئے ایک اور پہلو قابل غور ہے، ان انسانی حقوق (جنھیں بنیادی آزادیاں (FUNDAMENTAL FREEDOMS) اور بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) کہا جاتا ہے) کے بغیر یہ حقوق عملی روپ اختیار نہیں کر سکتے۔ بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے بغیر جو تمام افراد اور شہریوں کو حاصل ہوں ان کے بغیر اقلیتوں کے حقوق بالکل بے معنیٰ ہیں، ان بنیادی حقوق میں اولیت حق حیات یعنی زندگی کے حق (RIGHT TO LIFE) کو حاصل ہے۔ عام محاورہ ''جان ہے تو جہان ہے'' میں معنی ومفہوم کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، اسی حق کے بطن سے دوسرا حق حق صیانت وسلامتی (RIGHT TO SECURITY) سامنے آتا ہے، کیا ان حقوق کے بغیر اقلیتوں کے حقوق کا حصول ممکن ہے؟ جہاں زندہ رہنے کا حق تسلیم کیا گیا نہ ہو اور جہاں سلامتی صیانت کی ضمانت حاصل نہ ہو وہاں اقلیتوں اور اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والوں کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکتی رہے گی اور وہ خوف کے سایہ میں زندہ رہیں گے، حق حیات یا زندگی کے حق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر شخص کو اپنی شخصیت اور اپنی امکانی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور ان کو موجودہ تہذیب وتمدن میں کمال کی ممکنہ سطح تک فروغ دینے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ زندگی کا حق صرف جان وجسم کے رشتہ کو برقرار رکھنے کا نام نہیں بلکہ زندگی کو امکانی حد تک بامقصد بنانے، اپنی جسمانی شخصیت کو فروغ دینے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے ہر ایک کو مساوی اور تمام ممکنہ مواقع

فراہم کرنے کا نام ہے۔ اس حق میں ایک مہذب معاشرہ کے رکن کی حیثیت سے عمدہ زندگی (DECENT LIFE) گزارنے اور اس کو موزوں و معقول معیار تک پہنچانے کے لئے آزادی اور مواقع کا حق بھی شامل ہے۔ تمام حقوق میں سب سے پہلے اور کئی حقوق کی اساس ہونے کی بنا پر زندگی کے حق کو یقینی بنانے کے لئے مناسب اور موزوں ضمانتوں اور تحفظات (SAFE GUARDS) کی ضرورت ہوتی ہے، اقلیتوں کے حقوق کو بامعنی بنانے کے لئے اقلیتوں کے بشمول سب کو یہ حق حاصل ہونا ضروری ہے۔

یہی بات مساوات کے حق کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو عدل وانصاف کے نظم کے بنلئے شرط اول اور انسانی شخصیت کے فروغ کے لئے شرط ضروری ہے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مساوات کے حق میں صرف قانون کی نظر میں مساوات اور عدالت کے روبرو مساوات ہی شامل نہیں ہیں بلکہ اس میں شخصیت کے اظہار اور شخصیت کے فروغ کے لئے مواقع کی مساوات بھی شامل ہے، ان مواقع سے استفادہ کے لئے نسل، رنگ، زبان، عقیدہ، مذہب اور جنس کی بنیاد پر کوئی شرط اور پابندی عائد نہ ہو اور بشمول اقلیت سب کو یہ مواقع حاصل ہوں۔

اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بنیادی حقوق اور آزادیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اقلیتیں اپنی شناخت، تہذیب وتمدن، مذہب اور عقیدہ کی برقراری اور فروغ کے لئے سازگار ماحول وہاں پائیں گی جہاں اقلیتوں کے بشمول تمام کو بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیاں حاصل ہوں گی، اس مرحلہ پر یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ عالمی سطح پر بنیادی حقوق اور آزادیوں کے تصورات کا سرسری سہی جائزہ لیا جائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور (UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS 1948)

یہ عالمی منشور ابتدائیہ (PREAMBLE) اور (30) دفعات پر مشتمل ہے۔ دفعہ (۱)

میں اس منشور کی نظریاتی اساس کو بیان کیا گیا ہے کہ تمام انسان آزاد اور وقار و حقوق میں مساوی الحیثیت پیدا ہوئے ہیں، وہ عقل اور ضمیر رکھتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ احساس کے ساتھ عمل کرنا چاہیئے۔ دفعہ (۳) اس منشور کے اصل حق کو بیان کرتا ہے اور زندگی، آزادی اور سلامتی (SECURITY) کے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ ہر شخص کو زندہ رہنے آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے، دراصل یہی حق دوسرے تمام حقوق سے استفادہ اور ان کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

اس کے بعد دفعہ (۴) سے دفعہ (۲۱) تک (۸۱) دیگر حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، دفعہ (۲۲) میں معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو باوقار زندگی اور تعمیر شخصیت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور ان حقوق کو دفعہ (۳۲) سے دفعہ (۲۷) تک بیان کیا گیا ہے۔

اختتامی دفعات ۲۸ تا ۳۰ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ایسے سماجی و بین الاقوامی نظم کا حق حاصل ہے جس میں تمام انسانی حقوق اور آزادیاں پوری طرح حاصل ہوسکیں۔ ان دفعات میں فرائض اور ذمہ داریوں پر بھی توجہ دلائی گئی ہے جو ہر شخص پر اپنے معاشرہ اور سماج کے لئے عائد ہوتی ہیں۔ دفعہ (۳۰) میں انتباہ ہے کہ کوئی ریاست، کوئی گروہ اور کوئی شخص، اس منشور میں معلنہ کسی آزادی یا حق کو ختم و برباد کرنے کے لئے کسی سرگرمی میں مشغول ہونے یا ایسی کوئی حرکت کرنے کو اپنا حق نہیں قرار دے سکتا۔

چار اہم بین الاقوامی میثاقات:

حقوق انسانی کی تنظیم ''اقوام متحدہ'' کی جانب سے جاری کردہ اس منشور کے بعد، اس تنظیم کی جنرل اسمبلی نے دسمبر 1966ء میں دو میثاقات کو مرتب کیا، ان میں دراصل منشور میں ذکر کئے گئے حقوق و آزادیوں کو کچھ وضاحت کے ساتھ دو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے، معاشی،

معاشرتی وثقافتی حقوق اور مدنی (CIVIL) وسیاسی حقوق۔ ارکان ممالک کی توثیق کے بعد معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا عالمی میثاق (THE INTERNATIONAL COVENENT ON ECONOMIC, SOCIAL AND CULTURAL RIGHTS) جنوری 1976ء سے، اور مدنی وسیاسی حقوق کا عالمی میثاق (THE INTERNATIONAL COVENENT ON CIVIL AND POLITICAL RIGHTS) کو مارچ1976 سے موثر اور نافذ قرارد یا گیا، ان دونوں میثاقات کے ابتدائیے اور دفعات (۳) اور (۵) ایک ہی جیسے ہیں، دونوں کی دفعہ (۳) میں تمام انسانی حقوق سے استفادہ کے لئے مردوخواتین کے درمیان مساوات کے حق کو ضروری قرار دیتے ہوئے ریاستوں کو اس اصول کو عملی حقیقت بنانے کی بات کی گئی ہے، اور دونوں کی دفعہ (۵) میں کسی انسانی حق یا بنیادی آزادی کو ختم کرنے یا ان پر غیر مناسب پابندی عائد کرنے کی ممانعت ہے، معاشی، معاشرتی وثقافتی حقوق کے میثاق میں دفعات (۶) سے (۱۵) تک کے ان حقوق کو بیان کیا گیا ہے، اور مدنی اور سیاسی حقوق کے میثاق میں دفعہ (۱۶) سے دفعہ (۲۶) تک ان کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، اور دفعہ (۲۷) میں کہا گیا کہ ریاستیں نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی حفاظت کے لئے اقدامات کریں گی۔

تیسرا میثاق اہمیت کا حامل ہے جو ''نسل کشی کے جرم کے انسداد اور اس پر سزا کا اتفاقیہ'' (THE INTERNATIONAL CONVENTION ON THE PREVENTION AND PUNISHMENT OF THE CRIME OF GENOCIDE) کہلاتا ہے، یہ ابتدائیہ اور ۱۹ دفعات پر مشتمل ہے۔ دفعہ (I) میں کہا گیا ہے کہ نسل کشی GENO CIDE چاہے امن کے زمانہ میں ہو یا جنگ کے دوران، بین الاقوامی قانون کے تحت جرم ہے۔ دفعہ (II) میں اس جرم کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے کہ نسل کشی کے جرم

سے مراد درج ذیل میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرنا ہے جو کسی قومی، نسلی، یا مذہبی گروہ کو مکمل یا جزوی طور پر تباہ کرنے کی نیت سے کیا جائے:

(الف) اس گروہ کے ارکان کو قتل کرنا۔

(ب) اس گروہ کے ارکان کو شدید جسمانی یا ذہنی نقصان پہنچانا۔

(ج) اس گروہ پر عمداً ایسی شرائط زندگی عائد کرنا جن کے نتیجہ میں کلی یا جزوی طور پر اس گروہ کی تباہی مقصود ہو۔

(د) اس گروہ کے اندر پیدائشوں کو روکنے کے اقدامات کرنا۔

(ہ) اس گروہ کے بچوں کو زبردستی دوسرے گروہ کے حوالے کرنا۔

دفعہ (III) میں نسل کشی کرنے، نسل کشی کے لئے سازش کرنے، نسل کشی کرنے پر راست یا بالواسطہ ابھارنے، نسل کشی کی کوشش کرنے اور اس میں ملوث ہونے کو مستوجب سزا جرائم قرار دیا گیا ہے، دفعہ (IV) میں کہا گیا ہے کہ تمام مجرم اشخاص کو سزا دی جائے گی چاہے وہ آئینی اعتبار سے ذمہ دار حکمران ہوں، عوامی عہدیدار ہوں یا خانگی افراد، اس کے بعد کی دفعات میں نسل کشی کے جرم کے انسداد اور اس کے مجرمین کو سزا کے تعلق سے ریاستوں کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے۔

تنظیم اقوام متحدہ کا مرتب کردہ چوتھا معاہدہ نسلی امتیازات کی تمام شکلوں کے خاتمہ کا بین الاقوامی ''اتفاقیہ'' کہلاتا ہے (THE INTERNATIONAL CONVENTION ON ELIMINATION OF ALL FORMS OF RACIAL DISCREMINATION)

اس کنونشن کا نشانہ نسل و رنگ کی بنیاد پر امتیازات کا خاتمہ ہے۔ اس کی دفعہ (۵) میں جن حقوق کا بیان ہے اس میں درج ذیل حق اقلیتوں کے لئے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

(ب) تشدد اور جسمانی ضرر کے خلاف ریاست کی جانب سے صیانت وحفاظت کا

حق، چاہے یہ تشدد وضرر سرکاری عہدیداروں کی طرف سے ہو یا افراد کے کسی گروہ یا ادارہ کی جانب سے ہو، اس شق میں بیان کردہ حق نے ملک میں پائے جانے والے تمام گروہوں اور ان کے افراد کی سلامتی اور حفاظت کو ریاست یعنی حکومت کی ذمہ داری قرار دیا ہے، علاوہ ازیں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی جانب سے 1979ء میں تفصیلی انداز میں اقلیتوں کی حفاظت کے لئے رہنمایانہ اصول مرتب اور جاری کئے گئے، ان میں درج ذیل اصول اقلیتوں کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

" بلاشبہ اقلیتی گروہوں کے افراد کے لئے مساوات کی بنیاد پر اور کسی امتیاز سے آزاد ماحول میں اپنے بنیادی حقوق سے استفادہ کو یقینی بنانے کی خاطر دستور اور قانونی اقدامات کے بشمول تمام مناسب اقدامات کرنا تمام ریاستوں کا فرض ہے" (584)۔

" اہم ہدایتی اصول یہ ہے کہ صرف اس لئے کہ وہ کسی خاص نسل، مذہبی یا لسانی گروہ کا فرد ہے کسی فرد کو دقت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا، کسی کثیر نسلی، کثیر مذہبی، اور کثیر لسانی ملک میں متعلقہ ریاست کے سیاسی و روحانی اتحاد کو برقرار رکھنے اور معاشرہ کے مختلف حصوں کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کے روابط کو حاصل کرنے کے لئے مساوات اور عدم امتیاز کے اصولوں کی سختی کے ساتھ عمل آوری ناگزیر ہے" (586)۔

" چونکہ کسی اقلیتی گروہ کی ثقافتی شناخت کا تحفظ اس گروہ کی بقا کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے نہ صرف اپنی ثقافت کو فروغ دینے کا حق دساتیر اور قوانین میں تسلیم کیا جائے بلکہ اس حق کو عملی جامہ پہنانے کے متعین اقدامات بھی کئے جائیں" (592)۔

ہندوستان میں بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق:

تنظیم اقوام متحدہ (UNO) کی جنرل اسمبلی نے 18/دسمبر 1992 کو قومی یا نسلی،

مذہبی اور لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے حقوق کے اعلامیہ کو منظوری دی۔

Declaration of the Rights of Persons Belonging to National or Ethnic, Religious and Linguistic Minorities.

یہ اعلامیہ ۹ آرٹیکلس پر مشتمل ہے، اس کے پہلے آرٹیکل میں ان اقلیتوں کی اپنی مخصوص شناخت کے تحفظ اور اس شناخت کے فروغ کے لئے سازگار حالات کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے، دوسرے آرٹیکل میں ان اقلیتوں کے حقوق کو بیان کیا گیا ہے:

۱- ان کو اپنے تمدن پر قائم و برقرار رہنے، اپنے مذہب کے عقائد کو ماننے اور عمل کرنے اور اپنی زبان کو خانگی طور پر اور برسر عام استعمال کرنے کا حق حاصل ہے جس سے آزادانہ طور پر وہ کسی مداخلت اور کسی نوعیت کے امتیاز کے بغیر استفادہ کریں گے۔

۲- ان اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کو تمدنی، مذہبی، معاشرتی، معاشی اور عوامی زندگی میں مؤثر انداز میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

۳- ان اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کو قومی اور علاقائی سطح پر فیصلہ سازی میں مؤثر طور پر حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

۴- ان اشخاص کو اپنی انجمنیں قائم کرنے اور ان کو کارگزار رکھنے کا حق حاصل ہے۔

۵- ان اشخاص کو دوسرے گروہوں کے افراد اور دوسری اقلیتوں کے اشخاص سے بلا کسی امتیاز کے، آزادانہ و پرامن روابط رکھنے اور ساتھ ہی سرحد پار دوسری ریاستوں کے شہریوں سے ربط قائم کرنے اور رکھنے کا حق حاصل ہے جن سے وہ قومی یا نسلی، مذہبی یا لسانی رشتے سے جڑے ہوئے ہوں۔

اس کے بعد کے (5) آرٹیکلس میں ان حقوق کے احترام، ان سے استفادہ اور ان کے فروغ کے لئے ریاست کی ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے، آرٹیکل (4) میں کہا گیا ہے کہ:

۱- ریاست اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے لئے بلا امتیاز اور قانون کے

آگے مکمل مساوات کے ساتھ تمام انسانی حقوق کو اور بنیادی آزادیوں کو یقینی بنانے کے اقدامات کرے گی۔

۲-ریاست ان اشخاص کو اپنی خصوصیات کے اظہار، اپنے تمدن، زبان، مذہب، روایات ورسومات کوفروغ دینے کے لئے سازگار حالات فراہم کرے گی بجز ان مخصوص اعمال کے کہ جوقومی قانون کے خلاف ہوں یا بین الاقوامی معیارات کے برعکس ہوں۔

۳-ریاست جہاں تک ممکن ہو،ان اقلیتوں کے اشخاص کو اپنی مادری زبان سیکھنے یا مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے مناسب مواقع فراہم کرنے کے لئے موزوں اقدامات کرے گی۔

۴-ریاست تعلیم کے میدان میں ایسے اقدامات کرے گی جن سے ملک میں موجود اقلیتوں کی تاریخ،روایات،زبان اور تمدن کے بارے میں علم حاصل کرنے کی ہمت افزائی ہو، ان اشخاص کو پورے معاشرہ کے بارے میں جاننے کے مناسب مواقع بھی فراہم کرے گی اور:

۵-ریاست ایسے موزوں اقدامات پرغور کرے گی جن سے اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص اپنے ملک کی معاشی بہتری اور ترقی میں حصہ لے سکیں گے۔

آرٹیکل(6) میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اقلیتوں کے ان حقوق کا اعلامیہ، ریاستوں کو اقلیتوں کے تعلق سے بین الاقوامی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے نہیں روکتا اور یہ حقوق عالمی منشور حقوق انسانی میں درج حق مساوات کے منافی نہیں ہے، آخری آرٹیکل(9) میں تنظیم اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسیز اور دیگر تنظیمات سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اس اعلامیہ میں درج حقوق اور اصولوں کی عمل آوری میں حصہ ادا کریں۔

اس اعلامیہ میں ایک طرف اقلیتوں کے افراد پر قومی امور وترقیات میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے سازگار ماحول کی فراہمی کی ذمہ داری عائد کی گئی اور دوسری طرف ان کی تہذیب وتمدن،ان کی خصوصیات،ان کے مذہب اور ان کی زبان کے تحفظ کے علاوہ فروغ وترقی

کے لئے مناسب ماحول کی فراہمی بھی ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی؛ کیونکہ عموماً اکثریتی طبقہ کا رجحان اپنی تہذیب وتمدن کو دوسرے طبقات پر مسلط کرنے کا ہوتا ہے اور ریاستیں بھی اکثریتی تہذیب وتمدن کو قومی تہذیب وتمدن قرار دیتی ہیں اور اقلیتوں کو تہذیبی انضمام کا خطرہ لاحق رہتا ہے، ہندو راشٹر کا نظریہ جارحانہ تہذیبی انضمام کا نمائندہ ہے۔

ہندوستان میں بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق

تنظیم اقوام متحدہ کی جانب سے بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیوں نیز اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں منشور، میثاقات اور اتفاقیوں کے جائزے کے بعد ہم اپنے ملک ہندوستان کا جائزہ لیں گے۔ ہندوستان کا دستور اس سلسلہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس دستور کی تدوین کے وقت دنیا کے کئی ممالک کے دساتیر کو سامنے رکھا گیا اور ان میں جو خوبیاں ہیں ان کو چن لیا گیا، دستور ہند کا تیسرا حصہ شہریوں کے بنیادی حقوق کے بارے میں ہے جو (۲۴) آرٹیکلس یا دفعات (دفعہ ۱۲ تا دفعہ ۳۵) پر مشتمل ہے، ان میں سے اہم دفعات کا یہاں تذکرہ کیا جارہا ہے:

دفعہ (۱۴) میں قانون کی نظر میں مساوات کی بات کہی گئی اور دفعہ (۱۵) میں مذہب، نسل، جاتی، جنس یا مقام پیدائش کی بنیاد پر امتیاز کی ممانعت ہے، اس میں خواتین اور بچوں کے لئے اور سماجی وتعلیمی لحاظ سے پس ماندہ طبقات (بیک ورڈ کلاس) اور شیڈیولڈ کاسٹس اور شیڈیولڈ ٹرائبس کی ترقی کے لئے خصوصی قوانین بنانے اور اقدامات کرنے کے لئے استثناء فراہم کیا گیا ہے۔

دفعہ ۱۶ میں عوامی ملازمت یا روزگار کے معاملات میں مواقع کی مساوات کو لازم قرار دیا گیا ہے، اس میں بھی استثناء کی شکل میں ان بیک ورڈ کلاس کے لئے جن کی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہ ہو اور اسی طرح شیڈیولڈ کاسٹس اور شیڈیولڈ ٹرائبس کی ملازمتوں میں ترقی کے لئے تحفظات (RESERVATIONS) کی راہ نکالی گئی ہے۔

دفعہ (۱۷) چھوت چھات کے خاتمہ اور دفعہ (۱۸) خطابات (TITLES) کے طریقہ کو ختم کرنے سے متعلق ہے۔

دفعہ (۱۹) کا عنوان ''آزادیوں کا حق'' ہے اور اس میں ان بنیادی آزادیوں کو بیان کیا گیا ہے جو ''دستور ہند'' ہندوستان کے شہریوں کو عطا کرتا ہے، اور وہ یہ ہیں:

(الف) آزادی اظہار و بیان

(ب) پرامن طریقہ پر اور اسلحہ کے بغیر جمع ہونے کی آزادی

(ج) انجمنیں (ASSOCIATIONS) اور یونین بنانے کی آزادی

(د) سارے ملک میں آزادانہ نقل وحرکت کی آزادی

(ھ) ملک کے کسی بھی حصہ میں بسنے اور رہائش اختیار کرنے کی آزادی

(ز) کسی پیشہ کو اختیار کرنے یا کسی ذریعہ آمدنی، ہنر یا تجارت کو اختیار کرنے کی آزادی، ان آزادیوں کو چند شرائط کا تابع کیا ہے جو معقول اور مناسب ہیں۔

دفعہ (۲۰) میں جرائم پر سزا کے بارے میں اہم اصول بیان کئے گئے ہیں:

(۱) صرف کسی قانون کی خلاف ورزی پر ہی سزا دی جا سکے گی اور قانون میں درج سزا سے زائد سزا نہیں دی جائے گی۔

(۲) کسی جرم کے تعلق سے ایک سے زائد مرتبہ استغاثہ نہیں ہوگا اور ایک سے زائد مرتبہ سزا نہیں دی جائے گی۔

(۳) کسی کو اپنے ہی خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ (۲۱) میں زندگی اور شخصی آزادی کے تحفظ کو بنیادی حق قرار دیا گیا ہے، اس دفعہ کے تعلق سے عدالتی فیصلوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ زندگی کے حق میں عمدہ زندگی (DECENT LIFE)، خلوت (PRIVACY)، اور محنت (WORK) کے حقوق شامل ہیں۔

دفعہ (۲۲) میں گرفتاریوں اور نظر بندیوں (DETENTIONS) کے تعلق سے اصول بیان کئے گئے ہیں، دفعہ (۲۳) میں انسانوں و بھیک منگوں کی تجارت اور منتقلی اور جبری محنت کی ممانعت ہے، اور دفعہ (۲۴) کے ذریعہ بچوں سے فیکٹریز وغیرہ میں سخت محنت کروانے سے منع کیا گیا ہے۔

مذہبی آزادی کے حقوق

دفعہ (۲۵) مذہب وضمیر کی آزادی کے بارے میں ہے، اور یہ آزادی صرف اقلیتوں کے لئے نہیں بلکہ تمام شہریوں کے لئے ہے۔ ہندوستان کے ہر شہری کو ضمیر کی آزادی اور مذہب یعنی مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و پرچار کی آزادی حاصل ہے، یہ آزادی البتہ نظم عامہ، اخلاق، صحت، اور دیگر بنیادی حقوق کے تابع ہے۔ یہ دفعہ ریاست کو کسی مذہبی عمل سے وابستہ کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر سیکولر سرگرمیوں کو منضبط کرنے سے نہیں روکتا اور اس طرح کے موجود قوانین کو متاثر نہیں کرتا، نیز سماجی بھلائی (معاشرتی فلاح SOCIAL WELFARE)، اصلاحات اور عوامی نوعیت کے ہندو مذہبی اداروں کو ہندوؤں کے تمام طبقات کے لئے کھولنے کی غرض سے ریاست کو قانون بنانے کا حق حاصل ہے، اس دفعہ کے ساتھ دو توضیحات منسلک ہیں: ایک یہ کہ کرپان رکھنا سکھ مذہب کے عقیدہ میں شامل ہے اور دوسرے یہ کہ اس دفعہ میں مستعملہ لفظ ہندو میں سکھ، جینی اور بدھ دھرم کو ماننے والے شامل ہیں۔

دفعہ (۲۶) میں نظم عامہ، اخلاق وصحت کے تابع ہر مذہبی فرقہ یا ذیلی فرقہ کو مذہبی امور کی آزادی کی بات کہی گئی ہے کہ وہ:

(الف) مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لئے ادارے قائم کرسکتے ہیں اور چلا سکتے ہیں۔

(ب) مذہبی معاملات میں اپنے امور کا خود انتظام کرسکتے ہیں۔

(ن) منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد حاصل کرسکتے اور اپنی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں۔

(د) ایسی جائیدادوں کا انتظام قانون کے مطابق کر سکتے ہیں۔

دفعہ (۲۷) میں کہا گیا ہے کہ کسی مذہب کے فروغ کے لئے ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ (۲۸) میں کہا گیا ہے کہ ریاست کے زیر انتظام یا ریاست کے فنڈ سے چلنے والے تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی، البتہ اس ممانعت سے ریاست کے زیر انتظام وہ تعلیمی ادارے مستثنیٰ ہیں جنھیں کسی انڈومنٹ یا ٹرسٹ نے قائم کیا تھا اور جن کے قیام کی غرض وغایت میں مذہبی تعلیم داخل ہے۔ اس دفعہ میں یہ شق بھی ہے کہ ریاست کی جانب سے مسلمہ یا ریاست کی جانب سے رقمی امداد پانے والے تعلیمی ادارے میں کسی کو مذہبی تعلیم میں شریک ہونے یا مذہبی عبادت میں حصہ لینے کا پابند نہیں کیا جائے گا بجز اس کے کہ وہ شخص یا اس کا سرپرست اس کے لئے رضامندی دے۔

اقلیتوں کے حقوق

اس کے بعد کی دو دفعات ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے متعلق ہیں، ان میں لفظ اقلیت (مائناریٹی) استعمال ہوا ہے اور عموماً ان کو ہی اقلیتوں کے حقوق کی دفعات سمجھا جاتا ہے جو پوری طرح صحیح نہیں ہے، مذہبی اقلیتوں کے لئے دفعہ ۲۵، ۲۶ اور ۲۸ کی بڑی اہمیت ہے جو تمام شہریوں کے لئے مذہبی آزادی سے متعلق ہیں، اس سے پہلے یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ زندگی کے حق اور مساوات کے حق اور ان دونوں پر مبنی دیگر حقوق بھی اقلیتوں کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے بغیر اقلیتوں کے حقوق کوئی معنی نہیں رکھتے۔

دفعہ (۲۹) میں کسی زبان، رسم خط یا ثقافت کی بنیاد پر اقلیت قرار پانے والے گروہ کو اپنی زبان، رسم خط یا ثقافت کے تحفظ و برقراری کا حق دیا گیا ہے، اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ ریاست کے زیر انتظام یا ریاستی فنڈ سے امداد پانے والے تعلیمی ادارے میں صرف مذہب، نسل، جاتی، زبان کی بنیاد پر داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ (۳۰) میں اقلیتوں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق دیا گیا ہے کہ ہر مذہبی ولسانی اقلیت کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اوران کا انتظام کرنے کا حق ہوگا اور ریاست امداد دینے کے معاملہ میں اقلیت کے زیرانتظام تعلیمی اداروں سے امتیاز نہیں برتے گی۔

دستور ہند کے اس حصہ میں بیان کردہ ان بنیادی حقوق کی اہمیت اتنی ہے کہ اگر ان حقوق کا اخلاف یا ان حقوق پر پابندیاں عائد کی جائیں تو دفعہ 32 کی رو سے سپریم کورٹ سے رجوع ہوکر ان حقوق کی بحالی کے احکامات حاصل کئے جاسکتے ہیں، قانون کے اس جز کو جس میں کسی بنیادی حق کو ختم یا کم یا غیرضروری شرائط کا پابند کیا گیا ہے، سپریم کورٹ بے اثر اور کالعدم قرار دے سکتا ہے، اس نوعیت کے کسی بھی حکمنامہ کو بے اثر اور مسترد کر سکتا ہے، دستور ہند کی دفعہ (۲۲۶) کے ذریعہ بنیادی حقوق کے تعلق سے ایسے ہی اختیارات ملک کے تمام ہائی کورٹس کو دیے گئے ہیں۔

جہاں تک آئین وقوانین کا تعلق ہے، بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کو وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جنھیں عالمی سطح پر اور بین الاقوامی اداروں کی جانب سے مہذب معاشرہ کے لئے اور اقلیتوں کو اپنی انفرادیت اور خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کی حقیقی صورتحال

ہندوستان کے دستور کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کو وہ سب کچھ حاصل ہیں جن کی وہ توقع کرسکتے ہیں اور جن پر بین الاقوامی اعلانات میں زور دیا گیا ہے مگر جب زمینی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی ہے، پہلے ہم ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا جائزہ لیں گے۔

ہندوستان میں آزادی کا سورج مسلمانوں کے خون کی سرخی میں طلوع ہوا، دارالحکومت دہلی میں مسلمانوں پر حملے ہوتے رہے ان کو قتل کیا جاتا رہا مگر حکومت اوراس کے ذمہ

داروں میں سے کسی نے اس کو فوری روکنے اور قاتلوں اور غارت گروں کو قانون کی گرفت میں لانے کی کوشش نہیں کی، دہلی کی کہانی ملک کے کئی علاقوں اور مقامات پر دہرائی گئی، سوچا گیا کہ ملک کی تقسیم کے ذریعہ پاکستان بنانے کا ردعمل ہے جس کے لئے ہندو، مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھتے ہیں اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے، تقسیم کا زخم مندمل ہوگا اور مسلمانوں کو امن وچین نصیب ہوگا۔ ۱۳ سال بعد ہوئے جبلپور کے خوں ریز بھیانک فسادات نے اس سوچ کے کھوکھلے پن کو ظاہر کردیا، مسلم کش فسادات کا حال یہ ہے کہ کسی نے بڑا صحیح ریمارک کیا کہ ہم ہندوستان کے جغرافیہ سے فسادات کے ذریعہ واقف ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کون سا مقام اور کون سا شہر کہاں ہے، ہر مسلم کش فساد کے بعد اس کے اسباب وعلل پر لکھا اور کہا جاتا ہے، بڑے فسادات کے سلسلہ میں تحقیقاتی کمیشنوں کے ذریعہ چھان بین بھی کروائی گئی۔ ان کمیشنوں نے اپنی رپورٹس بھی حکومتوں کے حوالے کیں، ان سب کے باوجود مسلم کشی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، آج بھی معمولی معمولی باتوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات پر مسلمانوں کا خون بہایا جاتا ہے، ان کی دوکانیں نذر آتش کردی جاتی ہیں، ان کے مکانات اور ان کی املاک کو مسمار کیا جاتا ہے۔

فسادات کے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خوں ریز اور تباہ کن گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فسادات ہیں، جن کو مسلمانوں کی نسل کشی کہا جانا چاہیے، گجرات کی اس مسلم نسل کشی میں ریاستی حکومت، ریاستی انتظامیہ اور بالخصوص پولیس کا رول انتہائی قابل اعتراض رہا، یہ ریاستی ادارے مسلمانوں کی نسل کشی اور قتل عام میں ملوث رہے، ریاستی حکومت سے تو کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ اس کے ہاتھ مسلمانوں کے خون میں رنگے ہوئے تھے، اس وقت کی مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھی مگر این۔ڈی۔اے کی حکومت نے کچھ نہیں کیا، اس کے بعد برسر اقتدار آئی یو۔پی۔اے کی حکومت نے بھی چپ سادھ رکھی، اب کچھ عرصہ سے سپریم کورٹ کے احکامات کی وجہ سے یہ امید بندھ رہی ہے کہ گجرات کے قاتلوں اور غارت گروں کے چہرے بے نقاب

ہوں گے، گجرات کی یہ مسلم کشی ہر پہلو سے نسل کشی (GENOCIDE) ہے جس کو بین الاقوامی قانون سنگین جرم قرار دیتا ہے، اور اس میں ملوث مجرم چاہے دستوری حکمران اور سرکاری عہدیدار ہی کیوں نہ ہوں، ان کو سزا دینے کی ذمہ داری ریاست پر عائد کرتا ہے، گجرات کی اس مسلم کشی کو نسل کش قرار دے کر ریاستی حکومت کو برخاست کرنے اور اس کے ذمہ داروں کو قانون کی گرفت میں لاکر سزا دلانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ان اقدامات کے لئے جس سیاسی قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ یو۔پی۔اے۔کی اس حکومت میں بھی نظر نہیں آئی جو ۲۰۰۴ء کے الیکشن کے بعد برسراقتدار آئی۔

مسلم کش فسادات کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر طوالت کے خوف سے کئی پہلوؤں کو چھوڑتے ہوئے چند اہم پہلو پر اکتفا کروں گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فساد سے پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی جاتی ہے، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ، افواہوں اور جھوٹے الزامات کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف ہندو برادران وطن کو مشتعل کیا جاتا ہے، اور ایسی فرقہ وارانہ کشیدہ فضا میں ایک بہت ہی معمولی سا واقعہ فسادات کی آگ بھڑکا دیتا ہے، فسادات کے انسداد کے لئے ضروری ہے کہ ایسی تحریروں اور تقریروں اور افواہ بازیوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، قانون تعزیرات ہند (INDIAN PENAL CODE) میں ان کو جرم قرار دیا گیا ہے اور اس میں ملوث افراد کو سزا دلائی جاسکتی ہے، مگر ریاستی حکومتیں، عہدیدار اور پولیس آنکھیں بند کئے رہتے ہیں، اور آج تک ایسے نافرض شناس عہدیداروں کے خلاف کسی حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ آر۔ایس۔ایس اور اس کی محاذی تنظیمیں اور ادارے ہندو راشٹر کے نظریے کے تحت مسلمانوں کے خلاف مسلسل نفرت پھیلاتے ہیں، یہ کہہ کر کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے، مسلمان یا تو ہندو دھرم قبول کریں یا پھر ملک چھوڑ کر چلے جائیں، کسی غیر ہندو کو ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، مسلمانوں کے خلاف عدم رواداری کی فضا پیدا کرتے

ہیں، راوڑکیلا کے فسادات کی چھان بین کے بعد گاندھی پیس فاونڈیشن نے، بھیونڈی، جلگاؤں اور مہاڈ کے فسادات کی تحقیقات کے بعد جسٹس ڈی ۔ پی ۔ مادن نے اور کئی فسادات کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹس میں آر۔ایس ۔ایس سیوک سنگھیوں کی بنائی گئیں مقامی تنظیموں اور ان کی مخالف مسلم اشتعال انگیزیوں کو ذمہ دار قرار دیا، مگر آر۔ایس ۔ایس یا اس کے مخالف مسلم نظریات کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دینے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اگر پولیس فرض شناس ہو، فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا نہ ہونے دے تو مسلم کشی کے واقعات رونما نہیں ہو سکتے ہیں، مگر ہر فساد میں دیکھا گیا کہ پولیس نہ صرف فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے والوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتی ہیں بلکہ فساد پھوٹ پڑنے کے بعد فسادیوں کو کھلی چھوٹ فراہم کرتی ہے بلکہ خود مسلمانوں کے قتل اور ان کی املاک کی تباہی میں شریک ہو جاتی ہے، کئی تحقیقاتی کمیشن نے جن میں ممبئی میں ۱۹۹۳ء میں ہوئے فسادات کی تحقیقات کرنے والا جسٹس بی ۔ سری کرشنا کمیشن بھی شامل ہے، ایسے پولیس عہدیداروں کی نشاندہی کی جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے، ان پولیس آفیسرس کے خلاف ایسی سخت کارروائی ضروری ہے جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں، عموماً ان کے خلاف کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں کی گئی، اور اگر کی گئی تو تنخواہ کے ایک تدریجی اضافہ کو روکنے یا سینیریٹی کی فہرست میں نام کو نیچے کرنے کی حد تک، ایسی کارروائیاں دوسروں کے لئے عبرت کا سامان قطعاً فراہم نہیں کر سکتیں، پولیس اور انٹلی جینس میں ایسے عہدیداروں کی کمی نہیں ہے جو ذہنی طور پر ہندو راشٹر کے نظریے سے وابستہ ہیں، اس لئے خاطی پولیس ملازمین کو عبرتناک سزائیں دینے کے ساتھ پولیس اور عہدیداران پولیس کی وقفہ وقفہ سے ذہنی تربیت ضروری ہے اور ''دستور'' ہندوستانی قومیت کے جس تمدنی تعدد کے نظریے کو پیش کرتا ہے اس کو ان کے ذہن میں اتارنا ضروری ہے۔

عدم رواداری، تنگ نظری، مذہب، زبان یا علاقہ کی بنیاد پر دوسرے شہریوں کے

خلاف نفرت پیدا کرنے والی پارٹیز بڑے منظم طریقہ پر عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، سیکولرزم کی دعویدار سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عوام کے ذہن وفکر کو اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کریں، گجرات کی مسلم نسل کشی کے واقعات اتنے دردناک ہیں کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی اپنے دل میں درد محسوس کرتا ہے، مگر کسی سیکولرزم کی دعویدار سیاسی پارٹی نے گجرات کے عوام میں جا کر ان کے انسانیت کے جذبات کو ابھارنے اور ہندوستانی قومیت کی حقیقی تصور کو پیش کرنے اور فرقہ وارانہ قتل وغارت گری سے ملک کے کمزور ہونے کو پیش نہیں کیا، نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے عوام میں اپنے کیئے پر ندامت کا احساس پیدا نہیں ہوا، اس کے برخلاف کئی طبقات میں اپنی درندگی پر فخر کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سامپردائکتا وِرودھی سمیتی نامی تنظیم کو مسز سبھدرا جوشی نے آگے بڑھایا تھا جس نے ہندوراشٹر کے فسطائی نظریے کے خلاف کئی کتابچے شائع کئے، اخبارات میں مضامین چھپوائے، ملک کے مختلف مقامات پر مباحثوں، تقاریر اور سمینارس کا انتظام کیا جس کی وجہ سے ہندوتوا کی فسطائیت کے خلاف ذہن بننے لگا، آج ایسی کوششوں کی زیادہ ضرورت ہے، مگر سیکولرزم کی دعویدار پارٹیز الیکشن کے موسم میں ہی سرگرم ہوتی ہیں، جبکہ ان کو عوام کے ذہن وفکر کو بنانے کے لئے ہر وقت میدان میں رہنا چاہیئے اور جارحانہ فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو خبردار کرنا اور ان میں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا عزم اور ارادہ پیدا کرنا چاہیئے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ملک میں صرف مسلمانوں ہی کی جان ومال کی آزمائش ہوتی ہے، دوسری اقلیتوں کو کوئی نہیں چھیڑتا، لیکن اس کی تردید دہلی میں سکھ بھائیوں کے قتل عام سے اور اڑیسہ وکرناٹک میں عیسائیوں پر خون آشام حملوں سے ہوگئی، ان واقعات کے بعد سکھ برادری بھی اور عیسائی اقلیت بھی یہ محسوس کرنے لگی کہ صرف مسلمانوں ہی پر قاتلانہ اور غارت گرانہ حملوں کا خطرہ نہیں منڈلاتا ہے اب وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کی اکثریتی

جارحانہ فرقہ پرستی ان کے وجود کو بھی چیلنج کرنے لگی ہے، بہر حال جب اولین بنیادی حق یعنی جان ومال وآبرو کے حق کی بات آتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں کے اس اہم اور بنیادی حق کو پامال کیا جاتا رہا۔

مسلم اقلیت کے تعلق سے ایک اور مسئلہ کو میں یہاں پیش کرنا چاہوں گا، وہ ہے بابری مسجد کا مسئلہ۔ اس مسئلہ کے تعلق سے یہ قطعاً نہ سمجھا جائے کہ صرف یہ ایک مسجد کا مسئلہ ہے، یہ دراصل مسلمانوں کی تمام مساجد اور دیگر اقلیتوں کی تمام عبادت گاہوں کا مسئلہ ہے، آر۔ایس۔ایس ودیگر ہندو راشٹر وادی اس بنیاد پر بابری مسجد کو شری رام کی جائے پیدائش بتارہے ہیں کہ ان کے بقول شری رام کی مورتی نے اس جگہ سے برآمد ہوکر اپنی جائے پیدائش کی نشاندہی کردی، ہندو برادران وطن کے کروڑوں دیوی دیوتاؤں میں ہر ایک اسی طرح اپنی جنم بھومی کو بتانے لگے تو پھر کونسی مسجد، کونسا گرودوارہ اور کونسی چرچ بچ سکے گی، زمین سے مورتی برآمد کرنا، صحیح الفاظ میں وہاں لے جاکر رکھنا اور برآمد ہونے کا اعلان کرنا کوئی دشوار اور ناممکن کام نہیں ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندو راشٹر وادی حکمت عملی یہ ہے کہ اقلیتوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص خوف کا احساس گہرا کیا جائے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اگر ہم اپنے مذہب سے وابستہ رہتے ہیں تو اس ملک میں نہ ان کی جان سلامت رہے گی اور نہ ان کا مال محفوظ رہے گا، اور جیسے جیسے یہ احساس گہرا ہوتا جائے گا ان کا ذہن اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو دھرم کو قبول کرنے پر مائل ہوتا جائے گا، یہ ہندو راشٹر وادی اب اس خوف میں ایک اور خوف کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہیں گی، جس وقت اور جب چاہیں تمہاری عبادتگاہوں کو مسمار کیا جاسکتا ہے، پولیس اور حکومت بھی رکاوٹ نہیں بنے گی، اگر تم اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت چاہتے ہو تو اس کی بھیک ہم سے مانگو ہم چند عبادت گاہیں تم سے لے کر چند تمہارے لئے چھوڑ سکتے ہیں، یہ ہے مسلمانوں کے اندر خوف کو گہرا اور خوف میں اضافہ کرنے کی اسٹریٹجی، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم ہندو راشٹر وادیوں سے دوٹوک انداز میں کہنا چاہتے ہیں، انھوں نے

مسلمانوں کی نفسیات کو نہیں سمجھا ہے، ان پر مصیبت آتی ہے تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے، یہ مصائب سے ڈر کر اور جان و مال کے نقصان سے گھبرا کر اپنے دین اور اپنے ایمان سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں، بلکہ ان واقعات نے ان میں اپنے دین وایمان پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ارادے اور عزم کو بڑھا دیا ہے، اے ہندو راشٹر وادیو! تم نے ملک میں سینکڑوں قتل وغارت گری کے ہنگامے برپا کئے اور ان میں ایک بھی بدبخت مسلمان ایسا نہیں نکلا جو یہ کہے کہ مجھ پر خنجر نہ چلاؤ، میرے گھر کو نہ جلاؤ، میری دوکان کو نہ لوٹو، میں اپنے دین وایمان کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں، مسلمان نیک عمل کے اس معیار پر جو اسلام پیش کرتا ہے نہ اترتا ہو، مگر جہاں تک اس کے دل کے اندر ایمان کا تعلق ہے تو ایک مومن کے اندر اس کی مضبوطی اور استقامت موجود ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ حکومت کی ناکامی کی داستان ہے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ایودھیا، شری رام چندر جی کی افسانوی ایودھیا نگری نہیں ہے، اور یہ کہ بابری مسجد، ایسی جگہ پر جہاں کوئی مندر واقع نہیں تھا، بابر نے نہیں بلکہ بابر کے مقرر کردہ عامل میر باقی تاشقندی نے بنائی، ان تاریخی حقائق کے برعکس کئی جھوٹی کہانیاں گھڑی گئیں اور ان کا زبردست پرچار کیا گیا اور ایسی افواہوں کے ذریعہ بابری مسجد اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی گئی، نفرت انگیز افواہوں کا پھیلانا قانونی تعزیرات ہند کے تحت جرم ہے، مگر ارباب حکومت نے نفرت کے ان بیوپاریوں کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں کی۔

بابری مسجد کے معاملے میں شری لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا سے لے کر اس تاریخی مسجد کی عمارت کے انہدام تک اور انہدام سے لے کر آج تک مسلمانوں کو بجا طور پر اتنی شکایتیں ہیں کہ ان کے بیان سے یہ مضمون طویل اور منہ کا مزہ خراب ہو جائے گا، مسجد کے انہدام کی تحقیقات کے لئے تشکیل دیے گئے کمیشن نے ۱۷ سال بعد ۳۰/ جون ۲۰۰۹ء کو رپورٹ پیش کی ہے، انہدام کے ملزمین کے خلاف فوجداری کارروائی ایک عدالت میں معرض التوا میں ہے، کب شروع ہو سکے گی کہا نہیں جا سکتا، دوسری عدالت میں بڑی سست رفتاری سے کچھ عرصہ پہلے شروع

ہوئی ہے، بہر حال اس مسئلہ میں حکومت کے طرز عمل کی وجہ سے ہندوستانی جمہوریت پر سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، جمہوریت نام ہے قانون کی عمل داری اور حکمرانی کا اور یہ اصول مسلسل پامال ہوتا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے ایک اور مسئلہ کا ذکر میں یہاں کرنا چاہوں گا، مسلم پرسنل لا یعنی مسلم فیملی لا مسلمانوں کے دین اور ایمان کا جز ہے، اس حقیقت کو سمجھنے میں برادران وطن کو دشواری محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ ہندو برادران وطن کے پاس ان معاملات میں ان کے دھارمک قانون کی اہمیت بس اتنی ہے کہ اگر ان کے علاقے میں یا ان کے کسی طبقہ میں کوئی رواج ہے جو قانون کے مطابق نہیں ہے تو برتری رواج کو حاصل ہوگی اور دھارمک قانون پس پشت ڈال دیا جائے گا۔

عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ تو لا آف دی لینڈ (LAW OF THE LAND) کا قائل ہو گیا ہے، اس لئے ان کے پاس مذہبی قانون کی خاص اہمیت نہیں ہے، برادران وطن مسلمانوں کی اپنے پرسنل لا سے وابستگی کے جذبہ کو سمجھیں یا نہ سمجھیں، انہیں اور ملک کو اتنی بات تو سمجھ لینا چاہئے کہ جب دستور کی دفعہ (۲۵) میں عقیدہ کے مطابق عمل کی آزادی کو بنیادی حق تسلیم کر لیا گیا ہے اور مسلمان اپنے پرسنل لا کو مذہب وعقیدہ کا اہم حصہ سمجھتے ہیں تو ان کو یہ حق دیا جانا چاہئے۔ دفعہ (۲۹) میں اقلیتوں کو اپنے کلچر کے تحفظ اور اس کی برقراری وفروغ کا حق دیا گیا ہے، اور اس حق کی رو سے بھی مسلمانوں کے مسلم پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہئے۔

مسلمانوں کے حقوق اور ان کے مسائل کے اور بھی کئی پہلو ہیں، اردو بہر حال اب مسلمانوں کی زبان اور ان کا کلچر بن گئی ہے، اور اس زبان کے تعلق سے جو رویہ حکومتوں کا رہا ہے اس کے لئے حق تلفی اور ظلم کے الفاظ بھی ہلکے معلوم ہوتے ہیں، مسلمانوں کی عوامی خدمات اور سرکاری ملازمتوں میں نمائندگی کی بات آتی ہے تو انگریزی کا یہ محاورہ منطبق ہوتا ہے کہ مسلمان (LAST TO BE HIRED, FIRST TO BE FIRED) شہری ہے۔ جسٹس راجندر

سچر کمیٹی کی رپورٹ سے کئی حقیقتیں سامنے آئی ہیں، ریزرویشن کی بات نکلتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ دستور میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ دستور کی تدوین کے وقت دستور ساز اسمبلی میں سکھوں کے نمائندہ سردار اجل سنگھ نے اقلیتوں کے لئے ریزرویشن کی تجویز پیش کی تھی جس کو منظور کرلیا گیا، مگر بعد میں لفظ ''مائنارٹیز'' کو بیک ورڈ کلاس سے بدل دیا گیا، اور اس دفعہ کی دستور ساز اسمبلی میں یہ وضاحت کی گئی کہ لفظ کی اس تبدیلی سے اقلیتیں ریزرویشن کے حق سے محروم نہیں ہوں گی، آج ریزرویش کی اس تاریخ کو بالکل فراموش کردیا گیا ہے، آجکل مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو دہشت گرد قرار دے کر مصائب میں مبتلا کرنے اور ان کے خلاف ہندو برادران وطن میں نفرت کو ابھارنے کی سازش کارفرما ہے، کہیں کوئی دھماکہ ہوتا ہے یا پٹاخہ پھٹتا ہے تو فوراً ہی مسلمانوں کی طرف انگلی اٹھادی جاتی ہے جس کے بعد ان کی بے تحاشا گرفتاریوں اور ان کو ٹارچر کرنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، ان گرفتاریوں سے پہلے کسی نوعیت کی شہادت پولیس کے پاس نہیں ہوتی اور سپریم کورٹ نے گرفتاریوں کے لئے جو اصول وضوابط بنائے ہیں ان کو نظر انداز کردیا جاتا ہے، اور اس طرح کا دردناک ٹارچر کیا جاتا ہے کہ اس کے بیان ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، دہشت گردی کے جھوٹے الزام کے تحت مسلمانوں کی دارو گیر پر پوری کتاب مرتب ہوسکتی ہے، اس لئے میں اس مختصر تبصرہ پر اکتفا کرتا ہوں، یہ بھی یاد رہے کہ بین الاقوامی میثاقات کے تحت ٹارچر ممنوع ہے۔

الحاصل یہ کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو دستوری اور قانونی اعتبار سے وہ حقوق حاصل ہیں جو ان کی باعزت، پروقار اور عمدہ زندگی کی ضمانت دیتے ہیں، لیکن ان حقوق کی عملی صورت گری کے لئے رواداری، بقائے باہم اور عدل وانصاف کا ماحول نہیں بنایا گیا جس کے نتیجہ میں اقلیتیں اور بالخصوص مسلم اقلیت، خوف کے سایہ میں زندگی گزار رہی ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں اقلیتی حقوق کے بارے میں احکام اور عمل اسلامی اور مغربی روایات-ایک تقابلی تناظر

عبدالرحیم پی. بیجاپور☆

۱-تعارف: اقلیتی حقوق کی اہمیت:

بطروس غالی سابق سکریٹری جنرل اقوام متحدہ نے اپنے ایک پُر مغز مقالہ بعنوان ''امن کے لئے ایک ایجنڈا'' (۱۹۹۲ء) میں لکھتے ہیں: ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد سے تقریباً ۱۰۰ بڑے ممالک میں ۲ کروڑ (۲۰ ملین) کے لگ بھگ لوگ مر چکے ہیں، نئی نسل میں کشیدگیاں بڑھ رہی ہیں اور تشدد کی شکل میں ان کا اظہار ہوتا ہے اگر چہ نیشنلزم اور خودمختاری کے اظہار کا جذبہ شدت سے ابھرا ہے اور نسلی، مذہبی، سماجی، ثقافتی اور لسانی تنازعات کے وحشیانہ پھیلاؤ سے ممالک کے درمیان روابط خطرے میں پڑ گئے ہیں، اقوام متحدہ میں جمہوریت، انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے احترام کا تقاضا کرتی ہے، اسی طرح یہ وسیع مفاہمت، اقلیتوں کے حقوق کے احترام اور معاشرہ کے کمزور افراد خصوصاً عورتوں اور بچوں کے زیادہ احترام کی متقاضی بھی ہے، ان الفاظ میں بطروس غالی نے اقلیتوں سے متعلق پیش آنے والے تنازعات کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ بات بھی کہہ سکتے تھے کہ آج مقامی اور علاقائی طور پر جو تنازعات ابھر رہے ہیں جو یوگوسلاویا سے انگولہ تک پھیلے ہوئے ہیں اور اندرونی نوعیت کے جھگڑے ہیں ان سے امن کو سب

☆ پروفیسر پولٹیکل سائنس علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سے زیادہ خطرہ ہے جبکہ مضبوط جمہوری ملکوں یعنی ہندوستان سے لے کر برطانیہ تک ہر جگہ فرقہ وارانہ تشدد کو بآسانی بھڑکایا جاسکتا ہے۔

آج دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی نوعیت کی اقلیتیں موجود نہ ہوں، اس وقت دنیا میں ۳۰۰۰ کے قریب ایسے قبائلی یا نسلی گروپ ہیں جو اپنے حقوق اور اپنی شناخت کے بارے میں بے حد حساس ہیں، ۱۹۲ سے زیادہ سیاسی طور پر آزاد و مختار ممالک اس وقت موجود ہیں، ان میں سے ۱۷۵ ایسے ہیں جو اپنی آبادی کے لحاظ سے کثیر تہذیبی ممالک کہے جاسکتے ہیں۔ٹی آر گرکا پروجیکٹ ''اقلیتیں خطرے میں'' ۲۳۳ کے تحت مختلف غیر مراعات یافتہ اقلیتوں کے بارے میں اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں اگرچہ مختلف ممالک میں صورت حال مختلف ہے؛ تاہم دنیا کے ہر ملک میں یہ گروپ پائے جاتے ہیں اور ہر جگہ ان کی تعداد اور حیثیت میں فرق ہے۔

ماضی اور عصر حاضر میں ہر جگہ نسلی گروپوں میں کشمکش کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض نسلی گروپوں کو ان کے ملک میں سیاسی اقتدار میں حصہ لینے اور فیصلہ کرنے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے، جب تک سیاسی اقتدار میں انہیں شریک نہ کیا جائے اور ان اقلیتوں کو تحفظ اور عزت کا مقام نہ عطا کیا جائے اس وقت تک امن و امان قائم ہونا ممکن نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ بین المذہبی طور پر اکثر تنازعات احساس برتری یا کمزوری کے سبب ہوتے ہیں؛ کیونکہ یہ لوگ اپنے عقیدے کی برتری کے بارے میں پرشور دعوے کرتے ہیں، بہتر ہو کہ اس سلسلے میں ہم شہنشاہ اشوک کے سنگی ستونوں پر کندہ عبارت کا حوالہ دیں۔گاندھی جی نے ایک بار کہا تھا: کسی ملک کی تہذیب کو اس بات سے جانچا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی اقلیتوں سے کیسا سلوک کرتی ہے، اس قسم کے سلوک سے اس ملک کے تحمل اور ذہنی بلوغت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقلیتوں سے برتاؤ اس وقت بھی اور آج بھی ایک عالمی تنازعہ اور جنگ و جدال کا سبب بنتا رہا ہے، آج دنیا کے مختلف ممالک میں اکثریت کے ذریعہ اقلیتوں پر جبر و

استبداد بے اطمینانی اور کشمکش کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۲- ہندوستانی (ہندو) روایات:

یہاں ہمیں بھاگوت گیتا اور اپنشد میں بیان کئے گئے کچھ آفاقی اصولوں کی یاد آتی ہے جو انسانی حقوق کی قدروں کو اجاگر کرتے ہیں، ہندو مذہب کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر شئ میں اس کا جلوہ ہے، اس طرح ہندو ازم کی تعلیم کے مطابق روح (برہمن) انسان میں ظاہر ہوتی ہے، در حقیقت یہ ہر شئ میں سرایت کئے ہوئے ہے جیسا کہ ایسا اپنشد کی پہلی ہی آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا ہر اس شئ میں ہے جو اس کائنات میں حرکت کرتی ہے۔

خدا کے حاضر و ناظر ہونے اور ہر جگہ موجود ہونے کے اس بنیادی عقیدے کی ہماری اس بحث میں اہمیت ہے؛ کیونکہ یہ حقوق انسانی سے مربوط ہے۔ ہندو ازم بنیادی طور پر عالمی اخوت انسانی کا عقیدہ رکھتا ہے کیونکہ خدا ہر شئ میں سرایت کئے ہوئے ہے اس لئے سب برابر ہیں، اس کثرت میں وحدت کا پہلو نمایاں ہے، بھاگوت گیتا نے اسے یوں بیان کیا ہے:

ایک سنت وہ ہے جو
تمام فانی جسم میں ایک لافانی اور غیر تغیر پذیر کو دیکھتا ہے
اور اس بات کا ادراک کرتا ہے کہ وہی لافانی ذات یکساں طور پر ہر جگہ موجود ہے
اسے نجات حاصل ہوتی ہے
وہ دوسروں کو مارتا نہیں
کیونکہ ایسے عمل سے خود موت اس پر واقع ہو جاتی ہے
وہ حرکت کرتا ہے پھر بھی غیر متحرک ہوتا ہے
وہ دور بھی ہوتا ہے اور نزدیک بھی

وہ ہر شئ میں ہے اور ہر اس چیز میں جو اس کائنات میں ہے اس کا عکس ہے

وہ اس اعلیٰ اور برتر ذات کا مشاہدہ کرتا ہے جو ہر مخلوق کا آغاز و انجام ہے

اور ہر شئ اس کا مظہر ہے

اسی لئے کسی کو کسی سے نفرت نہیں کرنی چاہئے

ہندو مذہب کی ابتدائی تعلیمات جو ہندو معاشرہ میں ذات پات کی ترویج سے قبل کی ہیں، اس پر ان میں زور دیا گیا ہے کہ انسان کا مقصد یہ ہے کہ ہر شئ میں اس لافانی ذات کا ادراک کرے۔ اس سے وحدت ادیان کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے، اس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو کسی شخص سے نفرت نہیں کرنی چاہئے؛ بلکہ خدا کی مخلوق سے محبت اور خدمت ہی وہ راستہ ہے جسے اختیار کرکے کوئی شخص ذات حق سے واصل ہوسکتا ہے، مشہور ہندو کہاوت ''واسودیوا کوٹومبا کم'' (تمام انسان ایک کنبہ ہیں) سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

ہندو مذہب کا دوسرا نظریہ وحدت ادیان ہے؛ اسی لئے وہ اختلافات کو خوشگوار انداز میں برداشت کرنے کی تلقین کرتا ہے، بھاگوت گیتا میں اسے وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

جو بھی میری طرف آتا ہے۔ جس قدر بھی آتے ہیں۔

میں سب کو قبول کرتا ہوں۔ وہ تمام راستے انسان جن پر چلتا ہے مجھ تک ہی پہنچتے ہیں

گیتا کے مندرجہ ذیل اشلوک میں جو کچھ کہا گیا ہے انسانی حقوق، انسانی وقار، اخوت کے لئے اس سے بہتر طریقہ اظہار کیا ہوسکتا ہے:

میں ہر ایک کے لئے یکساں اور غیر جانبدار طریقہ سے اس کے ساتھ ہوں

میں کسی سے نفرت نہیں کرتا نہ کسی دوسرے سے زیادہ محبت کرتا ہوں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ویدک عہد میں انسانوں کو یکساں سمجھا جاتا تھا کوئی برتر اور کم تر نہیں تھا، اسے لمیکی اور ویاس کی مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے، یہ دونوں مہابھارت کے

مصنف ہیں، انہیں ملک کا سب سے بڑا شاعر فلسفی اور مصنف سمجھا جاتا ہے، انہیں آج بھی سماج کے ہر طبقہ میں احترام وعقیدت سے یاد کیا جاتا ہے، جب ہندوستان میں ذات پات کا نظام فروغ پذیر ہوا اور اس میں شدت پیدا ہوئی تو انسانی مساوات کی سابقہ قدریں اور عالمی انسانی اخوت کے مثالی نظریات طاق نسیاں میں رکھ دیئے گئے، چھوا چھوت کے نظریہ کے پھیلاؤ نے حقوق انسانی کے نظریہ کو بے حد نقصان پہنچایا۔

اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ ہندوستان کے دو عظیم شہنشاہوں اشوک اور اکبر نے اپنی سلطنت کی مستحکم بنیاد مذہبی رواداری اور ہر قسم کے معاشرتی امتیاز کو مسترد کر کے رکھی، اشوک کے سنگی کتبوں نے انسانی حقوق کے پاکیزہ اصولوں کو متعارف کرایا، یہاں ہم اشوک کے ستون نمبر ۱۲ کے کتبہ کو نقل کر رہے ہیں:

''تمام مذاہب احترام کے مستحق ہیں، جو شخص دوسروں کے مذہب کا احترام کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے مذہب کے احترام کو یقینی بناتا ہے، جو شخص ایسا نہیں کرتا ہے وہ خود اپنے مذہب کی بے حرمتی کرتا ہے اور دوسروں کے مذہب کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے مذہب کی مدح سرائی کرتا ہے لیکن دوسروں کے مذہب کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور اس طرح وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مذہب سے الفت اور گہری وابستگی اور عظمت ظاہر کرنا چاہتا ہے تو درحقیقت وہ اپنے مذہب کو شدید نقصان پہنچاتا ہے''۔

مشہور مورخ ایچ جی ویلز اس کے بارے میں لکھتا ہے:

ان ہزارہا شہنشاہوں کی بھیڑ میں جن کی عظمت وجلالت اور شان وشوکت سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں، صرف اشوک کا نام ہی ایسا ہے جو ہر دور میں تابندہ ودرخشاں رہا ہے، وولگا سے لے کر جاپان تک ہر جگہ اس کے نام کا احترام ہے، چین، تبت اور ہندوستان میں بھی جہاں اس کے نظریات کو چھوڑ دیا گیا ہے اس کی عظمت کی روایتوں کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں،

آج بھی لوگ اس کے نام کو قسطنطین اور شار لیمان سے زیادہ عزت واحترام سے لیتے ہیں۔

بات پوری طرح واضح ہے کہ ہندو تہذیب کا ایک ایسا ترقی یافتہ نظام تھا جس میں انسانی حقوق کا پورا احترام کیا جاتا تھا (اس میں اقلیتوں کے حقوق بھی شامل تھے) یہ حقوق انفرادی احترام و وقار کے لئے بے حد ضروری خیال کئے جاتے تھے۔

اکبر اور دیگر مسلم سلاطین نے بھی مذہبی رواداری کے ان ہی اصولوں کو اپنایا، عہد وسطی میں مسلم حکمرانوں کا دور ہندو اکثریت اور حکمراں مسلم اقلیت کے درمیان معاشرتی و ثقافتی روابط کے فروغ کا باعث ہوا، ہندوؤں کو مذہب اور عقیدے کی آزادی عطا کی گئی، مسلم حکمرانوں کی عمومی پالیسی رواداری تھی، وہ مذہبی رواداری اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے تھے، ایک نامور مورخ پروفیسر ایس آر شرما مسلم حکمرانوں کی مذہبی پالیسی کے بارے میں لکھتے ہیں:
اس دور میں ہندوستان کے ہندوؤں کی حالت یوروپ کے اکثر طبقات سے بہتر تھی جہاں عہد وسطی میں ان قبیلوں کا مذہب حکمرانوں سے مختلف تھا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہجری کلنڈر کے ایک ہزار سال پورے ہونے پر (جو ۹۲-۱۵۹۱ء) میں واقع ہوا اکبر نے متعدد قوانین نافذ کئے، ان میں سے بعض مذہبی رواداری کے بارے میں تھے مثلاً کسی شخص کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کی جائے گی، وہ جس مذہب یا عقیدہ کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

اگر کسی ہندو کو اس کے بچپن میں اس کی مرضی کے بغیر مسلمان بنالیا گیا تھا تو بالغ ہونے کے بعد اگر وہ چاہے تو اپنے مذہب میں واپس جا سکتا ہے۔

صوفی شہزادہ داراشکوہ نے اپنشد کا ترجمہ کیا اور اسے الہامی کتاب بتایا جس کا قرآن عظیم میں حوالہ دیا گیا ہے؛ اگرچہ قرآن عظیم میں صرف توراۃ وانجیل کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے تاہم قرآن کہتا ہے کہ ہر دور میں رسول اور صحیفے ہر قوم میں بھیجے گئے۔

اس پس منظر میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سی ایچ الیگزنڈر وچ نے اس پر مثالی

اعتراض کیا ہے کہ عالمی انسانی حقوق کا موجودہ نظریہ مغرب کا عطا کردہ ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ ایشیائی تہذیب تھی جس نے بین الاقوامی قوانین کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کیا، پھر یہ ممالک استعماری طاقتوں کے غلام بن گئے۔ مثال کے طور پر سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی کے دوران ہندوستان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بقاء باہم کا منظر دیکھا اور اس سے سبق حاصل کیا (خصوصاً ہندوستان کے مغربی ساحل پر) اور مشرق سے حاصل کئے ہوئے اس درس کو وہ مغرب میں لے گئے اور وہاں اس پودے کی آبیاری کی جبکہ وہاں اس وقت یہ نظریہ مذہبی جنگوں سے پامال ہو رہا تھا اور بارآوری کی توانائی سے محروم تھا۔

۳- اسلامی روایات:

اسلام میں انسانی حقوق کا ایک وسیع مفہوم ہے، کچھ فرق کے ساتھ اسلام وہ تمام انسانی حقوق عطا کرتا ہے جو عالمی منشور میں بیان کئے گئے ہیں، ۱۹۸۱ء کا عالمی اسلامی منشور جو حقوق انسانی کے بارے میں ہے وہ اس عالمی منشور جیسی ہی ایک دستاویز ہے، تمام انسانی حقوق کے تحت اسلام مذہبی آزادی اور رواداری کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، قرآن عظیم میں ارشاد ہے کہ مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہیں کیا جائے گا (بقرہ:۲۵۶)، مزید ارشاد ہے: یہ تمہارے رب کی طرف سے ہدایت کا راستہ ہے، اب جو چاہے اسے قبول کرے اور جو چاہے اس سے انحراف کرے۔ (الکہف:۲۹)، ایک اور جگہ ارشاد ہے: تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے شریعت اور راہ ہدایت واضح کر دی ہے اگر تیرا رب چاہتا تو وہ سب انسانوں کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں اس بارے میں آزمانا چاہتا ہے جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے (المائدہ: ۴۸)، تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین (الکافرون:۶)۔ قرآن عظیم کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے اصول کتنے ارفع ہیں، اول یہ کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت جبر سے نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ خدا نے ہر قوم میں رسول اور صحیفے بھیجے، اسی طرح اسلام کثرت

مذاہب کوتسلیم کرتا ہے۔

ہمیں ان اصولوں کی صراحت کرنی چاہئے، پہلے اصول کے مطابق ضمیر کو خارجی عوامل سے مجبورنہیں کیا جاسکتا، اسلامی تناظر میں ہر شخص آزاد ہے کہ وہ خدا کو مانے یا نہ مانے، درحقیقت کفر سے موت کی سزا لازم نہیں آتی۔ قرآنی آیات (بقرہ:۲۱۷، آل عمران:۸۷، آل عمران:۱۰۶، محمد:۲۵) میں کہا گیا ہے کہ کافروں کو آخرت میں عذاب دیا جائے گا، ان کی دلیل یہ ہے کہ موت کی سزا مقرر نہ کرنے سے ظاہر ہے کہ مذہب تبدیل کرنے کی آزادی ہے، اسے قرآن واضح طور پر کہتا ہے، ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اکبر کے عہد میں متعدد ہندو اور مسلمانوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی، لیکن عیسائیت قبول کرنے والے کسی مسلمان کو موت کی سزا نہیں دی گئی۔

دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ مسلمان اہل کتاب (ذمی) سے نہایت رواداری کا سلوک کرتے ہیں، یہودی، عیسائی عورتوں سے شادی بھی کی جاسکتی ہے اور انہیں تبدیل مذہب کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، بعد کو اہل کتاب کی فہرست میں آتش پرستوں (پارسی) (امام شافعی کے مسلک کے مطابق) اور ہندوؤں کو (امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق) بھی شامل کرلیا گیا، اور دیگر تمام غیر مسلموں کو بھی خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب (امام مالک کے مسلک کے مطابق)، پس اسلام کثرت مذاہب کوتسلیم کرتا ہے اور ان کے ساتھ بقائے باہم کا قائل ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں کاؤنٹ لیون اوسٹرونگ نے لندن یونیورسٹی میں اپنے لیکچر کے دوران کہا تھا کہ جدید انسانی حقوق کے نظریہ کے فروغ پذیر ہونے سے بہت عرصہ قبل شریعت (اسلامی قانون) نے دیگر مذاہب سے رواداری کا وہ بے حد فراخدلانہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مغرب کو ایسا نظریہ اختیار کرنے میں ایک ہزار سال کا عرصہ لگا۔

علاوہ ازیں اسلامی تاریخ مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی داستانوں سے پُر ہے، یہاں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں: جب یروشلم فتح ہوا اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وہاں

تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں کے سب سے بڑے کلیسا میں نہایت ادب واحترام سے داخل ہوئے۔ آپ نے کلیسا کے اسقف کی درخواست کے باوجود کلیسا میں نماز ادا نہیں کی مبادا مسلمان اس کلیسا کو مسجد بنانے کا بہانہ نہ بنالیں۔

جب قاہرہ کی قدیم آبادی کی ایک عیسائی عورت حضرت عمر بن الخطابؓ کے حضور شکایت لے کر پہنچی کہ عمرو بن العاصؓ نے مسجد بنانے کے لئے اس کے مکان پر قبضہ کرلیا ہے جب حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ فاتح مصر سے باز پرس کی تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنے عمل کا دفاع کرنا چاہا کہ اس علاقے میں بہت زیادہ مسلمان آباد ہیں اور انہیں ایک وسیع وعریض مسجد کی ضرورت ہے؛ کیونکہ اس عیسائی عورت کا مکان وہاں تعمیر کی جانے والی مسجد سے متصل ہے لہٰذا انہوں نے یہ مکان خریدنے کی پیشکش کی، اور دوگنی سے بھی زیادہ قیمت ادا کرنی چاہی، لیکن وہ عیسائی عورت کسی طرح مکان بیچنے پر رضامند نہیں ہوئی لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ اس مکان کو مسمار کر کے مکان کی قیمت بیت المال میں جمع کرادی جائے تاکہ اس عورت کو جب ضرورت ہو اپنی رقم وہاں سے نکلوالے، اگرچہ شدید ضرورت کے تحت یہ اقدام قانونی طور پر جائز کہا جاسکتا تھا لیکن امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا کہ زیر تعمیر مسجد کا وہ حصہ منہدم کر کے عیسائی عورت کو اس کے مکان کی زمین واپس کردی جائے اور اس کا مکان بعینہ اسی طرح دوبارہ تعمیر کرادیا جائے جیسا کہ وہ پہلے موجود تھا۔

یہ دو مثالیں آج کے حالات میں بھی معنویت رکھتی ہیں خصوصاً اس تناظر میں کہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں اجودھیا میں بابری مسجد شہید کردی گئی۔

عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانی کے دور میں ہندوستان میں ہندوؤں کو مذہبی آزادی:

اگرچہ فقہاء کے درمیان اس بات پر اختلاف تھا کہ آیا ہندو زمرہ اول کے تحت آتے ہیں یا زمرہ ثانی کے تحت؛ تاہم تمام مسلم حکمراں (محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک) ہندوؤں کو

ہر طرح سے بطور ذمی ہی شمار کرتے رہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ اہل کتاب کے دائرے میں آتے ہیں، شہزادہ داراشکوہ جس نے مجمع البحرین جیسی کتاب مرتب کی جس میں اسلام اور ویدانت میں یکسانیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اس کا کہنا تھا کہ صحائف کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ رحمٰن ورحیم نے ابتداء آفرینش میں ہی ایک صحیفہ سماوی وید کے نام سے نازل فرمایا، یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، اس میں انسانوں کے لئے دنیا و آخرت میں امر و نہی کے بارے میں ہدایات درج کی گئی ہیں، ہندو بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور اسی نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی، لوگوں کو ان کے نیک و بد اعمال کی جزا و سزا ملے گی، پس اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو مذہب ایک اچھا مذہب ہے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ اورنگ زیب جیسا کٹر حکمراں بھی ہندوؤں کو ذمی سمجھتا تھا، فتاوی عالمگیری سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوؤں کو ایک واضح قانونی حیثیت عطا کی گئی تھی اور انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل تھی، یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ وہ غیر مسلموں کو آزادی اور جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے، انہیں جبری فوجی خدمت کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا، بعض اوقات انہیں فوجی خدمات کے عوض جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، لیکن جو غیر مسلم فوجی خدمت انجام دینا چاہتے تھے ان پر جزیہ (ٹیکس) عائد نہیں کیا جاتا تھا، انہیں فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا اور منصب عطا کئے جاتے تھے۔

اگرچہ عہد وسطی کی تاریخ میں ہمیں بعض ایسے ناخوشگوار واقعات ملتے ہیں کہ کچھ مسلم حکمرانوں نے نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی عائد کردی تھی اور صرف مندروں کی مرمت کی اجازت ہی دی جاتی تھی، بعض عبادت گاہیں مسمار بھی کی گئیں تاہم عمومی طور پر مسلم حکمراں مذہبی رواداری اور غیر مسلموں کے مذہب اور کلچر کے احترام کا جذبہ رکھتے تھے، یہ پالیسی دلی کے اولین سلاطین سے لے کر سلطنت مغلیہ کے سقوط تک برقرار رہی۔

مورخ ایم سی مجمدار اس دور کے ہم عصر تاریخ نگار فرشتہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سلاطین دہلی نے اپنی غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، دلی میں جو کہ ان سلاطین کا دارالسلطنت تھی ہندو آزادی کے ساتھ اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے، جمنا میں اشنان کرتے تھے اور اپنے مذہبی جلوس بلا رکاوٹ نکالتے تھے، یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے اور تعمیراتی آثار سے بھی واضح ہے کہ تیرھویں صدی میں نئے مندروں کی تعمیر پر کوئی پابندی نہیں تھی، علاء الدین خلجی کے عہد میں ٹھاکر ہیرو نے مندروں کے فن تعمیر پر اپنی کتاب وسوارا مرتب کی اس میں حکومت کی جانب سے مندروں کی تعمیر میں مداخلت کی کوئی شکایت نہیں کی گئی ہے، اس کے برعکس جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے، اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اس دور میں مندر تعمیر کئے جاتے تھے، اتر پردیش کے شہر اٹاوہ میں جو تین جین دھرم کی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ جو کتبہ ہے اس میں ان مورتیوں کے نصب کئے جانے کی تاریخ ۱۲۷۸ عیسوی برآمد ہوئی ہے، دلی کے پرانے قلعہ میں ایک دولسانی کتبہ فارسی اور سنسکرت کا برآمد ہوا ہے اس کی تحریر بتاتی ہے کہ سری کرشنا مندر کو ۱۲ بیگھہ اراضی دیئے جانے کا فرمان اس کتبہ میں درج ہے، فیروز شاہ کا کہنا ہے کہ ہندوؤں نے شہر اور اس کے نواح میں نئے مندر تعمیر کر لئے ہیں اسے اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔

سلاطین مغلیہ نے نہ صرف سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ خود اس راہ میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئے، شہنشاہ اکبر کا کردار اس بارے میں اپنے پیشرو اور بعد کے سلاطین میں بھی سب سے زیادہ نمایاں ہے، اس کی سلطنت وسیع تر مذہبی آزادی اور عمومی بشر دوستی کا ایک دلکش نمونہ تھی، اس نے اپنی صلح کل پالیسی سے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کے درمیان اتحاد پیدا کیا اگرچہ وہ اپنی کاوش میں کامیاب نہیں ہوسکا تاہم اس نے ہندو اور مسلم مذہب کے امتزاج سے ایک نیا مسلک وضع کرنے کی کوشش کی، ان دونوں مذاہب کے علماء نے اس کی اس

کوشش کی شدید مخالفت کی، جزیہ اور تیرتھ یاترا ٹیکس منسوخ کرنا، جنگی قیدیوں کے جبراً مسلمان بنائے جانے پر پابندی، ہندو رانیوں کو اپنے مذہبی شعائر انجام دینے کی اجازت دی، خود ہندو شیوراتری، دیوالی، دسہرہ میں شرکت، ذبیحہ گاؤ پر پابندی، گوشت، لہسن، پیاز کھانے سے پرہیز نیز ہندوؤں کو اعلیٰ ترین عہدے دیئے مثلاً راجہ مان سنگھ کو وزیر اعظم اور راجہ ٹوڈرمل کو وزیر خزانہ بنایا، برہمن ججوں کا تقرر تا کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات کا فیصلہ کریں۔ ہندو جوگیوں سے بحث اور تبادلہ خیالات، ہندو مذہبی کتابوں اتھروید، رامائن، مہابھارت وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ایسی مثالیں ہیں جو اکبر کی مذہبی فراخدلی کو واضح کرتی ہیں۔

مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری کے موضوع پر مشہور مورخ ایس آر شرما کی متنازعہ کتاب میں اگرچہ اکثر غیر ہمدردانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض دلچسپ بلکہ چونکا دینے والی باتیں کہی گئی ہیں، مثلاً ہندوستان میں ہندوؤں کی حالت اس سے کہیں زیادہ بہتر تھی جیسی کہ اس وقت یوروپ کے عہد وسطی میں ان اقوام کی تھی جن کا مذہب ان کے حکمرانوں کے مذہب سے مختلف تھا، اکبر کی وہ بے حد تعریف کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں ہندو منصب داروں کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی جتنی کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہندوستان میں دیسی افسروں کی تھی، اکبر کے عہد میں جو نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے چار ہندوستانی گورنر تھے جبکہ انگریزوں کے دور اقتدار میں جو ڈیڑھ صدی پر محیط ہے ۱۹۳۷ء میں صرف ایک ہندوستانی گورنر تھا، انگریزی دور میں کوئی ہندوستانی اس اعلیٰ منصب تک نہیں پہنچ سکا جب کہ اس کے زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل سلطنت کا وزیر خزانہ تھا۔ ۹۵-۱۵۹۴ء کے درمیان ۱۲ رصوبوں میں جو وزرائے خزانہ مقرر کیئے گئے ان میں سے آٹھ ہندو تھے، کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے ۶۰ سال بعد بھی یہاں صرف ایک مسلمان جنتا دل کی سرکار میں وزیر داخلہ کے منصب تک پہنچ سکا۔ یہ ۱۹۸۹ء میں وی پی سنگھ کی وزارت عظمیٰ کے دوران تھا (وزیر داخلہ کا عہدہ وزیر اعظم کے بعد سب

سے زیادہ اہم عہدہ ہوتا ہے)۔ سلاطین دہلی اور سلاطین مغلیہ کے عہد میں متعدد ہندو سپہ سالار تھے، اس دور میں ان منصبوں پر تقرری کے لئے کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔

جہانگیر نے بھی مذہبی آزادی اور لبرل ازم کی اپنے باپ کی پالیسی کو جاری رکھنا چاہا، اس نے جمعرات اور اتوار کے دن جانوروں کے ذبیحہ پر پابندی عائد کردی، اس پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا، ایک دفعہ جب اسے اطلاع ملی کہ پابندی کے ان دنوں میں بھی گوشت فروخت کیا جارہا ہے تو اس نے شہر کوتوال کو کوڑے لگوائے، یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ایک بار جمعرات کے دن عید کا تیوہار پڑا تو اس نے دوسرے دن یعنی جمعہ کو قربانی کی اجازت دی، جہانگیر کی مذہبی رواداری کے واقعات اس کے درباری مورخوں کے حوالے سے بطور مثال درج کئے جاسکتے ہیں، یہ دونوں وقائع نگار عبدالرحیم خان خاناں اور سورداس ہیں، اول الذکر نے بکثرت دوہے لکھے جن میں بہت سے ہندو دیوتاؤں کی شان میں ہیں؛ جبکہ موخر الذکر نے سورساگر لکھا۔ شہنشاہ نے ہر شعر کے بدلے میں اسے ایک اشرفی (سونے کا سکہ) انعام میں دی۔

اپنے پیش رؤوں کی مذہبی رواداری کی روایات اور اپنے ولی عہد دارا شکوہ کے اثر سے شاہجہاں نے بھی ہندوؤں کے بارے میں فراخدلانہ رویہ اختیار کیا، دارا شکوہ نے اپنشد کا ترجمہ کیا اور لکھا کہ قرآن مجید میں اس کا حوالہ موجود ہے، ہندوؤں کی بابت اورنگ زیب کے رویہ پر مورخین شدید شکوک وشبہات کا شکار ہیں، بلاشبہ امور حکمرانی میں وہ اپنے پیشرو مغل سلاطین کے مقابلہ میں زیادہ کٹر مسلمان تھا، اس نے جزیہ دوبارہ عائد کیا، جھروکہ درشن کی رسم بند کردی، بادشاہ کی سالگرہ پر اسے سونے چاندی کے سکوں میں تولنے کی رسم بھی منسوخ کردی گئی، دربار میں گانا بجانا بھی ممنوع قرار پایا وغیرہ وغیرہ، پھر بھی وہ بعض سیکولر امور کا پابند تھا، اس نے متعدد سیکولر نوعیت کے احکام صادر کئے جنہیں ضوابط کہا جاتا تھا، فتاویٰ، شرعی احکام کا ہی ضمیمہ تھے، اس وقت ملک میں جو حالات تھے ان کے بارے میں شریعت میں کوئی نظیر دستیاب نہیں تھی۔

اگرچہ تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں بعض وجوہات کی بنیاد پر کچھ مندر مسمار کئے گئے تاہم تحقیقات سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس نے مندروں کی دیکھ بھال کے لئے فراخدلانہ رقوم بھی فراہم کیں۔ جناب بی این پانڈے نے اپنی کتاب ''ہندوستانی کلچر میں اسلام کا کردار'' میں ایسے تیس (۳۰) مندروں کی فہرست دی ہے (ان میں آبو، اجین، چترکوٹ، گوہاٹی اور گیمارشامل ہیں) ان کے پاس آج بھی اورنگ زیب کے ان فرامین کی نقول موجود ہیں جن کے ذریعہ ان مندروں کو جاگیریں عطا کی گئیں اور ان کے تحفظ کے اقدامات کئے گئے، اس نے سکھوں کے گرودواروں کو بھی فراخدلانہ امداد دی۔

ہندوؤں کو اورنگ زیب کے عہد میں اعلیٰ مناصب ملتے رہے اور انہیں شہنشاہ کا اعتماد حاصل رہا، درحقیقت اس کے دور میں ہندو ملازمین کی تعداد اکبر کے عہد کے مقابلے میں دوگنی تھی۔

اگرچہ سلاطین کے دور میں قبول اسلام کے متعدد واقعات پیش آئے لیکن ان میں کہیں بھی نہ جبر کا بدلا تھا اور نہ یہ منصوبہ بند طریقے سے عمل میں آتے تھے، تقریباً ایک ہزار سال مسلمان حکمرانوں کے اقتدار کے بعد بھی جب ہندوستان انگریزی استعمار سے آزاد ہوا تو یہاں مسلمانوں کی تعداد پوری آبادی میں تقریباً ایک تہائی کے برابر تھی (تقسیم سے قبل) اور اکثریت اس وقت بھی ہندوؤں کی ہی تھی، اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ مسلم سلاطین نے اپنی رعایا ہندو اور مسلمان سب کو مذہبی آزادی عطا کی، پس اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے واقعات یا تو سیاسی مراعات حاصل کرنے یا اقتصادی فائدہ کے لئے یا اپنی سماجی پوزیشن بلند کرنے کے لئے عمل میں آئے، بعض اوقات جب کوئی حکمراں یا قبیلہ کا سردار مذہب تبدیل کرتا تو اس کی رعایا یا اس کے قبیلے کے افراد بھی اس کی تقلید میں مذہب تبدیل کر لیتے تھے۔

صوفیاء کا کردار بھی اس بارے میں اہم ہے اگرچہ وہ تبدیل مذہب پر زور نہیں دیتے تھے لیکن ان

کی محفلوں میں ہندو اور مسلم شوق اور کثرت سے شریک ہوتے تھے، اگرچہ ہندو سماج میں چھوت کے سخت گیر رسوم کی وجہ سے بھی بعض نیچی ذات کے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ہوگا؛ تاہم ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ ان اچھوتوں نے وسیع پیانے پر اسلام قبول کیا۔

۴۔مغرب کی لبرل جمہوری روایات:

قرآن واحادیث کی طرح یہودی اور عیسائی صحیفوں میں مذہبی رواداری کا درس دیا گیا ہے، توریت باب پیدائش میں کہا گیا ہے: زمین پر رہنے والے سب ایک ہی خاندان کی طرح ہیں، قدرت نے ذات پات، طبقہ، نسل یا خون کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی ہے، انسانی مساوات اولین شرط ہے، نسل، قومیں اور افراد کسی ایک شجرہ کی شاخیں ہیں، عیسائی صحیفہ میں بتایا گیا ہے کہ اخوت اور مساوات وہ جذبہ ہے جو انسان کے خالق نے اس کے دماغ میں ودیعت کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور سب اسی کی شبیہ پر بنائے گئے ہیں۔

ایک باپ جس کے بچے ہم سب ہیں اس لئے سب یکساں ہیں، سب لوگ بھائی بھائی ہیں اس طرح کہ کوئی مخلوق انہیں برباد نہیں کرسکتی، اس اخوت کو برباد کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان خود کو خدا کی اولاد ہونے کے تصور سے خارج کرلے، نسل پرستی اختیار کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص عیسائیت سے باہر ہوجائے گا۔

ان تعلیمات کے باوجود دنیا کے مختلف حصوں میں مذہب کی بنیاد پر ایذا رسانی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں، خاص طور پر یوروپ میں ریفارمیشن (دور اصلاح) کے بعد سے مذہبی اقلیتوں کے حالات حد درجہ تشویشناک رہے ہیں، ان کی وجہ سے نہ صرف ممالک کے درمیان کشمکش ہوئی بلکہ عالمی پیانے پر بھی تعلقات پر اس کا بہت ہی ناگوار اثر پڑا، اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مذہبی اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر متعدد خارجی طاقتوں نے دوسرے

ملکوں میں مداخلت کو بہانہ بنایا، مثال کے طور پر انگلینڈ نے ۱۶۵۵ء میں والڈیسین کی حمایت میں جو فرانس میں رہتے تھے، مداخلت کی۔ ہالینڈ نے جس طرح فرانس میں کالوی نیسٹ کی حمایت میں مداخلت کی اور ۱۷۰۷ء میں سویڈن اور پروشیا نے پروٹسٹنٹ کی حمایت میں پولینڈ میں جارحیت کی، اس صورت حال سے واضح ہے کہ متعدد مغربی ملکوں کے تعلقات ان باتوں سے متاثر ہوتے تھے، خاص طور پر علاقوں کو منتقل کئے جانے کے مواقع پر اس پر زور دیا جاتا تھا کہ مذہبی اقلیتوں کو بلا جبر و استبداد ان کے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی آزادی دی جائے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران مغرب کے متعدد ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدوں میں مذہبی اقلیتوں کی آزادی کے بارے میں دفعات شامل کی گئیں۔

1815ء میں وی انا کا آخری معاہدہ جس پر آسٹریا، یونان، فرانس، برطانیہ، پرتگال، پروشیا، روس اور سویڈن نے دستخط کئے پہلا اہم بین الاقوامی معاہدہ تھا جس میں قومی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی شق شامل کی گئی، بلکہ مذہبی اقلیتوں کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ آرٹیکل (۱) فائنل ایکٹ میں کہا گیا ہے:

معاہدہ کے فریقین کے ہاں رہنے والی پولش اقلیت کو ایسے ادارے دیئے جائیں گے جو ان کی قومیت کی ضمانت دیں گے اور وہ ایسی سیاسی نوعیت اختیار کر لیں گے کہ ہر وہ حکومت جس کی وہ رعایا ہیں انہیں مناسب خیال کرے گی۔

بیسویں صدی میں انسانی حقوق کے میدان میں بے حد نمایاں لیگ آف نیشنز کا منڈیٹ سسٹم اور اقلیتی تحفظ کا منشور ہے۔

انسداد نسل کشی کنونشن ۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء

یو ڈی ایچ آر ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء

حقوق انسانی پر یوروپین کنونشن ۱۹۵۳ء

آئی سی ای ایس سی آر اور آئی سی سی پی آر ۱۹۶۶ء

آئی سی پی آر کا اختیاری پروٹوکول

کونسل آف یوروپ میں قومی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے فریم ورک کنونشن ۱۹۹۵ء گذشتہ ۶۰ سالوں میں اقوام متحدہ نے سو سے زیادہ بین الاقوامی حقوق انسانی اداروں کو اپنی سرپرستی عطا کی ہے، ان میں سے ذو اقلیتی حقوق کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ہر قسم کی عدم رواداری اور مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر کسی بھی قسم کے امتیاز کے خلاف اقوام متحدہ کا منشور (۱۹۸۱) اور نسلی مذہبی لسانی اقلیتوں کے حقوق ۱۹۹۲- یہاں ہم ۱۹۹۲ کے منشور کی وضاحت کرتے ہیں۔ انسانی حقوق پر اقوام متحدہ اور اس کی کمیشن نے اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق کا مسودہ تیار کرنے میں ۱۴ سال سخت محنت کی پھر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اقلیتوں کے حقوق کے اس منشور سے متعلق اپنا منشور جاری کیا، اس کا ابتدائی حصہ اور ۹ ابواب (آرٹیکل) عموماً موجودہ حقوق کا ہی اعادہ کرتے ہیں، آرٹیکل (۱) میں اقلیتی جماعتوں کے وجود اور شناخت سے متعلق سوالات زیر بحث لائے گئے ہیں، آرٹیکل (۲) اقلیتوں کے حقوق آزادی سے متعلق بحث کرتا ہے، اس میں اقلیتوں کو قومی اور علاقائی سطح پر ثقافتی، مذہبی، لسانی، سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا، اقتصادی اور عوامی امور میں متفرق سطح پر تفصیلوں میں شرکت، اپنی جماعتوں کے افراد سے اندرونی اور بیرونی طور پر روابط کی اجازت اور آزادی شامل ہے۔

آرٹیکل (۳) میں آئی سی پی آر کے آرٹیکل (۲۷) کے تحت مندرجات جو اقلیتوں کو اپنے گروپ کے افراد سے انفرادی اور اجتماعی طور پر روابط قائم کرنے کی اجازت سے متعلق ہیں کا اعادہ کیا گیا ہے، آرٹیکل (۴) کے تحت خصوصی اقدامات کا تذکرہ ہے، آرٹیکل (۵، ۶، ۷) میں ممالک کے درمیان قومی سیاست، پروگرام اور تعاون کی باتیں کہی گئی ہیں، یہ عین ممکن ہے کہ نئے منشور کی اہمیت اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ حقوق انسانی کا پہلا بین الاقوامی اعلامیہ (منشور)

ہے جسے مکمل طور پر اقلیتی حقوق پر مرتب کیا گیا ہے، اس کے ابتدائی حصہ اور آرٹیکل (۹) میں بوضاحت کہا گیا ہے کہ اس ڈیکلریشن میں جو باتیں کہی گئی ہیں اقوام متحدہ کی تنظیموں کو ان حقوق اور اصولوں کو بروئے عمل لانے کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہے، نیز ابتداء میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اقلیتی حقوق اور معاشرہ کی پوری ترقی کے ساتھ جمہوری دائرہ کار میں عمل ہونا چاہئے جو قانون پر مبنی ہو۔

آرٹیکل (۹) میں اقلیتوں کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے، اسی کے ساتھ ریاست کے مفاد، علاقائی سالمیت، مساوات، خودمختاری اور سیاسی آزادی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے، علاوہ ازیں عبارت مبہم اور منفی محاوروں سے بھری پڑی ہے مثلاً حوصلہ افزا حالات، مناسب، جہاں کہیں ممکن ہو، جہاں مطلوب ہو، اور اس انداز سے کہ وہ قومی قانون سازی سے غیر مربوط نہ ہو، مجموعی حقوق سے متعلق سوالات کا کوئی حل پیش نہیں کیا گیا، صرف دوسری جماعت سے اجتماعی رابطہ کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے، ڈیکلریشن (منشور) کے نفاذ کی نگرانی کے لئے ایک موثر میکانزم وابستہ کرنے کی تجویز ابھی تک منظور نہیں کی گئی ہے، یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اس مسودہ کی تیاری میں اقلیت کے کسی نمائندہ کو شریک نہیں کیا گیا تھا، بین الاقوامی قوانین کے تحت اقلیتی حقوق کے اہم موضوع ہیں:

بہ حیثیت ایک جماعت زندہ رہنے کا حق اور ثقافتی، معاشی بربادی سے تحفظ کا حق

زندہ رہنے کا حق، اپنی ثقافت اور مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کا حق

اپنی زبان کے استعمال کا حق

تعلیمی اور ثقافتی حقوق

مثبت اقدامات

میکیان کا استدلال ہے کہ مثبت امتیازی اقدامات معاوضہ جاتی اور عبوری نوعیت کے

ہوتے ہیں جبکہ تحفظ کے اقدامات جو اقلیتی جماعتوں کو پر امن حقوق عطا کرتے ہیں (مثلاً اپنی زبان، ثقافت اور مذہبی شعائر کو برقرار رکھنا، اپنے اسکول، لائبریریاں عبادت گاہیں اور اسی نوعیت کے دیگر ادارے قائم کرنا) متفرق صورت حال میں توازن پیدا کرتے ہیں اور انہیں اس وقت تک برقرار رکھا جانا چاہئے جب تک کہ اقلیتی گروپ انہیں باقی رکھنا چاہیں۔ اس طرح تحفظ سے متعلق اقدامات مستقل نوعیت کے ہوں گے جبکہ معاوضہ جاتی نوعیت کے اقدامات مثلاً ملازمتوں میں ریزرویشن (جیسا کہ ہندوستان میں رائج ہے) عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اقدامات کو اپنے مقصد میں مناسب اور لسانی، مذہبی اور ثقافتی جماعتوں سے قومی حدود کے دائرہ کار میں روابط قائم کرنے میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

۵- اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی - ہندوستان، اسلامی اور مغربی روایات کی روشنی میں طریق کار کا جائزہ:

دنیا کے ہر ملک میں اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، تین روایتوں کے حامل ممالک سے درج ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ہندوستان:

فرقہ وارانہ فسادات، بابری مسجد کا انہدام، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی بہت کم نمائندگی، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلم ممبران کی کم تعداد، ان کی مادری زبان (اردو) کی حق تلفی، سچر کمیٹی اور گوپال سنگھ کمیٹی کے پیش کردہ اعداد و شمار سے ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہے، تعصب اور امتیاز، ایک مسلم نوجوان کے داڑھی رکھنے پر جسٹس کاٹجو کے خیالات بھی اس کی ایک مثال ہے۔

یورپ:

کفر گوئی کے واقعات، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں، عیسائیوں میں کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے درمیان خونریز صف آرائی، اوٹو پریمنچر انسٹی ٹیوٹ وی آسٹریا (۱۹۹۴ء)، سلمان رشدی کی شیطانی آیات، ہندی سائنڈ کیس (۱۹۷۱ء)، ڈنمارک کے کارٹونسٹ کے قابل اعتراض کارٹون (۲۰۰۶ء)، سوئٹزرلینڈ میں مسجدوں کے مینار تعمیر کرنے پر پابندی، فرانس میں سر ڈھانپنے پر پابندی۔

۶-اختتام:

کیونکہ آج اقلیتوں کے حقوق پر کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود نہیں ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان تمام ممالک کے اشتراک اور تعاون سے جو مختلف تہذیبوں، مذاہب، قانون اور سیاسی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں اس قسم کا ایک معاہدہ مرتب اور منظور کیا جائے۔

حوالہ جات:

- کاسٹے لینو جوشوا: اقلیتی حقوق۔ کے ایم اسمتھ اور کرسٹن وان ڈین انکر: انسانی حقوق کے مبادیات، لندن: ہوڈر آرنلڈ ۲۰۰۵ء)
- گر- ٹی آر: اقلیتیں خطرے میں -نسلی و سیاسی تنازعات کا ایک عالمی منظر نامہ۔ (واشنگٹن ڈی سی۔ یو ایس اے، امن اور پریس کا ادارہ ۱۹۹۳ء)
- پیٹرک تھورن بیری: بین الاقوامی قوانین اور اقلیتی حقوق، آکسفورڈ کلیرنڈن پریس (۱۹۹۱ء)، ویجاپور۔ عبد الرحیم پی: اقلیتی حقوق کی عالمی ضمانت (تحفظ)، انٹرنیشنل (اسٹڈیز) نئی دہلی/ تھاؤزنڈ/ وکس/لندن)۔

- مذہبی آزادی اور رواداری کی تاریخ۔ ہندوستان میں انسانی حقوق کے بارے میں مسلم تناظر: پرشوتم مہرا، نارائنی گپتا اور راجیولوچن (مرتب): سوسائٹی، مذہب اور مملکت- تاریخ ہند میں شناخت کی کشمکش (مدارس: انڈو برٹش ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۹۶)۔
- اقلیتیں اور حقوق انسانی -قومی اور بین الاقوامی قانون کا ایک تقابلی جائزہ: ڈی ایل سیتھ اور گورپریت مہاجن (مرتب): اقلیتوں کی شناخت اور قومی ریاست (نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۹ء)۔
- سول اور سیاسی حقوق بین الاقوامی معاہدوں کا ملک میں نفاذ- ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق کے خصوصی حوالے سے: کے پی سکسینہ (مرتب): انسانی حقوق اور دستور-نظریہ اور حقائق (نئی دہلی: گیان پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۳ء)۔
- ہندوستان میں خطرے میں پڑی اقلیتیں-پولیس کے کردار کو سمجھنا: اصغرعلی انجینئر اور اے ایس نارنگ (مرتب): ہندوستان میں پولیس اور اقلیتیں (نئی دہلی منوہر ۲۰۰۶ء)۔
- ہندوستان میں اقلیتیں۔ تعصب اور امتیاز کا مظاہرہ: جوزف بنجامن (ایڈیٹر) ہندوستان میں اقلیتیں۔ سماجی نظام (نئی دہلی: گیان پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۶ء)۔
- رشدی کا معاملہ- انسانی حقوق کے تناظر میں: مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ سعودی عربیہ) جلد ۲۱، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۹۳ء
- مذہبی آزادی اور رواداری۔ ایک مسلم تناظر: ریڈیکل ہیومنسٹ جلد ۵۹، شمارہ ۹، دسمبر ۱۹۹۵۔ اس کا اردو ترجمہ بعنوان "اسلام۔ انسانی حقوق کا مجدد اور امام" شائع ہوا: مترجم: محمد شمیم الزماں (مطبوعہ تہذیب الاخلاق علی گڈھ جلد ۱۵، شمارہ ۱۲، دسمبر ۱۹۹۶)۔

☆☆☆

ہندوستان میں اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق

پروفیسر اقبال احمد انصاریؒ ☆

۱- دستوری بندوبست:

دستور ہند کے آرٹیکل ۲۵ کے تحت ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرے اور اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے، آرٹیکل نمبر ۲۶ کے تحت تمام مذہبی طبقات کو اس حق کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لئے ادارہ قائم کرسکتے ہیں، آرٹیکل ۲۷ کے تحت ممانعت کی گئی کہ ریاست کی مالی مدد سے قائم کئے گئے تعلیمی اداروں میں مذہبی ہدایات دی جائیں، آرٹیکل نمبر ۲۷۸ کے تحت ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ ریاست کی جانب سے مالی امداد پانے والے کسی ادارہ یا حکومت سے تسلیم شدہ ادارے میں منعقد ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کریں یا نہ کریں، آرٹیکل ۲۹(۱) میں شہریوں کے ان تمام طبقات کو جن کی اپنی نمایاں تہذیب، زبان، رسم الخط ہے انہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اس وراثت کا تحفظ کریں۔

۲- تبدیلی مذہب کا حق:

مذہبی تبلیغ کی آزادی کی ضمانت ایک مسئلہ بن گیا ہے؛ کیونکہ ہندوؤں کو یہ شکوہ ہے کہ ماضی میں جس قدر مذہب تبدیل کرنے کے واقعات ہوئے ہیں اور لوگوں نے اسلام یا عیسائیت قبول

☆ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف انگلش علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کیا ہے ان میں بیشتر وہ افراد ہیں جن کا ہندوؤں کے پسماندہ اور کمزور طبقات سے تعلق ہے، علاوہ ازیں ہندوؤں کے نزدیک مذہب ان کی وراثتی تہذیبی (ثقافتی) روایات کا ایک حصہ ہے، اس میں انفرادی اختیارات کی گنجائش نہیں ہے، اس سے تبدیلی مذہب کے خلاف شدید جذبات ابھرے ہیں، اس کی وجہ سے کتنی ریاستوں میں ایسے قوانین بنائے گئے جن کے تحت مذہبی آزادی کے حق میں بعض ترمیمات اور تبدیلیاں کی گئیں، سپریم کورٹ نے ان کے جواز کو تسلیم کیا؛ تاہم رضا کارانہ طور پر تبدیلی مذہب کا عمل جاری ہے، اس میں زیادہ تر ہندو و دیگر غیر ہندو فرقوں کے کمزور اور پسماندہ طبقات آتے ہیں۔

۲-۱-اس سلسلے میں اگر مسلمان یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ان کے اپنے مذہب اسلام کی تبلیغ اور ایک عزم کے ساتھ کہ وہ دیگر مذاہب کے لوگوں خصوصاً ہندوؤں کو اس تبلیغ کے ذریعہ مسلمان بنانے کے حق کو کسی معاشرتی یا ریاستی ترمیم وتحدید میں نہیں لایا جاسکتا، خواہ تنگی اور افلاس و بدحالی کی صورت حال ہو تب بھی جبکہ اگر کوئی مسلمان تبدیلی مذہب کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے ایک مجرمانہ فعل سمجھا جائے گا، اس موقف کو ایک دوہرے معیار کی بدترین مثال سمجھا جائے گا۔

۲-۲-علماء کا وہ طبقہ جو کسی مسلمان کے دیگر مذہب قبول کرنے (ارتداد) کو مجرمانہ فعل تصور کرتا ہے انہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہئے؛ تاکہ یہ صرف انسانی حقوق کے معیار کے مطابق ہی نہ ہو جائے؛ بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کا بھی مظہر ہو کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔

۳-۲-مذہب کی تبدیلی کے متنازعہ معاملہ کو جو کہ ایک تاریخی روایت اور وراثت بن چکا ہے، اسے ہندوؤں کے کمزور طبقات کی بابت جائز خدشات کے مدنظر ایک ایسے بالاتفاق اخلاقی ضابطہ کے تحت حل کیا جانا چاہئے جس کے تحت یہ عہد کیا جائے کہ تنگی وافلاس کے حالات میں ایسے طبقات کے افراد کو تبدیلی مذہب پر راغب نہیں کیا جائے گا، غریبوں کے درمیان معاشرتی اور خیراتی

کاموں کے ساتھ مذہبی تبلیغ کا عمل نہیں ہونا چاہئے جوانجام تبدیلی مذہب پر منتج ہوتا ہے۔

۴-۲- مسلم اکثریتی آبادی والے ممالک اور معاشرہ کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ غیر مسلم اقلیت کو ایسی ہی مذہبی آزادی حاصل ہو جیسی وہ خود اپنے لئے چاہتے ہیں، اور جو دیگر جمہوری ممالک بشمول ہندوستان میں حاصل ہے۔

۳- مذہبی طبقات (کمیونٹی) کے عائلی قوانین:

ایک اور مسئلہ جو ہندوستان میں مسلم علماء کی محتاط توجہ کا طالب ہے وہ مسلم پرسنل لا (ایم پی ایل) ہے جسے انگریزی دور اقتدار میں نافذ کیا گیا تھا، وہ ان کے مذہب (شریعت) کا حصہ ہے، لہذا آرٹیکل نمبر ۲۵ کے تحت اسے تحفظ حاصل ہے؛ خواہ شریعت کی یہ تشریح ایک عورت (بیوی) کی باوقار زندگی گذارنے کے حق اور شوہر کی جانب سے طلاق بائن دیئے جانے سے پہلے اس کی بات سنی جانے کے حق کی نفی کرتی ہو، آرٹیکل ۲۵ کے تحت تحفظ کا دعوی کرتے ہوئے یہ حضرات اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ آرٹیکل ۵۲ کے تحت مذہبی آزادی کی جو ضمانت دی گئی ہے وہ آرٹیکل ۲۵(۱) اور (۲) کے ساتھ مشروط ہے، عوامی نظم، اخلاقیات، صحت کے ساتھ مذہبی شعائر کی آزادانہ ادائیگی کا حق دیگر اشخاص اور شہریوں کے بنیادی حقوق کی دفعات کے ساتھ مشروط ہے خصوصاً آرٹیکل ۲۱ کے تحت وقار کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق اور آرٹیکل ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ کے تحت مساوات اور امتیاز نہ کیے جانے کا حق، مثلاً ہندوؤں کا کوئی طبقہ مذہب کے نام پر ''ستی'' (شوہر کی میت پر بیوی کو زندہ جلا دینے کی رسم) انجام نہیں دے سکتا؛ کیونکہ اس سے ایک بیوہ کے زندہ رہنے کے حق کی نفی ہوتی ہے، اگر مذہبی اور تہذیبی روایات کے تحت کوئی عورت اپنی مکمل رضامندی کے ساتھ ستی ہونا چاہتی ہے تب بھی ریاست اور معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جس میں وہ بیوہ عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہ سکے، ایسے معاملات میں آرٹیکل ۲۱ کے علاوہ آرٹیکل ۲۵(۲) بھی بروئے عمل آتا ہے جس میں مذہبی آزادی کے ساتھ معاشرتی

اصلاحات کو بھی مشروط کیا گیا ہے۔

۴-ہندوستان کے دستور میں تمام شہریوں کو صنفی امتیاز کے بغیر مساوات اور انصاف کی ضمانت دی گئی ہے اس کے علاوہ عالمی حقوق انسانی کا اعلامیہ (ڈی یو ڈی ایچ آر) ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۶ء کے دو عہد نامے (دستاویزات) جو یکجا طور پر عالمی حقوق کا بل پیش کرتے ہیں ان میں مذہبی آزادی پر معقول ومناسب پابندیوں کو جائز قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ دیگر باتوں کے علاوہ تمام شہریوں کے لئے مساوات اور عدم امتیاز کو یقینی بنایا جائے۔

علاوہ ازیں اقوام متحدہ کا کنونشن (سی ای ڈی اے ڈبلو) ۱۹۷۹ء جو خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازات کو ختم کرنے کے عزم سے مرتب کیا گیا ہے اس کا مقصد قوانین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کو ختم کر کے عملی طور پر خواتین کو مساوات کا درجہ اور حق حاصل ہو سکے۔

۵- بہر حال آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل ۲۷ اور اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق کی بابت ڈیکلریشن ۱۹۹۲ء کے آرٹیکل ۱، ۲، ۳، ۴ کے تحت قومی، نسلی، لسانی، مذہبی اقلیتوں کو ان کی واضح شناخت کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ ڈیکلریشن کے آرٹیکل ۴(۲) کے تحت ریاست کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ ایسے موافق حالات کو فروغ دے جن میں اقلیتیں اپنی خصوصیات کو ظاہر کر سکیں اور ثقافتی، لسانی اور مذہبی رسوم وروایات کو بڑھاوا دے سکیں؛ سوائے اس کے کہ جہاں ان میں سے بعض پر عمل کرنے سے بین الاقوامی معیار کی خلاف ورزی کا امکان ہو، مزید برآں آرٹیکل (۳۸) میں یہ اہم وضاحت پیش کیا گیا ہے کہ ان حقوق سے مؤثر طور پر بہرہ مند ہونے کے لئے ریاست کی جانب سے جو اقدامات کیے جائیں گے انہیں اصول مساوات کے منافی نہیں سمجھا جائے گا۔

۱-۵-اس کے پیش نظر کسی فرقہ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا شادی ایک مقدس رسم ہے یا مرد اور عورت کے درمیان ایک معاشرتی معاہدہ ہے یا دونوں پر مشتمل ہے (مذہبی اور معاشرتی تقدس کی

حامل ہے)، یہ اس لئے کہ کسی فرقہ کے عائلی قوانین کو مخصوص ثقافت کے حق کے تحت تحفظ کا درجہ حاصل ہے بشرطیکہ یہ عدل وانصاف کے بنیادی اصولوں سے مطابقت رکھتے ہوں خصوصاً جبکہ کمزور فریق یعنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کا معاملہ ہو، مثال کے طور پر خواتین کے لباس کا مسئلہ (اپنی مرضی کا لباس پہننے کا حق)، ان کی نقل وحرکت پر پابندیاں لگانا، ان باتوں کو تہذیبی تشخص کے تحت تقدس عطا نہیں کیا جاسکتا، طلاق دینے کا طریقہ آسان ہو یا پیچیدہ یہ ایک تہذیبی اختیار کا معاملہ ہے، لہٰذا اطلاق سے متعلق جو قوانین ہیں انہیں کسی تصوراتی عالمی نمونہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہئے، لیکن شوہر کی طرف سے فوری اور یک طرفہ طور پر طلاق دے دینا، سابقہ احوال، مسئلہ کی کیفیت اور اس پر مرتب ہونے والے معاشرتی نتائج کا لحاظ کئے بغیر ہندوستان میں اسے روایتی شریعت کے قوانین کے تحت جواز حاصل ہے؛ لیکن اس طریقہ سے طلاق کے عمل کی بنیادی مطلوبات پوری نہیں ہوتیں اور یہ طریقہ کھلی ہوئی ناانصافی اور ظلم پر مبنی ہے جس کے لئے مطلقہ ملکی اور شرعی قانون کے تحت ہرجانہ طلب کرسکتی ہے، ہندوسان کی سپریم کورٹ نے صحیح قدم اٹھا کر اس مسئلہ میں مداخلت کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ مسلم طلاق کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی فرمان کے مطابق طلاق کی مدت اور اس مدت کے دوران مصالحتی کوششوں پر عمل کیا جائے، اسی طرح پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرلینے سے بھی اسے پورا تحفظ حاصل نہیں رہ جاتا، قرآن مجید میں تعدد ازدواج کے بارے میں احوال وشرائط موجود ہیں انہیں عرف یعنی موجودہ باوقار طریقہ سے زیادہ بہتر بنایا جانا چاہئے۔

۶- یہ ظاہر ہے کہ کسی اقلیت کو حاصل مذہبی اور ثقافتی آزادی کے حق کو اس طبقہ کے مقتدر افراد کے ذریعہ دیگر افراد کو صنف وجنس کی برتری کی بنیاد پر نشانہ ستم بنانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے، ریاستوں نے صنفی امتیازات اور جبر کو ختم کرنے کے لئے جو اقدامات کئے ہیں وہ اسلام کے جذبہ عدل کے عین مطابق ہیں، مسلمانوں کے روایتی فقہی مسلک کے علمبرداروں کو مسلم پرسنل

لا کے تحت اپنے مواعظ وخطبات میں ازدواجی رشتوں میں کمزور صنف کے ساتھ عدل ومساوات کا سلوک کرنے کے جذبہ کو عام کرنا چاہئے جو واضح طور پر معاشرہ میں موجود نہیں ہے۔

۷-مشترکہ سول کوڈ:

ہندوستانی دستور کے آرٹیکل ۴۸ کے تحت رہنما اصولوں میں ریاست کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش کرے، یہ غلط مفروضے پر مبنی ہے، دستور ساز اسمبلی میں اس موضوع پر جو بحثیں ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ اس کا مقصد جنس کی بنیاد پر انصاف کے جواز کا نہیں؛ بلکہ متحدہ قومیت کے حصول کو لازمی مطلوب کے طور پر پیش کیا تھا، جسے دفعہ ۳۷۱ (اے) اور دفعہ ۳۷۱ (جی) کے تحت دستور میں ترمیم کے ذریعہ مسترد کر دیا گیا، اسی کے ساتھ انسانی حقوق کے مضبوط کثیر القومی تصور کے تحت بھی اسے پسندیدہ قرار دیا گیا جس میں پرسنل لا عائلی (قوانین) میں کثرت کی بات کہی گئی ہے؛ لیکن یہ ریاست کا جائز حق ہے اور اس کا فرض بھی ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کے لئے انصاف کے مساوی معیار کے حصول کی کوشش کرے؛ کیونکہ عورتیں اور بچے ہر فرقہ خواہ وہ اکثریت کا ہو یا اقلیت کا ہر جگہ کمزور ہیں۔

۸-لہٰذا میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہندوستانی دستور میں شہریوں کے فرقوں اور طبقوں کے واضح عائلی قوانین کے حقوق کو شامل کیا جائے بشرطیکہ یہ قوانین خاندان کے کمزور طبقہ کے حقوق کا اتلاف نہ کرتے ہوں، لہٰذا موجودہ آرٹیکل ۴۸ میں ترمیم کر کے اور تمام شہریوں کے لئے مشترکہ سول کوڈ کے حصول کے لئے کوشش کرنے کو حذف کر کے اس کی جگہ یہ جملہ شامل کر دیا جائے کہ پورے ہندوستان میں عائلی قوانین (فیملی لا) کی بنیاد پر کمیونٹی میں عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں انصاف کے مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرنا۔

۸-۱-اس قسم کی ترمیم سے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں میں محصور ہونے (گھیرے جانے) کے اندیشہ کو ختم کرنے میں مدد ملے گی، جس سے انہیں خدشہ ہے کہ ان کے مخصوص عائلی قانون کو

ختم کیا جا رہا ہے۔ اس ترمیم سے مسلم پرسنل لا میں مطلوب اصلاح کی راہ ہموار ہو سکتی ہے خصوصاً طلاق اور مطلقہ کے حقوق اور تعدد ازدواج کے مسائل۔

۹۔ مسلم ممالک میں ہندوؤں کے عائلی قوانین:

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ پاکستان میں اس خوف سے کہ کہیں اقلیتوں کے مذہبی آزادی میں مداخلت کا الزام عائد نہ کیا جائے ہندوؤں کے عائلی قوانین میں اصلاح کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

میرا استدلال انسانی حقوق کی آفاقیت اور آفاقی معیاروں کی بنیاد پر ہے اور ریاست کے اس حق کو کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے لئے عدل وانصاف کے یکساں مواقع فراہم کرے، جبکہ تمام فرقوں کے روایتی عائلی قوانین کی آزادی کا احترام کیا جائے، خواہ وہ اکثریت کے ہوں یا اقلیت کے، ان کا اطلاق پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہندوؤں پر بھی ہونا چاہئے، اس مسئلہ کو قومیت، سیکولرزم، ہندو یا مسلم کے تصور سے پوری طرح الگ کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے، قومیت کا یہ معقول نمونہ (ماڈل) انسانی حقوق اور تمام شہریوں کے لئے مساوی عدل کا معیار اور فرقوں کی ثقافتی آزادی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کے تعلیمی حقوق
ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر فیضان مصطفیٰ ☆

گاندھی جی کا قول ہے کہ کسی ملک کے مہذب ہونے کے دعویٰ کو اس سے جانچا جا سکتا ہے کہ وہاں اقلیتوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ لارڈ اکٹون نے اس میں ایک اور جہت کا اضافہ کیا: ''سب سے زیادہ حقیقی معیار یہ ہے کہ آیا اس ملک میں جس کا ہم جائزہ لے رہے ہیں کیا اقلیتوں کو پورا تحفظ حاصل ہے''۔ اقلیتوں کی حقیقت اور اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ کو فرقہ واریت اور سیکولرزم اور نیشنلزم بمقابلہ سیکولرزم کی بحث سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہئے اور اسے جمہوریت، مساوات اور حقوق کے نظریاتی دائرے میں رکھ کر دیکھنا چاہئے، ایک جمہوری اور تکثیری معاشرے میں اقلیتوں کے ان حقوق کی ضمانت کی بڑی اہمیت ہے؛ کیونکہ جیسا کہ فرینکلن روزولٹ نے کہا ہے کہ وہی جمہوریت برقرار رہ سکتی ہے جو اقلیتوں کے حقوق کو اپنے بنیادی اصولوں کے طور پر تسلیم کرے۔

اس سلسلے میں ہمارے ملک کا دستور ایک بہترین دستاویز ہے جیسا کہ اس کے ان محاسن کا ہر طرف اعتراف کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے حقوق پر بحث ہندوستانی جیسے سماج میں بے معنی ہے، دستور ساز اسمبلی میں کثیر ثقافتی مختلف النوع جہتوں پر سرگرم بحث ہوئی، اقلیتوں کے

☆ وائس چانسلر نیشنل لا یونی ورسٹی کٹک (اڑیسہ)

حقوق پر بھی بحث ہوئی اور یہی سیاسی نظریہ گذشتہ ۶ دہائیوں سے چلا آ رہا ہے۔

تاہم دستور مرتب کرنے والوں نے اقلیتوں کے بارے میں بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق پر ایک مشاورتی کمیٹی کے قیام کی بابت ریزولوشن پیش کرتے ہوئے پنڈت گووند ولبھ پنت نے واضح طور پر کہا تھا کہ اقلیتوں سے متعلق مسائل کا اطمینان بخش حل ہی آزاد ہندوستان کی صحت، طاقت اور توانائی کا ضامن ہوگا، اب یہ ضروری ہے کہ ایک نئے باب کا آغاز کیا جائے اور ہم سب کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے، جب تک اقلیتیں پوری طرح مطمئن نہ ہوں، ہم ترقی نہیں کر سکتے اور ہم پوری طرح امن بھی قائم نہیں کر سکتے۔

لہٰذا انہیں خصوصی تحفظات کی ضمانت دی گئی اور دستور میں اقلیتوں کے بنیادی حقوق کے بارے میں ایسی دفعات شامل کی گئیں جن سے ان میں تحفظ اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہو، اس طرح دستور میں ایک موثر بندوبست کر کے اقلیتوں کے خدشات کو دور کیا گیا، بشپ جیروم ڈی سوزا کے الفاظ میں جو ہندوستانی عیسائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں: "جس مکمل فراخدلانہ راست بازی اور صفائی سے یہ بنیادی حقوق دستور میں مرتب کئے گئے ہیں اور جن کے تحفظ کی ذمہ داری سپریم عدلیہ کو سونپی گئی ہے اور جس اسپرٹ سے ایوان نے انہیں پاس کیا تھا اس سے ہمارے ملک کو کثیر الجہتی وراثت کو محفوظ رکھنے میں مدد ملے گی۔

اگرچہ ہندوستانی عدلیہ نے دستور میں مندرجہ اقلیتوں کے حقوق کی فراخدلانہ تشریح کی ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دستور کی دفعہ ۳۰ دنیا میں ایک نادر مثال ہے جس کے تحت اقلیتوں کو ان کے اپنے تعلیمی ادارے بلکہ یونیورسٹیاں تک قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے، یہ ایک الگ کہانی ہے کہ ۱۹۶۸ء میں سپریم کورٹ نے اور ۲۰۰۵ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں انتہائی متنازعہ فیصلے صادر کئے جس سے اس عظیم تعلیمی ادارے کو جو ملک میں اقلیتوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے اسے اقلیتی کردار سے محروم کر دیا گیا۔

ہمیں اقلیت کی تعبیر وتشریح کے بارے میں ایک واضح خیال رکھنا چاہئے، مائنارٹی (اقلیت) کی یہ اصطلاح لاطینی لفظ مائنر سے اخذ کی گئی ہے، اس کا تکملہ "ٹی" ہے، اس اصطلاح کے معنی ہوتے ہیں: تعداد میں کم۔ اکثریت اور اقلیت کی اصطلاح کی سب سے نمایاں وضاحت اسی کثرت وقلت تعداد سے نمایاں ہوتی ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق مائنارٹی کا مطلب ہے وہ جماعت (گروپ) جو ایک مشترک خاندانی رشتہ سے منسلک ہو، ان کی زبان، مذہب یا عقیدہ مشترک ہو اور وہ کسی مخصوص ملک کی اکثریت سے فکر وخیال کے معاملہ میں مختلف ہوں۔ اقلیت وہ جماعت ہے جو عددی اعتبار سے ملک کی دوسری بڑی جماعت (اکثریت) سے کم تر ہے، یہ ایک حیرت ناک بات ہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ یو پی میں مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ دستور ہند میں اقلیت کی کوئی تعریف بیان نہیں کی گئی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں ایسی بات کہی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ۲۰۰۹ء میں پنجاب اور ہریانہ ہائی کورٹ نے اس سوال پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا کہ آیا سکھ پنجاب میں اکثریت ہیں، درحقیقت عدالت عالیہ کے سامنے یہ بڑا اہم اور نازک سوال تھا لیکن کیس میں اس پر غور نہیں کیا گیا اور گورنر پنجاب کے اس نوٹی فکیشن کو ہی حرف آخر سمجھ لیا گیا کہ پنجاب میں سکھ اقلیت میں ہیں۔ جبکہ یو پی میں اسی قسم کے ایک نوٹی فکیشن کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، علاوہ ازیں سپریم کورٹ نے متعدد کیسوں بشمول ٹی ایم اے، پائی فانڈیشن کیس میں گیارہ ججوں پر مشتمل بنچ کے فیصلے میں کہا کہ دستور کی آرٹیکل ۳۰ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی بابت ہے کہ وہ اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کر کے ان کا نظم ونسق چلا سکتے ہیں، اور چونکہ ریاستوں کی تشکیل لسانی بنیادوں پر عمل میں آتی ہے لہٰذا مذہبی اقلیتوں کی تشریح بھی اسی لحاظ سے کی جانی چاہئے، پس پنجاب میں سکھ اقلیت تسلیم نہیں کئے جا سکتے، اگر یہی صورت حال ہے تو بال تراشنے کی بنیاد پر سکھ طلباء کو داخلہ نہ دینے کی ساری بات غیر متعلق ہو کر رہ جائے

گی، اسی منطق کی بنیاد پر کشمیر میں مسلمان اور شمال مشرقی ریاستوں میں عیسائی بھی اقلیت تسلیم نہیں کیے جائیں گے اور وہ اقلیتی تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکیں گے، اگرچہ اقلیتی حقوق کے بارے میں کام کرنے والے بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مذہبی اقلیتوں کا اعتبار قومی بنیاد پر ہونا چاہئے نہ کہ علاقائی بنیاد پر۔

اب ہمیں اقلیت کی ایک قابل عمل تعبیر کی طرف رخ کرنا چاہئے۔ اقلیت وہ جماعت ہے جو عددی اعتبار سے ملک کی دیگر بڑی جماعت سے کم تر ہے، اول الذکر جماعت اس حد تک کم تر ہے کہ اس کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ اور قدروں کو یا تو قومی پیمانے پر اجاگر ہی نہیں کیا جاتا یا معاشرہ میں اس کی نمایاں حیثیت نہیں ہے، اور یہ کہ یہ جماعت اپنی خصوصیات میں اکثریتی طبقہ سے مختلف ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ اقلیتی جماعت اپنی ان خصوصیات کو برقرار اور محفوظ رکھنا چاہتی ہے، اقلیت کی یہ تعریف اکثریت کے تناظر میں عددی طور پر غلبہ اور عدم غلبہ کے طور پر اور اپنی مخصوص شناخت برقرار رکھنے اور یہ جذبہ کہ اس شناخت اور خصوصیات کو برقرار رکھا جائے، پر ہے خواہ وہ اکثریت کے جذبات سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔

۱۹۹۱ء میں مرکزی حکومت نے وسیع پیمانے پر اقتصادی اصلاحات کا جو عمل شروع کیا اس کے اثرات دیگر شعبوں تک بھی پہنچے، اس میں اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کا شعبہ بھی شامل ہے، اس سے پہلے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے اکثر ادارے ریاستوں کی تحویل میں تھے، اور صرف مہاراشٹر اور کرناٹک نے ہی اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نجی اداروں کو قدم رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ۱۹۹۰ء میں صرف ۳۳۷ انجینئرنگ کالج ڈگری کی سطح کے تھے جن میں ۶۸۰۰۰ سیٹیں تھیں۔ ۲۰۰۳ء تک ان کالجوں کی تعداد بڑھ کر ۱۲۶۵ ہوگئی جن میں ۳ لاکھ ۸۰ ہزار سیٹیں گریجویٹ سطح کی ہیں۔ اسی طرح مینجمنٹ (ایم بی اے یا پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ) کی سطح پر تعلیم دینے والے پیشہ ورانہ کالجوں کی تعداد بھی جو ۱۹۹۵ء میں صرف ۳۱۲ تھی ۲۰۰۳ء میں ۸۰۳۴ تک پہنچ

گئی۔ ایم سی اے کی تعلیم دینے والے اداروں کی تعداد ۱۹۹۷ء میں ۱۴۶۲ تھی جو ۲۰۰۳ء میں بڑھ کر ۱۳۰۸ تک پہنچ گئی۔ اسی سال تک ملک میں ان اداروں میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد ۴۴۰۳ (ایم بی اے) میں تھی۔ ۱۲۵۱۷ نے ایم سی اے میں، ۱۶۴۱۰ نے بی فارما میں اور ۳۴۰۸ نے بی آرکیٹکچر میں داخلہ لیا۔ صرف گزشتہ ۶ سالوں میں ہی پرائیویٹ انتظام اور ملکیت کے تحت چلنے والے اداروں (جن کی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے) کو یو جی سی ایکٹ کے تحت یونیورسٹی جیسی حیثیت (ڈیمڈ یونیورسٹی) عطا کی گئی ہے، گزشتہ پندرہ سالوں میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کا حصہ کیا رہا ہے؟ کیا تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیت (مسلمان) ملک کی تعلیمی وسعت کی پالیسی سے مستفید ہوئے ہیں؟ ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں عدلیہ کا رویہ کیا ہے؟ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کو کالج کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے جانے چاہئیں؟ یہ کچھ مسائل ہیں جن پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سیکولر صوبے اور ملک میں مسلمان اقلیتوں کی حیثیت سے

مقبول احمد سراج ☆

آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ بلا تردید خطے اور صوبے کا مجموعہ ہے جو تہذیب اور عقائد میں گھرا ہے، پچھلے ۲۰۰ سالوں میں سیاسی جغرافیہ نے دنیا کے نقشے میں کافی الٹ پھیر کی ہے، ملک اور صوبے شہنشاہیت اور سلطنتوں میں تبدیل ہو گئے۔ معاصر دنیا میں تقریباً 1.57 ملین مسلمان رہتے ہیں: (۱) تقریباً 56 مما لک میں یہ اکثریت میں ہیں اور اپنی تقدیر کے خود علمبردار ہیں، مگر مسلمانوں کے کل تعداد کا تقریبا تیسرا حصہ اقلیت کی شکل میں بہت سارے مما لک میں رہتا ہے جو مسلم دنیا کے باہر ہے، اس کی وجہ چاہے تاریخی ہو یا معاشی نقل مکانی کی حیثیت سے ہو یا سیاسی وجوہات کی بنا پر، الگ تھلگ مہاجر کی شکل میں ہو، اسکے علاوہ بہت سارے مسلم مما لک ایسے ہیں جہاں غیر مسلم اقلیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ اس کے سیاسی خطہ میں آباد ہیں، خطے کا ایک کثیر حصہ جو مشرق وسطی کہلاتا ہے (جہاں عربی اور اسلام مسلمانوں کی پہچان کا داخلی عنصر ہے) ۲۲ صوبائی مما لک میں بٹا ہوا ہے، نہ تو سبھی عرب مسلم ہیں اور نہ ہی سبھی مسلم عرب ہیں، یہ اس حقیقت کی بھی غماز ہے کہ مسلم ائمہ کی بین الاقوامی بھائی چارگی اور ان کی رائے مانی جاتی ہے اور قومی صوبے ایک حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا، لفظ ائمہ حقیقت میں بڑا جذباتی لفظ ہے اور ہر اس لمحہ میں نافذ کیا جاتا ہے جب مسلم کوئی یکساں مقصد لئے ہوتے ہیں یا ان کے عقائد کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً دانش روزنامہ کے ذریعہ

☆ سنیئر جنرلسٹ۔ بنگلور

شائع ہونے والا مقدس کارٹون پر بہتان تراشی اور سلمان رشدی کی کتاب جس میں آنحضرتؐ کے متعلق تحقیر آمیز باتیں۔ یہ ایک اجتماعی قوت حاصل کرلے اگر اسلام کے مخصوص معاملات پر اس کے عقائد کی بنا پر حمایت حاصل ہو، مگر ملک کی حدود اس کی اجازت نہیں دیتے اور ان پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں، پھر دنیا میں مختلف صوبے یا ملک کی اپنی آئینی حد ہے جس کے تحت عوام کو اس کی پاسداری کرنی پڑتی ہے، سبھی کے لئے یکساں اصول مرتب ہیں، یکساں عقیدے، مذہب اور تہذیب صوبے کے نشیب وفراز کو مکمل حیثیت سے واضح کرتے ہیں مگر جب حکمرانی کی بات آتی ہے تو نسلیات، زبان جو وہ بولتے ہیں اور ماضی کی یادیں (تاریخ) ان میں رخنہ ڈالتی ہیں اور اسی طریقے سے ہر صوبے کی معاشی اور حفاظتی نگرانی ہوتی ہے، اسی لئے اسلامک کانفرنس تنظیم (OIC) کی حیثیت ایک مرکز مباحثہ کی نہیں بلکہ یکساں معاملات پر تبادلۂ خیال کی تنظیم ہے، حقیقت میں یوروپین یونین (.E.U) کے مقابلے میں مسلم ممالک کے لوگوں کی درمیانی زندگی غیر اہم اور پھیکی ہے جو ایسے ممالک کا مرکز بحث (Forum of Discussion) ہے جو بالکل مختلف ہیں اور تاریخی اعتبار سے مشترکہ بے معنی بات پر آپس میں لڑتے اور جھگڑتے ہیں جبکہ او آئی سی (OIC) عدم وجود بنی ہوئی ہے، ایک یکساں کرنسی کے لئے بھی متحد نہیں ہوسکی، ای یو (.E.U) کے پاس کامیابی کے ساتھ یکساں بازار، کرنسی مثلاً یورو اور حفاظتی بلاک ہیں۔

صوبائی قوم کا مسئلہ شاید ہی کسی مسلمانوں کے درمیان تعلیمی توجہ کا مرکز بنا ہو؛ حالانکہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیۓ، مذہبی اقلیتوں سے تعلقات کا سوال زیر بحث ہونا چاہیے، مسلم صوبائی ملکوں میں غیر مسلم اقلیتوں کا سوال زیادہ توجہ کا مرکز ہے جنہیں قرآن اور حدیث نے قانونی تحفظ فراہم کیا ہے جہاں غیر مسلموں کو ذمی کا لقب دیا گیا ہے، مگر غیر مسلم ممالک جیسے انڈیا، روس، چین اور امریکہ اور دوسرے یوروپی ممالک میں رہنے والے مسلم اقلیتوں کا مسئلہ شاید ہی زیر بحث لایا جاتا ہو، قابل رحم حالت میں مسلمانوں کو ان صوبائی ملکوں

میں یہ فائدہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مذہبی اور تہذیبی اداروں کو فروغ دے سکتے ہیں اور اپنے عقائد کے مطابق یادگاریں تعمیر کرواسکتے ہیں، وہ ان سماج میں اپنے کو متحد کرتے ہیں اور اپنے لئے اچھا کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اقلیتیں عوامی آزادی کا لفظ اپنے معاصر اور نام نہاد مسلم صوبائی قوموں سے زیادہ اٹھاتی ہیں، کبھی کبھی پردہ، داڑھی کے ساتھ فوج میں خدمت انجام دینا، رمضان اور مقدس ہستیوں کی تصاویر کا مسئلہ سامنے آتا ہے، یہ انتہا پسند قومی فوج کے ذریعہ نسلی تشدد اور دشمنی کا بھی شکار ہوتے ہیں، مگر مجموعی طور پر حریت پسند بشر جوان ممالک کی نگرانی کرتا ہے ان ملکوں کے قرارداد کے لئے ضرور پائی قانونی اور آئینی سہارا مہیا کراتا ہے، حیران کن حقیقت یہ کہ مسلم اقلیتوں کے بہت سارے مسئلوں کا حل ان حریت پسند بشر کے ذریعہ قائم شدہ اداروں میں مل جاتا ہے بہ نسبت مسلم اقلیت کی جانب سے دانش ورانہ بات چیت کے ذریعہ، بہت سارے مسلم صوبے ہیں جو کٹر اسلامک ہیں، ذمی کا الحاق غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں لاگو ہے جو اپنے ملک کی حدود میں آباد ہیں، مثال کے طور پر کاپٹک عیسائی (Coptic Christions) (جو تقریباً مصر کی آبادی کے چھ فیصد ہیں) مشکل سے ہی اس زمرے میں آتے ہیں، وہ اسی قدر مصر کے باشندے ہیں جتنے دوسرے لوگ جنہیں مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے، کوئی بھی مسلم صوبہ غیر مسلموں پر جزیہ نافذ نہیں کرسکتا؛ کیونکہ قومیت کا انحصار، نسل، خاندان، پیدائش اور لسانی انفرادیت پر ہے نہ کہ فرد کے عقائد پر۔

اسی طرح سے انڈونیشیا میں عیسائی اور ملیشیا میں چینی یا پاکستان میں ہندو ذمی تسلیم نہیں کئے جاتے، حالانکہ زیادہ تر صحیح العقیدہ اسلامک صوبے جیسے ایران، سعودی عرب غیر مسلموں پر ٹیکس نہیں لگاتے، سعودی عرب تو کاروبار پر آمدنی ٹیکس بھی وصول نہیں کرتا خواہ وہ مسلم ہوں، ہندو ہوں یا عیسائی، ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ذمی کا مفہوم دوسرے قانونی معاملہ کو مستحکم کرنے کے لئے کیا گیا تھا جو آج کے زمانہ میں جائز نہیں، کوئی بھی اسلامک یا مسلم

صوبے غیر مسلموں کو تحفظ فراہم کرنے کے عوض میں ان پر جزیہ نافذ نہیں کرتیں، فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر مسلم باشندوں کو کوئی امتیازی حق دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بین الاقوامی عہد نامہ کے تحت جزیہ کو قانونی طور پر جائز ٹھہرایا جاسکتا ہے، ملک کے آئین کے ساتھ وفاداری سب سے بڑا امر ہے کہ آپ اس کے باشندے ہیں بہ نسبت اس کے کہ خدا سے فرمانبرداری کا حلف لیا ہے یا کسی مخصوص عقیدہ سے تعلق ہے۔

غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے بہت سارے مسائل اس لئے رونما ہوئے ہیں کہ یہاں کے مسلم اپنے آپ کو امت کا حصہ سمجھتے ہیں اور پر امید یا مصر ہیں کہ وہ اسلامک اصولوں کے مطابق فرماں روائی کئے جائیں اور ان کا وطن انہیں تمام سیاسی، قانونی سہارا فراہم کرے جس سے وہ اپنی زندگی اسلامک طور طریقوں سے جئیں۔ ایسا ممکن نہیں، ایسا مانا جاتا ہے کہ ان کی موجودگی ان ممالک میں بہت کم ہے اور غیر مسلم ممالک میں مستقل حصہ کے بارے میں انہیں تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسا بھی مانا جاتا ہے کہ یہ جماعتیں ایک بڑے مسلم امت کا حصہ ہوتی ہیں اور غیر مسلم ممالک میں مسلم ممالک کی نوآبادی حیثیت سے مانی جانی چاہئے، کچھ فتوے (مذہبی فرمان) جو اسلامی دنیا کے فقیہ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئے ہیں اس فہم کو مضبوطی فراہم کرتے ہیں۔

تبدیل شدہ سیاق وسباق نے اس مفروضہ کا سوال اٹھایا ہے، مثال کے طور پر مسلم اقلیتوں کو ان ممالک میں محکوم نہیں سمجھا جاتا (جیسے UK, USA, RUSSIA, CHINA, AUSTRALIA, INDIA اور کچھ مغربی یوروپین ممالک) اور نہ ہی مسلم اکثریت کو حکمراں بنایا جاسکتا ہے، ان تمام صوبائی ممالک میں ڈیموکریسی کا نظام ہے اور یہاں کی پالیسی سیکولرزم ہے (غیر مذہبیت ہوئے بغیر) اور کسی خاص عقیدہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، سبھی باشندے یکساں طور پر برابر ہیں، اس قانون کے تحت عوام نہ ہی حکمراں ہوسکتے ہیں اور نہ ہی ان پر حکمرانی کی جاسکتی ہے، تمام عوام آئین اور قانون کے لئے یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور وہ ملک کے

نظام میں اپنے آپ کو مدغم رکھتے ہیں، حقیقت میں اس نظام کے تحت یہاں کے عوام کو خود مختاری حاصل ہے (جو اسلامی ممالک کے نظام سے یکسر مختلف ہے جہاں کچھ عالم دین کے نزدیک خود مختاری کا تعلق صرف خدا سے ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسا نظام اس بات کا ضامن ہے کہ عوام کو قانون کی تشکیل میں برابری کا حق ملے چونکہ مجموعی طور پر صوبہ غیر عقیدہ میں یقین رکھتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ قانون ساز لوگوں کے پاس ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کے تحت وہ فرد کے عقیدہ میں مداخلت کریں، ان سے اس ممکنات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام مذہبی اہتمام نسلیت کے تحت زیر تسلط لائے جاتے ہیں، اس کے برعکس اس معاملہ کے لئے حقوق انسانی اس کی جانچ پڑتال کرتا ہے، تنقید کرتا ہے، ترمیم اور تلافی کرتا ہے۔

پچھلے تین دہائی سے مغربی سماج میں اسلام کی مقبولیت کی خبر مسلم دنیا کی میڈیا میں موج رفتہ کی مانند چھائی ہوئی ہے، یہ ایک مسرت آمیز امر ہے کہ بروسیلس Brussels ، میڈرڈ Madrid اور ڈیٹان Dayton میں مسجدوں کی تعمیر ہو رہی ہے، اسلامی عقیدہ اسکولوں کے نصاب تعلیم میں جگہ پا رہے ہیں، مسلم پادریوں کی امریکہ کی بحری اور زمینی فوج میں تقرری ہو رہی ہے، عید الفطر سے پہلے کی شام کو امریکی پوسٹل ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ٹکٹ شائع کئے گئے ہیں، ہلالی پرچم کا ایک نمونہ وہائٹ ہاؤس (White House) کے باغ کے مختلف جانب لگایا گیا ہے، امریکی نمائندوں کے اجلاس کی شروعات تلاوت قرآن پاک سے ہوتی ہے، ریو ڈے جنیر یو Rio de Jenerio میں ایک اسلامک سینٹر کا افتتاح کیا گیا ہے۔

اسپین کی کورٹ کچھ پرانے اور پیچیدہ معاملہ کو سلجھانے کے لئے اپنے عدالتی حکم نامے میں اسلامی نشریہ کا استعمال کیا ہے، مگر جہاں اسلامک اصولوں کی بازیابی اور ان کے درمیان تصادم، خاندانی مسائل، قانون اور مذہبیات کی بات آتی ہے اور مسلم وجود ان سے متصادم ہوتا ہے تو ان کے اس مقاصد پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے، علیحدگی کے فوبیا اور جذب ہونے کے خوف

سے مسلم انضمام ان معاشروں میں جھولتا رہتا ہے، مثال کے طور پر سیکولر صوبے میں مسلمان فوج میں داخل ہونے پر پرسکون نہیں ہوگا اور ایسی جنگ میں مرنا اس قسم کے قانون کا مسودہ ۹ نہیں لایا جاتا، ایسے مسائل جن میں دو فریقوں کو ورثہ میں برابری کا حصہ ملے، اسلام کے قانونی طلاق نامہ (جس میں شوہروں کو طلاق دینے کا حق ہے مگر عورتوں کے لئے ایسا کوئی نظام نہیں، وہ کورٹ کے ذریعہ اپنا خلع لے سکتی ہیں)، ایک آدمی دو عورتوں کے چشم دید گواہ کے برابر ہے، مسلم لوگوں کو یہ آزادی ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں مگر یہی حقوق عورتوں کو نہیں دئے گئے ہیں کہ وہ بھی کسی دوسرے غیر مذہب سے شادی کر سکیں، اور شرعیہ میں اس کا بھی اہتمام ہے کہ عورت کو عدلیہ کی کرسی پر نہ بٹھایا جائے، یہ چند مثالیں تھیں جو ثابت کرتی ہیں کہ عورتوں کے ضمن میں جانب داری سے کام لیا جارہا ہے، دوسری جانب غیر مسلموں کو اپنے مردے جلانے سے روکا بھی جاتا ہے (ایسا خلیجی ملکوں میں ہورہا ہے) غیر مسلموں کو اسلامی طور طریقے کو قبول کرنے پر مجبور کرنا اور مسلموں کو ان کے عقیدہ سے الگ تھلگ رکھنا (مرتد ہونے کے بنا پر موت کی سزا دینا) یہ تمام باتیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہیں جو قدرت کی جانب سے دیئے گئے پیدائشی حقوق کے بھی خلاف ہیں، اسی طرح صوبے کی پالیسی کے تحت جس میں مسلم اقلیتوں کو برتھ کنٹرول (Birth Control) کی بات کہی جاتی ہے مذہبی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کو اس امر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے جو اکثریت میں رہنے والے ڈیموکریٹک ملکوں کے کہنے پر کیا جارہا ہے، مسلم اقلیتیں برابری کے سلوک کی تبھی خواہاں ہوسکتی ہیں جب اسی طرح برابری کا سلوک غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ روا رکھا جائے اور وہی سلوک جو اسلام نے اقلیتوں کے ساتھ روا رکھا، تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نظام کی عدم موجودگی میں چاہے اچھا ہو یا برا جس قسم کا بھی سلوک مسلم اقلیتوں کے ساتھ روا رکھا گیا وہ اس بات پر زیادہ منحصر ہے کہ موجودہ غیر مسلم حکمراں کا زاویہ نظر کیا ہے، ماحصل گفتگو میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اب

مغربی ڈیموکریسی اپنے قول وفعل میں اور مذہبی عقائد کے معاملے میں نرم مزاجی کا ثبوت دے کر اپنے آپ کو مختلف النوع تہذیب کے سانچے میں ڈھال رہی ہے، مسلم صوبائی ممالک اپنے غیر مسلم باشندوں کو مسلم باشندوں کے مقابلے میں امتیازی حقوق نہیں فراہم کرا پا رہی ہے۔

مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے سامنے یہ اہم اور خاص سوالات ہیں؛ مگر بالآخر مسلم دنیا ان سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار ہے، مغرب کا تصور اب محض علاقائی نہیں یہ اب بین الاقوامی اور تہذیبی اقدار کا حامل ہے، ان اقدار کا پاس دار غیر مغربی ممالک کو بھی ہونا چاہیے اور اپنے یہاں مغربی تعلیم مغربی قانون، مغربی میڈیا اور مغربی دواؤں کا نفاذ کرنا چاہیے۔

نوٹس اور حوالے:

بین الاقوامی مسلم آبادی کے زاویہ نظر سے مسلمانوں کی آبادی 1.57 بلین ہوگئی ہے، بین الاقوامی مسلم آبادی کی جسامت اور تقسیم کاری پر ایک رپورتاژ۔ پیو ریسرچ سینٹر فورم آن ریلیجن اینڈ پبلک لائف۔ واشنگٹن ڈی سی کے ذریعہ نیا مطالعہ۔ وہ اقلیتیں ہیں۔

اس ادراک کی مثال مسلم اقلیتیں ہیں مسلم بود و باش کے متعلق مرحوم شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین کا فتوی جو دو بار سعودی کے مفتی تھے، کتاب اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ اسلام کے اصولوں پر سختی کے ساتھ پابند ہوا جائے چونکہ مسلمانوں کا یہ سب سے اہم فریضہ ہے، یہ اصول ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو اقلیتوں کی حیثیت سے ہیں، مسلم اقلیتوں کو درپیش مسائل سے آگاہ رہنا چاہیے، اور وہ مسلم جو اقلیتوں کی حیثیت سے رہ رہے ہیں انہیں صبر کی تلقین کرنی چاہیے، اگر یہ ممکن نہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کے لئے منع کیا ہے اس کی رزق تلاش کریں خاص طور سے مرد و عورت کے باہم رشتے ایسی رزق سے انحراف کرنا چاہیے۔

۲-غیر مسلم خواتین سے مسلمانوں کی شادی کے ضمن میں حوصلہ شکنی۔

۳-عیسائیوں یا ان کے مذہبی تہواروں پر انہیں مبارکباد دینے سے رد کنا۔

۴-اور انہیں اس بات کی اجازت دینا کہ وہ طلاق جیسے مسئلوں کے لیے غیر مسلم کورٹ سے رجوع کر سکتے ہیں؛ اگر اسلامی قانون نے انہیں اجازت دی ہے یا یہ امر اسلامی قانون کے تحت ہے۔

۵-مسلم اقلیتیں اپنے پرانے اصولوں سے انحراف نہیں کرتیں کچھ مخصوص حالتوں میں، جہاں انہیں رعایت دی گئی ہے وہ محض عارض ہیں ورنہ اسلامی قانون کے سامنے انہیں جواب دہ ہونا پڑتا ہے، مثال کے طور پر غیر مسلم افواج میں تصاویر اور خدمات کی ترسیل وابلاغ، اس فہم میں اسلامی قانون کی اطاعت ضروری ہے اور جو قانونی ماہرین ہیں ان کی پاس داری بھی جماعتوں کی تنظیم کے لیے ضروری ہے جس سے مقصد کی حصولیابی ممکن ہو سکے، عام طور پر مسلم اکثریت والے ملکوں کے امداد کے بغیر یہ ممکن نہیں، یہ کتاب مسلسل اس بات پر زور دیتی ہے کہ دانشور اور ناصح مسلم اقلیتوں کے پاس جائیں چاہے انہیں خیر و عافیت کے سلسلے ہی میں کیوں نہ جانا پڑے، غیر عقائد ممالک میں جانے پر پابندی ہے، ابن باز مسلم حکمرانوں اور دولت مند لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں ''کہ مسلم اقلیتوں کو جس طریقے سے بھی فائدہ بہم پہنچا سکیں کریں وہ چاہے تقریر یا وعظ کی شکل میں ہو یا امدادی شکل میں یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

دونوں مفتی یقیناً اس طور طریقے کے پابند ہیں، اور جہاں تک عالمی سطح پر قانون کا مسئلہ ہے اس سے بھی نالاں ہیں جس کے تحت ''دشمن ممالک'' کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔

۶-مسلم اقلیتوں کے لئے قیام گاہ۔ بعض مخصوص مقامات پر ابن باز نے اصطلاح کا ادبی مفہوم نہیں لیا ہے۔ ''اسلام کا گھر'' اور ''جنگ کا گھر'' (اصطلاح شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین، مسلم اقلیتیں۔ مسلمانوں کے حالات زندگی کے لئے جو فتویٰ اقلیت کی حیثیت سے ہیں۔ (لندن میسیج آف اسلام ۱۹۹۸)۔

جبکہ منصوبہ بندی اکثریت والے ممالک جیسے ترکی، نائجیریا، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور ایران میں نافذ ہے، ہندوستان میں رہنے والے مسلمان اسے مذہبی عقائد کی بنیاد پر رد کرتے ہیں Sundivisian.com کے عبدالملک مجاہد کے نزدیک مسلم ممالک میں کرسمس کے لئے تعطیل ہونی چاہیے خاص طور سے وہاں جہاں عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے مثال کے طور پر انڈونیشیا اور مصر یا ان مقامات یا ممالک میں عیسائیوں کے لئے ایک دن کی چھٹی ہونی چاہیے جہاں ان کی تعداد بہت کم ہے جیسے پاکستان۔

مصر میں کاپٹ کی آبادی چھ فیصدی ہے اور وہ کاپٹک بولتے ہیں، مصر کی زبان قدیم رومن زبان ہے، تاہم مصر کے عربستان بن جانے سے وہاں کے عیسائی عبادت گاہوں میں عربی زبان کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے، کاپٹ ۷ رجنوری کو کرسمس کا تہوار مناتے ہیں جو مصر کے سرکاری چھٹی کا دن ہے، کاپٹوں کے خلاف بنیاد پرست مسلمانوں کی جانب سے تشدد اور بربریت کا بھی معاملہ بڑھا ہے، کاپٹ اس بات کی بھی شکایت کرتے ہیں کہ مصر میں مذہبی خاندانی شادیوں پر پابندی عائد ہونی چاہیے، اگر کاپٹ کسی مسلم خاتون سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مذہب اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، مگر اسی مناسبت سے مصر میں مسلم کے لئے مذہب کی تبدیلی پر پابندی عائد ہے کہ وہ کاپٹ بن جائیں۔

☆☆☆

ہندوستان میں مسلم اقلیت کی صورت حال

پروفیسر ایم، کے، اے صدیقی ☆

کسی ملک میں آبادی کا وہ حصہ جو تعداد میں کم ہوتا ہے اور بقیہ آبادی سے الگ شناخت رکھتا ہے اور جسے اقتدار میں شرکت کے سلسلے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے اقلیت کہا جاتا ہے؛ جبکہ وہ طبقہ جو آبادی کے لحاظ سے بڑی تعداد میں ہوتا ہے جسے سیاسی اقتدار میں اختیار اور غلبہ حاصل ہوتا ہے اسے اکثریت کہتے ہیں۔

غالباً آج دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جو نسلی، مذہبی یا ثقافتی اعتبار سے یکساں نمونہ اور یک جہت ہو؛ لہٰذا ایک ملک کی حدود کے اندر طبقات کی یہ تکثیر ایک عام بات ہے اور عالمی منظر نامہ ہے، ایک معاشرہ میں مختلف طبقات ہونا اور تکثیری اعتبار سے الگ الگ اکائیاں ہونا، یہ ایک ملک کی حدود اور حدود سے ماورا بھی وجود میں آتا ہے، کبھی کبھی مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد اکٹھے ہو کر کسی محدود علاقے میں آباد ہو جاتے ہیں، بعض اوقات یہ لوگ ایک مشترک معاشرہ میں مانوس ہو کر یکجہتی سے رہنے لگتے ہیں، باہمی رشتے ناطے بھی قائم کر لیتے ہیں حالانکہ اپنی مخصوص شناخت کو برقرار رکھتے ہیں اور اس پورے معاشرہ میں علیحدہ پہچانے جاتے ہیں، ریاست اور مواقع کے حصول کے اعتبار سے ان کا مخصوص طرز انہیں عددی لحاظ سے ذہ مقام عطا کرتا ہے جس کی بنیاد پر نسلی غلبہ یا اقلیت کہا جاتا ہے۔

ان دو اصطلاحات یعنی غلبہ اور عددی طاقت میں اول الذکر ثانی الذکر کے مقابلے میں

☆ سابق ماہر علم الانسان انتھرو پولوجیکل سروے آف انڈیا

زیادہ اہم ہے جو غلبہ یا اقلیت کا مفہوم متعین کرتا ہے، مثال کے طور پر آزادی سے قبل جنوبی افریقہ میں سفید نسل کے لوگ عددی لحاظ سے اقلیت میں تھے لیکن معیار کے لحاظ سے انہیں غلبہ حاصل تھا کیونکہ جنوبی افریقہ کے کالے لوگ اپنی عددی اکثریت کے باوجود طبقہ کے ظلم اور ہر قسم کی پسماندگی کا شکار رہتے تھے، اسی طرح بعض اعتبار سے امریکہ میں آباد یہودیوں کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے حالانکہ وہ امریکہ کی مجموعی آبادی کا صرف ۲ فیصد ہیں تاہم امریکی سیاست میں انہوں نے وہ غلبہ اور اہمیت اختیار کرلی ہے کہ وہ اکثریت کی طرح غلبہ رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ۱۳۸ ملین (۱۳ کروڑ ۸۰ لاکھ) ہے اور انڈونیشیا کے بعد وہ یہاں سب سے بڑی تعداد میں ہیں اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، بعض لوگ انہیں دوسری اکثریت بھی کہتے ہیں، لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مسلمان ملک کی مجموعی آبادی میں صرف ۱۳ء۴۳ ہیں جبکہ ہندو آبادی ۸۲ کروڑ ۵۷ لاکھ ہے یعنی وہ مجموعی آبادی کا ۸۰ء۴۶ فیصد ہیں، سیاسی، اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے ان کا ملک پر پورا کنٹرول ہے، یہ صحیح ہے کہ ہندو سماج بھی طبقات میں تقسیم ہے اس میں بھی ترقی یافتہ اور پسماندہ طبقہ کے لوگ ہیں لیکن مسلمان سماجی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے بے حد پسماندہ ہیں، ہر شعبہ میں وہ پچھڑے ہوئے ہیں اور اکثر فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہوتے ہیں، ماہرین سماجیات کا خیال ہے کہ مسلمان تنزل کی راہ پر گامزن ہیں؛ کیونکہ ہر جگہ وہ امتیاز کا شکار ہوتے ہیں لہٰذا کسی بھی اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کو اقلیت کے زمرہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا نہ انہیں دوسری اکثریت سمجھا جاسکتا ہے۔

اقلیتوں کو عددی اعتبار سے اہم اور غیر اہم کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، غیر اہم اقلیتوں کو عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے، ان چھوٹی اقلیتوں کو امتیاز کا نشانہ نہیں بننا پڑتا جبکہ عددی اعتبار سے بڑی اقلیتیں اکثر میدانوں میں امتیاز اور مشکلات سے دوچار ہوتی ہیں، ہندوستان میں عیسائی، سکھ، پارسی، بدھ، جین اور آرمینائی چھوٹی اقلیتیں ہیں اور نسبتاً غیر اہم ہیں جبکہ

مسلمان اہم اقلیت ہیں، جینیوں، بدھوں بلکہ سکھوں سے بھی اکثریت کا رشتہ شعوری یا تحت الشعوری طور پر ثقافتی قربت کی بنیاد پر قائم ہے جبکہ مسلمانوں سے رشتہ کو ثقافتی علیحدگی کی بنیاد پر دیکھا جاتا ہے، تاریخ بالخصوص برٹش تاریخ نگاری بھی اس بارے میں ایک اہم عامل ہے؛ حالانکہ ثقافتی، لسانی، نسلی، معاشرتی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کافی قریب ہیں۔

ہندوستان میں مسلم اقلیت:

ہندوستان کے مسلمان اقلیت ہونے کی ایک عجیب مثال ہیں، سماجی، نسلی، لسانی اور معاشرتی وثقافتی اعتبار سے وہ ملک کے وسیع معاشرہ سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں؛ بلکہ اکثریتی طبقہ سے بھی کچھ بہت زیادہ الگ نہیں ہیں لیکن مذہبی اعتبار سے وہ قطعی طور پر ایک ممتاز فرقہ ہیں، اس لحاظ سے وہ عددی طور پر اور سیاسی طور پر بھی اقلیت کی ایک مکمل مثال ہیں۔

اکثریت اور اقلیت کا تعین کرنے کے لئے عددی اعتبار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض اسکالرز کا کہنا ہے کہ کیونکہ ہندو سماجی اعتبار سے متعدد ذاتوں میں تقسیم ہیں اور ان مختلف طبقات میں سے کوئی بھی اکثریت ہونے کا جواز پیش نہیں کرسکتا لہٰذا انہیں اکثریت نہیں سمجھا جانا چاہئے لیکن اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ جس طرح ہندو معاشرہ طبقاتی ومعاشرتی طور پر تقسیم ہے، اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں میں بھی یہ معاشرتی امتیاز موجود ہے، لیکن دستوری دفعات کے باوجود ہندو مسلم تعلقات میں غالب اور مغلوب کی واضح علامات موجود ہیں، لہٰذا اصطلاح کے مفہوم کے تحت اول الذکر اور آخر الذکر اکثریت اور اقلیت میں ہیں۔

دنیا کے ممالک میں اکثریت اور اقلیت تعلقات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اکثریتی طبقہ اپنے آپ کو ریاست کا والی سمجھتا ہے اور اقتدار نیز خوشحالی میں اقلیت کو شریک کرنے پر آمادہ نہیں ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اقلیت پر کنٹرول قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے صورت حال اور بگڑتی ہے اور ترقی میں رکاوٹ ہوتی ہے، ماہرین

سماجیات جو اختلاف زدہ غالب طبقہ اور اقلیت کے رشتہ کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ان باتوں کو غیر منطقی اور فضول قرار دیتے ہیں، لیکن جب تک عقل کی آواز پر دھیان نہ دیا جائے اس صورت حال کو برداشت کرنا ہی ہوگا، غالب طبقہ کا اقلیتی طبقہ سے برتاؤ مندرجہ ذیل امور و اسباب پر ہوسکتا ہے:

۱- اقلیت پر مستقل غلبہ رکھنا تا کہ اقلیت پر کنٹرول قائم رہے۔

۲- اقلیتوں سے پیچھا چھڑانا تا کہ ایک محفوظ زندگی میسر ہو اور دیگر طبقات سے خدشات و مفادات کے سبب کوئی مشکل یا الجھن پیدا نہ ہو۔

۳- اقلیتوں کو مکمل طور پر مطیع اور مغلوب بنانا تا کہ وہ ہر اعتبار سے غیر اہم ہو جائیں اور پھر ان کا بھرپور استحصال کیا جائے۔

۴- اقلیتوں کو حکمت عملی کے تحت محروم رکھنا تا کہ انہیں اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھا جائے اور اپنے مفاد کے لئے ان کا استحصال کیا جاتا رہے۔

اگرچہ ہندوستان میں صورت حال اس قدر تشویشناک نظر نہیں آتی تاہم مذکورہ بالا میں سے تمام باتوں کو یکسر خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اقلیتوں کے بارے میں غالب طبقہ کے کیا عزائم ہیں انہیں واضح نہیں کیا جاتا نہ سیاسی پالیسی کے طور پر انہیں بیان کیا جاتا ہے بلکہ خفیہ طور پر ریاستی اداروں کے ذریعہ انہیں اس انداز سے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ وہ مقاصد خود بخود حاصل ہو جائیں، دستور میں قابل قدر دفعات موجود ہونے کے باوجود ریاستی مشینری اس انداز سے کام کرتی ہے کہ جس سے غالب اور اقلیت کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے خاص طور پر اہم اقلیت جیسے ہندوستان میں مسلم اقلیت ہے، صورت حال پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتا چلے گا کہ:

۱- جیلوں میں مسلمان قیدیوں کی تعداد ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے جبکہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی سے تناسب کے اعتبار

سے بہت کم ہے۔

۲- دوسرے فرقوں کے مقابلے میں غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

۳-مسلمانوں کا پیشہ ورانہ ڈھانچہ اکثریتی طبقہ کے مقابلہ میں مختلف ہے، اس کے متعدد اسباب ہیں جن میں سرکاری سرپرستی کی کمی یا محرومی بھی شامل ہے، دوسرے طبقات کے مقابلہ میں مسلمانوں میں دستکار یعنی خود اپنا کام کرنے والوں کا تناسب زیادہ ہے، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمانوں کو روزی روٹی کے مواقع فراہم کرنے میں ان کی امداد کے بجائے ریاست ان کی حریف بن جاتی ہے۔

۴-تعلیمی اعتبار سے مسلمان دیگر غیر مسلم طبقات سے بہت پیچھے ہیں، اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم میں مسلمان مرد اور خواتین کا تناسب بالکل غیر اہم ہے، اس صورت حال سے ابھرنے کے لئے وہ جو کوششیں کرتے ہیں وہ بہت حقیر ہوتی ہیں، تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی اس پسماندگی کا سبب ان کے پاس وسائل کا نہ ہونا ہے، اس مقصد کے لئے ان کے جو اوقاف ہیں، حکومت ان اوقاف کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتی، حکومت اس کے وسائل کو برباد کرانے اور خیانت وغبن وغیرہ کے ذریعہ بے اثر کردیتی ہے، یہ بات دلچسپ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے روزگار کی فراہمی میں مدد دینے کے بجائے ریاست ان کی حریف بن کر انہیں اقتصادی میدان سے خارج کرنے کا کام کرتی ہے۔

۵- لا اینڈ آرڈر مشینری (انتظامیہ) اکثر مسلم نوجوانوں کی تاک میں رہتی ہے، فرضی اور ناجائز طور پر انہیں پھنسایا جاتا ہے، انہیں بے پناہ اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں، فرضی انکاؤنٹر کا شکار بنایا جاتا ہے اور ان کی خواتین کو بھی بخشا نہیں جاتا ہے۔

۶- ملک کے مختلف حصوں میں اکثر وسیع پیمانہ پر تشدد بھڑک اٹھتا ہے، آزادی کے بعد

سے اب تک مہاراشٹرا، اتر پردیش، بہار وغیرہ میں تشدد کے ایسے ہزاروں واقعات پیش آئے جن میں ریاست کا ہاتھ بھی دیکھا گیا، خطا کار پولیس افسران کو مشکل سے ہی سزا ملتی ہے، بلکہ وہ ترقی سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں، خطا کاروں کو عبرت ناک سزائیں کبھی کبھار ہی دی جاتی ہیں۔

۷- مسلمانوں کے خلاف ہونے والے تشدد کی انکوائری کمیشنوں کی رپورٹیں انتہائی تاخیر سے پیش کی جاتی ہیں، مثال کے طور پر بابری مسجد انہدام کی رپورٹ، اس سے مسلم اقلیت کے بارے میں انتظامیہ کے رویہ کا پتا چلتا ہے، تاخیر کا مطلب ہوتا ہے انصاف سے محروم کردینا۔

۸- بھاگل پور کے مظلوم مسلمانوں کو دہلی کے مظلوم سکھوں کے برابر معاوضہ دینے کی بابت نہیں سوچا گیا۔

۹- متعدد انکوائری کمیشنوں کی رپورٹیں بشمول گوپال سنگھ اعلیٰ اختیاراتی پینل کی رپورٹ، سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ، صرف داخل دفتر کردی جاتی ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ پر عمل درآمد ہونا باقی ہے۔

۱۰- مسلم پرسنل لا میں اصلاح کے نام پر بار بار مداخلت سے مسلمان حیرت زدہ ہیں، کیونکہ یہ اقدامات تکثیری معاشرہ کی روایات کے خلاف ہیں، اس سے ہمارے ملک کے دستور کی روح بھی مجروح ہوتی ہے۔

۱۱- مسلمانوں میں تعدد ازدواج اور کثرت اولاد کے بارے میں مفروضہ اعداد و شمار کو لے کر بہت غوغا آرائی کی جاتی ہے، مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ اور ہندو آبادی سے بھی زیادہ آبادی ہوجانے کے مفروضے سے اکثریت خطرہ محسوس کرتی ہے اور ان کے دلوں میں منفی جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں، اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی آبادی میں اضافہ کا تناسب مسلمانوں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔

متعدد ایسی باتیں ہیں جن سے باہمی اعتماد اور خیرسگالی کے جذبات کو فروغ دیا

جاسکتا ہے لیکن پالیسی سازوں کی زبان پر یہ باتیں نہیں آتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے ملکی مفاد کے مقابلے میں سیاسی اقتدار اور سیاسی اداروں پر قبضہ کرنے کی اہمیت زیادہ ہے۔

مثال کے طور پر پرائمری اسکول سے لے کر سینئر سکنڈری اسکولوں کے نصاب میں اصلاح کا معاملہ ہے، بجائے برٹش تاریخ نگاروں کے چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرنے کے اگر اصل حقائق کو نصاب میں داخل کیا جائے تو یقیناً بہتر ہوگا، کیونکہ انگریزوں کا مقصد تاریخ کو مسخ کرکے فرقہ وارانہ مغائرت کو تیز کرنا تھا، اقلیت کو بھی باہمی رشتوں کے بارے میں زیادہ حساس ہونا چاہئے، ایسے نہ صرف تعلیمی اور اقتصادی میدان میں آگے بڑھنا ہے بلکہ اکثریت کو بھی بیدار کرنا ہے اور باہمی خوشگوار تعلقات کو فروغ دینا ہے، اس طرح ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کرنا ہوگا۔

خوش قسمتی سے ہمارے دستور میں اکثریت واقلیت کے معاملات کے بارے میں بہتر دفعات موجود ہیں، سیکولرزم کو اختیار کرکے تمام طبقات کے مذہبی وثقافتی جذبات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ایک کثیر طبقاتی سماج کی تعمیر باہمی احترام اور رواداری کی بنیاد پر قائم ہے اگرچہ اکثریت کے بعض سیاسی حلقے اس راہ میں حائل ہیں لیکن ملک کے طویل المیعاد مفاد کا تقاضہ ہے کہ ہم حب الوطنی کے جذبہ سے باہمی رواداری، احترام اور بقائے باہم کے اصولوں پر عمل کریں۔

ایک اہم اقلیت کے لئے جمہوری نظام ایک مثبت علامت ہے اگرچہ ان کے تمام مسائل حل نہیں ہوجائیں گے؛ تاہم اگر وہ اپنے ووٹ کا دانش مندی سے استعمال کریں تو اکثریت کو اپنی خامیوں کا احساس ہوگا، ہندوستان کے حالیہ انتخابات میں یہ ذہن خاص طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے لیکن اقلیت کو مجموعی ماحول کا بغور مطالعہ کرکے بہتر سمجھ بوجھ پیدا کرنی ہوگی، اپنے مسائل اور اقتصادیات پر خصوصی توجہ دینی ہوگی، اپنے لئے محبت واحترام کے جذبات کو باوقار انداز میں فروغ دینا ہوگا۔

☆☆☆

اقلیتوں کے حقوق

ایم، ہاشم قریشی ☆

میرے نزدیک لفظ اقلیت کا معنی اس کے علاقائی مضمرات اور سیاق وسباق پر منحصر ہے، علاقائی عنصر کے عکس، خاص طور سے جماعت یعنی مذہب، لسانیات، نسلیات، وغیرہ ہیں، جغرافیائی خطہ میں یہ اقلیت میں شمار کئے جاتے ہیں، یہ علاقائی ڈھانچہ مصغر، درمیانی یا بہت بڑا ہوسکتا ہے، قومی، صوبائی، ضلعی اور گاؤں کی سطح پر اقلیت ہوسکتی ہے، ملک کے سیاق میں بحیثیت مجموعی یا ملک کی صوبائی اکثریت کے لحاظ سے ہندوستان میں مسلمان مذہبی اقلیت میں ہیں، بہت سارے دیہات اور اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں اگر ان کے شمار کو معیار بنایا جائے تو دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جہاں اقلیتوں نے اپنے دفاع کے لئے کوئی معیار نہ بنایا ہو، بدقسمتی سے مذہبی اقلیتیں یکساں طور پر انہیں ممالک میں پائی جاتی ہیں جہاں بہ ظاہر ایک ہی مذہب کے حامی ہوتے ہیں، کوئی مذہب غیر متشکل نہیں، معمولی اختلافات مذہبی جماعتوں میں پیدا ہوتی ہیں جو ان کے دلوں میں خوف پیدا کرتی ہیں، یہ معمولی اختلافات فکر، طور طریقے اور رسومات کے ہوتے ہیں۔ اس طرح سے جب ہم ایک ملک میں اقلیتی حقوق کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہماری توجہ پوری دنیا کے اقلیتی حقوق جو جہاں کہیں بھی ہوں، کی طرف ہونی چاہئے۔

☆ پروفیسر شعبۂ سیاسیات جواہر لعل یونیورسٹی، دہلی۔

اگر ہم ملک کی کل آبادی سے مسلم آبادی کا فیصد نکالیں تو ہندوستان میں مسلم اقلیت، کثیر اقلیت میں ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک جمہوری ملک میں اقلیتوں کو خاص حقوق کیوں دینا چاہیے جو تسلط، معاشی، سیاسی اور سماجی ہر اعتبار سے سماج کی ایک حقیقت ہے، کمزور محض زیر تسلط ہی نہیں ہے؛ بلکہ اس کے خلاف امتیاز سے کام لیا جا رہا ہے، ڈیموکریسی ان لوگوں کو طاقت فراہم کرتی ہے جن کے پاس تعداد ہیں، کسی بھی قسم کا تسلط، امتیاز اور اخراج ناہمواری پیدا کرتا ہے، ناہمواری، پابندی، فلاح اور سماجی رکھ رکھاؤ کی سہولتوں کو مانتے ہیں؛ یہی وجوہات ہیں کہ سماج بحیثیت مجموعی ایسی جماعتوں کو آئینی اور قانونی ضمانت مہیا کرا کر ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، دوسری اثر آفریں حقیقت یہ کہ سماجی طور سے پچھڑا، معاشی طور پر محروم اور سیاسی طور پر طاقتور نہ ہونا ایسی جماعتیں خود ہی ملک کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ہیں، ملک صحت مند نہیں رہ سکتا اگر اس کی چار دیواری میں کمزور اور بیمار جماعتوں کا وجود ہو، اگر چھوٹی انگلی میں کینسر ہو جائے اور اس کا علاج نہ کیا جائے یا اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ پورے جسم کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے، ترقی ایک مجموعی عمل ہے جو سماج کے ہر طبقے میں ہونی چاہیے، ترقی محض ایک خاص طبقہ کے لئے نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہم یکساں طور پر طبقاتی کشمکش پاتے ہیں، ان آویزشوں سے بچنے کے لئے اور ترقیاتی عوامل میں حصہ لینے کے لئے برابری کا انصاف اور موقع فراہم ہونا چاہیے۔

ہندوستان میں آئین نے ملک کے باشندوں کو بہت سارے حقوق مہیا کرائے ہیں، اقلیتی جماعت کے لوگ بھی ان حقوق کا فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ منفرد حقوق ہیں جو اکثریت اور اقلیت دونوں جماعتوں کے لئے یکساں ہیں، یہ وہی حقوق ہیں جنھیں قانونی زبان میں یکساں جاگیر کہتے ہیں، ملک کا آئین صراحت اور یقین کے ساتھ ملک کے ہر باشندے کو اس کے فکر، عقیدہ اور مرتبہ میں برابری کا حق دیتا ہے، کچھ ایسے بھی حقوق ہیں جنہیں ''الگ جاگیر'' کا نام دیا

گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ سماج کے خاص کمزور طبقوں کے لئے ہے، ہندوستانی سماج ایک مجموعی سماج ہے جس میں مختلف تہذیبیں، مختلف زبانیں اور مختلف رسومات ہیں، ان تمام عنصر کی فراہمی اس بات کی ضامن ہے کہ اقلیتی جماعتوں کی انفرادیت قائم رہے، ایک ماہر قانون نے ہمیں بے شمار ایسے حقوق بتائے جو ہندوستان کے آئین میں مختلف آرٹیکلس (Articles) کے تحت ہیں، میں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا؛ کیونکہ میں ان کا ماہر نہیں۔

بہت سی اچھی کتابوں کی طرح ہندوستان کے آئین میں بہت ہی قابل تعریف اہتمام ہے ہمیں ان پر اعتماد ہے، اور ہم انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، میرے نزدیک، زندگی کے حقوق، اپنی چیزوں کا اور اداروں کا تحفظ جو جماعتوں کے ذریعہ بنائی گئی ہیں، بہت ہی ضروری ہیں، یہ تمام لوگوں کا بنیادی حق ہے، جب ہم اپنے حقوق کی بات کریں تو ہمیں چاہئے کہ ہم دوسروں کے حقوق کو بھی عزت کی نظر سے دیکھیں اور ان کے حقوق کی بھی بات کریں، ہمیں جماعتوں کی شکل میں اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور ظلم یا زیادتی کسی بھی جماعت پر ہو رہی ہو خواہ وہ ملک کے کسی بھی خطہ میں ہو، اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے، اگر ہم دوسروں کے ساتھ کھڑے ہوں گے، تو دوسرے بھی ہمارے ساتھ کھڑے ہوں گے، دوسرا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہمیں اپنے حقوق کے متعلق لوگوں کو آگاہ کرنا چاہئے، اگر ہم ان حقوق کے بارے میں نہیں جانتے تو ہم اپنے حقوق کو مانگ بھی نہیں سکتے، حقوق مانگے جاتے ہیں اور اس پر عمل ڈیموکریٹک طریقہ سے مجموعی حصول کی شکل میں ہوتا ہے، ایسا خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ جماعتوں کے حقوق کی حصولیابی کا واحد راستہ، تشدد آمیز مظاہرہ ہے؛ تشدد، تشدد کو بیدار کرتا ہے، جو کچھ ہمیں بات چیت کر کے حاصل ہو سکتا ہے وہ بندوق کی گولی سے حاصل نہیں ہو سکتا، حکومت بہت طاقتور ہوتی ہے اور وقت آنے پر اس کا بے دردی سے استعمال کرتی ہے جس میں بے شمار لوگ موت کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں، ایک مجموعی حصول اور امن پسند مظاہرہ کے لئے ایک پر اثر تنظیم کا ہونا

ضروری ہے، وزارتیں اور کمیشن ایک ڈیموکریٹک ڈھانچہ کے تحت کام کرتی ہیں اور مختلف نوع کے معاملات کو پیش کرنا تنظیم کا مقصد ہوتا ہے، ایسا کہا جاتا ہے کہ علم ہی طاقت ہے، ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو وزیر اعظم کے ذریعہ پیش کئے گئے ۱۵ نکاتی پروگرام کے بارے میں علم رکھتے ہیں، حقوق کو جانے بغیر اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے، ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کے دوران ہر اس بنیادی ڈھانچہ کو نقصان پہنچاتے ہیں جو جماعتوں کے ذریعہ بنایا گیا، ۱۵ نکاتی پروگرام کے D حصہ میں دیئے گئے حقوق کو نافذ کرنے کے لئے ہمیں مانگ کرنی چاہئے، جس میں (i) فرقہ وارانہ فساد سے بچنا، (ii) فرقہ وارانہ جرم اور فرقہ وارانہ فساد کے مہلوکین کی رہائش کی بابت استغاثہ۔

سمینار کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسا نمونہ عمل تیار کرے جو تنظیم کی شکل میں ہو اور وہ بے لوث خدمت کر سکے۔

☆☆☆

مسلم اقلیتوں کے حقوق

پروفیسر سعود عالم قاسمی☆

اقلیت کی اصطلاح بہت زیادہ پرانی نہیں ہے، قدیم بادشاہی نظاموں اور نسلی ریاستوں میں اقلیت اور اکثریت کی تفریق اور ان کے حقوق و مسائل کی تعیین آج کی طرح نہیں ہوتی تھی، یہ اصطلاح جمہوری نظام حکومت کے ارتقاء کے ساتھ ابھری ہے، جمہوریت میں حکومت کی تشکیل شہریوں کی عددی قوت اور رائے دہندگان کی کثرت سے ہوتی ہے، اس لئے اکثریت کو حکومت میں قائدانہ اور حاکمانہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور اقلیت حاشیہ پر ہوتی ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں شہریوں کا کام تعداد پر مبنی طبقہ جو مذہبی، لسانی یا تہذیبی لحاظ سے اپنی الگ پہچان اور خصوصیات رکھتا ہے اسے یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کے حقوق اور مفادات نظر انداز نہ کئے جائیں اور اس کے ساتھ تعصب اور امتیاز نہ برتا جائے، اس امکان کی نفی اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ حکمراں طبقہ عموماً غیر حکمراں اقلیت پر اپنے مذہبی اور تہذیبی اثرات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی تہذیبی خصوصیات کو تحلیل کرنے کی سعی کرتا ہے۔

چنانچہ جمہوری حکومت کو اپنے دستور اور قوانین میں ایسی دفعات اور پیش بندیاں شامل کرنی پڑتی ہیں، جو اقلیتوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے تحفظ کی یقین دہانی کرا سکیں تاکہ اقلیت کے افراد ملک میں پر امن اور باعزت شہری کی طرح جی سکیں، سماج میں مثبت اور مؤثر رول ادا کر سکیں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر کا حصہ لے سکیں، چنانچہ

☆ ڈین فیکلٹی آف سنی تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اقلیت کے مسائل محض ملک کے ایک چھوٹے طبقہ یا طبقات کے مسائل نہیں رہ جاتے بلکہ جمہوریت کے مسائل قرار پاتے ہیں، اسی طرح جمہوری حکومت کی یہ ذمہ داری بھی قرار پاتی ہے کہ وہ اقلیت اور اکثریت کے درمیان سماجی رشتے اور انسانی تعلقات پائیدار بنانے کی کوشش کرے اور ان میں نفرت، امتیاز اور حق تلفی کے رجحانات کو پنپنے نہ دے۔

سوال یہ ہے کہ اقلیت سے مراد کیا ہے اور اس میں کون سے گروہ شامل ہیں، بہت سے سیاسی اداروں اور سماجی دانشوروں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن کے تحت جو ذیلی کمیٹی اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے خلاف امتیازات کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی، جس نے حقوق انسانی کا عالمی منشور تیار کیا تھا اس نے اقلیتوں کے مختلف مسائل کو سامنے رکھ کر اقلیت کی تعریف اس طرح کی ہے:

"اقلیت میں شہریوں کا صرف وہ غیر حکمراں طبقہ شامل ہے جو اپنی منفرد نسلی، مذہبی یا لسانی خصوصیات رکھتا ہے اور ان کا تحفظ چاہتا ہے، وہ خصوصیات جو ملک کی باقی آبادی سے نمایاں طور پر مختلف ہیں"۔

ڈچینین نے اقلیت کی تعریف اس طرح کی ہے:

"ملک کے شہریوں کا وہ طبقہ جس کی تعداد کم ہے، جو ملک میں حاکمانہ حیثیت میں نہیں ہے، جو ان نسلی، مذہبی یا لسانی خصوصیات کا حامل ہے جو ملک کے اکثریت طبقہ سے مختلف ہیں اور جو باہم اتحاد و یگانگت کا شعور رکھتا ہے اور اپنے اجتماعی وجود کی بقا اور اکثریت کے ساتھ مساوات چاہتا ہے"۔

مذکورہ تعریف کی روشنی میں اقلیت کی حسب ذیل خصوصیات ابھرتی ہیں:

۱-تعداد کی قلت، ۲-غیر حاکمانہ حیثیت، ۳-امتیازی شناخت، ۴-اپنی شناخت کے تحفظ کی خواہش، ۵-باہمی اتحاد کا شعور۔

اگر کوئی حکومت صحیح معنی میں جمہوری نظام اور سیکولر مزاج کی حامل ہے تو اسے اپنے قوانین اور پالیسیوں میں اقلیتوں کی مذکورہ خصوصیات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اس کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے کہ ملک کے تمام گروہ کو سکون اور امن حاصل ہو اور وہ ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکیں، حکومت کی حیثیت ایک محافظ اور نگراں ادارے کی ہے جو مساوی طور پر ملک کے ہر طبقہ کے مسائل و مشکلات پر نگاہ رکھتا ہے اور ان کے حل کے لئے ایماندارانہ کوشش کرتا ہے اور کسی بھی طبقہ کو اپنے فیض سے محروم نہیں رکھتا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے سیاسی اور شہری حقوق کے عالمی معاہدہ کی دفعہ ۲۷ کے تحت اقلیتوں کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ جن ریاستوں میں نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیتیں پائی جاتی ہیں ان کے افراد کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو اختیار کرنے اور ان پر عمل کرنے اور اپنی زبان بولنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں قومی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کا اعلامیہ منظور کیا تھا جو اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں پہلا مکمل اعلامیہ تھا، اس میں بہت سے ان مسائل کا احاطہ کیا گیا تھا جن کا سامنا عام طور پر اقلیتوں کو کرنا پڑتا ہے، اسی کے ساتھ ریاستی استحکام میں اقلیتوں کے حقوق کو بھی نمایاں کیا گیا تھا۔

اس اعلامیہ میں یہ باور کرایا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور ترقی ان ریاستوں کے سیاسی اور سماجی استحکام میں اضافہ کرتا ہے جن میں یہ رہتے ہیں، اگر اس اعلامیہ کو پوری طرح اس کے صحیح تناظر میں نافذ کیا جائے تو ریاستوں کے اندر مختلف نسلی، مذہبی اور لسانی گروہوں میں جو تنازع اور تصادم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور جس سے ملک کی تعمیر و ترقی پر منفی اثر پڑتا ہے اسے روکا جا سکتا ہے، کیونکہ اپنے حقوق سے محرومی کا احساس ہی دراصل تنازع اور تشدد کے رجحان کو

فروغ دینے کا سبب بنتا، ہے اور اگر اکثریت کے ساتھ اقلیت میں بھی اپنے انسانی حقوق کے تحفظ کا اطمینان پیدا ہو جائے تو سماجی امن اور ملکی ترقی کی راہ بہت حد تک آسان ہو جاتی ہے، اس لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے ''ایجنڈا برائے امن'' میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا احترام قیام امن میں گروہی تصادم کو روکنے اور تصادم کے بعد بھی استحکام عطا کرنے میں مؤثر رول ادا کرتا ہے۔

ہندوستان ایک قابل ذکر جمہوری ملک ہے، اسے اقلیتوں کا وفاق بھی کہا جاسکتا ہے، اس کے دستور میں تمام شہریوں کو یکساں حقوق، آزادی، مساوات، وجاہت اور انصاف کی ضمانت دی گئی ہے، نسل، مذہب، علاقہ اور زبان کے نام پر تعصب اور امتیاز کی نفی کی گئی ہے، جمہوریت، رواداری اور سیکولرازم یعنی غیر مذہبی جانب داری کو حکومت کا سنگ بنیاد بنایا گیا ہے، یہ بجائے خود اقلیتوں کے ساتھ، تنگ نظری، امتیاز، تعصب اور تشدد کے رویہ کی اجازت نہیں دیتا، اس کے علاوہ دستور میں خاص طور پر اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی اور تعلیمی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔

دستور کی دفعہ ۲۵ تا ۲۸ میں اقلیتوں کو اپنا پسندیدہ مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی شامل ہے، جب کہ دستور کی دفعہ ۲۹ تا ۳۰ میں زبان اور تہذیب کی حفاظت کرنے اور اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کی خصوصی رعایت دی گئی ہے اور ان اداروں کو حکومت کی امداد فراہم کرنے کی بھی حمایت کی گئی ہے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ایسے ذرائع اختیار کرتی ہے اور ایسی مراعات دیتی ہے جو ان کو عام شہریوں کے مساوی لے آئیں تو اسے اقلیت نوازی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ حکومت نے ملک کے دیگر پس ماندہ طبقات کو تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن عطا کر کے سماج کے ترقی یافتہ طبقات کے برابر لانے کی سعی کی ہے، اسی طرح اگر کوئی اقلیت اپنے مذہبی، گروہی، لسانی حقوق کے تحفظ کے لئے پرامن جدوجہد کرتی ہے، اپنے تہذیبی تشخص

اور تعلیمی نظام کے قیام کے لئے کوشش کرتی ہے اور اپنی خوش حالی اور سماجی مساوات کے حصول کے لئے سرگرمیاں انجام دیتی ہے تو اسے قومی دھارے سے علاحدگی اور قومی مفادات کی مخالفت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس کے مقابلہ میں اگر حکمراں جماعت اقلیت کے مذہبی حقوق پر دست درازی کرتی ہے، اس کے تہذیبی تشخص کو پامال کرنے کی اور اس کی زبان کو کاٹنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتی ہے تو اسے اقلیتوں کے حقوق کے قومی اور بین الاقوامی دستور اور آئین کی خلاف ورزی قرار دیا جائے گا۔

آئینی پیش بندیوں اور دستوری یقین دہانیوں کے باوجود یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عملی طور پر اقلیتوں کو بالعموم حکومت اور اکثریت دونوں کی جانب داری اور معاندانہ طرز عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، گویا محض دستوری یقین دہانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ قانون اور پالیسی بنانے والے اداروں اور افراد کا رویہ اقلیت کے بارے میں درست نہ ہو، اور انتظامیہ کا ذہن تعصب، تنگ نظری اور معاندانہ جذبے سے پاک نہ ہو، یعنی نظریہ جب تک عمل میں نہ ڈھلے اس کی افادیت بے معنی رہتی ہے۔

اپنے ملک بھارت میں گذشتہ ساٹھ سالوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ دستور کی دفعات کے حروف تو بہت سنہرے ہیں مگر اقلیتوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں حکومت اور اکثریت کی طرف سے جو زخم لگے ہیں وہ بہت گہرے ہیں، یہاں تک کہ ایک حساس دانشور کو یہ کہنا پڑا ہے:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی ☆ درد بے چارا پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

اس دردناک صورت حال کی حقیقی تصویر سچر کمیٹی کی رپورٹ ہے جسے گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی ہے، یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کے ساتھ ساٹھ سالوں میں مختلف سطح پر جو ناانصافی اور حق تلفی ہوئی ہے اس نے مسلمانوں کو ملک کے سب سے کمزور طبقہ میں پہنچا دیا ہے اور ان کی معاشی حالت کو قابل رحم بنا دیا

ہے، اس ناانصافی کی ایک شکل تو دستور کے علی الرغم ایسے قانون اور پالیسیوں کا نفاذ ہے جن کی زد براہ راست اقلیت کے حقوق پر پڑتی ہے، مثلاً دستور میں کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے اور تبلیغ کرنے کی آزادی دی گئی ہے مگر یہ آزادی ۱۹۵۰ء کے صدارتی حکم نامہ کے تحت سلب کرلی گئی ہے، اس طرح کہ جب کوئی سرکاری مراعات یافتہ دلت اسلام یا عیسائیت قبول کرلیتا ہے تو تعلیم اور ملازمت میں دلتوں کو دی گئی مراعات چھین لی جاتی ہیں، یعنی یہ مراعات ہندو مذہب کے لئے مخصوص ہوگئی ہیں، جب کہ دستور کی دفعہ نمبر ۱۴ جو ملک کے تمام شہریوں کو مساوات عطا کرتی ہے کسی مذہبی وابستگی کو غیر متعلق قرار دیتی ہے، اسلئے تبدیلی مذہب کی صورت میں مراعات چھین لینا دستور کی مکمل خلاف ورزی ہے اور اس کے ساتھ یہ اقلیتوں کی حق تلفی ہے، اس قانون کا مضحکہ خیز عنصر یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں اس حکم نامہ میں ترمیم صرف سکھ مت اور بدھ مت کے لئے کی گئی، اگر کوئی دلت بدھ مت یا سکھ مت قبول کرلے تو مراعات ختم نہیں کی جائیں گی بلکہ صرف اسلام اور عیسائیت اختیار کرنے کی صورت میں ختم کی جائیں گی۔

اسی طرح قومی ملازمتوں بالخصوص، فوج، نیم فوجی دستوں، پولیس اور انتظامی محکموں میں اقلیتوں کو کم سے کم نمائندگی دینے سے متعلق حکومت جو پالیسی اختیار کرتی ہے یا جو سرکاری اہل کاروں کے نام سرکلر جاری کرتی ہے یا اقلیتوں کے اداروں اور تنظیموں پر خصوصی نگاہ رکھنے کی جو ہدایت دیتی ہے اس سے اقلیتوں کے خلاف سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر تعصب اور حق تلفی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ نئی دہلی کی فوجی تربیت کے ایک سرکاری ادارہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اقلیتوں کو فوج میں کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ کیا کوئی قانونی ہدایت ہے؟ تو سربراہ کا جواب تھا کہ قانون نہیں ہے غیر تحریری پالیسی ہے۔

اس کے برخلاف ملک میں برہمنوں کی تعداد ۴ فیصد سے زیادہ نہیں ہے، مگر حکومت اور سیاسی اقتدار میں، اعلی مناصب اور ملازمتوں میں ان کی نمائندگی ان کی تعداد سے کہیں زیادہ

ہے، یہی وجہ ہے کہ مدراس میں یہ تین فی صد ہوتے ہوئے بھی ۹۷ فیصد باشندوں سے زیادہ حقوق ومراعات کے حامل ہیں، اس لئے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مدراس حکومت کو غیر برہمن ہندو کے لئے ریزرویشن کا قانون لانا پڑا، اسی طرح کے قوانین کی ضرورت مسلمانوں کے سلسلہ میں محسوس کی جاتی ہے۔

جمہوری ملک میں اکثریت اور اقلیت کے مابین سماجی وسیاسی کشمکش کا پیدا ہونا انوکھی بات نہیں ہے، آئیڈیالوجی کا اختلاف، مفادات کا ٹکراؤ اور غلبہ واستیلاء کی خواہش اکثر فرقہ وارانہ کشمکش کو جنم دیتی ہے، اور کبھی کبھی اسے تشدد اور تصادم میں تبدیل کردیتی ہے، یہ حکومت اور اس کی انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ غیر جانب دارانہ طریقہ سے اس تصادم کو روکے اور شہریوں کے مابین امن واعتماد کی فضا کو بحال کرے اور ملک کا ماحول زہر آلود نہ ہونے دے، لیکن ہندوستان میں اقلیتوں کے خلاف فسادات کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اکثر پولیس اور انتظامیہ کا رویہ اقلیتوں کے تئیں غیر جانب دارانہ اور بعض حالات میں جارحانہ ہوتا ہے، فسادیوں کی پشت پناہی تو سیاسی گروہ کرتے ہیں اور پولیس انتظامیہ ان کو شہ دیتی ہے، بلکہ کبھی کبھی معاشی، سیاسی مفادات کے حصول کی خاطر خود حکومت کی مشنری فساد برپا کراتی ہے، جبل پور، بھاگل پور، مرادآباد، بھیونڈی، ممبئی، حیدرآباد وغیرہ کے فسادات اس کی مثالیں ہیں، ۱۹۸۲ء میں میرٹھ اور ملیانہ کے فساد میں حکومت کے ملٹری دستہ پی اے سی نے ٹرکوں میں بھر کر مسلمانوں کو ندی کنارے لے جاکر قتل کیا اور ابھی تک ان کے خلاف کارروائی نہیں ہوئی۔

اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں حکومت کا رویہ جب جانب دارانہ اور ناانصافی پر مبنی ہوتا ہے تو اقلیتوں میں بداعتمادی اور احساس کمتری کا رجحان پیدا ہوتا ہے، اس کی زندہ مثال ۱۹۸۴ء کا سکھ مخالف فساد ہے، جو دہلی اور ملحقہ علاقوں میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد رونما ہوا، اس فساد کی متعدد انکوائری ہوئی، متعدد کمیشن بیٹھے اور فساد زدگان کو بڑے مالی پیکج کے ذریعہ مطمئن اور مسرور

کرنے کی کوشش کی گئی، جب کہ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۸۳ء میں نیلی اور آسام کے مسلمانوں کا قتل عام ہوا، عورتیں اور بچے زندہ جلائے گئے مگر نہ تو قاتلوں کو قرار واقعی سزا ملی، نہ فساوزدگان کو سکھوں کی طرح کوئی پیکیج ملا اور مظلوموں کا ہاتھ آج بھی انصاف کے لئے پھیلا ہوا ہے۔

۱۹۹۳ء میں ممبئی میں بم دھماکے ہوئے اس کے ملزمین کی اکثریت مسلمانوں کی تھی، ان کے خلاف خصوصی ٹاڈا عدالت قائم کی گئی، ان پر فرد جرم عائد کی گئی اور ان کو سخت سزا سنائی گئی، مگر اس سے پہلے خود ممبئی میں جو مسلمانوں کی جان و مال پر منظم حملے ہوئے، ان کا قتل عام ہوا جس کی انکوائری شری کرشنا کمیشن کے ذریعہ کرائی گئی، یہ رپورٹ آج تک سرد خانے میں پڑی ہوئی ہے، مقتولین کے وارثین آج بھی انصاف سے محروم ہیں، انصاف کا یہ دوہرا معیار اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور حکومت کی نیت پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کے لئے سب سے بڑا خطرہ ملک میں فرقہ وارانہ فسطائیت کا زہر ہے جسے سنگھ پریوار یعنی آر ایس ایس اور اس کی ذیلی شاخیں مثلاً بی جے پی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل وغیرہ سماج میں پھیلا رہی ہیں، سنگھ پریوار کا نظریہ، ایک زمین ایک قوم اور ایک تہذیب پر مبنی ہے، جو مذہبی اور تہذیبی اقلیتوں کے لئے اپنے اندر گنجائش نہیں رکھتا اور کثرت میں وحدت کی روایت کی نفی کرتا ہے، اس آئیڈیالوجی کو نافذ کرنے کے لئے اقتدار کی ضرورت ہے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے ملک کے شہریوں کا مزاج فرقہ وارانہ بنیاد پر ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۸۲ء میں پارلیمنٹ میں بی جے پی کے صرف دو نمائندے تھے، ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں انکے فکری رہنماؤں کی میٹنگ میں مشورہ کیا گیا کہ اقتدار پر قبضہ جمانے اور اپنے نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے کونسی تدابیر اختیار کی جائیں، طے پایا کہ ایودھیا کے رام مندر کا مسئلہ سڑکوں پر لایا جائے اور بابری مسجد توڑ کر رام مندر کی تعمیر کا اعلان کیا جائے، اس طرح رام کے نام پر اکثریت کی حمایت حاصل ہو سکے گی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول بھی

پیدا ہوگا۔

بی جے پی نے ایجنڈے پر عمل کرنا شروع کیا، رتھ یاترا نکالی گئی، پورے ملک میں اشتعال انگیزی کی گئی بالآخر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد شہید کر کے رام للا کی مورتی نصب کردی گئی، اور پھر بی جے پی اقتدار میں آنے میں کامیاب ہوگئی، ملک کی تاریخ میں یہ سیاہ دن صرف اس لئے نہیں تھا کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی عبادت گاہ کو مسمار کیا گیا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، بلکہ ملک کے سیکولرزم، رواداری، انصاف اور مساوات کے اصولوں کو روند ڈالا گیا جس پر حکومت کی عمارت کھڑی ہے اور اس دستور کو پامال کیا گیا جو شہریوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب و ثقافت کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، جب ملک کے باشندوں کو اس نفرت انگیز سیاست کے ہاتھوں مذہب کے استحصال کا اندازہ ہوا تو فسطائی طاقت کو اقتدار سے باہر کردیا گیا مگر بی جے پی نے ۲۰۰۱ء میں گجرات میں اس سے بڑا خونی کھیل کھیلا اور دوبارہ اقتدار میں آنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، مسلم عورتوں کی عصمت دری کی، ان کو زندہ جلایا اور ان کی املاک و جائیداد کو نذر آتش کیا اور اسے بی جے پی کی لیبارٹری کا نام دیا گیا، اس قتل عام کے ذمہ دار وزیر اعلی کو یو پی اے کی صدر مسز سونیا گاندھی نے "موت کے سوداگر" کا خطاب تو دیا مگر سزا نہیں دی۔

اقلیتوں کے خلاف سنگھ پریوار کی اشتعال انگیزی ہنوز جاری ہے، صرف افراد اور لہجے بدلتے رہتے ہیں، اب ملک کی عدالت عظمی نے اقلیتوں کو انصاف دلانے کی طرف پیش قدمی کی ہے مقدمات کی از سر نو پیروی ہوئی ہے اور اقلیتوں کو یہ احساس ہوا ہے کہ حکومت کے ظلم کے خلاف انصاف حاصل کرنا ممکن ہے۔

ہر چند جج حضرات کا ذہن بھی اس ماحول سے متاثر ہوتا ہے، جو ملک میں فرقہ پرست عناصر بناتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقلیتوں کی تہذیبی علامات مثلاً ڈاڑھی اور برقعے کے استعمال

کو فاضل جج کا طالبانائزیشن سے تعبیر کرنا، کسی شہر کی مسجد کی تعمیر پر اس لئے روک لگانا کہ اس سے شہر کی رونق متاثر ہوگی (جیسا کہ گڑگاؤں میں ہوا) کبھی مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا شوشہ چھوڑنا اور کبھی فاضل جج کا ہندوتو کو طرز حیات قرار دینا جیسا کہ جسٹس ورما نے مہاراشٹرا کے شیو سینا لیڈر جوشی کے کیس میں کیا، وغیرہ ججوں کا کمزور پہلو ہے، ان تمام کمزوریوں کے باوجود اقلیتوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دستور کی حفاظت اور انسانی حقوق کی ضمانت عدالت ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف ناانصافی کا نیا روپ دہشت گردی کی شکل میں سامنے آیا ہے، انسداد دہشت گردی کے نام پر سیکڑوں بے گناہ مسلم نوجوانون کو ٹارچر کیا گیا اور ہزاروں کو جیل میں ڈالا گیا، کوئی ہوشمند انسان دہشت گردی کی حمایت نہیں کرسکتا، مجرم کو سزا ضرور ملنی چاہئے، مگر بے گناہ مسلم نوجوانوں کو جھوٹے الزام لگا کر پھنسانا ملک کے سیکولر مزاج کے خلاف ہے، المیہ یہ ہے کہ اس الزام میں زیادہ تر تعلیم یافتہ، ہنرمند اور ہوش مند نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، تاکہ مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوجائے، ان کی آواز دب جائے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے وہ کھڑے نہ ہوسکیں۔

اس قضیہ کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ جب اقلیتوں کا کوئی سرپھرا فرد یا گروہ کوئی تشدد آمیز حرکت کرتا ہے تو اسے دہشت گردی قرار دے کر اس کو ٹاڈا، پوٹا وغیرہ کے تحت عبرت ناک سزا دی جاتی ہے، اور جب یہی کارروائی اکثریت کا کوئی جارح طبقہ کرتا ہے تو اسے صرف فرقہ پرستی کا نام دیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ اقلیت کی فرقہ پرستی کو دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے اور اکثریت کی فرقہ پرستی کو قوم پرستی کا تقاضا سمجھا جاتا ہے، ورنہ ملک کے کسی بھی طبقہ اور فرقے کے خلاف منظم اور مسلح جارحانہ کارروائی دہشت گردی ہے، کیونکہ اس کا مقصد دوسرے گروہ کو دہشت زدہ کرنا اور ان کے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا ہے، اور یہ موجودہ

نام نہاد دہشت گردی اور منظم فرقہ وارانہ جارحیت دونوں میں مشترک ہے، لہذا ملک کے دستور اور سیکولر کردار کے اعتبار اور وقار کا تقاضا ہے کہ کسی بھی فرقہ کے خلاف منظم اور مسلح جارحیت ہو تو اسے دہشت گردی قرار دیا جائے، اور اس کا نفاذ گجرات اور مہاراشٹر اور اڑیسہ کے فساد بھڑکانے والوں پر یکساں طور پر کیا جائے۔

اقلیتوں کے حقوق اور ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ☆

ہندوستان میں مسلمان تاریخی اعتبار سے تیرہ سو سال سے رہ رہے ہیں، انہوں نے اس ملک میں تہذیب وثقافت، علم اور تمدن کو فروغ دیا، یہاں کی زراعت، صنعت اور سڑکوں کو ترقی دی، یہاں کے رہنے والوں کے درمیان محبت وخلوص، انسانی وحدت، انصاف ومساوات کو بڑھاوا دیا اور مذاہب کے احترام کے ساتھ جبر کے بغیر دین کی تبلیغ کی، جو لوگ دین اسلام سے دور تھے اور اس کو نہیں مانتے تھے ان کے بارے میں اعلان کیا "لکم دینکم ولی دین" (تمہارے لیے تمہارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین)، اس پورے عرصہ میں انہوں نے عقیدہ اور عبادت میں اختلاف کے باوجود خدمت وتعاون میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ ملک کے تمام باشندوں کے ساتھ ہمدردی ومحبت کی شاندار روایتیں قائم کیں، ماضی کی خانقاہیں اور مدارس اس کی علامت ہیں، اس مبارک کوشش کے نتیجہ میں یہاں کے باشندوں میں آپسی محبت وبھائی چارگی نے اپنی جڑیں گہری کیں اور مسلم بادشاہوں کی مضبوط سلطنت اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے باوجود ایک ایسی محبت بھری تہذیب وجود میں آئی جسے گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا گیا، انگریزوں کے عہد سے پہلے ہندو مسلم منافرت نہیں تھی اور نہ انسانیت کش فسادات ہوتے تھے، عام لوگوں میں انسانی جان ومال کے احترام کا تصور زیادہ تھا اور سلاطین ونواب بھی اسی تصور کے پروردہ تھے، علماء وصوفیاء ودیگر خواص کا مسلک بھی یہی تھا، اس لیے ملک میں امن

☆ ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

وامان تھا اور لوگوں میں ایک دوسرے سے آپس میں قومی سطح پر خوف وہراس نہیں تھا بلکہ محبت ویگانگت تھی۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان طویل صدیوں میں مسلمان بحیثیت ایک ملت عددی اعتبار سے اکثریت میں نہیں رہے، مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی حیثیت سماجی اور سیاسی طور پر ایک مضبوط اور غالب ومنصف ملت کی رہی، اس عرصہ میں دینی اعتبار سے مسلمانوں کی مساجد اور مدارس کی تعمیر وسرپرستی زیادہ تر مسلم بادشاہوں اور نوابوں نے کی، البتہ انگریزوں کے غلبے کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کی حیثیت ایک مجبور ومغلوب اور مظلوم طبقہ کی ہوگئی، ڈیڑھ سوسال کے اندر ہی ان کی صنعتیں، مدارس اور تعلیم گاہیں اجڑ گئیں، انگریزوں نے تاریخی طور پر ایسی کتابیں لکھوائیں جن میں مسلم حکومتوں کے بارے میں ظلم اور جبر کی بے سروپا کہانیاں پھیلائیں، اس نے یہاں کے ہندو مسلم فرقے کے آپسی محبت اور بھائی چارے کو نقصان پہنچایا اور فرقہ وارانہ تشدد وتصادم کو ایسا بڑھایا کہ اس نے ایک بھیانک شکل اختیار کی جس کے بعد بالآخر ملک تقسیم ہوگیا۔

دستوری حقوق:

آزادی کے بعد ہندوستان کا ایک ایسا دستور مرتب کیا گیا جس میں بنیادی طور پر اس ملک کو سیکولر ملک قرار دیا گیا اور یہ سیکولرزم ہمارے دستور کا ایک ایسا اصولی اور اساسی حصہ قرار پایا جس کو کبھی بدلا نہیں جاسکتا ہے۔ دستور کی ابتدائیہ میں یہ کہا گیا ہے:

''ہم ہندوستان کے عوام ہندوستان کو ایک خود مختار سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوریہ کے طور پر قائم کرنے کا مقدس عہد کرتے ہیں اور اس کے تمام شہریوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف حاصل ہوگا، تمام شہریوں کو اظہار خیال اور عقیدہ، ایمان اور عبادت کی آزادی حاصل ہوگی، سبھوں کو منصب اور مواقع کی برابری حاصل ہوگی اور ان کے درمیان بھائی چارہ بڑھایا جائے گا، ہر فرد کی

عزت کی ضمانت دی جائے گی اور ملک کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھا جائے گا"۔

دستور ہند کے ابتدائیہ کے علاوہ بنیادی حقوق کے دفعات ۱۴/ ۔ ۱۵ ۔ ۱۶ ۔ ۱۹ ۔ ۲۱ ۔ ۲۵ ۔ ۲۶ ۔ ۲۷ ۔ ۲۸ میں برابری، عدم امتیاز، اظہار رائے اور مذہبی آزادی، اقلیتوں کو ان کے اپنے مذہبی ورفاہی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے، اسی طرح دفعہ ۲۹/ ۔ ۳۰ میں زبان، رسم الخط اور ثقافتی اداروں کے قیام اور اس کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے اور سیکولزم کو یہاں کی مختلف لسانی، مذہبی اور علاقائی گروہوں کی دینی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی تنوع کی بنیاد پر ملک کی لازمی ضرورت سمجھتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔

اقلیت واکثریت:

آزادی کے بعد سے اقلیت واکثریت پر بحث ہوتی رہی ہے، یہاں اقلیت کی اصطلاح میں وہ تمام غیر دستاویزی گروہ شامل ہیں جو ملک کے کسی بھی ریاست میں اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں اور جو اپنی نسلی، مذہبی یا لسانی روایات وخصوصیات میں باقی ماندہ آبادی سے مختلف ہیں، ہندوستان میں عام طور پر مذہبی اقلیتوں میں مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، بودھ، جین وغیرہ شامل ہیں۔

اقلیتوں کے حالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی ملک میں جہاں اقلیتیں آباد ہیں انہیں مختلف طرح کے خطرات ومشکلات درپیش ہوتے ہیں، خاص طور پر معاشی ترقی، سماجی مساوات، زندگی واملاک، سلامتی اور ثقافتی ومذہبی شناخت کے بارے میں وہ عدم تحفظ کے شکار ہوتے ہیں، اکثریت کی طرف سے عملی طور پر اگر انصاف میں کوتاہی ہوتی ہے تو نہ صرف مذہبی ولسانی اقلیتیں عدم تحفظ میں مبتلا ہوتی ہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ احساس محرومی کا بھی شکار ہوجاتی ہیں اور اس طرح کے ماحول میں سماجی طور پر پچھڑے ہوئے دیگر طبقہ کے افراد بھی مذہبی اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود اس کا شکار ہوجاتے ہیں جیسا کہ ہندوستان میں آج بھی مذہبی

اعتبار سے ہندو ہونے کے باوجود شیڈیولڈ کاسٹ اور شیڈیولڈ ٹرائب اس کے شکار ہیں، اس لیے یہی نہیں کہا جاسکتا کہ صرف اقلیتیں ہی ناانصافی کا شکار ہوتی ہیں بلکہ درج فہرست ذات وقبائل کے افراد عددی اکثریت کے باوجود سماجی ناانصافی کا شکار ہیں، اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ کوئی اقلیت احساس محرومی کا ہمیشہ شکار ہو بلکہ مواقع ملنے پر وہ ترقی کی اونچی منزل پر بھی پہونچتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان:

آزادی کے بعد دستوری تحفظ کے باوجود ملت اسلامیہ ہندیہ پسماندگی کی شکار رہوئی، اس بارے میں مختلف کمیٹیوں اور افراد نے جو جائزے لیے ہیں وہ تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں چند تأثرات درج کیے جاتے ہیں:

گوپال سنگھ پینل نے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی محرومی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

"مسلمان بطور ایک گروہ ہر معاملہ میں قومی اوسط کے لحاظ سے غریب وپس ماندہ ہیں، ان کی سماجی کامیابی، ملکی معاملات میں ان کی شرکت، ان کی آمدنی کی سطح، ان کی بچت کی سطح، ان کی تعلیمی کامیابی بالعموم بہت کم ہے۔ ان کے درمیان اسکول چھوڑنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور کامیابی کی شرح نیچی ہے اور یہ چیزیں بلا استثناء ہر علاقے اور ہر سطح کے لوگوں کے درمیان ہیں"۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی کے زیر اہتمام سید شمیم شاہ نے مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کا ایک سروے کیا تھا جس کی رپورٹ میں انہوں نے مسلمانوں کی محرومی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

"ماضی قریب کے بعض سیاسی اور تاریخی واقعات کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے تمام میدانوں میں تعلیم کی کمی اور ملکی سطح پر ہر جانب ہونے والی ترقی سے عدم واقفیت اور

خود کی معاشی پستی کی وجہ سے وہ دائمی طور پر ظلم ومحرومی کے شکار ہیں، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بڑی جماعت پیچھے چھوٹ گئی ہے، دراصل یہ برادری دھیرے دھیرے فائن آرٹ، سائنس وٹکنالوجی اور زبان وثقافت میں ہونے والی تمام ترقیات سے محروم رکھی گئی ہے''۔

۲۰۰۴ء میں لندن اسکول آف اکنامکس کے مشہور ماہر معاشیات لارڈ بھیکو پارکھ نے اپنے مطالعہ میں کہا ہے:

''اگرچہ انہوں نے آزادی کے بعد بالخصوص ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد ترقی کی ہے مگر وہ زندگی کے ہر دائرہ میں قومی اوسط سے بہت نیچے ہیں، ان کے اندر جہالت اور اسکول چھوڑنے والوں کی شرح بہت زیادہ ہے، ان کی بہت چھوٹی تعداد ہی کالج تک کی تعلیم پوری کر پاتی ہے، ان کی اوسط آمدنی ہندوؤں سے کم ہے اور معاشی طور پر خوشحال اور دولت مند مسلمانوں کی تعداد کا تناسب بہت ہی کم ہے، ان کی معاشی طاقت کی کمی خود ان کی معاشی حیثیت سے جھلکتی ہے جس کے نتیجے میں وہ نسبتاً کم سماجی قوت رکھتے ہیں''۔

۲۰۰۶ء میں سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا ہے:

''ہمارے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ریاستوں کے حالات میں (اور ان مسلمانوں کے حالات میں جو اپنے آپ کو او بی سی (OBC) اور دیگر طبقوں میں شمار کرتے ہیں) قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے، اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملاً تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے، درحقیقت زیر غور تمام اشاریوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم وبیش ایس سی، ایس ٹی سے کچھ بہتر مگر ہندو او بی سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں (بیشتر اعلیٰ ذات والے) سے بدتر ہے، کثیر مسلم آبادی والی ریاست مغربی بنگال، بہار، اتر پردیش اور آسام میں یہ صورت حال بطور خاص سنگین ہے، لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان خساروں اور محرومیوں کے باوجود مسلمانوں میں نوزائدوں کی شرح اموات اور صنفی تناسب کم ہے، ترقیاتی خسارے کے علاوہ

مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر یہ احساس موجود ہے کہ ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں الگ تھلگ رکھا جارہا ہے، اس سے مسئلہ سنگین تر ہوجاتا ہے'' (سچر کمیٹی رپورٹ/۲۴۱)۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کی سماجی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دینی صورتحال کے تفصیلی جائزہ اور اس پر بحث کی ضرورت ہے۔

سماجی اور اخلاقی حالت:

جہاں تک سماجی صورتحال کا تعلق ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ سماجی طور پر ہندوستانی مسلمان کئی طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں، پہلا یہ کہ ان کے رہائشی علاقے ترقیاتی مواقع سے محروم ہیں، تشویشناک حد تک غربت نے اکثریت کو گھر کے لیے زمینوں سے محروم کر رکھا ہے، ان کے اپنے گھر کے لیے زمین پچاس فیصد کے پاس بھی نہیں ہے، غربت نے کئی طرح کے سماجی ومعاشرتی خرابیوں کو جنم دیا ہے، ان کے گھروں کا ماحول دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اسلامی نہیں رہا، رہن سہن، تہذیب وثقافت اور شادی بیاہ کے رسوم میں وہ مقامی معاشرہ کے اثرات قبول کرتے جارہے ہیں، ان کے اندر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، شریعت کے مطابق موروثی جائدادوں کی تقسیم اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے جذبات میں کمی کا واقع ہونا قابل توجہ ہے، ان میں اخلاقی خرابیاں جیسے شراب نوشی، کاروبار میں سچائی سے دوری، انصاف اور ہمدردی کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے؛ گرچہ بہت حد تک یہاں کے بسنے والے دیگر طبقات کے مقابلے میں اچھے اخلاق کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔

گھریلو اعتبار سے بعض حساس علاقوں میں پینے کے صاف پانی اور صفائی کی عدم موجودگی نے صحت کے علاوہ انہیں کئی طرح کے سماجی، نفسیاتی مسائل جیسے ذہنی تناؤ، ڈپریشن وغیرہ میں مبتلا کردیا ہے، بعض علاقوں میں ان کی حالت ایسی ہے جیسی جانوروں کی ہوتی ہے، یہ

سب امور انتہائی تشویشناک ہیں، خاص طور پر ایسی آبادیاں جہاں یہ تھوڑی تعداد میں ہیں اور غربت میں مبتلا ہیں ان کی معاشرتی زندگی بھی ویسے ہی ہے، جیسی ایس سی اور ایس ٹی کی زندگی ہے۔

سماجی صورتحال کی بیشتر خرابیاں بدتر معاشی حالت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کی معاشی حالت مختلف میدانوں میں انتہائی تشویشناک ہیں۔

معاشی حالت:

مسلم معیشت کا جہاں تک تعلق ہے تو معاشرہ کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، ان کی آمدنی قومی سطح کی آمدنی سے کافی کم ہے، وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ سرکاری اور پرائیویٹ ایجنسیاں مسلمانوں کو تعاون دیں تا کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکیں، شہریوں کے اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے قرضے ایک اہم ذریعہ ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ملازمتوں میں ان کی حصہ داری چاہے وہ سرکاری سیکٹر میں ہو یا غیر سرکاری سیکٹر میں بہت کم ہے، اسی طرح بینکوں سے ملنے والے قرضوں کی صورت حال کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہے، مختلف رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار فیصد افراد کو بینک قرضوں تک رسائی ہے، بلکہ قابل لحاظ مسلم آبادی والے بیشتر علاقوں کو بینکوں نے منفی علاقہ قرار دے دیا ہے، وہاں کے رہنے والوں کو بینک قرض نہیں دیتے، یہی حال وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت قرضوں کی سہولتوں کا ہے، وہاں بھی مسلمان فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں، اسی طرح قومی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن نیشنل بیک ورڈ کلاس، فائنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور دیگر مالیاتی اداروں کی طرف سے دیئے جانے والے قرضوں کا جہاں تک تعلق ہے تو یہاں بھی بالعموم مسلمانوں کو محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیمی حالت:

جہاں تک مسلمانوں کی عمومی تعلیم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختلف رپورٹوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مسلم طلبہ اور عام مسلمانوں کی خواندگی کی شرح قومی شرح خواندگی سے کم ہے، یہ فرق دیہی علاقوں کے مقابلہ میں شہری علاقوں میں زیادہ ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۶رسال سے ۱۴رسال کی درمیانی عمر والے ۲۵رفیصد مسلم بچے یا تو کبھی اسکول جاتے ہی نہیں اور جاتے ہیں تو درمیان میں ہی تعلیم ترک کر دیتے ہیں، یہی حال اعلی تعلیم کا ہے، دیگر تمام طبقوں کے مقابلہ خاص طور پر شہری علاقوں کے مردوں میں گریجویشن مکمل کرنے کا امکان ایس سی اور ایس ٹی سے بھی کم ہوتا ہے، اور جو گریجویٹ ہوتے ہیں ان میں دیگر طبقوں کے مقابلے مسلم طبقے میں بے روزگاری کی شرح زیادہ ہے، جہاں تک خواتین کی تعلیم کا تعلق ہے شہری علاقوں میں یہ فرق کافی نمایاں ہے، شیڈیولڈ کاسٹ اور شیڈیولڈ ٹرائب کے مقابلے مسلم خواتین کی شرح خواندگی کافی کم ہے، اس کی ایک وجہ مسلم علاقوں میں لڑکیوں کے لیے اسکولوں کی عدم موجودگی ہے، کالج تو اور بھی کم ہیں، اسی لیے مسلمان طلبا و طالبات ہائر سکنڈری اور کالج کی سطح پر نسبتاً زیادہ نقصان میں ہیں۔

تحفظ اور شناخت:

مسلمان مذہبی اور ثقافتی طور پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں، لباس میں عورتیں پردہ کے لیے نقاب استعمال کرتی ہیں اور مرد داڑھی رکھتے ہیں اور ٹوپی استعمال کرتے ہیں، مگر یہ اپنی شناخت کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تحفظ کے مسائل سے دوچار ہیں، بعض ریاستوں میں یہ شکایت ملتی ہے کہ کسی داڑھی اور ٹوپی والے کو بازاروں، ریلوے اسٹیشنوں اور عوامی جگہوں سے انکوائری کے بہانے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔ اسی طرح نقاب پوش مسلم عورتوں کو شکایت ہے کہ

بازاروں، اسپتالوں اور اسکولوں میں ان کے ساتھ سخت اور نازیبا سلوک کیا جاتا ہے؛ یہاں تک کہ پبلک سیکٹر ٹرانسپورٹ بھی محفوظ نہیں ہے، اس تناظر میں مسلمانوں کے لیے اپنے سے باہر کی دنیا بعض علاقوں میں انتہائی غیر محفوظ بنادی گئی ہے، ان کے خلاف ہر سطح پر آوازیں کسی جاتی ہیں اور انہیں شک کے دائرہ میں رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ کسی داڑھی والے مسلمان کو برملا آئی ایس آئی کا ایجنٹ قرار دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا، دہشت گردی سے متعلق کسی بھی سانحہ کے بعد پولیس کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کا اغوا عام بات ہے، مسلم خواتین کی عزت وعصمت خاص طور پر فسادات کے موقع سے مسلم خواتین کو تلاش تلاش کر نشانہ بنایا جاتا ہے۔

دینی حالت:

ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی حالت کو بھی کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا، ان کی رہائش ہندوستان کے ایسے شہری اور دیہی گاؤں اور محلوں میں ہے جہاں عام طور پر نہ مساجد ہیں، نہ مکاتب، نہ اس میں علماء ومبلغین کی آمد ورفت ہے، بہت سی آبادیوں میں یہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں وہ اپنی غربت وجہالت کی وجہ سے دین سے ناآشنا ہیں اور ان کے ایمان کو خطرات لاحق ہیں، بعض جگہوں پر تو صرف ختنہ یا نکاح کی حد تک ہی مسلمان ہیں، وہ حلال وحرام اور پاکی وناپاکی یا نماز، روزے سے بھی ناآشنا ہیں، اگر ہم جمعہ اور عیدین میں شریک ہونے والوں کی بات کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کل مسلم آبادی کے نصف حصے سے کم اس میں شریک ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان نمازوں میں مسلمان مرد ہی شریک ہوتے ہیں، خواتین جمعہ اور عیدین سے بھی محروم ہوتی ہیں، پنجگانہ نمازوں میں دس ہی فیصد مردوں اور عورتوں پر مشتمل اس کی پابند ہیں، رمضان کے روزے البتہ نوے فیصد سے زیادہ افراد رکھتے ہیں جس میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں، جن لوگوں پر زکوۃ فرض ہے پورے ملک میں غالبًا چالیس فیصد افراد ہی اس فریضہ کی ادائیگی پر عمل کرتے ہیں، یہی حالت دیگر احکام شریعت اور ان

کی اخلاقیات کا ہے، ہمارا خیال یہ ہے کہ دس فیصد افراد میں جو دینی پختگی ہے ان میں سے پانچ فیصد تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے باضابطہ دینی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

مسلمانوں کی دینی تعلیم:

انگریزوں کے غلبے کے بعد انیسوی صدی میں برصغیر ہند کے مسلمان جن سنگین مسائل سے دوچار ہوئے تھے ان میں دینی مدارس اور تعلیم کے نظام کا خاتمہ بھی تھا، اس لیے علماء کے سامنے ایک بڑا مسئلہ دین اور تعلیم دین کی حفاظت وفروغ اور دینی شناخت کی بقا کا تھا؛ چونکہ پہلے سے جن مدارس میں علماء خدمت انجام دے رہے تھے نظام حکومت بدلنے سے وہ مدارس زوال کا شکار ہو گئے یا انگریزوں نے ان علماء کو قید وبند کی صعوبتیں دے کر مدارس پر روک لگانے کی کوشش کی، مدارس کی جاگیریں اور اوقاف کو ضبط کر کے ذرائع آمدنی کو مسدود کر دیا جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس ملک کے مدارس بند ہو گئے۔

اس کے بعد علماء نے محسوس کیا کہ مدارس کو عوامی شکل دی جائے اور اسے سرکاری سرپرستی سے الگ رکھا جائے، چنانچہ علماء نے ۱۸۵۷ء کے بعد دینی مدارس قائم کرنے کی تحریک شروع کی اور اس کی بنیاد عوامی چندے پر رکھی، خاص طور پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا، اور دیگر اکابر علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں میں نشأۃ ثانیہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی، یہ کوشش انیسوی صدی سے لے کر بیسویں صدی تک جاری رہی اور اکیسوی صدی میں بھی یہ تحریک جاری ہے۔ اس مدت میں جو مدرسے قائم کیے گئے اس کے اثرات مسلمانوں میں دوررس ہوئے اور مسلمانوں میں نسل در نسل علم دین سے وابستگی کا علماء کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اس کی وجہ سے انیسوی اور بیسوی صدی میں یہاں کے مسلمان اپنی دینی شناخت کو برقرار رکھنے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس تحریک کو دنیا کے ان دیگر ملکوں میں بھی پہنچایا جہاں کے مسلمان بے دینی

کے شکار ہو گئے تھے اور جہاں کے مسلمان مدارس کی حکومتی سرپرستی کے ختم ہونے کے بعد دینی تعلیم کا نظام ختم ہونے سے مشکلات میں مبتلا ہو گئے تھے، علماء نے صرف مدارس ہی قائم نہیں کیے بلکہ اس کے ساتھ ان کی ذات مسلسل طور پر علم اور تعلیم کا مرجع بنی رہی، ان کا گھر لوگوں کے لیے تعلیم گاہ کا کام کرنے لگا، اور اس تعلیمی تحریک سے اسلامی معاشرہ کے ہر طبقہ نے فیض اٹھایا۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی دینی ضرورتیں انہی سے پوری ہوتی رہی ہیں، مدارس ہی سے مساجد کے امام، مکاتب کے معلم، مفتی، قاضی اور دعوت وتبلیغ کے کام کرنے والے افراد ملتے ہیں بلکہ مدارس سے صحافی، اسلامی اسٹڈیز کے اسکالر اور دنیاوی کاموں میں بھی یہاں کے افراد ملتے ہیں جیسے سفارت خانے، ریڈیو، برآمدی تجارت، امور خارجہ اور ثقافتی اداروں کے لیے اردو اور عربی کے افراد مدارس ہی سے آتے ہیں بلکہ کمپیوٹر جاننے کی بنیاد پر اردو اور عربی کے کمپوزر بھی یہی سے ملتے ہیں، ملک کے اندر کی دینی ضرورتیں اسی سے پوری ہوتی ہیں، اس تعلیم وتربیت کے نظام کو اور زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے، امکانات سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مسلسل مشترکہ غور وفکر کی ضرورت ہے، تاکہ ان مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کا علمی معیار اور بلند ہو اور مدارس سے ایسے فقہاء ملت تیار ہوں جو موجودہ دور کے نئے مسائل پر مجتہدانہ نگاہ ڈالیں اور شریعت اسلامی کی ابدیت کو دنیا کے سامنے علمی وعملی طور پر پیش کریں، اس سمت میں جو کام ہونا چاہیے اس میں ابھی بہت کمی ہے، اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی تعلیم کے اس نظام کو اور پھیلائیں اور ان تمام قصبات اور محلوں میں دینی مکاتب کے نظام کو قائم کریں تاکہ وہاں کی نئی نسل دین کی بنیادی تعلیم سے آراستہ ہو۔

ہندوستانی مدرسوں کو درپیش مشکلات:

مدارس اسلامیہ نے بڑی خدمات انجام دی ہیں، یہ نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ رہیں، یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اسلامی

تشخص کی علامت بن گئے ہیں، اسی وجہ سے معاشرہ میں اکثر انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا جانا مسلمانوں کے لیے حد درجہ تشویش کا باعث ہے؛ باوجودیکہ ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، یہ سوچ مسلم فرقہ خاص طور پر اس میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے لیے تباہ کن ہے۔

چند مشورے:

مسلمانوں بلکہ عام انسانوں کی جان ومال، عقل، نسب، عزت وآبرو کی حفاظت اور معاش ومعاد کے مصالح کی رعایت اسلام کے مقاصد میں ہے، موجودہ حالات میں ہندستانی مسلمان جس طرح کے دینی، جانی، مالی، عزت وآبرو وغیرہ کے بارے میں عدم تحفظ کے شکار ہیں اس میں ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ درپیش مسائل ومشکلات کا نہ صرف حل پیش کریں بلکہ عملی طور پر اس میں شریک ہوں۔

(۱) جو مسائل اوپر مذکور ہوئے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق عام انسانوں سے بھی ہے، اس لیے ملک میں امن وامان کی فضا کو برقرار رکھنا اور اس کے لیے کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے، جب تک امن وامان مکمل طور پر سماج کے ہر طبقہ میں قائم نہیں ہوگا اور آپسی نفرت دور نہیں ہوگی اس وقت تک انصاف کا حصول مشکل ہوگا۔

(۲) مسلمانوں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مرکزی وریاستی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا اور ان کے ذریعہ نئی اسکیموں کو نافذ کرانا ضروری ہوگا۔

(۳) چوں کہ ہندستانی مسلمان اپنی تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی کے ساتھ آپس میں متحد نہیں ہیں بلکہ مختلف گروہ اور ٹولیوں میں منقسم ہیں، اس لیے وہ اپنے حالات کی اصلاح کے لیے منظّم کوشش نہیں کر پاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذاتی اغراض ومنافع سے گریز کرتے ہوئے آپس کے اتحاد میں کسی طرح کا رخنہ نہ آنے دیں اور مسلک ومشرب کے

اختلافات کو فرقہ کی شکل میں نہ بدلیں۔

(۴) دینی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے دینی تعلیم کے نظام کو استوار کرنا اور چھوٹے چھوٹے محلے اور قریوں میں مکاتب و مدارس کو قائم کرنا اور معاشرتی اصلاح کے لیے منظم کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے، زکوٰۃ کے نظام کو بھی اجتماعی طور پر شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق جاری کرنے کی ضرورت ہے۔

(۵) مسلمانوں سے متعلق مختلف طرح کی سرکاری وغیر سرکاری جو رپورٹیں آئی ہیں ان کا مطالعہ کر کے ان کے اٹھائے ہوئے نکات پر بحث کرنا اور مسلمانوں میں اپنی حالت کو سدھارنے کے لیے عمومی تحریک چلانا ضروری ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں مسلم اقلیت

مولانا سید شرافت علی ندوی ☆

اس دنیا میں ہر انسان اپنے وجود کا مالک بھی ہے اور محافظ بھی، وہ جس ملک کا بھی باشندہ ہو اسے جینے کا، رہنے سہنے اور اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کا پورا حق ہے، دنیا کے تمام ممالک اور ان کے دستور اپنے ہر شہری کو یہ حقوق اور رعایات دیتے ہیں، کسی بھی ملک میں رنگ، نسل اور مذہب کی بنیاد پر اپنے شہریوں میں فرق کرنے کا کوئی قانون اور جواز نہیں ہے۔

دنیا کے اہل سیاست، قانون ساز، اربابِ عدل وانصاف اور اہلِ علم ودانش کا اس پر اتفاق ہے کہ انسانی اقدار کا احترام کیا جائے اور کسی بھی صورت میں اقلیتوں کو انسانی، اخلاقی اور مذہبی اختیارات سے محروم نہ کیا جائے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں عوام ہی نہیں ارباب اقتدار بھی نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں، بعض ممالک میں تو اقلیت کے افراد کو دوسرے نمبر کا شہری تصور کیا جاتا ہے۔

امریکہ، انگلینڈ، جرمنی اور آسٹریلیا میں ہندوستانی نژاد طلبہ اور دیگر افراد کو گزشتہ دو تین سالوں میں جس طرح قلبی، ذہنی اور جسمانی اذیت کا نشانہ بنایا گیا اور ان میں بھی مسلم افراد کو دہشت گردی کے شبہ میں بالخصوص ستایا گیا ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا ہے، وہ افسوسناک اور قابلِ مذمت ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ ان ممالک میں انسانی اقدار وحقوق کے محافظ ادارے دنیا کے اور دیگر ممالک کے مظالم کی چھان بین تو کرتے ہیں، لیکن خود اپنے علاقہ میں

☆ استاذ تفسیر وحدیث دار العلوم تاج المساجد، بھوپال

ہونے والی انسانی حقوق کی پامالی ان کو نظر نہیں آتی، بعض مرتبہ ان اداروں کے ذمہ دار اور ترجمان مذہبی اقلیتوں پر ہونے والی ذہنی وقلبی اذیتوں کا جواز، آزادیٔ رائے کی بنیاد پر پیش کردیتے ہیں، مذہبی شعائر اور مقدس شخصیات کی تضحیک کو صحافتی آزادی اور ضمیر کی آواز بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیتے ہیں، یہ سب اس وجہ سے ممکن ہورہا ہے کہ نشانہ بنائی جانے والی قوم مسلم ہے اور اس کو اپنے دینی مسلمات کا تحفظ سب سے زیادہ محبوب ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ ودیگر غیر مسلم طبقات کو اسلام اور اہلِ اسلام کو نشانہ بنانے میں سکون محسوس ہوتا ہے اور ایسا ہوتے رہنے کو وہ اپنے مذہب کی بھی ایک خدمت سمجھتے ہیں، یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ آغازِ اسلام سے اب تک جاری ہے، بہت سی قرآنی آیات وشواہد اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔

ہندوستان کی حالت:

ہمارا دیش ہندوستان اس ٹریجڈی سے مستثنیٰ نہیں ہے، نسلی امتیاز تو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا امتیاز رہا ہے، یہاں پسماندہ طبقات اور برادریوں کو شودر، جانور اور زندگی کے حقوق سے محروم مخلوق قرار دیا گیا، حکومت کرنے والے راجا، پجاری اور گیان کے مہارتی سب اس میں مبتلا رہے اور آج بھی آزاد ہندوستان میں بڑی ذات کے دبنگ، چھوٹی ذات کے کمزوروں کے ساتھ یہی معاملہ کررہے ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان کی سیاست کا رخ بھی کچھ اسی جانب ہوچکا ہے، تعجب اس بات کا ہے کہ دونوں فریقوں میں مذہبی اشتراک کے باوجود یہ لعنت صدیوں سے چلی آرہی ہے اور بڑھتی ہی جارہی ہے۔

مسلم اقلیت:

جہاں تک مسلم قوم کا تعلق ہے، ہندوستان میں وہ دنیا کی سب سے بڑی آبادی ہے، لیکن غیر مسلم اکثریت کے مقابلہ میں وہ اقلیت میں ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے غیر منقسم ہندوستان

میں جس میں پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل تھے، مسلم اقلیت کے ساتھ تعصب اور استیصال کا معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا جو تقسیم کے بعد ہو چکا ہے، اس کی وجہ مذہبی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا قیام اور برادران وطن کی اعتقادی منافرت ہے، تقسیم کے بعد کی سیاست نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے، مسلمانوں کے علاوہ یہاں اور بھی اقلیتیں ہیں، لیکن مسلمانوں کو اس وجہ سے خاص ہدف بنایا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکمرانی کی تاریخ بھی ہے، جس کو انگریزوں نے اور متعصب غیر مسلم مؤرخین نے برادرِ وطن کے ذہن میں ہندو کشی اور استحصال کی تاریخ قرار دینے میں پورا زور تصنیفی اور سیاسی طور پر لگا دیا ہے، ان تین وجوہ کے علاوہ ایک اور وجہ مسلم قوم کو نشانہ بنانے کی ووٹ کی سیاست ہے، ایک پارٹی کو ضرورت ہے کہ یہ قوم پٹتی رہے، پستی رہے اور اس کی پناہ میں آتی رہے، دوسری پارٹی مسلمانوں کے ووٹ نہ ملنے کی بنیاد پر ان کے وجود کو ہندوستان کے لئے غیر ضروری سمجھتی ہے اور وجود کو مٹانے، کم کرنے یا بے اثر کرنے کے لئے اس نے کئی محاذ قائم کر رکھے ہیں، اور اب گزشتہ دس پندرہ سالوں سے ''دہشت گردی'' کا عنوان بھی حکومت اور اہل سیاست نے قائم کر دیا کہ اس کی آڑ میں مسلم افراد کو کسی بھی طرح نشانہ بنا دیا جائے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک مسلم اقلیت کو جان ومال، عزت وآبرو، مساجد وشعائر اور زبان وتہذیب کے جو نقصانات ہوئے ہیں، وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ شاید ہی دنیا میں کسی اقلیت کو اتنے برداشت کرنے پڑے ہوں گے، یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

سمجھوتہ سے پرہیز:

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلم اقلیت اپنے تحفظ اور اپنے عقیدہ وثقافت کے تحفظ کے لئے کیا کرے؟ اس کی ذمہ داری علماء، سیاستداں، دانشورانِ قوم اور مسلم تنظیموں کے سربراہوں پر ہے، کوئی ایک گروہ، کوئی ایک مسلم تنظیم اس کی علمبرداری کرے اور

پوری قوم کی اجارہ داری کرے یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں، سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ سیاسی جماعت کی ذاتی ملکیت بننے سے بھی پرہیز کیا جائے، خواہ وہ سیکولر ہو یا غیر سیکولر، گزشتہ ساٹھ برسوں میں جو معلوم اور نامعلوم سمجھوتے رہنمایانِ قوم نے سیاسی جماعتوں سے کئے اس کا شدید خمیازہ پوری مسلم قوم کو بھگتنا پڑا۔

اتفاق ایک اہم ضرورت:

ایک اہم تقاضہ تمام مسلم تنظیموں اور گروپوں میں ''اتحاد'' کا ہے، یہ اتحاد قدرِ مشترک کی بنیاد پر ہو اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے طرز پر ہو، جو ۱۹۷۲ء سے آج تک الحمدللہ قائم ودائم ہے اور اس کے مثبت نتائج بھی مرتب ہوئے، یہ اتحاد خالص مذہبی بنیاد پر قائم ہو اور اس کی پیشوائی وہ علماء کریں جو متفق علیہم ہوں اور اعتدال، سنجیدگی ودوراندیشی میں اپنا امتیاز رکھتے ہوں اور ان کی سیاسی وابستگیاں قابلِ ملامت نہ ہوں۔

ملی وابستگی:

ملت اسلامیہ ہند، کسی بھی برسرِ اقتدار پارٹی یا محروم الاقتدار پارٹی سے اپنی وابستگی سے کہیں زیادہ اپنا تعلق انفرادی واجتماعی طور پر صرف ان دینی جماعتوں، پارٹیوں اور علمی وتعلیمی مراکز سے مضبوط رکھے جو دینی اقدار اور شعائر اسلامیہ کی بنیاد پر قائم ہیں اور ان کے لئے جدوجہد کررہی ہیں، یہ رشتہ ملت اسلامیہ کی اجتماعیت کو قائم رکھے گا اور اس کی سرگرم ومتحرک زندگی کا ضامن ہوگا، یہ مضبوط رشتہ بذاتِ خود ایک محاذ سے کم نہ ہوگا۔

احساسِ کمتری سے نجات:

ہندوستانی مسلم اقلیت، سیاسی، سماجی اور اعداد وشمار کے اعتبار سے اقلیت شمار کی جاتی

ہے اور اکثریت کے مقابلہ اس کی حیثیت اور مقام کمتر سمجھا جاتا ہے، یہ دراصل حوصلہ شکنی کی ایک سازش ہے، اس سے اقلیت میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے اور کچھ نہ کرسکنے کا مرض بڑھنے لگتا ہے، مسلم قائدین بھی اس کو ایشو بنا کر کاسہ لیسی اور دریوزہ گری کے عادی ہوجاتے ہیں، نتیجتاً ایک بے بس قوم کا تصور منظرِ عام پر آتا ہے اور اقدام، مقابلہ اور محاذ آرائی سے گریز کیا جانے لگتا ہے، جبکہ اسی ملک میں دیگر اقلیتیں اپنے چھوٹے بڑے مطالبات اور تحفظات میں حریفانہ انداز اختیار کرتی ہیں اور اپنی حیثیت منوا کر دم لیتی ہیں، اہلِ اقتدار ان کو ایک قابلِ ذکر اور قابلِ قدر اکائی سمجھ کر قانون بھی بناتے ہیں اور سیاسی وسماجی اقدامات کرتے ہیں۔

اکثریتی استبداد:

ایک طویل عرصہ سے غیر مسلم اکثریت، مسلم اقلیت کے خلاف محاذ آرائی اور اقلیت کشی کے منصوبہ پر تسلسل کے ساتھ عمل کررہی ہے، اس مشن میں فرقہ پرست معلوم تنظیموں کے علاوہ بعض مرتبہ سیکولر جماعتیں بھی ہم نوا بن جاتی ہیں، اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ نفرت اور زہرافشانی کو عام کرنے والی یہی تنظیمیں اکثریت میں کیوں مقبول ہوجاتی ہیں، اقلیت پر لگائے جانے والے ان کے الزامات ناقابلِ تردید کیوں ہوتے ہیں؟ جبکہ مسلم اقلیت کے پاس ہر زہر کا تریاق اور نفرت کا علاج موجود ہے، وہ ہے "کردار واخلاق کا عملی مظاہرہ"۔ ضروری ہے کہ نفرت وزہر کا کاروبار کرنے والوں سے مرعوب ہوئے بغیر ان سے ملاقات کی جائے اور قولاً وعملاً نفرت کا جواب محبت سے، آگ کا جواب پانی سے اور مخالفت کا جواب مفاہمت سے دیا جائے، ہمیں سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سبق ملتا ہے کہ مکہ کے مشرکانہ اور معاندانہ ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقلیت میں ہونے کے باوجود کردار واخلاق، امانت ودیانت کے ذریعہ اپنا ایک برتر مقام بنایا اور معاندین اسلام کے لئے فیض رسانی کا سلسلہ جاری رکھا۔

یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنا بھولا ہوا سبق یاد کریں اور برادرانِ وطن کے ساتھ

حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں، برسوں پہلے بھوپال میں ''مسلم مجلس مشاورت'' کے ایک جلسہ میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے فرمایا تھا کہ ''ہمارا، جس قوم سے واسطہ ہے، وہ یا تو نفع کی زبان سمجھتی ہے یا نقصان کی''۔ ظاہر ہے کہ اسلام بذات خود ظلم وتشدد کو ناپسند کرتا ہے، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''خیر کم من ینفع الناس'' ہمارا شیوہ اور شعار رہا ہے، عرب وعجم میں اقتدار کا حصول ہو یا اقلیت میں ہوتے ہوئے تحفظ کا مسئلہ ہو، نفع رسانی کے کردار نے مسلم قوم کو ہمیشہ سرخرو کیا ہے، اسی دیش میں اولیاء کرام اور صوفیاء عظام نے اس صفتِ عالیہ کی بنیاد پر لاکھوں انسانوں کے قلوب سے اسلام اور اہلِ اسلام سے نفرت اور عناد کو ختم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مرحوم اولیاء اللہ کے مقابر ومزارات آج بھی مرجع خلائق بنے رہتے ہیں، یہ کمال اور خوبی ہمارے قائدین، علماء میں ہوگی، تو عوام تک بھی پہنچے گی اور اس کے اثرات وثمرات جلد ظاہر ہوں گے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کا تحفظ کیسے ہو؟

مولانا سید مشتاق علی ندوی ☆

حضرات! سب سے پہلے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ذمہ دار حضرات کو ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے موجودہ نازک حالات میں ملت کے اس طبقہ کو یکجا کرنے کی سعی مشکور فرمائی، جس طبقہ کی دینی حمیت وملی غیرت اخلاقی جرأت، معمولی قربانیاں، صدیوں کے لیے ملت کا مستقبل محفوظ کردیتی ہیں اور جو کام بعض اوقات لاکھوں، کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام دے دیتی ہے۔ (خواص — ملت میں ان کا مقام۔ ص: ۳۲، مولانا علی میاں ندویؒ)۔

اکیڈمی جس اہم اور حساس موضوع پر سمینار منعقد کررہی ہے، اس میں ضرورت ہے کہ اس طبقہ کا ہر فرد دوسرے فرد کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لئے صبر واستقامت کا داعی ومبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان ویقین، اس کا صبر وتوکل، اس کا عزم وحوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو، اس کو دیکھ کر لڑکھڑاتے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند ومستحکم ہوجائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا ایسا ہی مشکل ہوجائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد وتذبذب کے ماحول اور خوف وہراس کے عالم میں صبر وہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت'' (سابقہ حوالہ)۔

حضرات! ہندوستان میں اقلیتوں کے تحفظ اور مسائل کے حل کے لئے ہمارے سامنے

☆ قاضی شہر، بھوپال

دو محاذ ہیں: ایک خارجی اور دوسرا داخلی، ان دونوں محاذوں پر ہم کو پوری بصیرت، ہوش مندی اور دردمندی سے کام کرنے کی ضرورت ہے، چند نکات کی طرف اس اہم و پروقار مجلس میں توجہ مبذول کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

خارجی محاذ:

اقلیتوں کے تحفظ اور مسائل کے حل کے سلسلہ میں سمینار میں ایسی فعال و متحرک اور بیدار کمیٹی کی تشکیل ہونی چاہئے جو اس بات پر نظر رکھے کہ دستور ہند میں جو جو مراعات اقلیتوں کو فراہم کی جاتی ہیں، ان پر کتنا عمل ہو رہا ہے اور دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی حکومت جو ادارے اور پروگرام مرتب کرتی ہے، وہ کس حد تک فعال و موثر ہیں، اس وقت کئی ادارہ حکومت کی سرپرستی میں زیر کار ہیں، لیکن بالکل بے اثر، وہ زیادہ سے زیادہ تجاویز مرتب کرتے ہیں اور ان تجاویز پر بڑا سرمایہ اور وقت لگتا ہے، لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ حکومت بہت سے منصوبوں کا اعلان کرتی ہے، مثلاً یہ اعلان ہوا کہ جہاں بھی 250 مسلمانوں کی آبادی ہو وہاں ایک اردو ٹیچر رکھا جائے گا، لیکن گزشتہ دس سالوں میں ایک بھی تقرری عمل میں نہیں آئی، سرکاری اسکیم ہے کوچنگ کے لئے مدد، لیکن جو ادارے کوچنگ کر رہے ہیں، ان میں ابھی تک کتنے اداروں کو مدد مل سکی ہے، طلبہ کے تعلیمی وظائف کا اعلان ہوتا ہے اور اس میں اقلیت کے افراد کا بہت وقت اور پیسہ لگتا ہے کیوں کہ ہر ایک کے ساتھ ایسی شرائط ہوتی ہیں مثلاً حلف نامہ اور فلاں فلاں جگہ سے تصدیق وغیرہ تو ضرورت مند افراد دوڑ دھوپ کرتے ہیں، لیکن ان کو مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح اوقاف کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ ہے، یہ اور اس طرح کے دیگر معاملات وواقعات جو وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور علاقائی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، مذہبی آزادی دستور ہند نے دی ہے، لیکن کتنے علاقوں کے اندر اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے اور علاقائی افراد متحرک و فعال ہو کر مسائل کھڑے کرتے ہیں، جو سراسر مذہبی آزادی کے منافی ہوتے ہیں، ایسے حالات و مسائل پر برابر نظر

رکھنے اور ان کا معقول حل تلاش کرنے کے لئے سعی مسلسل کی ضرورت ہے۔

داخلی محاذ:

داخلی محاذ پر ہمیں اقلیتوں کے اندر وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جن سے محبوبیت پیدا ہوتی ہے، اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ صفات میں تغیر پیدا کیا جائے اور دعوتی مزاج پیدا کیا جائے، مسلمانوں کو تبلیغ کی جائے، تاکہ مسلمانوں میں اصلاح ہو، تعلق مع اللہ پیدا ہو، ان کے اخلاق درست ہوں، وہ نمونہ بنیں اور اپنے اخلاق سے دلوں کو فتح کریں اور پھر غیروں میں دعوت کو پہنچائیں، انسانیت کا پیام پہنچائیں، جب انسانیت کا پیام پہنچائیں گے تو محبوب بن جائیں گے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بڑے درد سے لکھا ہے کہ "بھائی راستہ یہ ہے اور باقی سب راستے آزمائے جا چکے ہیں، جو قوم دعوت لے کر کسی ملک میں گئی اسے قبول کر لیا گیا، ملک بھی پھولا پھلا اور وہ بھی۔"

آخری بات یہ ہے کہ باہمی طور پر اعتماد واتحاد کی فضا قائم کی جائے، بدگمانی اور افواہ بازی سے مکمل اجتناب کیا جائے اور روٹھنے کے مزاج اور تنگ مزاجی کو بدلا جائے، بات بات پر روٹھے بیٹھے ہیں، اب بالکل دلچسپی نہیں، اب کسی تعمیری کام میں حصہ نہیں لے رہے، دل کھلا ہوا رکھنا چاہئے اور طبیعت میں تحمل اور حقیقت پسندی ہونی چاہئے، ملک کے حالات پر نظر ہو کہ ملک کدھر جا رہا ہے، اس وقت کیا کرنے کی ضرورت ہے، کون سا فائدہ جائز حدود کے اندر مسلمان اٹھا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ہم حقائق پر غور کریں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فہم سے کام لیں، اس ملک کے لئے ہم بابرکت وجود ثابت ہوں۔

وما توفيقي الا بالله عليه توكلت وإليه أنيب وصلى الله على النبي الكريم۔

☆☆☆

اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور ہندوستان

ندیم اشرف قاسمی☆

کسی بھی ملک وقوم کی شناخت اس کے مقام کی تعیین اور اس کے ترقی پذیر ہونے کی کسوٹی، بلاشک وشبہ اس بات کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس ملک کا نظام حکومت سنبھالنے والے لوگ اپنی رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں، ان کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں اور خاص طور پر کمزور طبقوں کی فلاح وبہبودی کے لیے ہمیشہ سرگرم اور کمربستہ نظر آتے ہیں، جس حکومت کے اندر یہ تمام خوبیاں ہوتی ہیں اسی کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے، اور ایسے ہی افراد کو مہذب اور تعلیم یافتہ سماج میں بار بار حکومت سازی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

اچھی حکمرانی وکارکردگی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بار مہاتما گاندھی نے کہا تھا:
''اپنی زندگی میں آپ نے جو غریب انسان دیکھا ہو، کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے بارے میں سوچیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ آپ کا اگلا قدم یا فیصلہ کس حد تک اس کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے''۔

وزیراعظم منموہن سنگھ نے بھی نئی دہلی میں 2006 میں وزرائے اعلیٰ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے عدم تحفظ کے نتائج ہمارے سماج کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔''

ان چند تمہیدی جملوں کے بعد جب ''ہندوستانی منظرنامہ میں اقلیتوں کے حقوق اور اس

☆ ریسرچ اسکالر، شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کا تحفظ'' کے حوالہ سے بات کی جائے اور خاص طور پر آزادی کے بعد سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لیا جائے کہ مرکزی اور ریاستی سطح پر حکمراں طبقوں نے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو ترقی کی راہیں طے کرنے، سماج کے دیگر طبقوں کے شانہ بشانہ چلنے اور معاشی ومعاشرتی طور پر کامیابی کی بلندیوں کو سر کرنے کے لیے کیا وسائل فراہم کیے اور کیا عملی کوشش کی، تو افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں مسلمانوں کے پچھڑنے اور پسماندہ ہونے کی شرح دن بدن بڑھتی جارہی ہے، متعدد سرکاری وغیر سرکاری سروے میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ مسلم اقلیتی طبقہ دیگر پسماندہ طبقوں میں بھی بہت زیادہ پچھڑا ہوا ہے، یہ طبقہ صرف تعلیم وخواندگی جیسے شعبوں میں پسماندگی کا شکار نہیں، بلکہ سرکاری وغیر سرکاری، فوج، نیم فوجی دستوں، تعلیمی اداروں، انتظامیہ، خفیہ ایجنسیوں، صنعت وتجارت اور دیگر تمام شعبوں میں ان کی نمائندگی نہ کے برابر ہے۔

افسوس اور غم اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب حکومتی سطح پر اقلیتوں کی فلاح وبہبود کے لیے طرح طرح کی ترقیاتی اسکیموں کا اعلان کیا جاتا ہے، لیکن اس کو نافذ کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، اور اگر نافذ کر بھی دیا جائے تو ان اقتصادی وترقیاتی اسکیموں کا معمولی اثر بھی مسلمانوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے، بلکہ بسا اوقات مشاہدہ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ حکومت اقلیتوں کے لیے روپے جاری کرتی ہے، لیکن مقامی انتظامیہ اس فنڈ کو اقلیتوں کی ترقی کے لیے استعمال کرنے کے بجائے دیگر امور میں صرف کر کے اپنی جانب داری کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہے، اس جانب داری کے اسباب وعوامل پر نظر ڈالی جائے تو بادی النظر میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سماج کے ایک مخصوص طبقہ سے جینے کے وسائل تک چھین لیے جائیں، اسے کمزور سے کمزور ترین بنا دیا جائے، ان سے آگے بڑھنے کے خواب دیکھنے کا حق تک چھین لیا جائے۔

اقلیتوں کے ساتھ عصبیت کی یہ آندھی صرف سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ

بنانے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس آندھی نے اقلیت بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی لوکو اور بھی تیز کیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ ملک میں آزادی کے بعد سے لیکر اب تک ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بھی سیاسی قیادت، نوکرشاہی، انتظامیہ اور پولس پر مشتمل پوری انتظامی مشینری نے جس طرح خاص طور پر مسلمانوں کو ظلم وستم، نفاق وزیادتی اور قتل وغارت گری کا نشانہ بنایا ہے اور ان پر تشدد اور نسل کشی کے پہاڑ توڑنے والے ظالموں کی براہ راست اور بالواسطہ طور پر سرپرستی ومدد کی ہے، گجرات، کانپور، میرٹھ اور مرادآباد کے فرقہ وارانہ فسادات ان تمام طرح کی زیادتیوں کے عملی گواہ ہیں۔

کہنے کو تو یہ ہمارا جنت نشاں ملک ایک جمہوری ملک ہے اور ہمیں اس پر فخر بھی ہے، جمہوریت میں سماج کے تمام افراد کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے نیز اپنے اصولوں اور مذہبی آزادی کے مطابق یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں، اگر کسی بھی طرح کی سماجی عدم مساوات اور حقوق تلفی کی بات سامنے آئے تو ایسی جمہوریت کو نامکمل اور ناقص قرار دیا جاتا ہے۔

جب ہم سکہ کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک طرف ہمیں ہندوستان جمہوریت کے علمبردار کے طور پر ممتاز نظر آتا ہے، لیکن جب ہم دوسرے رخ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ جمہوریت کے تقاضوں سے دور عصبیت، جانب داری اور سماجی عدم مساوات کی بیماری میں گھرا نظر آتا ہے، ایسی صورت حال میں مہاتما گاندھی کے بقول ”کیوں کر اچھی حکمرانی کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور کہاں تک کامیاب جمہوریت کے دعویٰ کی تصدیق کی جاسکتی ہے اور جب ہر طرف سے دبانے اور کچلنے کی سازشیں عمل میں لائی جاتی ہوں، خوف وہراس کی فضا قائم کی جاتی ہو، تو پھر ملک کے ایک بڑے طبقے کے ذہن ودماغ سے عدم تحفظ کا احساس کیسے ختم ہوسکتا ہے۔“ جو کہ وزیراعظم منموہن سنگھ کے بقول ایک خطرناک رجحان ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی کی راہوں پر

گامزن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ ملک کے تمام باشندوں کو اس کے مذہب، زبان، علاقہ اور تہذیب وتمدن سے قطع نظر کرتے ہوئے زندگی، تعلیمی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی طور پر آگے بڑھنے کے حقوق یکساں طور پر حاصل نہ ہوں، کیونکہ اس چمن کی آبیاری میں دیگر برادران وطن کے ساتھ مسلمانوں کا بھی خون شامل ہے، لہٰذا یہاں کے وسائل پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ دیگر اقوام کا۔

اخیر میں امت مسلمہ کے لیے ایک پیغام ہے کہ ان حالات میں وہ مایوسی کے شکار نہ ہوں، جدوجہد اور سعی جاری رکھیں، انشاء اللہ اس تاریک رات کے بعد صبح ضرور نمودار ہوگی، بس شرط یہ ہے کہ ہمارا حوصلہ اور لگن زندہ رہے۔

اے مسلم دل خستہ مصائب سے نہ گھبرا
خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے

علامہ اقبال نے کہا تھا:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

☆☆☆

بھارت کی مسلم اقلیت ـــــ ایک مثبت نظریہ

مولانا شمس الدین ندوی ☆

جب ہم دنیا کی اقلیتوں کی بات کرتے ہیں اور مدمقابل اکثریت کے ساتھ باہم منفی پہلوؤں کی گفتگو ہوتی ہے، تو اسی کے ساتھ منفی نقطۂ نظر ہندوستان میں بھی کچھ نزاعی حالات پیش آجانے کی وجہ سے میڈیا اور فکر وخیال پر چھا جاتا ہے، اس سلسلہ میں جب ہم بڑے فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بھارت کی مسلم اقلیت کئی بڑے ملکوں کی آبادی کے برابر ہے یا کئی چھوٹے ملکوں کی مجموعی آبادی کے برابر ہے تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قیاس مع الفارق کی طرح یہ تقابل بھی کافی حد تک مع الفارق ہو جاتا ہے، اس قسم کا تقابل یہ تأثر دیتا ہے کہ اکثریت واقلیت کا مقامی فرق 50-40 یا 45 کا ہوگا، اگر اقلیت عظیم ہے تو ہم اکثریت کے عظیم تر ہونے کو کیوں بھول جاتے ہیں، جہاں تقابل 80-20 کے آس پاس ہے۔

اس تمہید کو سامنے رکھتے ہوئے جن پہلوؤں کو سامنے لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہیں:

ا۔ برصغیر میں آٹھ سو سال ۔ سے لیکر پانچ سو چھ سو سال کی اسلامی دور حکومت کی ایسی تاریخ ہے کہ اس کے بعد مکمل سیاسی اقتدار کی تبدیلی، مصر کی قدیم تاریخ میں قبطیوں کے عروج کے بعد نبطیوں کے سامنے اپنے وجود کا مسئلہ نظر آنے لگا، تو اجتماعی ہجرت ہی انہیں ایک آخری حل نظر آیا، یا اسپین کی تاریخ میں مسلم سیاست کے زوال کے بعد مسلم اقلیت کے اخراج کا واقعہ، مگر جب ہم بھارت میں اکثریت واقلیت کی بات کرتے ہیں تو یہی نہیں کہ اس قسم کی کسی بھی صورت حال کا

☆ ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شائبہ بھی نظر نہیں آتا، بلکہ اس کے برعکس یہاں کی اکثریت نے مسلم اقلیت کے ایک بڑے حصہ کے علیحدہ ملک بنانے کی تحریک کی زبردست مخالفت کی، لیکن اس تحریک کے قائدین مستقبل کے موہوم اور غیب میں پوشیدہ اندیشوں کو بنیاد بنا کر اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے لاکھوں انسانوں کی جانوں کی قیمت پر اپنی علیحدگی کے مطالبہ میں کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد کی بقیہ ہندوستان میں اکثریت واقلیت کے درمیان تلخیوں کا ایک زبردست دور براہ راست اس ناعاقبت اندیش واقعہ کی وجہ سے تھا، نہ کہ اقلیت کو ملک سے بے دخل کرنے کے شوق میں۔

۲۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کی اپنی خودمختار حکومت کے لئے بننے والے دستور اور اس کے قوانین کو کن اصولوں پر بنایا گیا، وہ ہم سب کو معلوم ہونے کے باوجود مناسب لگتا ہے کہ اس ضمن میں اس سیمینار کے دعوت نامہ میں تحریر شدہ چند سطروں کو یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ''ہندوستان کئی لحاظ سے ایک منفرد نوعیت کا ملک ہے، دستور ہند میں اقلیتوں کے مخصوص حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، ہندوستان ایک قابل لحاظ مدت تک مسلمانوں کے زیر اقتدار رہا، ہندوستانی مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں، تاہم وہ یہاں پر دنیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم امت ہیں، لیکن وہ دیگر فرقوں کے مقابلہ میں ہر شعبہ میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں، ہندوستان میں بھی اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق قوانین اور ادارے موجود ہیں، اس کے تعزیراتی قوانین کے تحت فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانے کے جرم کی سزا بھی مقرر ہے''۔

میں اس بات سے بھی پوری طرح متفق ہوں کہ ہندوستان میں ''مسلمانوں سے متعلق مختلف پہلوؤں پر تجزیاتی اور مخصوص واقعاتی مطالعات'' پیش کرتے وقت ہم اس بنیادی اور ناقابل انکار حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے آئیڈیل کے طور پر اس مثبت نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کرسکتے ہیں کہ اس کی وجہ سے دنیا کے ''دیگر ممالک میں'' اقلیتوں کے حقوق کو تقویت

ملے اور خود ہندوستان میں بھی وقتاً فوقتاً منفی صورت حال پیدا کرنے والوں کی ہمت شکنی ہو۔

اب رہی بات اسلام فوبیا کے چیلنج کی، تو اس سلسلہ میں بھی فطری اور قدرتی تشویشوں سے آگے، بہت آگے تک بگاڑ کی منظر کشی کرنا، وقتی خطابت کے بعد نارمل زندگی کے ساتھ ہی اپنی مذہبی، سیاسی اور معاشی زندگی میں اپنے آپ کو تمام دستوری حقوق اور مشترکہ معاملات میں اکثریت کے ساتھ ہر جگہ شانہ بشانہ مشغول پاتے ہیں اور بسا اوقات مسلم اکثریت والے ملکوں میں باہمی تباہ کن صورت حال کے مقابلہ اپنے آپ کو بدرجہا بہتر، مطمئن اور مامون محسوس کرتے ہیں۔

۳۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مختلف گروپوں کی سیاسی حوصلہ مندی، انہیں مذہبی منافرت پیدا کرنے والوں کے عمل کو ایک تکنیک کے طور پر اختیار کر لیتے ہیں، یہ ایک ایسا معلوم و معروف طریقۂ کار ہے جسے ہر دور و ملک کے حاشیہ پر پڑے ہوئے سیاستدان اختیار کرتے چلے آ رہے ہیں، جو کبھی کبھار وسیع و عریض سمندر میں ایک طوفان کی سی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں، مگر ہم بخوبی جانتے ہیں کہ طوفان ہمیشہ وقتی اور عارضی ہی ہوا کرتے ہیں اور پھر یہ وسیع و عریض انسانوں کا سمندر ان یادوں کو اسی طرح بھول جاتا ہے جیسا کہ ایک تندرست معدہ اندر داخل ہونے والی مکھی کو قے کر دیتا ہے۔

عظیم ہندوستان کی ایک مشترکہ سمجھ اپنے ارتقاء، اپنے استحکام، معاشی و سیاسی مضبوطی کے لئے فوراً اپنے اندر یہ احساس جگا لیتی ہے کہ پرامن بقائے باہم، ہماری تقدیر ہے، اور آسمانوں پر ہونے والے فیصلوں میں یہ ایسا اٹل فیصلہ ہے جسے مسلم اقلیت اگر گہرے شعور کے ساتھ محسوس کرے تو اپنے اندر خود اعتمادی اور حب الوطن کے فطری اوصاف اتنے مضبوط کرے کہ اس کے بعد ہر منفی لہر کو ایک فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دیتے ہوئے، ایک ملی و سماجی گھٹنا قرار دیتے ہوئے اسے مشترکہ کوششوں کا اشو بناتے رہیں، جب کہ عملی حقیقت بھی یہی ہے، ضرورت ہے تو بس اسے ایک زندہ شعور میں تبدیل کرنے کی، تا کہ مطلوبہ فوائد حاصل ہو سکیں۔

☆☆☆

پانچواں باب:

اسلاموفوبیا

اسلام فوبیا۔تعریف،اسباب اور حل

ڈاکٹر محمد شہاب الدین سبیلی ☆

فوبیا کا لغوی معنی

فوبیا کا لغوی معنی بے جا خوف اور نفرت ہے،انگریزی میں Xenophobia (دوسرے ملک کے لوگوں سے نفرت رخوف) Anti- Semitism (یہودیوں کے خلاف نفرت رخوف) جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں،مجموعی اعتبار سے ان تمام اصطلاحات میں عدم رواداری اور نسل پرستی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

یہ اصطلاح دولفظ سے مل کر بنی ہے،یعنی اسلام اور فوبیا،ان دونوں لفظوں کے بیچ میں انگریزی زبان کا "O" بھی بڑھایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان نسبت کا معنی پیدا ہو جائے،اس طرح اسلامو فوبیا کا معنی اسلام سے بے جا خوف،نفرت اور مسلمانوں کے بارے میں منفی ذہنیت رکھنا ہے۔

اسلام فوبیا کی ابتداءوارتقاء

اگرچہ اسلام فوبیا ایک جدید اصطلاح ہے مگر اس کی بنیادیں کافی قدیم ہیں،ایک ریسرچ اسکالر کی رائے ہے کہ اس اصطلاح کو 1921 میں سب سے پہلے فرانسیسی مستشرق Etienne Diet نے استعمال کیا،اس کے بعد 1991 میں ایک امریکی رسالہ "Insight Magazine" میں یہ اصطلاح استعمال ہوئی،اس اصطلاح کو شہرت اس وقت ملی جب 1997 میں برطانیہ کے

☆ لکچرر شعبۂ عربی افلو،حیدرآباد

ایک مشہور ادارہ Runnymede Trust نے اسلام فوبیا کے موضوع پر ایک تفصیلی رپورٹ "Islamphobia : A challenge for us all" کے عنوان سے شائع کی۔ جنوری 2001 میں Stock Holm International Forum نے Xenophobia اور Anti-semitism کی طرح اس لفظ کو بھی نسل پرستی اور عدم رواداری کے دائرہ میں شامل کرلیا۔ 11/ستمبر 2001 کے حادثہ کے بعد اسلام فوبیا کا لفظ کثرت سے استعمال ہونے لگا، یہاں تک کہ 2004 میں اقوام متحدہ نے اسلام فوبیا پر قابو پانے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی اور اقوام متحدہ کے سکریٹری جناب کوفی عنان نے اسلام فوبیا کو افسوس ناک، تکلیف دہ اور امتیاز پر مبنی رجحان قرار دیا، کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اسلام فوبیا مغربی ملکوں میں ہمیشہ رہا ہے، البتہ پچھلے دو دہوں سے اس رجحان میں شدت اور تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ اس رائے کی تائید میں Pater, Humphriies اور Naik لکھتے ہیں:

Islamophobia has always been present in .Western countries and cultures. In the last two decades, it has become accentuated, explicit and extreme."(The 3 R's in social work - Religion, Race, Racism PP.197-198)

اس کے برخلاف ماہر سماجیات پروفیسر Vertovec کی رائے ہے کہ اس رجحان میں تیزی نہیں آئی ہے، بلکہ عوامی زندگی میں اس کو دریافت کرنے کا صرف مزاج پیدا ہوا ہے۔

"Islamophobia has not necessarily escalated in the past decades, but that there has been increased public scrutiny of it." (Islamophobia and Muslim recognition in Britain PP 32-33)

ڈاکٹر عبدالجلیل ساجد صاحب کی رائے ہے کہ اسلام فوبیا ازل سے ہے البتہ اس کی شکلوں اور طریقوں میں فرق رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Islamophobias have existed in varying strains throughout history, with each version possessing its own distinct features as well as similarities or adaptations from others. An observatory report on

Islamophobia by the Organisation of the Islamic Conference similarly states that Islamophobia has existed for as long as Islam itself." (Islamophobia : A new word for an old fear.)

اس سلسلہ میں ایک انکشاف یہ ہے کہ 1990ء کے دوران مغربی دنیا میں رنگ ونسل کی بنیاد پر امتیاز برتنے کا رجحان ختم ہوگیا ہے، اب مذہبی، ثقافتی اور فکری بنیادوں پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ Islamophobia watch میں یہ رپورٹ ان الفاظ میں درج ہے:

"During the 1990's many sociologists and cultural analysts observed a shift in forms of prejudice from ones based on skin colour to ones based on notions of cultural superiority and otherness."

اس بات کی تصدیق مغربی دنیا کے سیاسی رجحان میں آنے والی نئی تبدیلی سے بھی ہوتی ہے یعنی وہاں بھی ہندوستان کی طرح فرقہ پرستی کا رجحان پیدا ہوگیا ہے اور بی جے پی جیسی سیاسی تنظیمیں مغربی ممالک میں قائم ہوگئیں ہیں۔

اسلام فوبیا کی تعریف

Runnymede Trust کی رپورٹ میں اسلام فوبیا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"An outlook or world-view involving an unfounded dread and dislike of Muslims, which results in practices of exclusion and discrimination." (Encyclopedia of Race and Ethics P-215)

"ایک نظریہ یا عالمی رائے جو بے بنیاد خوف اور نفرت پر مبنی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز اور بے گانگی برتی جاتی ہے۔"

امریکی مصنف Stephen Schwartz نے اسلام فوبیا کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"The condemnation of the entirety of Islam and its history as extremist; denying the existence of a moderate Muslim majority; regarding Islam as a problem for the world; treating conflicts involving

Muslims as necessarily their own fault; insisting that Muslims make changes to their religion; and inciting war against Islam as a whole."(Front page Magazine - April 2005)

"اسلام کی ہر چیز کی مذمت کرنا، اس کی تاریخ کو پر تشدد قرار دینا، مسلمانوں میں اعتدال پسند اکثریت کی نفی کرنا، اسلام کو پوری دنیا کے لئے مسئلہ بنا کر پیش کرنا، مسلمان دنیا میں جہاں بھی معرکہ آراء ہیں، اس بارے میں ان ہی کو قصوروار سمجھنا، مسلمانوں کو ان کے مذہب میں تبدیلی لانے پر اصرار کرنا اور ان کے خلاف محاذ جنگ شروع کرنا"۔

Wikipedia میں اسلام فوبیا کی تعریف اس طرح درج ہے:

"Islamophobia is the fear and hatred of Islam, Muslims or Islamic culture. Islamophobia can be characterised by the belief that all or most Muslims are religious fanatics, have violent tendencies towards non-Muslims, and reject as directly opposed to Islam such concepts as equality, tolerance and democracy." (Wikipedia)

"اسلام فوبیا سے مراد اسلام، مسلمان اور اسلامی ثقافت سے نفرت کا اظہار، اس کی تشریح اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ ایک ایسا نظریہ جو سمجھتا ہے کہ تمام یا اکثر مسلمانوں میں مذہبی تشدد ہوتا ہے، وہ غیر مسلموں کے بارے میں جارحانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں، مساوات، رواداری اور جمہوریت کے تصور کو مسلمان یہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب ان کے مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہیں"۔

سلام ویب سائٹ میں اسلام فوبیا کے بجائے اسلام مخالف نسل پرستی کی اصطلاح استعمال کرنے پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ اس ویب سائٹ کے مرتب لکھتے ہیں:

"The term Islamophobia does not adequately expresses the full range and depth of antipathy towards Islam and Muslims in the west today. It is an inadequate term. A more accurate expression would be 'anti-Islamic racism' for it combines the elements of dislike of a religion and active discrimination against the people belonging to that

religion."(Salaam website)

''اسلام فوبیا کی اصطلاح، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی دنیا میں پائی جانے والی نفرت، بے زاری اور امتیاز کو پوری گہرائی اور وسعت کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر ہے، اس لئے اس سے بہتر تعبیر Anti-Islamic racism ہے، کیوں کہ اس میں مذہب اسلام سے بیزاری، نفرت اور امتیاز کا شدید عنصر پایا جاتا ہے۔''

اسلام فوبیا کی مثالیں

(1) فرانس میں 148 مسلم قبروں کی مسماری اور مساجد کی بے حرمتی

(2) اسپین میں مسجد کو نذر آتش کر دینے کا واقعہ

(3) مختلف مغربی ملکوں میں اسلامی حجاب پر پابندی عائد کرنے کی کوشش

(4) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ کو کارٹون کی شکل میں پیش کرنا

(5) سوئٹزرلینڈ میں ریفرنڈم کے ذریعہ میناروں پر پابندی

(6) ایر پورٹس اور ہوائی جہازوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کے واقعات

(7) اسکارف لگانے والی مسلم لڑکی کا جرمنی کے ایک کورٹ میں قتل

(8) ویڈیو گیمس میں مسلمانوں کو دہشت گرد کے روپ میں پیش کرنا

(9) اسلامی اداروں پر حملے اور اس کے قیمتی اثاثہ جات کو تباہ کرنے کی سازش

(10) ممتاز مسلم شخصیتوں کو مجروح کرنے کی کوشش

(11) **فلموں**، ناولوں اور ثقافتی پروگرامس میں مسلم شبیہہ کو بگاڑ کر پیش کرنا

(12) قرآن سے حلف لینے کو امریکہ کے لئے خطرہ قرار دینا

(13) عوامی خطاب میں سیاسی شخصیتوں کا مغربی تہذیب کو اسلام سے برتر قرار دینا

دنیا کے مختلف ملکوں میں اسلام فوبیا

دنیا کے اکثر حصوں میں اسلام فوبیا کے واقعات رونما ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں بھی اسلام فوبیا کے اثرات دیکھنے میں آتے ہیں، گودھرا فسادات اس کی واضح مثال ہے، سچر کمیٹی رپورٹ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں، سماجی اور سیاسی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی تشویشناک حد تک کم ہے، مثلاً مغربی بنگال جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 27% ہے لیکن سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب بمشکل 3% ملے گا۔

چین میں مسلمانوں کے ساتھ کافی زیادتی ہوتی رہی ہے، یہاں تک کہ حکومت مسلمانوں کو سفر حج، روزہ اور قرآن کی تعلیم سے بھی روکتی ہے اور ''ہان چینی'' کے مقابلہ میں ''یوگور'' مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا جو غلط برتاؤ ہے، پوری دنیا اس سے واقف ہے۔ Human Right Watch نے تو یہاں تک کہا کہ حکومت چین دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں کو نشانہ بنارہی ہے۔ European Monitoring Centre نے مئی 2002ء کی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ 9/11 کے بعد پورے یورپ میں مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بدسلوکی، تشدد، امتیاز اور انتقام کا سامنا ہے، دہشت گردی کے ہر واقعہ سے مسلمانوں کو جوڑا جاتا ہے اور اسامہ کی اولاد کہہ کران کی تضحیک کی جاتی ہے۔

اسلام فوبیا کا اظہار حالیہ دنوں میں ہونے والے '' گلوبل مانیٹر'' نامی ادارہ کے ایک سروے سے بھی ہوتا ہے، اس سروے کے مطابق 62% جرمنی باشندے اسلام کی وسعت سے فکر مند ہیں جب کہ 33% لوگ اسلام کی اشاعت سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں اور صرف 29% لوگ اس بارے میں معتدل رائے رکھتے ہیں، اسی ادارہ کی جانب سے ہونے والے دوسرے سروے میں بتایا گیا ہے کہ 37% برطانوی باشندوں کا خیال ہے کہ مساجد کے میناروں پر

پابندی لگائی جائے۔ 25% لوگوں کا کہنا ہے کہ میناروں پر پابندی لگانے کی ضرورت نہیں ہے، امریکہ میں 21% لوگوں کی رائے ہے کہ میناروں پر پابندی لگنی چاہیے جبکہ 19% لوگ اس کے خلاف ہیں، کینیڈا میں بھی 35% لوگوں کی رائے ہے کہ مساجد کے میناروں پر پابندی لگنی چاہیے جب کہ 27% لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے پیو ریسرچ سنٹر کے سروے کے مطابق ٹیکساس میں قائم فورٹ ہوڈ آرمی سنٹر پر میجر ندال ملک حسن کی فائرنگ کے بعد 52% سے زیادہ امریکیوں کا ماننا ہے کہ اسلام امریکہ کے لئے شدید خطرہ ہے، اس قسم کے سروے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پوری دنیا اسلام اور مسلمانوں سے عمومی طور پر خوف زدہ ہے اور مغرب میں خاص طور پر اس بارے میں سماجی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

اسلام فوبیا کی تردید

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اس اصطلاح کی کوئی اصل نہیں ہے، مارچ 2006ء میں اس نظریہ سے وابستہ 12 مصنفین نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اس اصطلاح کو غلط قرار دیا، ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نسل پرستی ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے اس کو ایک الگ نام دینے کی ضرورت نہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلام فوبیا کی اصطلاح کے ذریعہ اظہار رائے کی آزادی پر قدغن لگتی ہے اور روح تنقید متاثر ہوتی ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے مناسب نہیں ہے، انہوں نے یہ الزام لگایا کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جو ماحول ہے وہ مسلمانوں کی غلط حرکتوں کی وجہ سے ہے، اس لئے مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے نہ کہ ان کے خلاف اٹھنے والی آواز کو خاموش کرنے کی کوشش۔

Roger Kinball کا کہنا ہے کہ اسلام فوبیا غلط اصطلاح ہے؛ کیوں کہ فوبیا کا مطلب بے جا خوف ہے جب کہ اسلام کا خوف بجا ہے اور اس خوف کی بنیادیں درست ہیں۔

"A phobia describes an irrational fear, and it is axiomatic that

fearing the effects of radical Islam is not irrational, but on the contrary very well-founded indeed."(After the suicide of the West -2006)

اسلام فوبیا کے اسباب

(الف) اسلام کے بارے میں غلط فہمی:

اسلام فوبیا کا اصل سبب یہ ہے کہ مغربی قومیں اسلام کے بارے میں کھلا ذہن نہیں رکھتی ہیں، ان کے غلط طرز فکر کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کے سامنے اسلام کی تفہیم بہت مشکل ہے، مثلاً وہ اسلام کو مغرب کے مقابلہ میں مختلف سمجھنے کے بجائے اس کو مغرب سے کم تر سمجھتی ہیں، اسلام کو متنوع اور ترقی پسند مذہب سمجھنے کے بجائے اس کو منجمد اور ترقی کا دشمن مانتی ہیں، اسلام ان کی نظر میں حلیف ہونے کے بجائے حزب مخالف ہے، اس لئے یہ قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور امتیاز کو نہ صرف درست خیال کرتی ہیں بلکہ اس کی پذیرائی بھی کرتی ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ مغرب میں امتیاز و نسل پرستی کے خلاف آواز اٹھانے والے ہیں، ان کی نظر میں بھی اسلام فوبیا کوئی بری بات نہیں ہے، صورتحال یہ ہے کہ یورپ اور مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی ایسی تصویر ذہنوں میں بٹھادی گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ان کی قومیت اور تہذیب کے بالکل برعکس ہیں، لہٰذا ان سے مفاہمت اور ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔

"Many of the stereotypes and misinformation that contribute to the articulation of Islamophobia are rooted in a particular perception of Islam, such as the notion that Islam promotes terrorism; especially prevalent after the September 11, 2001 attacks." (Islamophobia watch)

Runnymede Trust نے اپنی رپورٹ میں مغربی نظریات کو 8 شقوں میں بیان کیا ہے، جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

1. Islam is seen as a monolithic bloc, static and unresponsive to change.

2. It is seen as separate and "other." It does not have values in common with other cultures, is not affected by them and does not influence them.
3. It is seen as inferior to the West. It is seen as barbaric, irrational, primitive, and sexist.
4. It is seen as violent, aggressive, threatening, supportive of terrorism, and engaged in a clash of civilizations.
5. It is seen as a political ideology, used for political or military advantage.
6. Criticisms made of "the West" by Muslims are rejected out of hand.
7. Hostility towards Islam is used to justify discriminatory practices towards Muslims and exclusion of Muslims from mainstream society.
8. Anti-Muslim hostility is seen as natural and normal.(Runnymede Trust's report on Islamophobia-1997)

(1) اسلام کے بارے میں خیال ہے کہ یہ ایسا سیاسی نظام ہے جو کسی دوسرے نظام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتا ہے؛ کیونکہ وہ تبدیلیوں کے خلاف ہے۔

(2) ان کا خیال ہے کہ اسلام مغربی دنیا سے الگ تھلگ رہنے والا ایک جامد مذہب ہے اور وہ مشترکہ اقدارِ حیات میں یقین نہیں رکھتا ہے، اس میں نہ قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی اثر انداز ہونے کی۔

(3) اسلامی نظام کو مغربی نظامِ حیات سے کمتر سمجھا جاتا ہے، اور اس کو غیر مہذب، غیر معقول، قدامت پرست اور جنسی امتیازات کی وکالت کرنے والا مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

(4) اسلام کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تشدد کا حامی، جارحانہ، خطرناک، دہشت گردی کو فروغ دینے والا اور تہذیبی تصادم کو بھڑکانے والا مذہب ہے۔

(5) اسلام کو روحانی مذہب سمجھنے کے بجائے اس کو ایک ایسا سیاسی نظام سمجھتے ہیں جس کا استعمال سیاسی اور عسکری بالادستی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

(6) مسلمانوں کی طرف سے مغرب کے خلاف جو آواز اٹھائی جاتی ہے اس کو فوراً رد کر دیا جاتا ہے۔

(7) مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور ان کو سماجی دھارا سے خارج کرنے کے لئے اسلام پر ستم ڈھایا جاتا ہے۔

(8) مسلمانوں کے خلاف ظلم وستم کو فطری اور معمول کی کارروائی قرار دیا جاتا ہے۔

تاہم Runnymede Trust کی رپورٹ خامیوں سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ Self Help کے طور پر مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا چاہیئے اور ہر وہ چیز جس سے یہودیوں کے احساسات کو ٹھیس لگتی ہو، مسلمانوں کی طرف سے اس کی بھرپور مذمت ہونی چاہیئے ۔لیکن اسی ادارہ نے 1993ء میں Anti - Semitism پر رپورٹ شائع کی تو یہودیوں کو یہ مشورہ دینا گوارہ نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساسات کا لحاظ رکھیں ۔اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ان دانشوروں کے دل میں بھی اسلام اور مسلمانوں کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔

(ب) مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے عرصہ میں یورپ ،امریکہ ، برطانیہ وغیرہ میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے، چنانچہ فرانس میں مسلمانوں کی آبادی 5 ملین ہوگئی ہے، جرمنی میں مسلمانوں کی آبادی 4 ملین سے متجاوز ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ترکی یورپ میں شامل ہوگیا تو یورپ میں مسلمان اکثریت میں آجائیں گے،امریکہ میں بھی مسلمانوں کی آبادی کم از کم 5 ملین ہوچکی ہے اور پھر اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے، اسی وجہ سے مغربی قومیں مسلمانوں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں، حکومتیں اس کے تدارک کے لئے اقدامات کررہی ہیں

مگر ماہر سماجیات پروفیسر Steven Vertovec کا کہنا ہے کہ حکومتی اقدامات سے مسلمانوں کو عوامی زندگی میں نمایاں مقام تو ضرور ملے گا مگر اس سے اسلام فوبیا کا ازالہ نہیں ہو سکے گا، کیوں کہ مسلم مخالف افراد اور تنظیموں کے منفی جذبات اس سے اور بڑھیں گے۔

"As the public sphere shifts to provide a more prominent place for Muslims, Islam phobic tendencies may amplify."(Islamophobia and Muslim Recognition in Britain PP 32-33)

(ج) میڈیا کا منفی کردار

اسلام فوبیا کو فروغ دینے میں میڈیا سب سے زیادہ پیش پیش رہی ہے، اس بات کا اعتراف الیزبتھ پال نے انسائیکلوپیڈیا آف ریس اور اتھنک اسٹڈیز میں کیا ہے، مثال کے طور پر 1994 سے لے کر 2004ء تک برطانوی پریس میں شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی بہت کم ہوئی ہے اور اگر کچھ ہوئی بھی تو وہ منفی نقطۂ نظر سے۔ جواد اور بین لکھتے ہیں:

"Hostility towards Islam and Muslims are closely linked to media portrayals of Islam as barbaric, irrational, primitive and sexist." (Benn, Jawad-165)

اسلام فوبیا کا تدارک

اسلام فوبیا کے تدارک کے لئے Runnymede Trust نے 60 سفارشات پیش کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو میڈیا اور سیاست میں اپنا اشتراک بڑھانا چاہئے، چنانچہ اس رپورٹ کے بعد ہی برطانیہ میں مسلمانوں نے ایک ادارہ "مسلم کونسل آف برطانیہ" کے نام سے قائم کیا تا کہ متحد ہو کر حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرے اور انہوں نے

میڈیا کے اداروں سے بھی ربط وضبط بڑھایا تاکہ ذرائع ابلاغ میں اپنی بہتر نمائندگی کر سکیں، ظاہر ہے کہ صرف سیاست اور صحافت کے میدان میں کوشش کرنے سے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے بلکہ ہزاروں ایسے میدان ہیں جہاں اسلام فوبیا سے مقابلہ درپیش ہے تاکہ مسلمانوں کو معاشی وسیاسی اور عوامی زندگی میں یکتاو تنہا کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے اس کا کامیاب مقابلہ کیا جا سکے۔

اسلام فوبیا کے خلاف کئی شخصیتیں اور ادارے سرگرم ہیں، مثلاً آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (امریکہ) جس نے اس رجحان کے تدارک کے لئے دستاویزات تیار کئے ہیں، فرانسیسی مسلمانوں نے دستخطی مہم شروع کی اور پچاس ہزار افراد کی دستخطیں حاصل کر کے سابق صدر فرانس جیاک چراک کو ایک پٹیشن پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسلام فوبیا کو نسل پرستی کی طرح قابل سزا جرم قرار دیا جائے، کئی برطانوی تنظیموں نے اسلام فوبیا کے موضوع پر سمینار منعقد کئے تاکہ اس رجحان پر قابو پایا جا سکے، ان کے علاوہ کئی تنظیمیں اور ادارے اس میدان میں متحرک ہیں مثلاً ''اسلام فوبیا واچ'' جس کا آغاز جنوری 2005ء میں ہوا، اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام فوبیا جو مغربی استعمار کی نئی شکل ہے، اس پر قابو پایا جا سکے، خاص بات یہ ہے کہ اس ویب سائٹ کو دو غیر مسلم افراد نے قائم کیا ہے، اسی طرح Islamphobia.org اور Islamicawareness.net جیسی ویب سائٹس اس میدان میں کام کر رہی ہیں، اس رجحان پر قابو پانے کے لئے پروفیسر دیپا کمار جیسی سیکولر شخصیت اس اہم معرکہ میں حصہ لے رہی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہر باضمیر انسان کو اسلام فوبیا کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔

"At times like this, people of conscience need to organize and speak out against Islamophobia." (Fighting Islamophobia : A response to critics-2006)

عہد حاضر کی مسلم اقلیتیں اور اسلام فوبیا مسائل وحقائق کا جائزہ

پروفیسر عبدالباری☆

ایک وقت وہ بھی تھا کہ امت کی زبوں حالی، صورتحال کی سنگینی، اور ”نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن“ کی سی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ مولانا حالی کو ضبط کا یارا نہ رہا، اور ان کا دل دردمند، غایت بے بسی میں کچھ یوں پکار اٹھا ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

(مسدس حالی، الطاف حسین حالی، ص ۱۲۵، مطبوعہ پٹنہ)

سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی شاید حالات کی سنگینی میں کوئی زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا، آج بھی اگر دیدۂ بینا ہوتو صاف نظر آتا ہے کہ امت مسلمہ خارجی طور پر اسلام فوبیا کا شکار ہے، اور داخلی طور پر احساس ضعیفی کا فوبیا اسے خود اپنی پستی وشکست خوردگی کی قعر مذلت سے نکلنے نہیں دیتا۔

مولانا آزاد نے قوموں کو احساس ضعیفی سے نجات کا نسخۂ کیمیا اپنے شاہکار ادبی مضمون ”چڑا چڑیے کی کہانی“ میں پیش کیا ہے، آپ بھی ان بصیرت افروز کلمات کو گوش گزار کیجئے اور

☆ سابق صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دیکھئے کہ وہ چڑیا کے ایک ضعیف بچے کی داستان، جو زمین پر اونچائی سے گر پڑا تھا، کس طرح سناتے ہیں: ''اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے، پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا، پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا، دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا، اس چڑیا کے بچے میں لڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی، مگر ابھی تک اس کی خود شناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا، وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا، لیکن جونہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ ''میں اڑنے والا پرندہ ہوں'' اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار ہو گئی، گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہو گیا، غور کیجئے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے (غبار خاطر: مولانا آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۹۰۲-۲۳۲، دہلی ۱۹۷۶ء)۔

مذکورہ کہانی کے پس منظر میں جب ہم اپنی قومی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہنوز ہم خود شناسی کی منزل تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔

عہد حاضر کی مسلم اقلیتوں (Minorities) سے میری مراد وہ مسلم طبقہ ہے جو رہائش پذیر ہے ان ممالک میں جنہیں ہم عمومی حیثیت سے Democratic World کے اصطلاحی الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اسی زمرے میں ہمارا ملک ہندوستان بھی آتا ہے۔ Democracy کی تعریف تو یہی کی گئی ہے کہ یہ "Govt. of the People" ہے۔ قانونی ضابطے سبھی ملک والوں کے لئے یکساں ہیں اور انہیں مساوات حاصل ہے، تو پھر "Minority" کے لفظ کا استعمال کیا معنی رکھتا ہے؟ لامحالہ اس لفظ کے اطلاق سے اقلیتی طبقہ نفسیاتی طور پر یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے Democracy Setup میں Majority کی محکومی سے مفر نہیں اور شاید یہی حقیقت

ان کے سامنے ظاہر بھی ہوتی رہتی ہے، Democratic میں ہر مذہبی اکائی کو خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو یا سکھ طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اسے اپنے مذہبی مقامات کے تقدس کو برقرار رکھنے اور وہاں اپنے مذہبی امور کو انجام دینے کا حق ہے؛ لیکن ہندوستان کے ہی تناظر میں دیکھئے، یہاں اکثریت کے ایک مخصوص فکر والوں نے دن کی روشنی میں یہاں کے جمہوری نظام کی دھجیاں اڑائے ہوئے ہیں، ایک اقلیتی جماعت کے مذہبی مقام یعنی بابری مسجد کو منہدم کر دیا، یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فرقہ پرستی کے اس مجرمانہ اقدام کو غلط طریقے پر ہی سہی اکثریت کی عددی طاقت کا سہارا ضرور حاصل رہا اور سرکاری مشینری نے بھی، سیاسی مفاد پرستی کا اثر قبول کرتے ہوئے چشم پوشی سے کام لیا۔

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو ایک دوسری مثال فلسطین پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ کی ہے، یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک اور امریکہ کے "So Called Democratic Setup" میں معاشی اور سیاسی مفاد کا اشتراک بشمول U.N.O ایک مفاد پرست اکثریتی ادارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں فلسطین کی مسلمان اقلیتوں کی زمین پر نہ صرف غاصبانہ یہودیوں کا قبضہ برقرار رکھا جاتا ہے؛ بلکہ انہیں مظالم کا شکار بھی بنایا جاتا ہے۔

آج کے اس مخصوص Demoratic Setup کے مضرت رساں کھوٹے کی ہمیں پہچان ہونی چاہئے، ہم اگر اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف صرف آواز اٹھاتے رہیں، اور سرکاری کمیشنوں کی طفل تسلی کو کافی وشافی سمجھ کر مطمئن ہوکر بیٹھ رہیں تو ہمیں جان لینا چاہئے کہ مسائل چاہے جس طرح کے ہوں ان کا حل ہو جانا یقینی اور حتمی نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک ''اسلام فوبیا'' کی بات ہے، یہ تصور بھی بیش تر خام خیالی کا ایک مفروضہ ہی ہے جسے ہم بڑی حد تک حقیقت پسندانہ سمجھ بیٹھے ہیں، عمومی طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اغیار کے دلوں میں، حالات کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ایک طرح

کا خوف (یعنی اسلام فوبیا) بیٹھ گیا ہے، اگر اسے دور کردیا جائے تو مسلمانوں کے خلاف ان کا ناروا سلوک اور ظلم وزیادتی کا سلسلہ ختم ہوجائے گا، ہماری اس طرح کی کوشش Root Cause سے ہٹی ہونے کے سبب، سودمند تو کجا، ناپائیدار ثابت ہوگی۔

آج کی دنیا میں اصل حقیقت یہی ہے کہ Democracy کے پس پردہ Majority rule کا کھیل کھیلا جاتا ہے، ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ یورپ کے اکثریت والے، ترقی یافتہ ایک مہذب ملک سوئٹزرلینڈ میں مساجد میں میناروں کی تعمیر روک دی گئی، سرکار نے یہ جواز پیش کیا کہ عوام کی اکثریت نہیں چاہتی، اس سے مسلم کلچر کی فوقیت اور شناخت ابھر جائے گی۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا وہاں عیسائیت کے پیروکمزور ہیں؟ کیا وہاں کے Setup Democratic کی موجودگی میں Democratic rights کو اچھا نہیں سمجھا جاتا؟ ایسا کچھ بھی نہیں، تو پھر اسلام فوبیا کا اثر کیوں کر مانا جاسکتا ہے۔

ایک دوسری مثال لیجئے، چھوٹے بش نے جب یورپی عیسائی ملکوں کی ہم نوائی کے سہارے U.N.O کے ریزولوشن کو ٹھوکر مارتے ہوئے افغانستان پر اپنی جنگ مسلط کی تو ایک مرتبہ اپنی فاتحانہ اور متکبرانہ سرگرانی کے جوش میں یوں گویا ہوا: "These medieval horse riders are racing against my supersonic jets. And then (making a mockery of the Muslims) laughed loudly."

کیا یہاں بش کی لن ترانی میں اسلام فوبیا کا کوئی شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ وہ تو طاقت کے نشے میں مسلمانوں کو حقیر سمجھتا ہے اور دنیا کی نظروں میں انہیں حقیر بنانا چاہتا ہے، اگر بڑے بش کی بات کی جائے تو اس کے تکبر کی حدیں کچھ اور بڑھتی نظر آئیں گی، پہلی عراق کی جنگ میں جب عالمی امن ومساوات کے سب سے بڑے مرکز .U.N.O نے امریکی جنگی عزائم اور کھلی جارحیت پر روک لگانی چاہی تھی تو بڑے بش نے اعلان کیا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے جنگ سے نہیں

روک سکتی۔اس کے الفاظ تھے:

"I can say hell to U.N.O"

چلئے اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اقلیتوں کے حقوق کی پامالی اور مسائل کی سنگینی میں کچھ نہ کچھ اسلام فوبیا کو بھی دخل ہے تب بھی ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اصل محرک اکثریت کا اپنے کلچر کی بالادستی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی بالادستی ہی حاصل کرنا ہے۔

اسلامی کلچر کی بقا اور فروغ میں خصوصیت سے مغربی استعمار پسند طاقتوں کو اپنے مادہ پرستانہ کلچر کی کم مائیگی اور شکست خوردگی کا اندیشہ ہی انہیں اپنی فرومائیگی کا احساس دلانے لگتا ہے، دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنی معاشی اور سیاسی چودھراہٹ(Uper Hand) بھی کسی طرح ختم تو کیا، مجروح بھی ہونے دینا نہیں چاہتے، یہی وہ محرکات ہیں جو مسلم اقلیتوں کو بے دست وپا دیکھنے کی درون دل خواہش رکھتی ہیں، شاید اسی پس منظر میں قرآن مجید نے مسلمانوں کے علاوہ دوسری بھی اقوام یا مذہبی اکائیوں کو ''امۃ واحدۃ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ سے ہی اسلام اور پیغمبر اسلام کو طرح طرح کی الزام تراشیوں کا نشانہ بنا کر بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس زمانہ میں اشعار ہی Public Opinion کو Mobilize کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ سمجھا جاتا تھا، انہی اشعار کے ذریعہ عہد جاہلی کے شعراء نے اسلام کے خلاف ایک طرح کی Media War چھیڑ رکھی تھی۔

چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے بھی اپنے مسلم شعراء کے ذریعہ اشعار کے ہی واسطے سے انہیں خاموش ہوجانے پر مجبور کردیا تھا۔

آج بھی مسلمانوں کو عالمی سطح پر مجرمانہ ذہنیت کا مالک سمجھانے کی کوششیں جاری ہیں، کبھی Fundamentalist کا لیبل لگا کر معتوب کیا جاتا ہے، اور کبھی اسلامی تعلیم اور درس گاہوں کو ہی مجموعی طور پر Terrorism کے فروغ کا ذریعہ بتا دیا جاتا ہے؛ حالانکہ جہاں کہیں مسلم

علاقوں میں Terrorism جیسے آثار بھی پائے جاتے ہیں، ان کی ایک بڑی وجہ سماجی انصاف کا فقدان ہوتا ہے، UNO کے ایک سابق سکریٹری نے خود اس بات کا اعتراف ایک تقریر میں کیا ہے؛ ورنہ حقیقت میں مذہب اسلام میں ایسی کوئی تعلیم نہیں جو Terrorism کو فروغ دیتی ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کا انسداد کس طرح ہو، صورت حال کے غائر مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں دو علاحدہ علاحدہ محاذوں پر اپنے عملی اقدامات کو آگے بڑھانا ہوگا۔

۱-ملی مسائل کا داخلی محاذ، ۲-اغیار کی ریشہ دوانیوں کے سدباب کا خارجی محاذ، اس کے علاوہ ہمیں کوئی بھی مثبت قدم اٹھانے سے پہلے مسلم اقلیتوں کے جائز حقوق پر پڑنے والی زد کے مختلف گوشوں کی نشان دہی کر لینی ہوگی اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے انسداد کے لئے کارروائیاں کرنی ہوں گی۔

موجودہ دور کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقلیتوں کے حقوق کی حصولیابی میں پیش آمدہ مسائل خواہ داخلی ہوں یا خارجی، ہمیں علامہ اقبال کی زبان میں نفس سوختۂ شام وسحر کی تازہ کاری سے کام لینا ہوگا۔

۱-داخلی محاذ: امت کی شیرازہ بندی:

خود مسلم سماج سے جڑے معاملات میں سب سے پہلا کام امت مسلمہ کی شیرازہ بندی ہے۔

۱-ہمیں مسلمانوں میں ایمان کی پختگی لانے کے تمام ذرائع ووسائل کو فعال بنانا ہوگا، انہیں صرف نسلی طور پر مسلمان بنے رہنے کی صورت سے اوپر اٹھا کر معیاری مسلمان بنانے کے لئے تگ ودو کرنی ہوگی "وتواصوا بالحق" کے نسخہ کیمیا کو صرف تلقین تک محدود نہ کر کے عملی

جہت کی صورت پیدا کرنی ہوگی؛ تاکہ مسلمانوں کے اندر آپس میں مسلکی، علاقائی اور نسلی اختلافات دور ہوں، مختلف امور اور معاملات زندگی میں اختلاف اپنی جگہ؛ مگر اس کے علی الرغم ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں، ہماری زندگی میں اس فکر کا عملی مظاہرہ ہونا چاہئے۔

۲-مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور علمی لیاقت کو بڑھانے کی سبیل کی جائے۔

۳-سرسید احمد خاں کے طرز کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنسوں کا انعقاد کیا جائے۔

۴-مسلمانوں کے ذریعہ اوقاف کے قیام کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جائے جو عرصہ دراز سے بند پڑا ہے، صرف چندوں کے ذریعہ دینی و تعلیمی مسائل کا حل تلاش نہ کیا جائے۔

۴-ملی مسائل کے حل میں صرف علماء کے اشتراک عمل تک بات محدود نہ رہے؛ بلکہ ان علماء کو آگے لایا جائے جن کی معاملات کی مناسبت سے Expertise بھی ہو۔

۵-سیاسی معاملات میں وہی علماء شریک ہوں جو سیاسی احوال کا علم اور تجربہ رکھتے ہوں۔

۶-اکابرین ملت اور علمائے دین کی کارکردگی میں کہیں ملت کے مجموعی مفاد کے نقصان کا اندیشہ نظر آئے تو ان کی غلطیوں پر انتباہ کی صورت بھی پیدا کی جائے، اگر ضرورت محسوس ہو تو ذی استعداد اکابر کا ایک پینل بنا دیا جائے جو وقتاً فوقتاً صائب رائے دہی کا فریضہ انجام دیں؛ تاکہ انفرادی کمزوریوں کا ازالہ ہو سکے۔

مثلاً علاقائی اور مرکزی الیکشن کے وقت مسلمانوں کو ووٹوں کے صحیح استعمال میں رہنمائی دی جا سکے؛ تاکہ وہ ٹکڑوں میں بٹ کر نہ رہ جائیں اور اجتماعی طاقت کا استعمال بے کار ہو جائے۔

۲-خارجی محاذ:

دوسرا سب سے اہم کام Media کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف غلط پروپیگنڈوں کا

شافی وکافی جواب فراہم کرنا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف الزام تراشی اور من گھڑت باتوں سے نقصان پہنچانے کا سلسلہ اوائل اسلام سے ہی چلا آتا ہے، آج بھی اقلیتوں کے حقوق کی پامالی اسی راہ سے زیادہ ہوتی ہے، مسلم اقلیتوں کے بعض کمزور پہلوؤں کو نشانہ بنایا جاتا ہے، اور Media کے مختلف ذرائع عوام کے ایک بڑے حصے کی ایک طرح سے Brain Washing کر دیتے ہیں، Terrorism کے مسئلے کو ہی لے لیجئے، الزام تراشیوں کے ذریعہ کتنے ہی بے قصور محض شک وشبہ کی بنا پر جیلوں میں سڑتے نظر آتے ہیں، اور نہ جانے کتنی معصوم جانیں چلی جاتی ہیں، احمد آباد کا خونی حادثہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے؛ ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ اقلیتوں میں مجموعی طور پر خوف و ہراس (Demoralization) کی ایک فضا پیدا ہوجاتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اقلیتوں میں Insecurity کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے، یہی وہ صورت حال ہے جو اقلیتوں کو زندگی کے ہر موڑ پر اور ملک وسماج کی ترقی کے ہر دوڑ میں پچھڑنے پر مجبور کر دیتی ہے، ہندوستان کی اقلیتوں کے سلسلے میں صرف سچر کمیٹی کی رپورٹ ہی حقیقت حال کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

Media کے سلسلے میں کام کی دو جہتیں ہوسکتی ہیں:

۱- ان اخبارات ورسائل میں جو سرکاری یا غیر سرکاری ہیں، مگر مسلمانوں کے ذریعہ نہیں چلائے جاتے، اپنے مسائل کے حل کے لئے اپنے موقف کو واضح طور پر پیش کرنا، مزید برآں مسلمانوں کے Cause کے خلاف پروپگنڈوں کا تشفی بخش جواب دینا؛ تاکہ مسلمانوں کی شبیہ عوام الناس میں خراب نہ ہو، ضرورت سمجھی جائے تو خود Media کے غلط رویوں پر مناسب قدغن لگائی جائے۔

۲- مسلمانوں کے ذریعہ جاری کردہ اخبارات ورسائل (ممکن ہو تو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی جاری ہوں) کے ذریعہ مسلمانوں کی تہذیبی ذہن سازی کے ساتھ

ساتھ حالات حاضرہ سے جڑے سماجی وسیاسی مسائل کی تفہیم کا صحیح شعور ابھارا جائے۔

Vigilence Cell کا قیام:

ایک ایسے فعال Vigilence Cell کے قیام کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کا مقصد خاص ایسی پالیسیوں اور اقدامات پر نظر رکھنا ہے جن کا تعلق خواہ کسی بھی پارٹی یا ادارے سے ہو، مگر ان سے مسلم اقلیتوں کے ملی تشخص کی پامالی کا اندیشہ ہو، یہ Cell ملکی یا صوبائی سطح پر علاحدہ سے ایک ادارہ ہوسکتا ہے یا بعض موجود ملی ورفاہی اداروں مثلاً فقہ اکیڈمی، مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ وغیرہ سے منسلک بھی، ایک معتبر اطلاع کے مطابق عالم اسلام میں صلیبی مشنری کے ۱۰۷ ادارے سرگرم ہیں اور امریکہ میں اسلام کے خلاف ۵۲ ہزار کتابیں چھاپی گئی ہیں، دنیا بھر میں پانچ کروڑ NGOs اسلام کے خلاف اہم کردار ادا کر رہی ہیں، آج انٹرنیٹ پر دیگر مذاہب کے لوگ چھائے ہوئے ہیں اور انہوں نے بڑی چالاکی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم چھیڑ رکھی ہے، ہمیں بھی اپنی حکمت عملی کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہوگا، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے ''بین الاقوامی نیٹ ورک'' کا قیام ناگزیر سا نظر آتا ہے (راشٹریہ سہارا ص: ۷، ۲۶ ردسمبر ۲۰۰۹ء نئی دہلی)۔

ہندوستان کے نظام سیاسی کی ہی بات کو لیجئے، ہم مسلم اقلیتیں یہاں ایک اہم Democratic Unit ہیں، ہندوستان کھلے عام اگر اسرائیل سے روابط ایک دوست کی طرح بڑھانا چاہے تو ہم بجا طور پر اس عمل کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں؛ کیونکہ اسرائیل مسلم دنیا اور خصوصیت سے فلسطینی مسلمانوں کے خلاف زیادتیوں اور جرائم کا ارتکاب کر رہا ہے، ہمیں اس معاملے میں سرکاری اقدامات کا پتہ ہونا چاہئے، اسی طرح خود مسلمان کے کسی حلقے، سیاسی تنظیم یا افراد کی طرف سے کسی ایسے بیان یا پالیسی کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے ملی تشخص کو مجروح کرنے والی ہے تو ہم اس کے خلاف بھی آواز اٹھائیں گے، مثال کے طور پر کلیان سنگھ کے ہی معاملہ کو لے

لیجئے جب وہ سماج وادی پارٹی میں جا گھسے تھے تو کچھ ناعاقبت اندیش اور مطلب پرست مسلمانوں نے بھی اس معاملہ کی حمایت کی تھی، وقت نے بتا دیا کہ کلیان سنگھ کا یہ سیاسی پینترا مسلمانوں کے لئے مضر ثابت ہوا، ایسی حالت میں حمایت کرنے والوں کے خلاف بھی مسلمانوں کی طرف سے آواز اٹھائی جانی چاہئے، مسلمانوں میں موجود "کالی بھیڑوں" اور مطلب پرستوں کے حرکات کی خبر بھی رکھنی چاہئے؛ تاکہ وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کہیں ہمارے ہی خلاف استعمال نہ کر لئے جائیں۔

آخر میں مختصراً عرض کرنا چاہوں گا کہ امت مسلمہ کو اقلیت میں ہونے کا تصور ذہنوں سے جھٹک دینا چاہئے، ایک اچھے مسلمان اور ایک اچھے شہری کی طرح معاملات زندگی میں داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے استحکام لانے کی صورت گری کرنی چاہئے۔

امت کے کاروبار زندگی میں استحکام کچھ ایسا ہو کہ بقول ایک عربی شاعر:

ثبّتوا قضب الجناح وأنبتوا ریش الغنا

یعنی قوم نے پر پرواز کو مضبوط کر لیا ہے؛ تاکہ آسمان کی سرحدوں تک جا پہنچیں اور جسم پر خود کفالت کے روئیں اگا لئے ہیں۔

☆☆☆

لبرل ازم، رواداری وفراخدلی اور اسلاموفوبیا کا مفروضہ
انصاف اور باہمی احترام کے بارے میں اسلامی تناظر

محمد محب الحق☆

فرانسس فوکو یاما نے اپنی کتاب "دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ دی لاسٹ مین" ۱۹۹۲ء میں بڑی سادہ لوحی سے لکھا ہے کہ انسانی حکومت کے لئے لبرل ڈیموکریسی کو آخری شکل کے طور پر تسلیم کئے جانے کے بعد اب تخیل وتصور کی تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے، مصنف کی دلیل یہ ہے کہ عالمی طور پر مغرب کی لبرل جمہوریت کو بطور مثالی نمونہ قبول کرنے کے بعد اب کسی نئے ماڈل (نمونہ) کی جستجو یا کاوش ختم ہو گئی ہے، مصنف کے اپنے الفاظ میں: "اس طرح ہم تاریخ کے خاتمہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں یعنی یہ بنی نوع انسان کے نظریاتی ارتقا کا اختتام اور مغربی لبرل جمہوریت کو عالمی سطح پر انسانی نظام حکومت کے طور پر حتمی انداز میں تسلیم کیا جانا ہے"۔ فوکو یاما کے یہ خیالات نئے نہیں ہیں اس سے پہلے بھی امریکی ماہر سماجیات ڈینیل بیل نے بآواز بلند اعلان کیا تھا کہ سیاسی خیالات کا خزانہ ختم ہو چکا ہے، اگرچہ اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظریاتی اختتام ہے؛ تاہم اس نے دلیل پیش کی کہ کیونکہ مغرب میں اکثر سیاسی شعبدہ باز اقتصادی خوشحالی، سماجی تحفظ اور مادی تمول کے دعدوں پر سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہیں جو کہ زندگی کے جذباتی وجسمانی آسودگی کے نظریہ پر مبنی ہے، یہ ان سیاسی شعبدہ بازوں کے درمیان ایک قسم کا اجماع یا اتفاق ہوتا ہے، ان دونوں اسکالروں کے

☆اسسٹنٹ پروفیسر پولیٹیکل سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظریات میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کے خیالات مغرب زدہ ہیں اور ان کے مفروضوں میں تمرد کا پہلو بھی مشترک ہے، لیکن اس قسم کے خیالات ونظریات کا اظہار کرتے وقت انہوں نے دنیا کی ۸۰ فیصد آبادی کو نظر انداز کر دیا جو مغرب سے باہر کی دنیا میں بستی ہے۔

اگر ہم مغرب میں سیاسی افکار ونظریات کے فروغ کا گہرائی سے جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ وہاں تین اہم نظریات کو فروغ ہوا جنہوں نے اپنے گہرے نقوش واثرات مرتب کئے، یہ نظریات ہیں: لبرل ازم/کیپٹل ازم (سرمایہ داری)، سوشلزم/ مارکسزم اور فاشزم (فسطائیت)۔ یہ سب نظریات مادہ پرستی، خدا بیزاری اور طاقت واقتدار کو ہر پہلو سے حاصل کرنا اور پوری بربریت سے حاصل کرنا ان مغربی نظریات کی بنیاد ہے؛ کیونکہ بیسویں صدی کے دوران ہی سوشلزم/ مارکسزم اور فاشزم عملی طور پر بے اثر ہو چکے۔

لہٰذا اب مغرب میں صرف دو نظریات موثر ہیں یعنی لبرل ازم اور کیپٹل ازم۔ لبرل ازم/کیپٹل ازم کے اندر جو کمزوریاں ہیں وہ اب سامنے آنے لگی ہیں اور مغرب ایک نظریاتی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے؛ کیونکہ یہ نظریات حکومت اور عوام کے اعمال کا تعین کرتے ہیں اس لئے اقتدار کے حصول کے لئے اسے برقرار رکھنے، بروئے عمل لانے اور اس میں اضافہ کرنے کے لئے ہمیشہ ایک نظریہ کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ نظریات مذہبی عقیدہ کی طرح عوام کو ایک شناخت بھی عطا کرتے ہیں، جب ہنٹنگٹن نے یہ لکھا کہ لوگ سیاست کو محض اپنے مفاد کے لئے ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنی شناخت ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں تو غالباً اسی نظریاتی سیاست کی طرف اشارہ کر رہا تھا جب ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کیا نہیں ہیں تب ہی ہم اپنے آپ کو پہچانتے ہیں یا اکثر اس صورت میں جب ہم اس سے باخبر ہوتے ہیں کہ ہم کس کے خلاف ہیں، مغرب میں چونکہ خدا کو جلا وطن کر دیا گیا ہے اور مذہب کو محض ذاتی مسئلے کے طور پر باقی رہنے دیا گیا ہے لہٰذا اس کے لئے ایک نظریہ کی ضرورت ہوتی ہے جو مؤثر طور پر

اپنی تعریف یا اپنی شناخت واضح کر سکے، ہمیں یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مغرب میں آج تک کوئی مذہبی پیشوا پیدا نہیں ہوا اور غیر مغربی معاشرے نے گذشتہ کئی صدیوں کے دوران کوئی اہم سیکولر سیاسی نظریہ پیش نہیں کیا، لہٰذا مغرب کے لئے نظریہ/نظریات اور غیر مغربی معاشرہ کے لئے مذہب/مذاہب کی بے حد اہمیت ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ لبرل ازم، کیپٹل ازم کے پیرو اور حامی اس نظریہ کو مستحکم، لازمی اور انسانیت کے لئے واحد نسخہ کیمیا قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، بدقسمتی سے غیر مغربی معاشرہ میں متفرق سیاسی اور مذہبی نظریات کو جانچنے کے جو پیمانے مقرر کئے گئے ہیں وہ لبرل ازم/کیپٹل ازم کی بنیاد پر کئے گئے ہیں، پس تاریخ کے خاتمہ اور نظریاتی اختتام کے مفروضہ کو ایک خاص مقصد کے تحت پیش کیا جا رہا ہے، درحقیقت اس کوشش کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ غیر مغربی دنیا کوئی مکمل نظریہ پیش نہیں کر سکتی لہٰذا مغرب کے نظریات ہی دنیا کے لئے قابل عمل ہیں، اس نازک مرحلہ پر اسلام کو تاریخی اعتبار سے ایک برتر نظریہ کے طور پر پیش کرنا اہم ہوگا، متعدد مغربی اسکالرز بھی اس کے مطالعہ میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔

اسلاموفوبیا:

ہنٹنگٹن کہتا ہے: "ہم اپنے کو جب ہی پہچانتے ہیں جب ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم کیا نہیں ہیں یا پھر اکثر یہ کہ ہم کس کے مخالف ہیں، وہ اپنی بات پر زور دینے کے لئے مائیکل ڈیڈین کے اس قول کا سہارا لیتا ہے کہ کسی واقعی دشمن کے بغیر کوئی واقعی دوست نہیں مل سکتا، جب تک ہم اس بات سے نفرت نہ کریں کہ ہم کیا نہیں ہیں اس وقت تک ہم اس سے الفت نہیں کر سکتے کہ ہم کیا ہیں (اس جملہ پر زور دیا گیا ہے)، ہم ہنٹنگٹن کے خیالات کو تحقیر اور نفرت کے ساتھ مسترد کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ یہ وہ خیالات ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی کی اہم ترین بنیاد ہیں، بدقسمتی سے امریکہ کے متعدد اتحادی بھی اس کی توسیع پسندانہ اور صف آرائی کی خارجہ پالیسی کو درست سمجھتے ہیں، چنانچہ سرد جنگ کے دوران

سرخ آشوب اور سرخ خطرے کی اصطلاح بکثرت استعمال کی جاتی تھی، اور سوشلسٹ بلاک کو برائی یا ابلیس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، سوویت روس کے انتشار کے بعد اب استعماری طاقتوں کو ایک نئے دشمن کی تلاش ہے، لہٰذا سامراجی طاقتوں کے پروپیگنڈے/مشن کو ایک نیا دشمن تلاش کرنے یا وضع کرنے کی مہم سپرد کی گئی، بس اب سبز آشوب اور سبز خطرے کی اصطلاحیں وضع کی گئی تاکہ اس سیاسی، مذہبی نظریہ کو بدنام کیا جائے جو مغرب کے اقتدار اور غلبہ کے لئے اخلاقی، سیاسی، دانشورانہ اور روحانی طور پر سب سے بڑا چیلنج ثابت ہوسکتا ہے لیکن پھر تیزی سے ان پیچیدہ اصطلاحوں کو چھوڑ دیا گیا اور ان کی جگہ زیادہ جارح اور اذیت ناک اصطلاحیں مثلاً اسلامی جنگجوئیت، اسلامی دہشت گردی، اسلامی بنیاد پرستی اور اسلامی فسطائیت وغیرہ جیسی اصطلاحیں رائج کردی گئیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ بہت سی اسلامی دہشت گردی عالمی نیٹ ورک اور کثیر القومی بھرتی نظام سے وابستہ پائے گئے، دہشت گردی اور بربریت کے بہت سے حملوں اور کارروائیوں میں ان ہی نام نہاد اسلامی دہشت گردوں کا ہاتھ بتایا گیا، اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ آخر یہ تمام نام نہاد اسلامی دہشت گرد اشتراکی روس کے انتشار کے بعد ہی منظر عام پر کیوں آئے، اس کا جواب اسلاموفوبیا کے پروپیگنڈے میں پایا جاسکتا ہے۔

انسانیت کی بقا اور انسانوں کے پرامن بقاء باہم کے نظریات کے ساتھ باقی رہنے کا انحصار اس پر ہے کہ اسلاموفوبیا کے خصوصی خطرات کے پیچھے سامراجوں کے جو عزائم ہیں انہیں واشگاف کیا جائے، اس وقت یہ ضروری ہے کہ ہم اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں سے بامعنی مذاکرات کریں اور دنیا کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ کرائیں، یہ مسلم دانش وروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے محاسن کو اجاگر کرکے مسلمانوں/ اسلام کے خلاف پھیلی ہوئی بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، تاریخ کے اس موڑ پر جبکہ مغرب اقتصادی بحران اور نظریاتی کشمکش سے دوچار ہے اسلام اہل مغرب کے لئے ایک بہترین متبادل ثابت ہوسکتا ہے،

اس سے پہلے کہ ہم اس پر غور کریں کہ اسلام مغرب کو کیا دے سکتا ہے میں یہاں ہیولٹ پاکٹ کے سی ای او کارلی فائیورینا کی ایک تقریر کا حوالہ دینا چاہوں گا، یہ ان کی ایک تقریر ''ٹکنالوجی بزنس اور ہمارا طرز زندگی۔اس کے بعد کیا؟ سے ایک اقتباس ہے جو ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کو کی گئی۔ اس تقریر کو جو عنوان دیا گیا وہ تھا: کبھی یہاں ایک تہذیب تھی جو سطح ارض پر سب سے عظیم تھی، خاتون مقرر نے ان الفاظ میں اسلامی تہذیب کو خراج عقیدت پیش کیا:

''اس نے ایک ایسی براعظمی عظیم ریاست قائم کی جو سمندروں کو پار کر گئی اور شمالی اقالیم سے گزر کر دشت تک پھیلی، اس کے زیر اقتدار لاکھوں افراد رہتے تھے جن کا تعلق مختلف مذاہب اور نسلوں سے تھا۔

اس کی متعدد زبانوں میں سے ایک دنیا کی عظیم ترین زبان بن گئی جو کہ سیکڑوں علاقوں کے درمیان رابطہ اور واسطہ بنی، اس کی افواج متعدد اقوام کے سپاہیوں پر مشتمل تھی، اس کے عسکری تحفظ نے امن وخوشحالی کے ایک ایسے دور کو قائم کیا جس کا اس سے پہلے وجود نہیں تھا اس تہذیب کی تجارتی سرگرمیاں لاطینی امریکہ سے چین تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے اثرات بھی ہر ایک مقام پر موجود تھے۔

اس تہذیب کے تحت بہت زیادہ ایجادات عمل میں آئیں، اس کے فن تعمیر نے وہ طرز تعمیر ایجاد کیا جو ثقل کے اثرات سے بے نیاز تھا، اس کے ریاضی داں فضلاء نے الجبراء اور الغوری ازم ایجاد کیا جس سے کمپیوٹر اور شارٹ ہینڈ (رمز نگاری) کا وجود ممکن ہوا، اس کے طبیبوں نے جسم انسانی کا معائنہ کیا اور امراض کے نئے علاج دریافت کیے، اسی کے ماہرین فلکیات نے آسمانوں کا مشاہدہ کیا، ستاروں کے نام رکھے اور وہ راہیں فراہم کیں جن سے خلائی سفر اور انکشافات کا آغاز ہوا۔

اور ان کے اہل قلم نے ہزاروں حکایتیں لکھیں، حکایتیں جو حوصلہ، رومان، سحر کے

بارے میں ہیں، اس کے شعراء نے محبت کے نغمے گائے جبکہ اس سے پہلے کے لوگ ایسی باتیں سوچنے سے بھی گھبراتے تھے۔

جب دوسری قومیں خیالات ونظریات سے خوفزدہ تھیں تو اس کے مفکرین نے نئے خیالات ونظریات پیش کیئے اورانہیں زندہ رکھا، جب مذہبی احتساب علم اور پرانی تہذیبوں کو متاثر کرنے پر تلا ہوا تھا تو اس تہذیب نے پرانی تہذیبوں کی حفاظت کی اور علم وتہذیب کو دوسروں تک پہنچایا اگرچہ مغربی تہذیب بھی ان خصوصیات کی حامل رہی ہے، لیکن میں جس تہذیب کا تذکرہ کررہی ہوں وہ اسلامی دنیا ہے جو ۸۰۰ سے ۱۶۰۰ء تک غالب رہی، اس میں خلافت عثمانیہ، بغداد، دمشق، قاہرہ کے دربار بھی شامل ہیں اور سلیمان فاتح جیسے عظیم حکمران بھی۔

اگرچہ ہم اس تہذیب کے احسانات سے بے خبر ہیں، لیکن اس کے اثرات ہماری تہذیبی وراثت کا اہم حصہ ہیں، اگر عرب ریاضی دانوں کی خدمات نہ ہوتیں تو آج ٹیکنالوجی اور صنعت کا دور بھی نہ ہوتا، صوفی شعراء اور فلاسفہ جیسے رومی نے ہماری خودی اور پندار کے خیالات کو چیلنج کیا، سلیمان جیسے عظیم لیڈروں نے ہماری رواداری اور عوامی لیڈر شپ کے نظریات کو سہارا دیا۔

ہم غالباً اس کی مثال سے ایک سبق سیکھ سکتے ہیں یہ ایک ایسی قیادت تھی جو محاسن پر قائم تھی وراثت پر نہیں، یہ ایک ایسی قیادت تھی جس نے ایک کثیر الجہت آبادی کی صلاحیتوں کو فروغ دیا جس میں عیسائی اسلامی اور یہودی اثرات وعوامل بھی شامل تھے۔

یہ ایسی عالمانہ قیادت تھی جس نے آٹھ سو سال تک ایجادات وخوش حالی کا دائرہ وسیع رکھا، ثقافتی وتہذیبی کثرت اور عزم وحوصلہ کو برقرار رکھا۔

اس ظلمت اور سنگینی کے دور میں ہمیں ایسے اداروں اور سماج کی تشکیل سے اپنی وابستگی کا عہد کرنا چاہئے جو اس جیسی عظمتیں حاصل کرسکیں، اس وقت ہمیں سب سے زیادہ قیادت پر توجہ دینی چاہئے، ایسی اہم باحوصلہ قیادت جو فیصلہ کن طور پر قائدانہ کردار ادا کرسکے۔

پس دیدہ ور اور سنجیدہ اسکالر اس بات سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ نظریات کے خاتمہ یا تاریخ کے اختتام کے نظریہ کو قبول کرنا ایسا ہی ہے گویا انسانی فکر کے خاتمہ کو قبول کرنا اور یہ علم و انسانیت کے فروغ کے لئے نہایت ہی خطرناک بات ہوگی، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مختلف افکار و نظریات وخیالات کے حلقوں کے درمیان گفت وشنید، افہام وتفہیم اور تبادلہ خیال کا دور جاری رہنا چاہئے کیونکہ علم اور انسانیت کے لئے یہ سلسلہ جاری رہنا بے حد ضروری اور اہم ہے، اس سے رواداری امن، باہمی مفاہمت کی بنیاد پر ایک عالمی معاشرہ کی تشکیل میں مدد ملے گی۔

بہر کیف اس قول کے مطابق کہ علم سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اسلام موجودہ مغربی تہذیب کو کیا کچھ عطا کر سکتا ہے، اگرچہ وقت کی کمی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں تفصیل سے اس پر کچھ کہوں تاہم میں اپنی بات اسلام کے دو اہم اصولوں یعنی انصاف اور باہمی احترام کی بنیاد پر پیش کروں گا۔

ہر معاشرہ میں انصاف کا تصور موجود ہے اور اسی کی بنیاد پر حق وناحق میں امتیاز کیا جاتا ہے، اسی طرح ہر معاشرہ میں کچھ اصول اور معیار ہوتے ہیں جن پر انصاف کا تصور برقرار رہتا ہے، چونکہ احوال ومقام اور وقت کی تبدیلی واقع ہوتی ہے اس لئے انصاف کا تصور بھی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ جاتا، مغربی تہذیب جو لبرل ازم، کیپٹل ازم پر انحصار کرتی ہے اس کے ہاں انصاف کا یہی تصور ہے، انصاف کے اس نظریہ کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ بہت سے معیار مستقل نوعیت کے ہیں اور تبدیلی سے انصاف کی عمومیت پر اثر پڑے گا اور فکر کی بنیاد پر سامراجیت، استحصال اور سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہوتا ہے، دراصل یہی نظریہ عالم سیاست کے شعبدہ بازوں کی ہوس اقتدار کو سہارا دیتا ہے، حالات کی تبدیلی کے ساتھ انصاف کا یہ تصور بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے اور طاقتور ممالک اور معاشرہ دوسروں کو ان حقوق ومراعات سے محروم رکھتے ہیں جن سے وہ خود بہرہ ور ہوتے ہیں، مغرب نے انصاف کا جو یہ نظریہ وضع کیا ہے

اس کی متعدد المناک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

میڈلین البرائٹ جو اس وقت اقوام متحدہ میں امریکی نمائندہ کے طور پر کام کر رہی تھی اس سے ۱۹۹۶ء میں نیشنل ٹی وی پر سوال کیا گیا کہ عراق کے خلاف معاشی پابندیاں لگائے جانے کے نتیجے میں ۵ لاکھ عراقی بچے موت کا شکار ہو گئے، البرائٹ نے جواب دیا کہ یہ ایک بڑا مشکل فیصلہ تھا لیکن حالات کے پیش نظر یہ قدم اٹھانا پڑا اور اس کی جو قیمت ادا کی گئی وہ بہر حال صحیح تھی۔

آپریشن لامحدود انصاف جس کا نام بدل کر آپریشن مستقل آزادی رکھا گیا اس کی وجہ سے عراق اور افغانستان کے لوگوں کو بے پناہ مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں۔

گوانتانامو سے ابو غریب تک ہر جگہ انسانی حقوق اور انسانی وقار کی پامالی کی گئی۔ ۵ سال کے دوران افغانستان و عراق میں بیس لاکھ لوگوں کی ہلاکت اور دہشت گردی روکنے کے نام پر اتحادی فوجوں کے ہاتھوں ان دونوں ملکوں میں عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں کی ایک نامعلوم تعداد کا خاتمہ سفا کی اور انصاف کے اس دوہرے معیار کو ظاہر کرنے کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ورسیلز کے معاہدے سے لے کر اقوام متحدہ کی تشکیل ہونے تک ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی، موجودہ عالمی سیاسی نظام جس پر یو این او اور ناٹو کا غلبہ ہے اور بین الاقوامی اقتصادی نظام جس پر عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او کا قبضہ ہے، یہ سب غیر منصفانہ بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ (اگر مطالبہ ہو تو اس صورت حال کی وضاحت بھی کی جا سکتی ہے)۔

انصاف کا اسلامی تصور:

اسلام معاشرہ، سیاسیات اور اقتصادیات میں انصاف کو بے حد اہمیت دیتا ہے، اسلام اس کا درس دیتا ہے کہ اللہ انصاف کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو انصاف کرتے ہیں۔ اسلام میں انصاف کی بنیادی اہمیت ہے کہ یہ امن اور نظم وضبط کی اولین شرط ہے، اسلام انصاف کو

صداقت کی طرح ہی ایک ابدی تصور سمجھتا ہے، عدل ناقابل تغیر، کامل ہے اور قرآن وسنت کے اصولوں پر قائم ہے، کوئی حاکم، کوئی فرد یا کوئی جماعت نہ قرآن میں ترمیم وتنسیخ کر سکتی ہے نہ اس کے احکام کو بدل سکتی ہے، اسلام میں عدل کے تصور کی دلکشی اور اہمیت یہ ہے کہ یہ آفاقی ہے اور قومی، بین الاقوامی یا نظریاتی حدود سے ماوراء ہے، قرآن عظیم کے متعدد احکام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس صداقت پر گواہ ہیں، ان احکام وارشادات میں سے بعض یوں نقل کیے جاتے ہیں: بلاشبہ ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور گھرانے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے (حجرات: ۱۳)۔

''تمام انسان برابر ہیں'' (۲:۲۳)۔

خطبہ حجۃ الوداع میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی عرب کو کسی غیر عرب پر اور کسی غیر عرب کو کسی عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، فضیلت کا معیار صرف تقوی ہے، تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی (المسند امام احمد بن حنبل: ج ۵، ص ۳۲)۔

قرآن عظیم اس بات کا بھی واضح اعلان کرتا ہے کہ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے (بقرہ: ۲۵۶)۔

اوپر پیش کردہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام وحدت بنی آدم کا درس دیتا ہے اور رنگ، نسل، مقام اور خاندان کی بنیاد پر کسی بھی افتخار یا امتیاز کو سختی سے رد کرتا ہے، پس اسلام کسی طاقتور قوم یا طائفہ کو بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے کا استخفاف کرے، اسلامی امت کسی حال میں بھی ایسے سفاک افعال کی اجازت نہیں دے سکتی، جیسا کہ مغرب طویل عرصہ سے عراق، افغانستان اور فلسطین میں ارتکاب کر رہا ہے، اقتصادی پابندیاں

عائد کر کے معصوم بچوں کو ہلاک کرنا، کلسٹر اور کارپیٹ بموں کے ذریعہ بے گناہ لوگوں کو شہید کرنا انسانیت کے خلاف سنگین جرائم ہیں، اسلام یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کسی بے گناہ شخص کو قتل کردیا جائے تو گویا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عدل کو مساوات، عدم امتیاز اور وحدت انسانی سے مربوط کردیا گیا ہے، اسلام تمام انسانوں کی مساوات کا اعلان کرتا ہے جبکہ مغرب قومیت اور علاقائی روابط کی بنیاد پر مساوات کی بات کرتا ہے، ان سامراجی ملکوں کی غلامی میں جو قومیں آباد تھیں انہیں ایک آبرومندانہ زندگی گزارنے کا حق نہیں دیا گیا اور نسلی امتیاز کی پالیسی پر کھل کر عمل کیا گیا، آج کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اقوام کے اتحادی ممالک دوسری قوموں کو مساوات کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، اور غیر مغربی معاشرہ کے افراد کے ساتھ انتہائی غیر منصفانہ سلوک کیا جارہا ہے۔

اسلام کا تصور عدل قلب وضمیر کو متاثر کرتا ہے؛ کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اقتدار اللہ کے لئے ہے، حاکم یا ریاست اقتدار کے مالک نہیں ہیں، اقتدار کے مغربی تصور کے تحت ریاست کو اتنا اونچا درجہ دیا گیا ہے کہ اسے معبود بنادیا گیا ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں سمجھا جاتا، وہ مطلق ہے بسیط ہے، اور معصوم ہے، اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی قادر مطلق نہیں ہے، ساری قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ ہی اعلیٰ ترین اور عصمت وعظمت کا حامل ہے، اسلامی معاشرہ اور ریاست میں قرآنی احکام کی برتری ہوتی ہے، حکمراں اور عوام سب اسی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اسی سے انہیں اپنے حقوق وفرائض کا ادراک ہوتا ہے، اسلامی معاشرہ میں اکثریت کے جبر واستبداد کا کوئی اندیشہ نہیں نہ کوئی مقتدر شخصیت ظلم کرسکتی ہے، ریاست، معاشرہ اور حاکم سے متعلق یہ بنیادی نظریہ ہی مکمل عدل کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اسلام کسی ایسی ریاست کا تصور پیش نہیں کرتا جسے استبداد کا محور قرار دیا جائے، اسلامی ریاست میں ہر حال میں ہر شخص کے ساتھ

انصاف کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ریاست اور اقتدار کے تصور کے تحت عدل، مساوات، باہمی اخوت واحترام ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت قدر کی صورت میں فروغ پذیر ہوتے ہیں۔

باہمی احترام:

تحمل اور رواداری کو ایک بنیادی جمہوری قدر تسلیم کیا جاتا ہے، مغرب کا لبرل ازم بھی بظاہر اس کی تعلیم دیتا ہے، درحقیقت یہ تحمل اور رواداری کی دنیا میں امن کی ضمانت ہے، اسلام اس سے ایک قدم آگے جا کر باہمی احترام کی تعلیم دیتا ہے، اسلام میں اس کی اس قدر زیادہ اہمیت ہے کہ ہر مسلمان دن میں کم ازکم پانچ دفعہ اس باہمی احترام کے تصور کی تکرار کرتا ہے، پنج وقتہ نمازوں میں مسلمان مرد/عورت درود پڑھتے ہیں جس میں کہا گیا ہے: اے اللہ! محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل واولاد پر درود نازل فرما جیسا کہ تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی آل واولاد پر درود نازل فرمایا، بے شک تو تعریف کے لائق ہے تو ہی صاحب عظمت وجلال ہے، اے اللہ! اپنے رسول محمد اور ان کی آل واولاد پر برکت نازل فرما جیسی کہ تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر برکت نازل فرمائی، بیشک تیری ذات ہی تعریف کے لائق ہے تو ہی صاحب عظمت وجلال ہے (صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ)۔

رواداری کے مقابلہ میں باہمی احترام کا جذبہ مثبت اور وسیع ہے، جب ہم تحمل کی بات کرتے ہیں تو اس میں جبر اور دباؤ کا احساس ہوتا ہے، ہم کسی شئے، کسی خیال، کسی فرقہ یا فرد کو پسند کریں یا ناپسند کریں لیکن ہمیں تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، اسلام اس کے مقابلے میں باہمی احترام کی تلقین کرتا ہے، باہمی احترام کے نتیجہ میں تحمل بھی ضرور پیدا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ کہیں بھی کوئی مسلمان کسی دوسرے شخص کے مذہبی جذبات کی بے حرمتی نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور دیگر رسولوں کا بھی ایسا ہی احترام کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے ہیں، ڈنمارک کے اخبار میں کارٹون میں

پیغمبر اسلام رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو جس انداز میں پیش کیا گیا اور پھر یورپ کے درجن بھر اخباروں نے اسے نقل کیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کے تحمل اور رواداری کے دعوے کس قدر کھوکھلے ہیں، لہٰذا تحمل کے بجائے باہمی احترام کے جذبہ کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور بلاشبہ اس سلسلے میں اسلام بہترین رہنما ثابت ہو سکتا ہے، ہماری تجویز یہ ہے کہ مغربی حکومتوں کو پیشوایان دین کی توہین کے خلاف جو قوانین ہیں ان کے تحت حضرت رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی بھی شامل کرنا چاہئے۔

اختتام:

اوپر جو کچھ زیر بحث آیا اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تبادلہ خیالات اور باہمی روابط اس سلسلے میں بے حد اہم اور مفید ثابت ہوں گے۔ یہ اسلام اور مغرب کے درمیان باہمی روابط کا اثر تھا کہ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور یہ مکمل طور پر انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے، ماضی میں مغرب اور اس کے معاشرے کی ترقی میں اسلام نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی اسلام امن، باہمی احترام، عدل، مساوات اور اصل آزادی پر مبنی ایک آفاقی معاشرہ کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے، جس سے ایک مثالی معاشرہ وجود میں آئے گا، نظریات کا خاتمہ یا تاریخ کا اختتام جیسے دعوے محض جہل اور نادانی پر مبنی ہیں، ان کا مقصد دوسرے معاشروں کو نظریاتی طور پر مغرب کے لبرل ازم/کیپٹل ازم سے مغلوب کرنا ہے، اسلام عدل پر مبنی زندگی کا ایک مکمل اور ہمہ جہت تصور پیش کرتا ہے؛ اسی لئے اسلام کے خلاف ہمہ گیر پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ کہیں یہ مغرب کا متبادل نہ بن جائے، لہٰذا اس وقت یہ بے حد ضروری ہے کہ مثبت اور منطقی انداز میں دنیا کے سامنے اسلام کے عدل، مساوات، باہمی احترام، عالمی انسانی بھائی چارہ اور امن کے بے مثال تصور کو پیش کیا جائے، اسلام مغرب کو

آزادی کا وہ تصور عطا کر سکتا ہے جو اخلاقیات پر مبنی ہے، عدل و مساوات اور باہمی احترام سے فروغ پاتا ہے اور ایک غیر یقینی امن کے مقابلہ میں حقیقی امن کی راہ دکھا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

۱- سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم میں نقل کیا ہے۔ پنگوئن بکس نئی دہلی، ۱۹۹۶ء ص ۳۱۔

۲- تفصیل کے لئے دیکھیے: تاریخ کا خاتمہ: (ڈینیل بیل، ۱۹۵۰ء، نیو یارک فری پریس)

۳- سیموئیل پی ہنٹنگٹن، ص ۲۱۔

۴- ایضاً

۵- ایضاً، ص ۲۰

۶- ارون دھتی رائے دی الجبرا آف انفائنٹ جسٹس پینگوئن نئی دہلی ۲۰۰۱ء

نوٹ:- براہ کرم اس مضمون سے اقتباس نقل نہ کیجئے کیونکہ ابھی یہ نامکمل ہے۔

☆☆☆

سرد جنگ کے بعد کی سیاست میں اسلاموفوبیا گلوبلائزیشن اور جمہوریت کا درس

ڈاکٹر محمد سہراب☆

تعارف:

اسلاموفوبیا ایک متنازعہ موضوع ہے، لہٰذا اس پر موضوعاتی تفصیل وتشریح سے متعلق کافی لٹریچر کی ضرورت ہے، اس ضمن میں اسلاموفوبیا کے سوال پر تنقیدی مطالعہ کی شدید ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

متعدد اہم واقعات مثلاً ایران میں اسلامی انقلاب، افغانستان میں اشتراکی روس کی مداخلت اور مغربی نیز مسلم ممالک کی حمایت وتائید کی بناء پر افغانیوں کی مزاحمت، رشدی کی کتاب، سوویت یونین کا بکھراؤ اور دنیا میں یک قطبی نظام کا عملی استیلاء اور مغرب کی یہ خواہش کہ اسلام کو مستقبل میں عالمی نظام کے لئے ایک خطرے کے طور پر پیش کیا جائے اور آخر میں ۹/۱۱ کا حادثہ وغیرہ، ان دو دہائیوں کے دوران ان واقعات نے اسلاموفوبیا کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس دوران اسلام کو مغرب کے لئے ایک متبادل خطرے کے طور پر پیش کیا گیا، ان تمام

☆ مقالہ نگار جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی اکاڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں انہوں نے سعودی عربیہ پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے انہیں اسلامی نظریہ اور امت مسلمہ کی شناخت کے مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔

واقعات کے پس منظر میں اسلاموفوبیا اور اسلام بیزاری کا رویہ بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس اصطلاح کا استعمال پہلی بار ایک رپورٹ بعنوان "اسلاموفوبیا- امریکہ کے لئے ایک چیلنج"، میں کیا گیا، یہ رپورٹ برطانیہ میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی، اُس رپورٹ میں اسلاموفوبیا اور اسلام کے نظریات کو درج ذیل طرز پر پیش کیا گیا۔

۱- اسلام ایک یک سنگی مذہب ہے جس میں نئے خیالات ونظریات کو قبول کرنے کی گنجائش نہیں۔

۲- اسلام علیحدگی پسند کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، نہ دوسروں کا اثر قبول کرتا ہے، نہ دوسروں کو متاثر کرتا ہے اور نہ اس کی قدریں مشترک ہیں۔

۳- اسلام کو متشدد، دہشت گرد، دہشت گردی کا حامی مذہب کے طور پر پیش کیا گیا جو تہذیبوں کے تصادم میں الجھا ہوا ہے۔

۴- فلسفۂ اسلام کو مغربی سماجی اقدار سے کم تر دکھایا گیا جس میں بربریت ہے، غیر معقولیت ہے، تہذیب کے دور سے پہلے کا انداز ہے، جنسیت کا غلبہ ہے۔

۵- اسلام کو ایسے سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کیا گیا جسے کشور کشائی کے مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔

۶- اسلام کے مغرب پر جو اعتراضات تھے انہیں یکسر مسترد کر دیا گیا۔

۷- اسلام بیزاری کو مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک اور انہیں اصل معاشرہ سے الگ تھلگ رکھنے کے جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔

۸- اسلام دشمنی کو فطری اور صحیح موقف کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

سامراج کے تحت رہنے والی اقلیتوں کے شہری حقوق کے لئے جدوجہد نے جو یوروپی سلطنتوں میں شروع ہوئی ایسے سیاسی تاریخی حالات پیدا کر دئے جن کے تحت نسلی امتیاز کی جگہ

ثقافتی نسل پرستی کا جذبہ پیدا ہوا، گورے دانش وروں نے نسل پرستی کے نظریہ کو ترک نہیں کیا، انہوں نے سامراجیت میں دبے لوگوں کی جدوجہد کے پیش نظر نسل پرستی کی تعبیر، معنی، الفاظ اور مفہوم کو تبدیل کر دیا۔

ثقافتی نسل پرستی ایک ایسا نظریہ ہے جس میں نسل کا لفظ استعمال ہی نہیں ہوتا، یہ دوسرے لوگوں کی ثقافتی کم تری پر انحصار کرتا ہے، عموماً یہ دوسرے لوگوں کی عادات واطوار، خیالات وعقائد کی کمتری کو بنیاد بناتا ہے، یہ بھی نسل پرستی کی ہی ایک شکل ہے، کیونکہ یہ ثقافتی و تہذیبی بنیاد پر دوسری قوموں سے امتیاز برتا ہے، ایسے لوگوں کو ایک جمود میں اسیر سمجھا جاتا ہے، اس ثقافتی نسل پرستی میں مذہب کا غالب کردار ہے، جدید اصطلاح میں اب دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد وحشی، دہشت گرد، غیر مہذب، پسماندہ اور سخت گیر سمجھے جاتے ہیں، اس طرح یورپی، امریکی اور اسرائیلی حلقے خود کو نسل پرستی کے الزام سے بچالئے جاتے ہیں، ان کی باتوں کا تنقیدی جائزہ ان کی اس ذہنیت کو واضح کرتا ہے، یہ ساری باتیں اس پرانی نسلی برتری کے اظہار کا دوسرا انداز ہے، اسلاموفوبیا کا ہدف مغربی یورپ کے سابق غلام باشندے ہی بنتے ہیں جو کہ مشتبہ افراد سمجھے جاتے ہیں، آج کے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور خوف کو غیر یورپی لوگوں سے نسلی برتاؤ سے علیحدہ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے، اسلاموفوبیا اور نسل پرستی دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، یورپ کے ذہن میں آج بھی استعماری دور کی نخوت زندہ ہے اور جدید سامراجی سرمایہ داری نظام آج بھی اس سے دامن نہیں بچا سکا ہے اور یہی اسلاموفوبیا کو پرانے سامراجی نسلی ذہن سے جوڑے رکھتا ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کو پاکستانی، بنگلہ دیشی، مصری مہاجرین کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، کیونکہ یہ سب برطانیہ کی سابق رعایا ہیں، اس طرح برطانیہ میں اسلاموفوبیا کو کالوں، عربوں اور جنوبی ایشیائی لوگوں سے نفرت کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے، فرانس میں مسلم مہاجرین زیادہ تر

شمالی افریقہ سے آتے ہیں، الجیریا، مراکش، تیونس، سینی غال وغیرہ جو پہلے فرانسیسی نوآبادیاں تھیں، ہالینڈ میں مسلمان زیادہ تر مہمان کارکن کے طور پر آتے ہیں، یہ ترکی، مراکش، انڈونیشیا، سنگاپور وغیرہ سے آتے ہیں لہٰذا ہالینڈ میں اسلاموفوبیا مہمان کارکنوں اور سابق رعایا کے خلاف اظہار مغائرت کا ذریعہ ہے، بلیجیم میں ان مہاجرین کے لئے غیر ملکی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو بیشتر مراکش سے آئے ہوئے ہیں، یعنی مسلمانوں کے علاوہ بھی جو ثقافتی اعتبار سے اجنبی ہیں، جرمنی میں اسلاموفوبیا ترکوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے، اسپین میں اسپین مور (عرب) مخالف جذبہ کا اظہار ہے، اسلاموفوبیا مسلمانوں سے نفرت و مغائرت کے ساتھ عرب دشمنی، جنوبی ایشیائی ممالک کے لوگوں سے نفرت اور کالے لوگوں سے نفرت سے عبارت ہے۔

اسی طرح امریکہ میں اسلام کو افریقی ایشیائی اور یوروپی امریکی نسل پرستی سے جوڑا جاتا ہے، پورٹوریکن (Puerto Ricans) جو امریکہ کی رعایا ہیں انہیں مشتبہ بھی سمجھا جاتا ہے یہ بھی اسلاموفوبیا سے جڑا ہوا ایک خبط ہے، اسی طرح لاطینی امریکہ کے مہاجرین کی بڑھتی ہوئی آبادی (جن میں سے بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں) بھی ایک تنازعہ کا عنوان ہے۔

استشراق میں اسلاموفوبیا:

ایک ثقافتی اور نسل پرستانہ دلیل جو اسلام کے معاشرتی رسوم ورواج کے خلاف وسیع پیمانہ پر استعمال کی جاتی ہے وہاں عورتوں کا جنسی استحصال اور انہیں دبا کر رکھنے کا الزام ہے، ایک جابر اسلام اور جابرانہ معاشرتی نظام کے سبب مسلمان عورتوں پر ستم رانی کا موضوع مغرب میں بہت عام ہے اور اس نام نہاد مفروضے کو حقیقت سمجھا جاتا ہے، اسی خیال کے تحت مسلمانوں کو کم تر درجہ کا سمجھا جاتا ہے، مغرب کے لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہبی، ثقافتی اور حکمرانی کا جابرانہ نظام مسلمانوں کی غیر مہذب اور پر تشدد اقدار کے باعث ہے جس کے تحت عورتوں پر جبر کرتے ہیں، اس قسم کی باتیں اس لئے پھیلائی جاتی ہیں تاکہ عالم اسلام کے مذہبی، ثقافتی و سیاسی امور میں

مغرب کو مداخلت کے مواقع حاصل ہوں، بش نے افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے جو دلائل استعمال کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ افغانی خواتین کو افغان مردوں کے جبر سے آزاد کرایا جائے، گوری اقوام کی جانب سے رنگدار نسل کی عورتوں کو ان کے مردوں کے جبر سے آزاد کرانے کے نعروں کی تاریخ استعماری دور سے دیکھی جا سکتی ہے، اسی کے پیچھے شمال مغرب پر سامراجی قبضہ کے اصل عزائم کو چھپاتا تھا، یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ بش نے افغانستان پر جو حملہ کیا اس کے پیچھے افغانستان کی سیاسی و جغرافیائی پوزیشن اور اس کی اہمیت نیز جنوبی ایشیا میں تیل اور گیس کے ذخائر سے اس کی قربت ہے، اس خطہ کی عورتوں کو مردوں کے جبر سے آزاد کرانے کے نعرے اصل حقیقت نہیں ہیں، نہ طالبان کو شکست دینا اصل مقصد ہے۔

مغربی میڈیا میں اسلاموفوبیا مسلمانوں کو وحشی ثابت کرنے کے لئے اور مغربی تہذیب کو ان کا مسیحا ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ یہ مغرب کے اقتصادی، سیاسی و جغرافیائی عزائم کو چھپانے کا ایک بہانہ ہے، بش نے ''اسلامی دشمن'' کا خوف پھیلا کر عیسائی بنیاد پرستی کی حمایت کی یہ گویا صلیبی جنگ کا ہی ایک حصہ ہے، سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ایک بار پھر اسلام اور مسلمانوں کو صلیبی لڑائیوں اور سامراجی غلبہ کے دوران جس طرح مطعون کیا جاتا تھا اس عمل کو دوہرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اسلاموفوبیا ایک علمی نسل پرستی کے طور پر:

یہاں میں نے یہ اصطلاح اسلاموفوبیا کے متبادل کے طور پر اس تناظر میں استعمال کی ہے جس نے بعض مفروضوں کو جنم دیا ہے اور جو اس کی شناخت اور سیاسی شناخت کی بنیاد ہے، یہ مفروضے اور سیاسی شناخت دیگر علمی موضوعات کو جدید دور میں خیالات کی آفاقیت میں اپنی جگہ حاصل کرنے سے محروم کر دیتے ہیں؛ چنانچہ عیسائی دنیا خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات اسی بنیاد پر طے ہوتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

مغربی فلسفی ڈیکارٹ ایک مفروضہ وضع کیا ہے ایگو کوگیٹو (Ego Cogito)، جس کا مفہوم یہ ہے میں سوچتا ہوں لہٰذا میرا وجود ہے، اس مفروضہ نے عیسائیوں کے عالمی دینی نظریہ اور علوم کو فکر اور تخلیق کا واحد ماخذ بنا دیا، اسی مفروضہ کے تحت وہ خود کو دنیا میں سوچنے اور تخلیق کرنے والی واحد قوم سمجھنے لگے، اس مفروضہ سے جو ذہن پیدا ہوا وہ سب پر برتری اور خود کو علم اور طاقت کا منبع سمجھتا ہے، اس مفروضہ نے ایک اور مفروضہ کو وضع کرنے کا ماحول پیدا کیا یعنی فاتحانہ انا، اسکا مفہوم یہ ہے کہ میں فاتح ہوں لہٰذا میرا وجود ہے، اس مفروضہ سے مسیحی خدا کے برتاؤ میں بتدیلی کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ چھپی ہوئی ''انا'' میں مغربی تہذیب جو اہل مغرب کو پیش کرتی ہے، اس مفروضہ نے مغرب کو اکسایا کہ نئے علاقوں کی تلاش میں مہم جوئی کرے، اس مہم جوئی کے نتیجہ میں نو آبادیاں قائم کی گئیں، اور اس طرح عالمی تعلقات میں ایک نئی طبقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا، اس نئے نظام میں مغرب شہنشاہیت اور استعماریت کا عنوان بن کر ابھرا۔

ڈکارٹ کی علم کی سیاسی انا سے ایک اور مفروضہ پیدا ہوا جو کولمبیائی فلاسفر ساتینگو کاسترو گومیز کا تھا، اس مفروضہ کو پوائنٹ زیرو تناظر کہا گیا، اس سے مغرب کے اس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ہر نقطۂ نظر سے بلند تر سمجھتا ہے، اس مفروضے کے مطابق مغربی تہذیب میں تبدیلی طبعی طور پر موجود ہے، لہٰذا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس علم کو وہ پیش کرتے ہیں وہ حتمی صداقت ہے جسے آفاقی طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے، یہ غیر جانبدارانہ اقدار و مقصدیت پر مبنی ہے۔

اس کا نتیجہ ہوا کہ ھنٹنگٹن جیسے معاصرین نے علوم مغربی اور استشراق کا ایک نیا امتزاج پیدا کیا مغرب کی برتری کو یقینی طور پر تسلیم کیا گیا اور مغرب کی علمی مراعاتی شناخت جس سے وہ دوسروں کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں اور عالمی سامراجی عزائم ایک ایسی پالیسی ہے جو نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ ارزین کے بقول کچھ دانشور جغرافیائی سیاسی مسائل اور سیکورٹی خطرات

کو امریکہ کی خصوصی شناخت کے مسائل سے جو کرتے ہیں جو غیر سفید عیسائی مہاجرین اور نیا مذہب قبول کرنے والوں سے ہے جن میں اتنا حوصلہ اور صلاحیت ہے کہ وہ مغربی برتری کو معاشرتی، معاشی، سیاسی اور آخرکار علمی طور پر چیلنج کرسکتے ہیں۔

اس علمی بحث کا اسلاموفوبیا سے کیا تعلق ہے؟ یہ دراصل مغرب کی اس برتر شناخت پالیسی اور علمی مراعات سے پیدا ہوتا ہے کہ دیگر علوم اور آفاقی جانکاری کو کم تر، مفروضہ اور مذہب اور داستانوں اور دیگر تمام غیر مغربی علوم کو کم تر درجہ پر رکھا جاتا ہے، غیر مغربی علوم کی یہ کمتری اور کم درجہ بندی علمی نسل پرستی کو فروغ دیتی ہے، اس سے استشراق پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اسلام کا استخفاف نہ صرف اسلام کو روحانی طور پر کم تر دکھاتا ہے بلکہ علمی طور پر بھی اسے کم درجہ پر رکھتا ہے۔

مغربی علوم کی برتری کا مفروضہ مغرب کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ تمرد کے ساتھ اسلام کو دیگر مذاہب سے کم تر اور جامد ثقافت ثابت کرے، ایسے ہی خیالات ''تہذیبوں کا تصادم'' جیسی دستاویزات میں پیش کئے گئے ہیں، اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں کیا خرابی اور بھی ہے، اس علمی نسل پرستی نے اسلام کے خلاف استشراق کی راہ ہموار کی؛ کیونکہ اسلاموفوبیا بطور نسلی برتری صرف ایک معاشرتی مظہر نہیں ہے بلکہ علمی سوال بھی ہے، علمی نسلی برتری کا یہ ذہن مغربی اسکالروں کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر مغربی فضلاء کی باتوں کو غور سے سنیں، دوسروں کے خیالات کو وحشیانہ، پسماندہ، غیر مہذب، جہالت پر مبنی کہہ کر مسترد کردیا جاتا ہے، یہی علمی نسلی برتری کا تمرد مغرب کو آمادہ کرتا ہے کہ یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے لئے کیا بہتر ہے اور کسی بھی باہمی ثقافتی گفت وشنید کی راہ مسدود کرتا ہے۔

اسلاموفوبیا اور عولمہ اور جمہوریت پر گفتگو:

آہنی پردہ کے انہدام سے مغرب میں ایک نئے فاتحانہ ذہن کو فروغ ملا، مغرب نے اپنے پرانے دشمن پر فتح کو نظریاتی اور تہذیبی فتح کے طور پر منایا، سرخ خطرے پر فتح پانے کے بعد

ایک ایسی نئی دنیا کا تصور مغرب کے ذہن میں آیا جس میں یہودی صلیبی تہذیب اور قدروں کا غلبہ ہو، اس ذہن کے بعد مغرب نے دیگر ممالک خصوصاً عالم اسلام کے خلاف تمرد کا رویہ اختیار کیا۔

مغرب کے بااثر دانش وروں کے مطابق جب تک اسلامی دنیا کو مغلوب نہیں کیا جاتا اس وقت تک یہودی صلیبی تہذیب کے غلبہ کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا، اس لئے وہ اس مفروضہ خطرے کے بارے میں بہت زیادہ بولتے ہیں، وہ اسے مغرب کے لئے ایک نیا چیلنج سمجھتے ہیں، اس تصوراتی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے مغرب نے گلوبلائزیشن (عولمہ) اور جمہوریت کے نعرے نئے انداز اور نئی سیاسی اصطلاحات میں لپیٹ کر دنیا کے سامنے پیش کئے، مقصد عالم اسلام پر غلبہ حاصل کرنا ہے، اس کے لئے پہلے اسلام اور مسلمانوں سے وابستہ ہرشئ کو حقیر گردانا جائے اور پھر ان کو مغلوب کر کے متعدد تبدیلیوں اور بڑے پیمانہ پر ماہیت قلبی پر مجبور کیا جائے، ان کے ہاں مغربی سیاسی فلسفہ اور ثقافتی قدروں کو مسلط کر کے حاصل کیا جاسکتا ہے دوسری حکمت عملی یہ ہے کہ عام دانشوروں سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تحقیر آمیز لٹریچر تیار کرایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کو خوفناک اور نفرت انگیز شبیہ میں پیش کیا جائے، ان ہی دو حکمت عملیوں کو بروئے عمل لانے سے سرد جنگ کے بعد کے عرصہ میں مغرب میں اسلاموفوبیا اور اسلاموفوبیائی رویہ میں ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوا ہے، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ حقیقی اور کچھ فرضی وہشت گردی کے واقعات نے مغرب میں اسلاموفوبیا کو مقبولیت بخشی لیکن اسے اسلاموفوبیا کی اصل بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا، اسلاموفوبیا کی بنیاد اسلام اور مسلمانوں کی ثقافتی حدود سے باہر ہے، گلوبلائزیشن، جمہوریت کی تبلیغ اور اسلام نیز مسلمانوں اور ان کی ثقافت کے بارے میں معاندانہ لٹریچر ایک نئے ذہن اور رویہ کو فروغ دے رہا ہے اور اس رویہ کی بنیاد وہی آج مغرب اور عالم اسلام کے تعلقات قائم ہیں، اسی سے خانگی اور عالمی پیمانہ پر جنگ کا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور مغائرت بڑھ رہی ہے، اس سے غیروں کے خلاف روایتی انداز کے مخالفانہ

پروپیگنڈے کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، ان کی ثقافت اور علامات کو غلط اور تحقیر آمیز انداز میں پیش کیا جارہا ہے (غیر سے مراد اسلام/مسلمان ہیں)، اسلاموفوبیا اور اسلاموفوبیائی رویہ اسی مہم کا نتیجہ ہیں، اس کے نتائج دوررس ہو سکتے ہیں، اس سے مغرب اور عالم اسلام کے تعلقات متاثر ہوں گے بلکہ مغرب میں رہنے والے افراد اور طبقات کے تعلقات پر بھی ناگوار اثر پڑسکتا ہے، اس سے ایسے تضادات اور تنازعات کے ابھرنے کا شدید اندیشہ ہے جس سے شناخت کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، اس تناظر میں اسلاموفوبیا کے عنوان سے جو سماجی سیاسی ماحول پیدا ہوا ہے اس کا ہر جہت اور انداز سے تجزیہ اور جانچ ہمارا موضوع ہے۔

اسلاموفوبیا اسلام کے خلاف سب سے زیادہ اشتعال انگیز مہم ہے اگرچہ اسلاموفوبیا کے بارے میں ہمارا فکر اور سمجھ عصری حقائق پر انحصار کرتی ہیں، لیکن مغرب کے لئے یہ نئی بات نہیں ہے، اس کی جڑیں یوروپی تاریخ اور اہل مغرب کی روح میں پیوست ہیں، اس کی جڑیں صلیبی جنگوں میں پیوست ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ ایک مستقل منظرنامہ رہا ہے، نشاۃ ثانیہ کا دور ہو یا علمی روشن خیالی کا یا جدت کا، خیال وعمل کے پہلو سے یہ ذہن ہمیشہ سرگرم کار رہا ہے، مغرب کا وسیع لٹریچر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مغربی ذہن اور مغرب کی پالیسیوں پر اسلاموفوبیا کا کتنا زبردست اثر ہے، تھامس ہینک اپنے مضمون ادب اور مسلمان میں نئی صلیبی لڑائی کے تحت اس

ل یہاں میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ مغرب کی اصطلاح کسی پہلو سے بھی یک سنگی نہیں ہے نیز تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مغرب نے ہمیشہ اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں ایک عوامی فکر وعمل کو اختیار کیا ہے۔ مغرب کی سیکولر جمہوری نمائشی باتیں، کثیر ثقافتی نظریہ اور کثرت ان کے اصل ذہن کو نمایاں نہیں کرتیں، مغرب نے اسلام کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا ہے اور تعلقات میں دورنگی رکھی ہے اگرچہ عظیم تبدیلیوں، نشاۃ ثانیہ، ریفارمیشن اور روشن خیالی کے دور میں بھی مغرب اسلام اور مسلمانوں سے اپنی دشمنی کے اثرات کو ختم نہیں کرسکا، روشن خیالی اور مابعد روشن خیالی دور کے تنقیدی جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دلوں میں پیوست دشمنی کو ختم نہیں کیا، یہ آج بھی اسی طرح جاری ہے، مغرب آج بھی اسلام کو غیر اور عام انسانی سماجی دائرہ سے خارج سمجھتا ہے، اس کے ماننے والے سماجی اور ثقافتی تکثیر میں گہری اپنائیت کے باوجود انہیں ہمارے بارے میں بھی ایسا ہی رد یہ اختیار کرنا چاہئے۔

بات کو واضح طور پر لکھتا ہے کہ کروسیڈ (صلیبی جنگ) میں عیسائیت مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار تھی، صلیبی جنگوں نے یوروپ میں عام ذہن کو بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، نشاۃ ثانیہ کے تحت جب عیسائیت کی نئی شناخت قائم ہوئی تو اس میں مسلم دشمنی دب گئی، تاہم صلیبی جنگوں کا ذہن زندہ رہا، تھامس ہینک کے مطابق جب 1453ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تو یہ اسلام دشمنی مغربی صلیبیوں کے ذہنوں میں دوبارہ تازہ ہوگئی جبکہ یوروپ میں بھی ٹرانسفارمیشن (نئی تبدیلی) کا دور شروع ہورہا تھا، عثمانیوں کی یلغار سے مغربی یوروپ کے عیسائیوں میں مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ پھر ابھارا گیا اور اپنے باہمی اتحاد اور مذہبی یکجہتی بھی پیدا کرلی، مسلمانوں کے خلاف صلیبیوں کی مخالفانہ روش ختم ہونے کے بجائے ان کی سیاسی پالیسیوں اور ذہنوں میں ہمیشہ بیدار اور برسرکار رہی، درحقیقت جسے ہم صلیبی جنگوں کا جنون لکھتے ہیں مسلمانوں کے خلاف یہ بنیادی نفرت ومخالفت ہے جو آج ہمارے دور میں بھی زندہ اور فعال ہے۔

یوروپی تاریخ اور سیاسی نظریات اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت سے پُر رہے ہیں، اراسمس جو نشاۃ ثانیہ کے دور کا ایک ممتاز اسکالر تھا وہ ترکوں کو وحشی قرار دیتا تھا اور انہیں خوفناک درندے، چرچ کے دشمن کہتا تھا اور ایک ایسی قوم کہتا تھا جو ہر قسم کے جرائم اور جہالت سے پہچانی جاتی ہے، تھامس، اراسمس کے خیالات کی تائید کرتا تھا اور انہیں مسیح کے دشمنوں کا ایک قابل نفرت طبقہ قرار دیتا تھا، اسپین میں سقوط غرناطہ کے بعد عیسائیوں نے عرب مسلمانوں پر جو لرزہ خیز مظالم کئے اس سے بھی مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے شدید جذبہ انتقام کا پتہ چلتا ہے، والٹیئر جو یورپ میں روشن خیالی کی سب سے بڑی علامت ہے اس کے مطابق ترک زمین پر سب سے بڑی لعنت ہیں اور انہیں ختم کرنا چاہئے۔

ایڈورڈ سعید کے مطابق اسلام اور عالم عرب مغربی ذہن کا بنیادی عنصر رہا ہے، اسلام کے خلاف نفرت کے مشترکہ جذبہ سے ہی ان میں اتحاد اور شناخت کا جذبہ پیدا ہوا، ڈیوک آف

سلی ۱۵۶۰-۱۶۴۰ء نے اپنے عظیم منصوبہ میں عیسائی حکمرانوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کا خاتمہ کر کے اور امن و اتحاد قائم کر کے کفار (مسلمانوں) کے خلاف مستقل جنگ لڑنے کا منصوبہ پیش کیا، یہ ایک مستقل نوعیت کا جہاد ہے، اسی منصوبہ کے تسلسل میں چرچل نے ہیگ کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۴ء میں ڈیوک آف سلی کے منصوبہ کی بنیاد پر ہی یورپ کے اتحاد کا نظریہ پیش کیا۔

عصر حاضر میں اسلاموفوبیا کے ہتھیار کو سربیوں نے سابق یوگوسلاویہ کے بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف بربریت سے استعمال کیا، جب بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کا وحشیانہ دور جاری تھا اس وقت برطانوی وزیر اعظم جان میجر اور فرانسیسی صدر فرانکوس متران نے ان مظلوم مسلمانوں کی مذمت کی اور ان قاتل سربیوں کے خلاف کچھ نہیں کہا، جنہوں نے انسانیت کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا، ایک فرانسیسی ڈپلومیٹ نے کہا کہ یوروپین جنگ کے پھیلاؤ کو روکنا اور یورپ میں ایک حقیر سی مسلم ریاست کا وجود دیکھنا نہیں چاہتے ہیں، ہمارا مفاد سربیوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا آپ سمجھتے ہیں، ہم مسلمانوں کی فکر نہیں کرتے، ہم سربیوں کے بارے میں فکر مند ہیں۔

یہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ امریکی اور مغربی ممالک نے جس طرح سربیوں کے قتل عام کے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اس سے سرب قاتلوں کے حوصلے اور بلند ہوئے اور انہوں نے کھل کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ''تہذیبوں کے تصادم'' کے مصنف سیموئل پی ہنٹنگٹن کے خیال میں اسلاموفوبیا کا تصور جدید اور عصری دور میں پھیل رہا ہے، وہ اپنی ''تہذیبوں کا تصادم اور ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل'' میں لکھتا ہے کہ مغرب کے سامنے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی کا نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام ہے جس کی مختلف تہذیب ہے، جس کے ماننے والے اپنی ثقافت کی برتری اور دوسروں کی کمزوری میں یقین رکھتے ہیں اور اپنی طاقت کی کمی سے تشویش میں مبتلا ہیں، اسلام کے

مقابلہ کے لئے سی آئی اے یا امریکہ کا محکمہ دفاع موثر نہیں ہوسکتا، یہ مغرب ہے جس کی اپنی منفرد تہذیب ہے، جس کے لوگ اپنی تہذیب کی عالمگیریت میں یقین رکھتے ہیں، اسے برتر مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسری کمزور قومیں اپنا کلچر دنیا پر مسلط نہیں کرسکتیں، اس میں ایسے عناصر ہیں جو اسلام اور مغرب کے درمیان تنازعہ کو ختم کرسکتے ہیں، وہ مزید لکھتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی جنگجوئی اور تشدد ایسے واقعات ہیں جن کا نہ مسلمان انکار کرسکتے ہیں نہ غیر مسلم۔

امریکن دانش وروں اور نئے قدامت پرستوں مثلاً اروِنگ کرسٹول کے نظریہ کے مطابق اشتراکیت کی شکست کے بعد مغرب کو ایک ایسے دشمن کی ضرورت ہے جس کے نام پر وہ اس انحطاط کو روک سکے جو لبرل ازم سے پیدا ہو رہا ہے، مغرب میں اسلام دشمنی کا جذبہ اسے اس انحطاط سے بچانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، اور اُسے خود شناسی اور ایک موضوع بھی مل رہا ہے، اسی سے اس امریکی نو قدامت پسند طبقہ کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے جو اسلام کو خوفناک شکل میں پیش کرتا ہے، اسے دہشت گردی سے جوڑتا ہے اور تمام نظریاتی اور عملی برائیوں کا مرکز قرار دیتا ہے۔

یوروپین اسکولوں میں نقاب پر پابندی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون بنانا، ان سب کے پیچھے اسلام کو بدنام کرنا اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کا جذبہ ہے، سوئٹزرلینڈ میں رائے شماری کرا کر مساجد کے میناروں کی تعمیر پر پابندی لگانا وغیرہ مغرب کا اپنے ہی شہریوں کے خلاف اسلاموفوبیا کو ظاہر کرنا ہے، بنیاد پرست عیسائی اور عیسائی الونجلسٹ لوگوں کو مشتعل کرنے کے لئے اسلام کے خلاف فرسودہ حربے استعمال کر رہے ہیں؛ کیونکہ وہ اسلام کو مغرب کے لئے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں، جرمنی میں ایک جماعت ہے جو دیوز ولٹ کریئیم، اس لاطینی جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا محبت چاہتا ہے لیکن یہ لوگ خدا کا جو وحشتناک تصور پیش کرتے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت کو ظاہر کرتا ہے، وہ مسلمانوں پر نسل پرستی اور مذہبی نفرت کا الزام لگاتے ہیں، اس جماعت نے اپنا یہ لاطینی نام پوپ اربن اے کی ایک دستاویز سے

اخذ کیا ہے جو عہد وسطی میں لکھی گئی اس میں مومنوں (عیسائیوں) سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ پہلے صلیبی جہاد میں حصہ لیں اور ارض مقدس (یروشلم) سے کفار (مسلمانوں) کو نکال دیں، اس جنونی جماعت کی ویب سائٹ جو 2007ء میں شروع کی گئی تا کہ پوپ بینڈکٹ 16 کی 80 ویں سالگرہ منائی جائے اس موقع پر اس جماعت نے پہلے پوپ کی اسی پرانی دستاویز کو نئے ڈھنگ سے شائع کر کے لوگوں کو تشدد پر ابھارا، اس میں کہا گیا کہ یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم مغربی تہذیب کی حفاظت کریں اور ہر اس چیز کی حفاظت کریں جسے انقلابی، قرآنی اسلام سے خطرہ ہے۔

سلمان رشدی اور ڈنمارک کے کارٹونسٹ کے بعد وسیع پیمانے پر ایسا لٹریچر تیار کیا گیا جس میں آزادی اظہار کے موقف کی حمایت کی گئی خصوصا جبکہ معاملہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کا ہو (طارق رمضان)۔

دراصل ہماری بہت سی شناخت ہیں، میں پیدائش کے لحاظ سے مصری ہوں ذہنی طور پر بھی میں مصریوں کے کلچر کے اعتبار سے میں یوروپین ہوں، مذہب کا سوال ہو تو میں مسلمان ہوں، شہریت کے اعتبار سے سوئٹزرلینڈ کا ہوں، اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے میں عالمی فکر کا حامل ہوں، اب ان تمام شناختوں میں سے کون سی شناخت سب سے اہم ہے اس کا انحصار صورت حال پر ہے، اگر میں ووٹ ڈالنے جا رہا ہوں تو میں سوئس ہوں؛ کیونکہ میں سوئٹزرلینڈ کا شہری ہوں اگر آپ مجھ سے زندگی اور موت کے مفہوم کی بابت پوچھیں تو میں مسلمان ہوں؛ کیونکہ میں ان موضوعات پر اسلام کی تعلیمات پر یقین رکھتا ہوں، اولین شناخت کا مسئلہ صورت حال کی ضرورت پر انحصار کرتا ہے، اگر میں اپنا ہمہ جہت تجزیہ کروں تو مختلف جہت سے میری چھ شناخت ہیں اس سے کوئی مشکل یا تذبذب پیدا نہیں ہوتا، شناخت کے بارے میں کوئی سخت گیر موقف اپنانا یا ایسی شناخت رکھنا جسے مخالف تسلیم نہیں کرتے اور وہ سوال اٹھاتے ہیں یہ گویا اس بڑے جال میں پھنسنے کی بات ہے (طارق رحمان)۔

سوئٹزر لینڈ کے باشندوں نے مسجد کے میناروں کے خلاف ووٹ نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے خلاف ووٹ دیا، یہ اس اشتعال پھیلانے والے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے، اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی علامات اور ان کے ثقافتی مظاہر ہی بیداری کی بنیاد بن گئے ہیں، سوئٹزر لینڈ میں میناروں پر یا یوروپ میں مسلمانوں کے وجود کے خلاف ایک قومی ردعمل ہے۔

یوروپ کے ہر ملک کی اپنی ایک خصوصی علامت اور موضوع ہے جسے وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں، فرانس میں یہ نقاب، برقعہ، چادر یا سر کا رومال ہے، جرمنی میں مساجد ہیں، برطانیہ میں تشدد ہے، ڈنمارک میں کارٹون ہیں، ہالینڈ میں ہم جنس پرستی وغیرہ وغیرہ، اس گلوبلائزیشن اور مہاجرت کے دور میں جو اہل یوروپ اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہیں وہ خود اپنے آپ سے سوال کر رہے ہیں کہ ہماری جڑیں کہاں ہیں، ہم کون ہیں، ہمارا مستقبل کیسا ہوگا؟ اپنے اس ماحول میں نسل پرستی، لسانی، ثقافتی کشمکش کے دوران یہ سارے سوال ابھرتے ہیں، وہ اپنے گرد وپیش نئے لوگوں نئے رنگ ونسل کے انسانوں اور علامتوں کو دیکھتے ہیں جن کے وہ خوگر نہیں ہیں، وہ نئے سماجی آفاقی منظرنامے کے ساتھ نباہ نہیں کرنا چاہتے، اہل مغرب مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی الگ شناخت اور معاشرتی وجود قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس یوروپی معاشرت میں ضم ہوجانے کو تیار نہیں ہیں جس پر عیسائیت کا غلبہ ہے، مجموعی طور پر دیکھئے تو میناروں کے خلاف احتجاج دراصل اسی ذہنیت اور عصبیت کا آئینہ دار تھا، اپنے خدشات اور اندیشوں کو مسخ انداز میں پیش کرکے جذباتی اپیلیں جاری کی گئیں، سوئٹزر لینڈ والوں نے ایک برقعہ پوش عورت کی تصویر بنائی، مینار کو ہتھیار کے طور پر دکھایا گیا تھا جو سوئٹزر لینڈ کے مفتوح جھنڈے پر منعکس تھا، یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ اسلام سوئٹزر لینڈ کی قدروں سے ہم آہنگ نہیں ہے، اس مہم میں میڈیا کا کردار بھی تھا، اس نے سوئس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ان کی مظلومیت کو عنوان بنایا کہ ہمیں محصور کرلیا گیا ہے، مسلمان خاموشی سے ہم پر غلبہ جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم

اپنی قدروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، یہ حکمت عملی کامیاب رہی، سوئس عوام نے مسلمانوں کو بتا دیا کہ وہ ان پر اعتبار نہیں کرتے اور سب سے اچھا مسلمان ان کے نزدیک وہی ہے جو وہاں سے چلا جائے۔

ضیاء الدین سردار کے بقول اسلاموفوبیا مغرب میں کوئی عجیب سی برطانوی بیماری نہیں ہے، لبرل بھی مسلمانوں سے کھلا تعصب رکھتے ہیں، وہ اسلاموفوبیا اور غیروں سے بیزاری کے اس تناظر میں ایک چبھتا ہوا سوال کرتے ہیں، کیا یہ ذہنیت نئے قتل عام کا اشارہ ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضیاء الدین یوروپ کی معاشرتی اور ثقافتی دنیا کا جائزہ لیتے ہیں، انہوں نے یہ جائزہ کثیر ثقافتی اور کثیر ملی عصری تعلقات کے تناظر میں لیا ہے، ان کا جائزہ اسلاموفوبیا کے اس ذہن کو واضح کرتا ہے جو یوروپ میں روشن خیالی کے دعووں کے باوجود وہاں کے عوام کے دل و روح میں جاگزیں ہے، اس تعصب کے پیش نظر وہ اس دہشت ناک نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یوروپ نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے، انہوں نے ماضی میں جو کچھ یہودیوں کے ساتھ کیا وہی اب مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، دوسرا ہولوکاسٹ اب مسلمانوں کے خلاف ہوگا۔

ضیاء الدین سردار کی ریسرچ یوروپ میں اسلاموفوبیا کے اس تعصب کو ظاہر کرتی ہے جو وہاں کے معاشرہ میں زیریں لہر کے طور پر موجود ہے، اس کے نتیجہ میں مسلمان اس معاشرہ میں اس طرح گھل مل نہیں سکتے جیسا کہ دیگر مہاجرین کھپ جاتے ہیں، مسلمانوں کے سوا دیگر مہاجرین مثلاً یونانی، اطالوی، پولش اور اسپینی، جرمن کے شہر ڈورمنڈ میں پوری طرح جذب ہو کر کامل ہم آہنگی سے رہتے ہیں، ڈورمنڈ ایسا کثیر ثقافتی شہر ہے جو عالمی اقتصادیات سے اچھی طرح مربوط ہے، اس شہر میں ترکی مہاجرین زیادہ دکھائی دیتے ہیں، یہ ایک بڑا مسئلہ ہے، یہ لوگ اس شہر کی ثقافت میں ضم نہیں ہو پاتے؛ کیونکہ (بقول مقامی باشندگان) یہ لوگ جرائم پیشہ اور قدامت پرست ہیں، ان کی عورتیں سر ڈھانپتی ہیں قرآن انہیں تلقین کرتا ہے کہ عیسائیوں کو قتل کرو، لیکن ان کی تاریخ کا ایک اور

عجیب پہلو یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے ترکی نسل کے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے اور ان سے نفرت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، وہ ترکی نسل کے لوگوں سے اپنی مغائرت اور بیزاری کا برملا اظہار کرتے ہیں؛ حالانکہ ان کے پاس اس مغائرت کے جواز کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے، ضیاء الدین سردار کے بقول جرمن ترک اس کھلی ہوئی نسلی تفریق کا جواب نفرت سے نہیں دیتے، ترکی نسل کے جرمن اس پر حیران ہیں کہ جرمن میں پیدا ہونے اور جرمنی خصوصیات کو قبول کرنے کے باوجود جرمن معاشرہ انہیں باعزت طور پر قبول کیوں نہیں کرتا، انہیں ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور کیوں کیا جاتا ہے اور سماجی، ثقافتی اور بعض اوقات جسمانی طور پر ایذا کیوں پہنچائی جاتی ہے، ابھی تک انہیں جرمن شناخت کے دائرے سے باہر کیوں رکھا جاتا ہے، آخر جرمنی کے لوگ ترکوں کو عزت اور وقار سے کیوں نہیں دیکھتے، یوروپ کے ہر ملک میں ثقافتی تکثیر کا مطلب یوروپین ثقافت ہے، دیگر ثقافت کے لوگ آج بھی سابق سامراجی رعایا کے طور پر سمجھے جاتے ہیں، فرانس میں الجیریا اور مراکش کے مہاجرین کی کئی نسلیں اقتصادی محرومی اور عدم مساوات کا شکار ہیں، انہیں ملازمتوں، تعلیم، رہائش کے معاملات میں ناانصافیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے، پھر فرانسیسی سوسائٹی کی نسل پرستی بھی ان کے لئے عذاب بنتی ہے، انہیں زندگی گزارنے کے لئے آبرومندانہ وسائل میسر نہیں ہیں، انہیں زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے، الجیریا اور مراکش کے مہاجرین کی تیسری اور چوتھی نسل کو جو فرانس میں پیدا ہوئی اسے آج بھی مہاجروں میں شمار کیا جاتا ہے، انہیں فرانس کے جمہوری نعروں آزادی، مساوات اور اخوت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک خوف کسی مخصوص شئ سے ہوتا ہے، اشتقاق کے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ اس چیز سے دور بھاگنے کی ذہنیت ہے، جدید دور میں یہ ایسے خوف کو ظاہر کرتا ہے جو نفرت و مغائرت سے پیدا ہوتا ہے اور جو ذاتی پسند ناپسند سے ماوراء عمومی منظر بن جاتا ہے جو ایک جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے، سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد دو قطبی سیاسی گفتگو میں اسلاموفوبیا کی اصطلاح گمراہ کن بن گئی

ہے، اس اصطلاح کے تحت تمام مسلم مخالف گفتار، رویہ اور افعال جو عیسائی غلبہ والی تہذیب سے ابھرتی ہیں استعمال ہوتی ہیں۔ 2001ء میں ڈربن میں اقوام متحدہ کی طرف سے نسل پرستی، اجنبیوں سے اجتناب، نسلی تفریق اور عدم رواداری سے وابستہ دیگر تمام جرائم کے خلاف ایک عالمی کانفرنس بلائی گئی تھی، اس کانفرنس میں ان برائیوں کے ساتھ اسلاموفوبیا کو بھی زیر بحث لایا گیا اور پہلی مرتبہ اس قابل نفرت لعنت پر غور کیا گیا۔

اسلاموفوبیا کو بطور ایک اصطلاح اور ایک نظریہ تشریح کرنے کے لئے بہت سے لسانی معانی کو سمجھنا پڑے گا؛ اگرچہ اسلاموفوبیا کی اصطلاح ہر جگہ استعمال ہوتی ہے تاہم اسلاموفوبیا ایک مخصوص انداز سے ہر طرف پھیل رہا ہے، اس کا مفہوم ثقافتی، ذہنی، روایتی اور کسی ملک یا خطہ میں پھیلے ہوئے تعصب سے متعین کیا جاتا ہے۔

کئی دہائیوں سے امریکہ کے اولونجلسٹ عیسائی تو قدامت پرست اور یوروپی دانشور نفرت اور بے غیرتی سے اسلاموفوبیا پر لٹریچر تیار کر رہے ہیں، جس میں دلائل کی بھرمار ہے اور مغربی تہذیب کی اصطلاحوں میں رنگا ہوا ہے، عوامی مقامات پر اس کا اظہار مختلف انداز میں عوامی سطح پر زیادہ متاثر اور نمایاں طور پر ہوتا ہے، اس کا واضح سبب یہ ہے کہ مغربی معاشرہ زیادہ متعصب اور نسل پرست ہے جبکہ مملکت ایک حقیقی نمائندہ ادارہ کے طور پر سیکولر اور عقلیت پسند ہے، مغربی ملکوں میں قوم اور ریاست کے درمیان مکمل تقابلی تعلق ہے، جو کہ قوم کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک اور سامراجیت کے بعد ابھرنے والے سماج میں ایسا نہیں ہے۔

مغرب میں سیاسی و جغرافیائی مصلحتوں کی وجہ سے اہم سیاسی بحث و مباحثہ میں اسلاموفوبیا کا ذکر نہیں آتا، اسلاموفوبیا میں وسیع پیمانہ پر سیاسی و جغرافیائی امور موجود ہیں، اعلیٰ سیاسی سطح پر اسلاموفوبیا کی اصطلاح عموماً استعمال نہیں کی جاتی؛ کیونکہ اس سے مسلم ریاستوں کو دہشت گردی کے خلاف مہم میں شریک کرنے میں دشواری آسکتی ہے بالخصوص ایران جیسے ممالک

جو بہت سے اہم موضوعات پر امریکہ کی بالا دستی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، لہٰذا عالمی دہشت گردی مخالف مہم میں اسلام فی نفسہ ایک مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کے دیگر پہلو مثلاً سیاسی اسلام، ریڈیکل (انقلابی) اسلام، جہاد اور حالیہ دور میں اسلامی فسطائیت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں، اس سے مفہوم یہی ہے کہ اسلام تضادات سے پُر ہے، جب سے اسلام، دین دنیا یعنی مذہب دنیا اور ریاست سیاسی فکر کو ظاہر کرتے ہیں، لہٰذا ایسی کوئی اصطلاح نہیں ہے جسے غیر سیاسی اسلام کہا جائے دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اگر ریڈیکل اسلام ایک زیادہ انقلابی برائی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتدال پسند ایک کم تر برائی ہے۔

جہادازم کی اصطلاح مغرب کے مستشرقین اور نام نہاد اسلام شناسوں نے وضع کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قرآنی تصور کو مسخ کیا جائے اور مجموعی طور پر اسے غلط رنگ میں پیش کیا جائے، اسلامی فاشزم کی اصطلاح کھلے طور پر اسلام اور فسطائیت کے درمیان تعلق کو ثابت کرنے کی کوشش ہے جو کسی محسوس حقیقت کو ثابت نہیں کرتا، بنیاد پرستی کی اصطلاح کا تناسب یا پروٹسٹنٹ ازم سے اخذ کی گئی ہے یا انٹگر ازم سے لی گئی ہے جو فرانس میں کیتھولک کلیسا کے مسائل سے متعلق ہے، اسے انقلابی تحریکوں یا مصر کے مسلمانوں سے نہیں جوڑا جاتا، جو متعدد اسلامی تحریکوں کے پیرو ہیں ایک بظاہر غیر جانبدار اصطلاح اور سلام ازم اور اسلامیت کی وضع کی گئی ہے، لیکن یہ اپنے تضادات کو چھپا نہیں سکتی؛ کیونکہ عربی زبان اسلامک اور اسلامیت کے درمیان فرق نہیں کرتی، (دونوں اصطلاحوں کے لئے اسلامی لفظ ہی ترجمہ ہو سکتا ہے) سوائے اس کے کہ یورپین نظریہ سے اسلامیہ وغیرہ کا ترجمہ کیا جائے۔

یوروپ اور امریکہ کے متعدد اسکالر، دانش ور، صحافی اور ماہرین اسلامیات جو عموماً دانش ور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اسلام پر انگشت نمائی کرنے والوں میں شامل ہیں، اس بارے میں بدنام زمانہ اسکالر برنارڈ لیوس اور نفرت و اشتعال کا پروپیگنڈہ کرنے والے ڈینیل

پائپس کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے جو اپنی اسلام دشمن فکر اور تحریر و تقریر کے لئے معروف ہیں۔

پوپ بنڈکٹ 16 جس نے ایک بازنطینی بشپ کا قول نقل کیا تھا جسے عثمانی ترکوں نے محصور کر رکھا تھا، پوپ نے وہائٹ ہاؤس کے اونجلسٹ کرایہ دار (جارج بش) کی بولی بول کر خود کو اور بھی مشکل میں پھنسالیا، اسلام دشمنی کا یہ جذبہ اس قدیم زیریں لہر کے احتراز سے پھولتا اور پھلتا ہے جو کسی دور میں دیگر مذاہب خصوصاً اسلام سے دشمنی عیسائی کی شناخت تھی، صلیبی جنگوں سے ۔لے کر استعماری دور تک اسپین میں عیسائی غلبہ سے تاتاریوں کی زمین پر روسیوں کی یلغار اور مہاجرین کی آمد سے پیدا شدہ مسائل مجموعی یوروپین فکر اور مزاج اسلام کو ہی سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے، اسی کے ساتھ یہ موجود عالمی خاکہ سے بھی جڑا ہوا ہے جس کے تحت اشترا کی روس کے بکھراؤ کے بعد یوروپ کو ایک نئے عالمی دشمن کی تلاش ہے۔

عربوں کے بارے میں اقوام متحدہ کی فروغ انسانی وسائل کی رپورٹوں میں جو بش اور اس کے ساتھیوں نے تیار کرائی تھیں ان میں ان کی جارحانہ مداخلت کا جواز پیش کیا گیا تھا اور جارحانہ ڈپلومیسی کو بھی صحیح ٹھہرایا گیا۔

فرانس میں خاص طور پر یوروپ میں عموماً سر ڈھانپنے کے سوال پر جو ہنگامہ ہے وہ در اصل ثقافتی شناخت کے بحران کا نتیجہ ہے، ترکی کو یوروپین یونین میں شامل کرنے کا جو تنازعہ ہے اس کے پیچھے بھی یہی تعصب ہے، دائیں بازو کے عیسائی کہتے ہیں کہ ایک مسلم ملک یوروپی یونین کا ممبر نہیں ہوسکتا؛ جبکہ ڈیموکریٹ اس کے لئے ترکی خواتین، کردوں، اور آرمینیائی قوم کا بہانہ بنا کر مخالفت کرتے ہیں۔

☆☆☆

یورپ میں نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کا مقابلہ کرنا

پروفیسر عبدالرحمٰن مومن☆

میرا مقالہ عمومی طور پر چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ یوروپین معاشرہ میں نسل پرستی، غیروں سے اجتناب کا خبط اور اسلاموفوبیا کے مختلف مظاہر پر مشتمل ہے، دوسرے حصہ میں حقوق انسانی کے دائرہ میں نسل پرستی اور اسلاموفوبیا پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، تیسرے حصہ میں یوروپین حکومتوں، عدالتوں، سماجی تنظیموں اور بین المذہبی جماعتوں کی جانب سے نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے خلاف مختلف مزاحمتی اقدامات کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، مقالہ کے آخری حصہ میں یوروپ میں رہنے والے مسلمانوں کے نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے بارے میں کردار کا جائزہ پیش کیا ہے۔

نسل پرستی اور اپنے کو بڑا سمجھنے کے خبط کا جذبہ یوروپ کے مزاج میں صدیوں سے جاگزیں ہے، سامی دشمنی کا نظریہ جو سب سے زیادہ طویل عرصہ تک نفرت کے مظاہر کا عنوان بنا رہا اس کی ایک طویل تاریخ ہے، ایک کروڑ خانہ بدوش یا رومن یوروپ میں سب سے زیادہ قابل نفرت اور خطرناک اقلیت سمجھے جاتے تھے، آج بھی وہ معاشرہ میں الگ تھلگ رہتے ہیں، متعدد یوروپی ملکوں میں انہیں معاشرہ میں گھل کر رہنے، تعلیم، ملازمت وغیرہ کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا ہے، نہ انہیں مکان بنانے کی اجازت ہے نہ حفظان صحت اور علاج معالجہ تک ان کی آسان رسائی ہے، اکثر الگ تھلگ گھٹن والی بستیوں میں رہتے ہیں، عملاً وہ قومی معاشرہ سے الگ

☆ پروفیسر ایمریٹس (اعزازی) ممبئی یونیورسٹی

رہتے ہیں، یوروپین معاشرہ میں نسل پرستی اور غیروں سے الگ رہنے کے خبط کو دائیں بازو کی انتہا پسند پارٹیاں، دیگر انتہا پسند سیاسی جماعتیں، نازی گروپ، میڈیا کے بعض حلقے بڑھاوا دیتے ہیں، بعض مشہور مصنفین اور دانشور اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کا جواز فراہم کرتے ہیں، نسل پرستی، خود کو بڑا سمجھنے کا خبط اور مسلم دشمنی کی شکایات پر نگاہ رکھنے والے یوروپی مرکز کی رپورٹ بعنوان "مسلمان یوروپی یونین میں-- امتیاز اور اسلاموفوبیا" ۲۰۰۶ء میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ نسل پرستی، خود کو بڑا سمجھنے کا جنون اور اسلاموفوبیا تینوں مل کر مسلمانوں کے خلاف نفرت کی فضا کو بڑھا رہے ہیں، نسلی اقلیتوں اور مہاجروں کے خلاف تعصب کی عام فضا میں اسے بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

نسلی اور مذہبی اقلیتوں کو اچھی تعلیم، بہتر ملازمت، کشادہ مکانات کی سہولیتوں سے محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ گندی بستیوں میں رہنے پر مجبور ہیں اور انہیں حقارت کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے، یوروپین یونین بنیادی حقوق ایجنسی (ایف آر اے) کی سالانہ رپورٹ ۲۰۰۸ء میں کہا گیا ہے کہ ۲۰۰۸-۲۰۰۰ء کے درمیان متعدد یوروپی یونین کے ممبر ممالک میں نسلی امتیاز پر مبنی جرائم، ایف آر اے کے نئے مطالعہ کے مطابق نسل پرستی اور غیروں سے دور رہنے کا جنون آج بھی یوروپ کے مزاج میں بری طرح گھر کئے ہوئے ہے، اس مطالعہ میں تعلیم، رہائش، ملازمت، صحت اور سماجی خدمات کے دائروں کا جائزہ لیا گیا، اسکول یا دکان کھولنے، بینک میں اکاونٹ کھلوانے یا قرضہ حاصل کرنے کے بارے میں جدہ روما، افریقن اور مسلمان نسلی تفریق کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔

اس معاملے میں ہالینڈ میں نسلی تفریق کا جنون کافی کم ہے اور وہاں اقلیتوں کے حقوق، مراعات کا زیادہ پاس رکھا جاتا ہے۔

۱۹۹۷ء میں اسلاموفوبیا امریکہ کے لئے ایک چیلنج جورنی میڈے کمیشن نے شائع کی

تھی، اس وقت اسلاموفوبیا کی اصطلاح برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں میں ہر طرف رائج ہوگئی ہے، رپورٹ میں اسلاموفوبیا کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے: ''ایک نظریہ یا عالمی نقطہ نظر جو مسلمانوں سے خوف اور نفرت کے ایک بے بنیاد مفروضے پر مبنی ہے جس کے نتیجہ میں مغائرت اور امتیاز کو ہوا دی جاتی ہے۔کونسل آف یوروپ کی ایک رپورٹ بعنوان ''اسلاموفوبیا اور نوجوان - لوگوں کے لئے اس کے نتائج'' میں کہا گیا ہے کہ ان سے متعلق امور کے بارے میں تعصب اور خوف کا رویہ خواہ یہ روزانہ کی زندگی میں نسلی تفریق و امتیاز کا رخ اختیار کرے یا تشدد کی شکل میں ظاہر ہو، اسلاموفوبیا انسانی حقوق کی پامالی ہے اور اس سے معاشرتی روابط کو سنگین خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس رپورٹ میں برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف نسلی امتیاز اور اس کے مختلف پہلوؤں کی متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں، رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسلاموفوبیا معاشرتی مغائرت کا ایک ڈرامائی پہلو ہے، اس سے مسلمانوں کی نازک پوزیشن اور تشدد نیز ستائے جانے کے ذہن کو بڑھاوا ملتا ہے، ۲۰۰۴ء میں اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس میں اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان نے کہا تھا: دنیا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک نئی اصطلاح وضع کرے تاکہ عمومی طور پر پھیلی ہوئی پر تشدد انتہا پسندی کا جائزہ لیا جائے یہ ایک افسوسناک اور تشویشناک صورت حال ہے، ایسا ہی معاملہ اسلاموفوبیا کے بارے میں ہے۔

مسلمانوں کو بدنام کرنے اور انہیں خوفناک انداز میں پیش کرنے، مسلمانوں کو پریشان کرنے، تشدد کا نشانہ بنانے، ان کی مسجدوں، قبرستانوں پر حملے، نئی مساجد تعمیر کرنے کی مخالفت، مسجدوں کے مینار تعمیر کرنے پر پابندی اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت پر پابندی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو مغرب میں نسل پرستی اور بڑا بننے کے جنون کو ظاہر کرتے ہیں، ویانا کے ادارے جو نسلی امتیاز اور بڑے بننے کے خبط کی نگرانی کرتا ہے، اس کی رپورٹ بعنوان یوروپین یونین میں مسلمان - نسلی تفریق اور اسلاموفوبیا (۲۰۰۶)، اس میں یوروپین یونین کے ۲۷ ممبر

ممالک میں اسلاموفوبیا کے ہر طرف پھیلے ہوئے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے، رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ اسلاموفوبیا کے نام پر مسلمانوں کے خلاف امتیاز اور انہیں معاشی و معاشرتی اعتبار سے الگ تھلگ کر دینے کے رویہ سے مسلمانوں میں شدید بے اطمینانی اور مغائرت کا احساس ابھر رہا ہے، رپورٹ میں بتایا ہے کہ یوروپین یونین کے ممالک میں مسلمانوں کو مذہب، رنگ، نسل اور قومیت کی بنیاد پر تفریق اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ان کے خلاف روایتی تعصب برتا جاتا ہے، میڈیا میں ان کے خلاف منفی انداز کی خبریں دی جاتی ہیں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کم حصہ ملتا ہے، تعلیم کے میدان میں بھی انہیں ترقی کے بہتر مواقع حاصل نہیں ہیں، ملازمت کے دروازے بھی ان پر کھلے نہیں ہیں۔

۱۱/۹ کے بعد یوروپ میں مسلمانوں سے نفرت اور انہیں خوفناک طریقہ سے پیش کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔

نسل پرستی اور عدم رواداری کے خلاف یوروپین کمیشن کی رپورٹ (۲۰۰۴) میں کہا گیا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۶ء کے واقعات کے بعد دہشت گردی کے خلاف لڑائی کے نتیجہ میں بعض گروپ مثلاً عرب مسلمان، پناہ کے طالب افراد، ریفیوجی مہاجر، نیز اقلیتی افراد اور وہ لوگ جو ان جماعتوں سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں ایسے لوگ عوامی زندگی کے متعدد شعبوں میں ایک خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں، انہیں تعلیم، ملازمت، صحت، عوامی اداروں، رہائش، آزادانہ نقل وحرکت، عوامی جگہوں میں آنے جانے میں دشواری ہوتی ہے۔

ایک انتہا پسند جنونی جماعت کے افراد کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف سنگین تشدد اور بے گناہوں کو ہلاک کرنے کے سبب مسلمانوں اور مغربی معاشرہ کے درمیان مغائرت کی خلیج اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف تشدد اور نسلی تفریق کے واقعات جو یوروپی معاشرہ میں پیش

آتے ہیں انہیں ادارہ جاتی روایتوں سے اور زیادہ بڑھاوا ملتا ہے، برطانیہ، ڈنمارک اور یونان میں کفریہ کلمات ادا کرنے کے خلاف قوانین رائج ہیں، لیکن ان کا نفاذ صرف عیسائیوں کے حق میں ہوتا ہے دیگر مذاہب اس کے زیر تحفظ نہیں آتے، ڈنمارک کی لبرل پارٹی جو تکفیری قانون کے خلاف ہے اور برسر اقتدار قدامت پسند پارٹی نے پارلیمنٹ میں بلاس فیمی (تکفیر) کے بارے میں پارلیمنٹ میں پیش کئے گئے ایک بل کی مخالفت کی ہے، برطانیہ میں نسلی تعلقات کا ایکٹ ۱۹۷۶ کے تحت نسل، رنگ یا قومیت کی بنیاد پر تفریق کو ممنوع قرار دیتا ہے، لیکن مذہبی بنیاد پر امتیاز اس میں شامل نہیں ہے، ابھی کچھ سال پہلے تک برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف نسلی تفریق کو غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا تھا، کیونکہ برطانیہ کی عدالتیں مسلمانوں کو نسلی گروپ تسلیم نہیں کرتی تھیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں اور سکھوں کو نسلی گروپ تسلیم کیا جاتا تھا۔

نیک گریفن جو ایک انتہا پسند اور جنونی حد تک مسلم مخالف برٹش نیشنل پارٹی کا لیڈر ہے، اس نے جنوری ۲۰۰۶ء میں ایک بیان میں کہا تھا کہ اسلام ایک غیر اخلاقی اور برا مذہب ہے، اس پر نسلی تعلقات ایکٹ ۱۹۷۶ء کے تحت نسلی اشتعال پھیلانے کا مقدمہ چلایا گیا، لیکن عجلت میں چلائے گئے مقدمہ میں اسے بری کر دیا گیا، اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل پیش کی کہ اس نے ایک ایسے مذہب کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا جس پر تنقید ممنوع نہیں، یہ صرف عیسائی انجلیکل مذہب ہے جو اس دائرہ میں آتا ہے اور اس کا تعلق نسل پرستی سے نہیں ہے۔

برطانیہ کے مکانوں کے الاٹمنٹ میں بھی رنگ و نسل کا امتیاز برتا جاتا ہے، برطانیہ میں ۲۲۰۰۰ ایسے اسکول ہیں جنہیں حکومت سے امداد ملتی ہے، ان میں سے تقریباً ۷ ہزار وہ اسکول ہیں جو عیسائی کیتھولک اور یہودیوں کے انتظام میں چلائے جاتے ہیں، طلبہ کی مجموعی تعداد کا ایک چوتھائی حصہ ان مذہبی سرکاری امداد پانے والے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے، ایک طویل جدوجہد و سیاسی لڑائی کے بعد حکومت اس بات پر تیار ہوئی کہ وہ ۵ مسلم اسکولوں اور ایک سکھ

اسکول کو بھی سرکاری امداد فراہم کرے گی۔

سوئٹزر لینڈ میں مسجد کے میناروں کی تعمیر پر پابندی جسے نومبر ۲۰۰۹ء کے قومی سطح کے ریفرنڈم کے ذریعہ منظور کروایا گیا، سوئٹزر لینڈ کے دستور میں اندراج کے مطابق اگر ایک لاکھ شہری کسی مخصوص مسئلہ پر ریفرنڈم کرائیں تو دستوری طور پر اس کی اجازت ہوگی اور اس کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے گا۔

یورپ کے متعدد شہروں میں شہریت عطا کرنے کے بارے میں جو قوانین ہیں ان میں بھی نسلی امتیاز کا عنصر دیکھا جاسکتا ہے، بعض ملکوں مثلاً اسپین اور اٹلی میں شہریت کے لئے نسل، مذہب اور اکثریت سے ثقافتی تعلق کو بنیاد بنایا گیا ہے، ظاہر ہے اس سے اقلیتوں اور مہاجرین کو شہریت حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے، اٹلی میں شہریت حاصل کرنے کا طریقہ کار اس قدر پیچیدہ اور ہراساں کرنے والا ہے کہ غیر اطالوی افراد کے لئے شہریت حاصل کرنا عموماً ممکن نہیں ہوتا۔ ۱۹۸۵ء کے قانون میں شہریت کے لئے جو قانون نافذ ہوا اس میں شہریت کو پیدائش اور خاندان سے جوڑ دیا گیا ہے، جو شخص اسپین میں پیدا ہوا اور ماں باپ میں سے کوئی ایک اسپینی ہوا سے خود بخود اسپینی شہریت حاصل ہو جائے گی، اسپین میں عموماً دس سال تک قیام کے بعد وہاں کی شہریت حاصل ہو جاتی ہے، تاہم جو لوگ ترجیحی قومیت کے خواہش مند ہوتے ہیں یا جن کے اسپین سے کچھ تاریخی روابط ہوتے ہیں انہیں دو سال میں یہ سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔

ترجیحی گروپ کے ان افراد میں لاطینی امریکہ، پرتگال، فلپائن، گنی، اور سیفارڈک یہودی شامل ہیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمان جنہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی ہے انہیں ترجیحی قومیت کے زمرے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

سوئٹزر لینڈ کی تقریباً ۲۲ فیصد آبادی غیر ملکیوں پر مشتمل ہے، تقریباً ۴ر لاکھ مسلمان بھی وہاں آباد ہیں جو سوئٹزر لینڈ کی ۷۵ لاکھ کی مجموعی آبادی کا ۵ فیصد ہیں۔ ۸۰ فیصد سے زیادہ

مسلمانوں نے سوئٹزرلینڈ کی قومیت اختیار کرلی ہے، سوئٹزرلینڈ میں قومیت اوراس کے طریقہ کار کے قوانین دنیا میں سب سے زیادہ سخت ہیں، کسی شخص کو محض اس بنیاد پر اس ملک کی شہریت خود بخود حاصل نہیں ہوجاتی کہ وہ وہاں پیدا ہوا، جولوگ شہریت لینے کے خواہش مند ہیں انہیں وہاں کے قوانین کے تحت باقاعدہ اس کے لئے درخواست دینی ہوتی ہے، اکثر معاملات میں وہاں شہری حکام محض معمولی عذر کی بنیاد پر ایسی درخواستیں خارج کردیتے ہیں۔ ترکی، سابق یوگوسلادیہ اور افریقی ملکوں سے آنے والے افراد کی درخواستیں رد کردی جاتی ہیں؛ حالانکہ وہ تمام مطلوبہ شرائط پوری کرتے ہیں۔

سیموئیل ہنٹنگٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مغرب میں مسلمان ایک ایسی اقلیت ہیں جنہیں جذب نہیں کیا جاسکتا، گذشتہ چند سالوں کے دوران مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں پر یہ شدید دباؤ ہے کہ وہ اپنی مخصوص شناخت ترک کرکے مغرب کی تہذیب اور ثقافت کو اختیار کرلیں، مغرب کے اکثر ممالک میں اب شہریت کو اس ملک کی تہذیب میں جذب ہوجانے سے مشروط کیا جانے لگا ہے، نسل پرستی، غیروں سے اجتناب کے خبط پر نگاہ رکھنے والے یورپین مانیٹرنگ سینٹر کی ایک رپورٹ بعنوان یوروپین یونین میں مسلمان۔ امتیاز اور اسلاموفوبیا (۲۰۰۶ء) ہے، اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مسلمان یہ بات شدت سے محسوس کررہے ہیں کہ مغربی سوسائٹی میں انہیں قابل قبول بنائے جانے کے لئے یہ ذہن ابھر رہا ہے کہ وہ اس معاشرہ میں پوری طرح جذب ہوجائیں اور اپنی اسلامی شناخت کو ترک کردیں۔ فروری ۲۰۰۶ء میں جرمنی کی ایک ریاست بیڈن ورٹن برگ میں ۳۰ سوالات پر مشتمل ایک فارم تیار کیا گیا جو جرمنی کی شہریت اختیار کرنے کے خواہشمند افراد کے لئے ہے، یہ سوالات خاص طور پر مسلمانوں کے لئے پریشان کن ہیں، اس سوال نامہ/ ہدایت نامہ میں درج ایک سوال یہ ہے کہ فرض کیجئے آپ کا بیٹا آپ سے کہتا ہے کہ وہ ہم جنس پرست ہے اور کسی شخص کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، اس پر آپ کا

ردعمل کیا ہوگا؟ ایک سروے سے یہ انکشاف ہوا کہ تقریباً ۷۵٦% افراد اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

مغرب میں رہنے والے مسلمانوں میں یہ خیال عام ہے کہ شہریت حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغربی معاشرہ نے آپ کو قبول کرلیا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مغربی تہذیب میں جذب ہوجائیں اور اپنی روایتی تہذیبی شناخت کو مسترد کردیں۔ ۲۰۰۵ء میں فرانس میں مراکش کی ایک خاتون کی درخواست شہریت محض اس بنیاد پر رد کردی گئی کہ وہ جذب ہوجانے کے معیار پر پوری نہیں اتری، دلیل یہ پیش کی گئی کہ وہ خاتون انقلابی، اسلامی رسوم ورواج پر عمل پیرا ہے جو کہ فرانس کی اقدار سے میل نہیں کھاتیں جن میں مرد وعورت کی مساوات بھی شامل ہے، اس خاتون کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ حجاب کی پابندی کرتی تھی، نقاب چہرے پر ڈالتی تھی حالانکہ اس کی شادی ایک فرانسیسی باشندے سے ہوئی تھی، وہ پیرس میں رہتی تھی، روانی سے فرانسیسی زبان بولتی تھی اور اس کے دونوں بچے بھی فرانس میں ہی پیدا ہوئے تھے، اس خاتون نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی، فرانس کے دستور میں بنیادی حقوق کے طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت کا حوالہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اس نے فرانس کی قدروں کی پامالی کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جولائی ۲۰۰۸ء میں فرانس کی عدالت عالیہ نے اس کی اپیل خارج کردی اور سابقہ فیصلہ کو برقرار رکھا۔

نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کا جذبہ تضادات سے بھرا ہوا ہے جس سے قانونی ضوابط اور معاشرتی حقائق کے درمیان خلیج کا پتا چلتا ہے، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، ایسی روایات جو مجرمانہ ذہن کو ظاہر کرتی ہیں، سرکاری ادارے بھی اس قسم کے امتیاز اور مغائرت کو دوام بخشنے کے لئے کام کرتے ہیں، اس میں ترک وطن اور اظہار رائے کی آزادی سے متعلق دعوے بھی ہیں۔

اکثر مغربی ملکوں میں دستوری اور قانونی ضوابط (مثلاً بنیادی انسانی حقوق شہریت اور سیکولرزم) اور اس تفریق ومغائرت کی حقیقت کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے جن سے اقلیتی افراد

کو دو چار ہونا پڑتا ہے یعنی امتیاز اور مغائرت، برطانیہ میں نسل پرستی کی بنیاد پر امتیاز کے خلاف قانون ۱۹۶۰ء میں پاس ہوا تھا لیکن نسلی امتیاز اور مذہبی اقلیتوں سے مغائرت کا رویہ آج بھی پوری طرح فعال ہے، برطانیہ میں حال ہی میں نسلی مساوات کمیشن کی ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ میں آج بھی نسلی امتیاز پر عمل ہوتا ہے اور برطانوی قوم اس سوال پر بٹی ہوئی ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ ایک ایسا مقام ہے جہاں نسلی عدم مساوات، علیحدگی پسندی اور خود پرستی پر عمل ہوتا ہے، اس رپورٹ میں صحت، تعلیم، رہائش اور قانون آفس سے متعلق اعداد و شمار پیش کر کے کہا گیا ہے کہ ان متعلقہ ادارے کو نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیاز کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں، رپورٹ میں اس اندیشہ کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ اگر یہ نسلی مذہبی امتیاز جاری رہا تو اقلیت کے بعض افراد مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں، فرانس جمہوری اصول آزادی، مساوات اور اخوت پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن فرانسیسی معاشرہ نسل، مذہب اور طبقاتی طور پر بے حد امتیاز پر عامل ہے، فرانس یوروپ کا ایسا ملک ہے جہاں سب سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں یعنی اندازاً ۵۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان وہاں ہیں جو ملک کی آبادی کا ۸ سے ۱۰ فیصد ہوتے ہیں، رومن کیتھولک مذہب کے بعد اسلام فرانس کا سب سے بڑا مذہب ہے، لیکن وہاں بڑی سرکاری ملازمتیں اور اہم عہدے صرف سفید نسل کے لئے مخصوص ہیں، مسلمانوں کو عموماً نسلی امتیاز مغائرت اور الزام تراشیوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے، ان میں سے اکثر مزدوروں کے خاندان ان علاقوں میں رہتے ہیں جہاں مہاجرین کی آبادی ہے اور شہر سے باہر ہے، انہیں بین لیوس کہا جاتا ہے جو کہ گندی بستیوں کے مترادف ہیں جہاں غربت، گندگی، بیروزگاری، جرائم اور ڈرگ کا استعمال ہوتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف مان ٹیگن جو فرانس کے اہل فکر کا ایک ادارہ ہے، کے مطابق فرانس میں مسلمانوں کے درمیان ملازمت کا تناسب قومی تناسب سے تین گنا کم ہے اور بعض مسلم

کالونیوں میں تو یہ تناسب ۴۰ فیصد تک ہے، غربت، بیروزگاری، سماج سے علیحدگی ایسے عوامل ہیں جو محرومی اور مغائرت کے مظہر ہیں، ان مسلم تارکین وطن کے صرف ۴ فیصد بچے ہی یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے داخلہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ اکثریتی طبقہ کے لئے یہ تناسب ۲۵ فیصد تک ہے۔ ۲۰۰۴ء میں تفریق کے خلاف نگراں کمیشن نے پیرس یونیورسٹی میں ایک سیلز مین کے جواب میں ۲۲۸ ایڈورٹائزمنٹ دیئے جو مختلف بایوڈاٹاز پر مشتمل تھا وہیں پر یہ بھی پتا چلا کہ شمالی افریقی ملک سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مثبت جواب کے امکانات ۴ گنا کم تھے، اس صورت حال سے مجبور ہو کر بہت سے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں اپنے نام بدل لیتے ہیں، اپنے پتے کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں انہیں ملازمت ملنے میں دشواری نہ ہو۔ نومبر ۲۰۰۵ء میں پیرس اور دیگر فرانسیسی شہروں میں تنگ آئے ہوئے مشتعل شمالی افریقی نوجوانوں نے جو ہنگامہ آرائی کی اس سے فرانسیسی نظام کی بے حد کمزوری اور فرانس کے جمہوری دعوے، آزادی، مساوات اور اخوت کی پول کھل گئی۔

گے، جے میک ڈوگل جو اقوام متحدہ میں اقلیتوں کے مسائل کے ایکسپرٹ ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فرانس میں نسل پرستی آج بھی زندہ ہے اور تارکین وطن ہر طرف اس کا شکار ہو رہے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ فرانسیسی شہریت اختیار کر چکے ہیں، دستور میں مساوات کی جو ضمانت دی گئی ہے وہ محض ایک خواب ہے، جدید فرانس میں حقیقی صورت حال اس سے قطعی مختلف ہے، ایک لبرل جمہوریت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ستون انتظامیہ، فوج اور پولس اور عدلیہ غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور شفاف طریقہ پر کام کرتے ہیں، بدقسمتی سے بہت سے مغربی ملکوں میں اکثر ایسا نہیں ہوتا، نسل پرستی اور خود پرستی کے جنون کی نگرانی کرنے والے دیانا میں قائم ادارے نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ بیشتر مغربی ملکوں میں نسل پرستی، غیروں سے اجتناب، جنون کے خلاف لڑنے کا جذبہ ملا جلا ہے، بعض ممالک اس سلسلے میں سست روی اختیار

کرتے ہیں، بعض ایسے اقدامات کرتے ہیں جن سے تارکین کی مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں بہت سے مغربی ممالک میں عدالتیں غیر جانبداری سے کام نہیں کرتیں، ڈربی پروجیکٹ جسے برطانیہ کے ہوم آفس نے شروع کیا تاکہ مسلمانوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کا جائزہ لیا جائے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر مذہبی بنیاد پر امتیاز ثابت بھی ہو جائے تب بھی عدالتیں ایسے تحفظ کے اقدامات کی جانب فیصلہ نہیں دیتیں جو اکثریت کے لئے دشواریاں پیدا کرے، جیک فرسن رپورٹ جس نے ۱۹۹۹ء میں لارنس اسٹیفن کے قتل کے معاملہ کی تفتیش کی تھی اس نے لندن پولس کو ایک نسل پرست ادارہ قرار دیا تھا، یوروپین یونین بنیادی حقوق ایجنسی کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق جس نے نسلی بنیاد پر امتیاز کے واقعات کا جائزہ لیا اس کا کہنا ہے کہ جن افراد سے روابط قائم کیا گیا اور انٹرویو سنے گئے ان میں ۸۲ فیصد افراد مقامی پولس کے رویہ کے خوف سے اپنی شکایتیں افسران تک نہیں پہنچاتے۔

متعدد مغربی ملکوں میں دستور میں مسلمانوں کے سیاسی دستوری اور تہذیبی حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے، ازروئے انصاف ملنے والے حقوق جبکہ ازروئے حقیقت انہیں جو کچھ ملتا ہے اس میں بڑا فرق اور تضاد ہے، مقامی افسران اکثر انتہا پسند کردیوں سے مل جاتے ہیں اور دستور کے تحت مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو دیئے گئے حقوق کی پامالی میں معاون ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال نئی مسجدوں کی تعمیر کی عوامی مخالفت ہے، اور حکام اقلیتوں کو ان کے دستوری حقوق کی ضمانت دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عوام کا ساتھ دیتے ہیں، اٹلی، جرمنی اور اسپین میں نئی مساجد کی تعمیر کے خلاف احتجاج بہت پھیلا ہوا ہے، اگر مقامی حکام نئی مسجدوں کی تعمیر کی اجازت بھی دیتے ہیں تو وہ شہر سے دور ایسے علاقوں میں ہوتا ہے جو عموماً انتہا پسندوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ وہ پرائیویٹ ہال، موٹر گیراج، دفتروں یا مکانات میں ہی نماز ادا کریں، اسلامی سنٹروں کی تعمیر کے لئے بھی

مقامی حکام اسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی طرح حلال خوراک کی فراہمی، اسکولوں میں سرڈھکنے کے معاملہ میں ایسا ہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

مغرب میں تارکین وطن کا مسئلہ، تنازعہ اور احتجاج کا موضوع بنا ہوا ہے، اکثر اس پر نسل پرستی اور غیر لوگوں سے اجتناب کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں، تارکین وطن کے مسئلہ پر سیاسی مہم جوئی بھی ہوتی ہے اور اکثر اس سے سیاسی صف آرائی کا ماحول بھی پیدا ہو جاتا ہے، انتہا پسند سیاسی پارٹیاں لوگوں میں خوف کا ماحول پیدا کرتی ہیں، مہاجروں کی دوسری اور تیسری نسل کے افراد کو بھی جو مغربی ممالک میں ہی پیدا ہوئے اور پروان چڑھے انہیں بھی غیر ملکی قرار دیا جاتا ہے، الیکشن میں مہاجرین/تارکین وطن کا مسئلہ زور شور سے اٹھایا جاتا ہے اور حکومت کو ان مہاجرین کے خلاف اقدامات کرنے ہوتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں الیکشن میں وہ انتہا پسند سیاسی جماعتوں سے ہار نہ جائیں۔

یوروپی معاشرہ میں اظہار رائے کی آزادی کو مقدس اور نا قابل تغیر سمجھا جاتا ہے، اٹلی میں اس موضوع کو ریاکاری، دوہرا معیار، دوغلی گفتار اور متضاد رویہ کہا جاتا ہے، کسی بھی ملک بشمول مغربی ممالک میں اظہار رائے کی بے لگام آزادی کی اجازت نہیں ہے، ہر ملک میں اظہار رائے کی آزادی کے تحت بدگفتاری، کفر گوئی، کسی کو بدنام کرنے؛ دشنام دینے، توہین کرنے، فحش کلامی، نفرت پھیلانے کی اجازت نہیں ہے، مغرب کے ۲۰ ممالک میں میڈیا کی آزادی کے ایک حالیہ سروے میں جس کا عنوان ''آزادی کو الوداع'' ہے اسے صحافیوں کی آزاد ایسوسی ایشن نے شائع کیا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال کے دوران ۲۰ میں سے ۱۸ ملکوں میں صحافیوں کو توہین، سرکاری راز کے افشا جیسے معاملات میں مجرمانہ مقدمات کا سامنا کرنا پڑا اور جیل بھی جانا پڑا۔

متعدد یوروپین ممالک مثلاً جرمنی، آسٹریا، فرانس، اسپین اور بلجیم میں ہولوکاسٹ

(یہودیوں کے قتل عام) کے بارے میں تفصیلات شائع کرنا جرم ہے، کاسٹ کے واقعہ کا انکار
کرنے والے عالمی شہرت یافتہ ارنسٹ زنڈیل کو ۲۰۰۵ء میں کناڈا سے نکال دیا گیا، جرمنی میں
اس پر چودہ الزامات عائد کئے گئے، برطانوی مورخ ڈیوڈ اروِنگ جس نے دوسری جنگ عظیم پر
۳۰ کتابیں لکھیں، اسے آسٹریا کی ایک عدالت نے ۲۰۰۶ء میں تین سال قید کی سزا دی؛
کیونکہ اس نے اور گیس چیمبر نے ۱۹۸۹ء میں آسٹریا میں ایک تقریر کے دوران آشویٹز میں
گیس چیمبر اور ہولوکاسٹ کا انکار کیا تھا، نومبر ۲۰۰۹ء میں جرمنی کی ایک عدالت نے برطانوی
بشپ رچرڈ ولیم سن کو ۱۲۰۰۰ پونڈ جرمانہ کی سزا دی؛ کیونکہ اس نے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں
ہولوکاسٹ کا انکار کیا تھا، یہ انٹرویو گزشتہ سال سویڈش ٹیلی ویژن کو دیا گیا جس کے بعد ہر طرف
ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

دوسری طرف انتہا پسند سیاستدان، اہل قلم اور صحافی اپنی تحریروں اور تقریروں میں
اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہیں، لیکن انہیں کسی قسم کی سزا یا ردعمل کا خوف
نہیں ہوتا، ہالینڈ میں انتہا پسند پارٹی کا لیڈر گیرٹ وِلڈرس نے کبھی اس بات کو نہیں چھپایا کہ اسے
اسلام اور مسلمانوں سے نفرت ہے، وہ اسلام کو ایک مفلوج کلچر کی آئیڈیالوجی کہتا ہے، وہ قرآن
عظیم کو ہٹلر کی کتاب ''مین کیمف'' کے مساوی قرار دیتا ہے اور ہالینڈ میں مقیم مسلمانوں سے مطالبہ
کرتا ہے کہ اگر انہیں ہالینڈ میں رہنا ہے تو اپنے صحیفے کا آدھا حصہ پھاڑ کر پھینک دیں، ویلڈرس کو
آزادی اظہار کے نام پر اپنی زہر افشانی کی کھلی چھوٹ دی گئی ہے، ناقدین نے یوروپین یونین
کے اس دوہرے معیار کی نشان دہی کی ہے کہ ایک طرف تو یہ ممالک عیسائیت اور یہودی نسل
(سامی) کی حفاظت کے قانون بناتے ہیں دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ
سرائی پر خاموش رہتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں لکسمبرگ میں یوروپین یونین کا صدر ایک قانون سازی
کے ذریعہ نسل پرستی کے خلاف اقدام کرنا چاہا لیکن اٹلی کی حکومت نے اس کی مخالفت کی کہ یہ

اظہار رائے کی آزادی سے متصادم ہے، اس طرح وہ قانون پاس نہیں ہوسکا، انسانی حقوق پر یوروپین کنونشن میں ہر شخص کی آزادی اظہار کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے تاہم اس میں یوروپین ممالک کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عوامی فلاح، قومی یک جہتی، شورش سے بچنے اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے آزادی اظہار کے اس حق کو محدود بھی کرسکتے ہیں، نسل پرستی اور غیروں سے اجتناب کے ذہن کی نگرانی کرنے والے مرکز کی ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کوئی مطلق حق نہیں ہے، بین الاقوامی قوانین اور یوروپی یونین کے نظام قانون میں ایسی دفعات موجود ہیں جن میں دوسروں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے اس حق کو محدود کیا جاسکتا ہے، رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ نسل پرستی اور غیروں سے وحشت کے ساتھ آزادی اظہار کا حق پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں مغربی حکومتوں، عدالتوں، سول سوسائٹی کے عالمی تنظیموں، تجارت، صنعت، بین المذہبی مفاہمت کے اداروں نے متعدد ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے نسل پرستی اور اسلام فوبیا کے اثرات کو دبایا جاسکے، مسلمانوں اور یوروپی معاشرہ کے درمیان گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اختلافات اور بدگمانی کی خلیج کو پاٹا جائے۔

تمام یوروپین ممالک میں اسلام کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، ان میں وہ ممالک بھی شامل ہیں جہاں عیسائی مذہب کو ریاستی مذہب قرار دیا گیا ہے مثلاً برطانیہ، بلجیم اور ڈنمارک، بلجیم نے ۱۹۷۴ء میں ایک قانون کے ذریعہ اسلامی طریقہ عبادت کو وہی مساوی درجہ عطا کیا جو اس ملک میں سرکاری طور پر تسلیم مذاہب کو حاصل ہے، یعنی کیتھولک مذہب، پروٹسٹنٹ اور یہودیت، ہالینڈ میں بلورائزیشن سسٹم کے تحت ہر مذہب کے ماننے والوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ثقافتی اور مذہبی ادارے سرکاری امداد سے قائم کرسکتے ہیں، مسلمانوں کو بھی اس حق کے تحت یہ رعایت حاصل ہے، مغربی ممالک میں مسلمانوں کا تجزیہ اور مغربی حکومتوں کی طرف سے

ان کے مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کا معاملہ مناسب طور پر مثبت رہا ہے، عموی طور پر مغربی معاشرہ میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کیا جاتا ہے، اس میں انہیں اقتصادی سہولیات، اعلیٰ تعلیم کی سہولیات اور پیشہ وارانہ میدان میں آگے بڑھنے کے امکانات بھی شامل ہیں، بہتر طبی سہولیات، تحفظ، سیاسی وسماجی حقوق، شخصی آزادی نیز مذہبی وثقافتی آزادی بھی حاصل ہے (جو کہ بعض مسلم ممالک میں بمشکل دستیاب ہیں یا سرے سے ان کا وجود ہی نہیں)، بیشتر مغربی ممالک میں مسلمانوں کو مسجدیں بنانے، اپنے قبرستان بنانے اور اپنے اسکول کھولنے کی آزادی ہے، بعض ممالک میں اس کے لئے سرکاری امداد بھی فراہم کی جاتی ہے)۔ انہیں اپنی مذہبی اور ثقافتی انجمنیں قائم کرنے کا اختیار بھی ہے، تقریباً تمام مغربی ملکوں میں مسلمانوں کو اسلامی طریقہ پر ذبیحہ کی اجازت ملی ہوئی ہے، تقریباً تمام مغربی ممالک میں تارکین وطن کے بچوں کو اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے، جرمنی، بلجیم، سوئیڈن اور ہالینڈ جیسے ممالک میں بچوں کو اپنی تعلیم دینے کے لئے ترکی، مراکش اور دیگر مسلم ممالک سے اماموں کو بلانے کی اجازت ہے، ۱۹۵۷ء سے بلجیم کے سرکاری اسکولوں میں عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اسلام کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، ملک میں تقریباً ۷۰۰ مسلمان اساتذہ ہیں جن کی تنخواہیں سرکاری خزانہ سے دی جاتی ہیں، متعدد مغربی ممالک میں مسلمانوں کے خیراتی اداروں میں دیئے گئے چندہ پر سرکار ٹیکس میں رعایت دیتی ہے، اگر مسلمان ایسی درخواست کریں تو قید خانوں، اسپتالوں، اسکولوں اور فوج کے کینٹن میں انہیں اسلامی طریقہ پر تیار کردہ خوراک فراہم کی جاتی ہے۔

تمام یوروپی ممالک مساوات، انصاف اور حقوق انسانی کے پابند ہیں اور یوروپین کنونشن کے تحت انسانی حقوق کی جو رہنما ہدایات ہیں ان پر عموماً عمل پیرا ہیں، اب یوروپین اقوام نے ایسے قانونی ادارے قائم کردیئے ہیں جو تعلیم، ملازمت، صحت وحفظان صحت کے میدانوں میں نسلی امتیاز کے خلاف اقدام کرتے ہیں، برطانیہ میں مساوات اور انسانی حقوق کے ادارے

ہالینڈ میں مساوی سلوک کے ادارے، جرمنی میں امتیاز کے خلاف قانون ایسے اقدامات ہیں جو نسل یا مذہب کے نام کئے جانے والے امتیاز اور تفریق کو روکتے ہیں، کئی مغربی ممالک نے ایسی پالیسیاں وضع کی ہیں جن سے مسلمانوں کو محنت مزدوری کے میدان میں آسانی ہو، انہیں سرکاری امداد سے تعمیر کئے جانے والے مکانات حاصل کرنے کی سہولت بھی دی جاتی ہے، کئی مغربی ملکوں بشمول برطانیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور جیک ری پبلک میں پولیس اور فوج میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتی گروپ کے افراد کو بھرتی کرنے کی خصوصی مہم چلائی گئی۔ سویڈن میں پولیس انتظامیہ نے اپنے پروگرام کے تحت پولیس افسران کو ڈیوٹی کے دوران ٹوپی، پگڑی، یہودی ٹوپی وغیرہ پہننے کی اجازت بھی دیدی ہے، خاتون پولیس افسران کو بھی سر ڈھکنے کا اختیار ہے، آسٹریا میں فیڈرل وزارت دفاع میں مسلم ملازمین کو بعض خصوصی مراعات مثلاً حلال کھانا، نماز کے لئے جگہ کی سہولت اور مذہبی تقاریب منانے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ ۳/فروری ۲۰۰۹ء کو حکومت ناروے نے اعلان کیا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ مسلم خواتین پولیس افسر یونی فارم کے ساتھ سر پر حجاب کے لئے رومال بھی باندھیں۔

اگرچہ مغرب میں آزادی اظہار کو ایک ناقابل تنسیخ حق سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض انتہا پسند طبقے اس آزادی کا ناجائز استعمال کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں؛ کیونکہ انہیں کسی تعزیر کا اندیشہ نہیں ہوتا، متعدد مغربی ممالک بشمول برطانیہ، جرمنی اور ہالینڈ میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر نسل پرستوں کے حملوں کے خلاف حفاظتی اقدامات کئے ہیں اور کئی ایسے عالمی اقرار ناموں پر دستخط بھی کئے ہیں جن کے تحت نفرت ابھارنے والی تحریر و تقریر پر پابندی عائد کی گئی ہے، برطانیہ میں ۲۰۰۶ء میں نسلی اور مذہبی بنیاد پر نفرت یا تفریق پھیلانے کے خلاف ایک قانون پاس کیا گیا جس کے تحت مذہبی یا نسلی بنیاد پر نفرت یا تفریق پھیلانا جرم قرار دیا گیا ہے، ۲۰۰۸ء میں جرمنی میں دو انتہا پسندانہ تنظیموں پر پابندی عائد کردی گئی جو کہ

یہودیوں کے خلاف پروپیگنڈا اور نازی ازم کی تبلیغ کرتی تھیں، ہالینڈ کے وزیر اعظم جان پیٹر بالکنینڈے نے سرعام ہالینڈ کے انتہا پسند سیاستدان گیرٹ ولڈرس کی اسلام کے خلاف بنائی گئی فلم کی مذمت کی، انہوں نے کہا ہم سمجھتے ہیں کہ اس فلم سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ مسلمانوں کے جذبات بھڑکاتی ہے، ہالینڈ میں آزادی اظہار اور مذہب وغیرہ کی آزادی کی روایت قدیم سے ہے، اسی کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا احترام، رواداری اور ذمہ دارانہ برتاؤ کی روایت بھی ہے کچھ طبقات کی طرف سے دوسروں کو اذیت پہنچانا یہاں کی روایت کا حصہ نہیں ہے، ہالینڈ کے تمام اہم ٹی وی مراکز نے اسلام کے خلاف فلم کو دکھانے سے انکار کر دیا، بالآخر مارچ ۲۰۰۶ء میں اسے ویڈیو ویب سائٹ پر دکھایا گیا، کولون میں ایک نئی مسجد تعمیر کرنے کی تجویز پر وہاں کے انتہا پسند طبقات نے شدید احتجاج اور مظاہرے کئے، لیکن کولون کی سٹی کونسل نے اگست ۲۰۰۸ء میں مسجد کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ جرمنی کی وزارت داخلہ نے گزشتہ دو سالوں کے درمیان جو اہم اقدام کیا ہے وہ اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہے، ستمبر ۲۰۰۶ء میں جرمنی کے وزیر داخلہ ولف گینگ شوبل نے اسلام پر ایک بڑی کامیاب کانفرنس کا انعقاد برلن میں کیا، جس میں اہم سرکاری ذمہ داران اور مسلم تنظیموں کے نمائندے مدعو کئے گئے، وزیر موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز اس جملہ سے کیا کہ مسلمان بلاشبہ جرمنی کا ایک حصہ ہیں اسے نہ صرف مسلمانوں کے لئے ایک اہم تعظیمی اشارہ سمجھا گیا بلکہ وہاں کے سماج کے لئے بھی یہ اہم تھا۔

مغربی ممالک میں عدالتوں نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتی گروپوں کو دیئے گئے دستوری حقوق کی برقراری میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور اقلیتوں کی جائز شکایتوں کو دور کرنے میں بھی اہم اقدامات کئے ہیں، فرانس میں ۲۰۰۷ء میں ایک قانونی فیصلہ میں وضاحت کی گئی کہ سر پر رومال/ دوپٹہ اوڑھنے پر پابندی محض سرکاری اداروں تک محدود ہے نجی اداروں میں اس کے استعمال پر کوئی بندش نہیں ہے۔ بعض ایسے کیسوں میں جہاں پرائیویٹ کمپنیوں نے سر پر رومال

اوڑھنے والی ملازماتوں کو برخاست کر دیا عدالت نے اسے غیر قانونی قرار دے کر مسترد کر دیا۔

ایمسٹرڈم کی اپیل کورٹ نے ۲۰ر جنوری ۲۰۰۹ء گیبت ویلڈرس کے خلاف اسلام مخالف فلم بنانے کے لئے اس پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا، عدالت نے ویلڈرس کے اخباری بیانات، انٹرویو اور میڈیا میں دی گئی خبروں کو یک طرفہ قرار دیا...... جس سے نفرت پھیلتی ہے، ایمسٹرڈم اپیل کورٹ کے تین ججوں نے کہا کہ انہوں نے ویلڈرس کے آزادی اظہار کے حق کے تناظر میں اس کے بیانات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے جو کہ سیاستدانوں کو حاصل ہیں، عدالت کی نگاہ میں یہ اس قدر توہین انگیز ہیں کہ اس کی پاداش میں ویلڈرس پر مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔

تقریباً تمام یورپین ممالک میں یہودیوں کی مذہبی عدالتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے (جو بیت دین کہلاتی ہیں) یہ عدالتیں یہودیوں کے عائلی تنازعات کے فیصلے کرتی ہیں۔ اب بعض مغربی ممالک نے مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے فیصلے کے لئے شرعی عدالتوں کے قیام کو بھی رسمی یا غیر رسمی طور پر تسلیم کئے جانے کے رجحان کا مظاہرہ کیا ہے، برطانیہ میں ثالثی ٹریبونل کے تحت کئی شرعی عدالتیں قائم ہیں جو مسلمانوں کے وراثتی اور عائلی تنازعات کے فیصلے کرتی ہیں، ان کے فیصلوں کو کاونٹی اور ہائی کورٹ ثالثی ایکٹ ۱۹۹۶ء کے تحت نافذ کراتی ہیں، اس ایکٹ کے تحت اس قسم کے تنازعات متبادل طریقوں ٹریبونل وغیرہ کے ذریعہ بھی طے کئے جاسکتے ہیں۔

سول سوسائٹی ادارے بشمول غیر سرکاری تنظیمیں، تجارتی گھرانے، کلیسا اور مذہبی ادارے، علمی اور صحافتی ذرائع، جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی بقا کے لئے اہم کردار ادا کرتے ہیں، نسل پرستی، مغائرت کو مٹانے، باہمی مفاہمت اور رواداری کو فروغ دینے میں بھی یہ ادارے سرگرم ہیں، حالیہ برسوں میں ان اداروں نے مسلمانوں اور مغربی معاشرہ کے درمیان مغائرت کو دور کرنے کے لئے کئی اہم اقدامات کئے ہیں، باہمی گفت وشنید، افہام وتفہیم کے ذریعہ خلیج کو

بانٹنے کی کوشش جاری ہے، اس طرح نسل پرستی، غیروں سے خوف کے ماحول کو تبدیل کرنے کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

مغرب میں انتہا پسند سیاستدانوں اور پارٹیوں کو الیکشن میں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ووٹر انہیں مسترد کر دیتے ہیں، حالیہ برسوں میں سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا میں یہ انتہا پسند جماعتیں الیکشن میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر کامیاب ہوئیں، لیکن جب انہوں نے حکومت بنانے کے لئے دیگر پارٹیوں سے رابطہ قائم کیا تو دیگر پارٹیوں نے ان کے ساتھ اشتراک یا تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو انتہا پسند تحریکوں سے تعلق رکھنے والے دوسو افراد دور دراز علاقوں سے جرمنی کے شہر کولون میں جمع ہوئے اور انہوں نے بقول خود کولون حامی گروپ کے لوگوں سے کہا تھا کہ یہ لوگ شہر میں ایک مسجد کی تعمیر کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، اس مظاہرے میں یورپ کے متعدد ممتاز انتہا پسند سیاسی رہنما شریک ہوئے، تقریباً ۴۰ ہزار مظاہرین کولون کے ہملٹ علاقے میں جمع ہوئے تاکہ مظاہرین کی ریلی کی مخالفت کریں، ۴۵ منٹ بعد پولیس نے ان لوگوں کو منتشر کر دیا، ان مظاہرین میں کولون کی متعدد جماعتیں کرسچن ڈیموکریٹ، لیبر یونین اور مسلمانوں کی تنظیمیں شامل تھیں، بائیں بازو کی پارٹیوں کے ممبران طلبہ، اہل قلم و دانشور اور دیگر عیسائی گروپ شامل تھے، اس عظیم الشان جوابی مظاہرے سے جرمنی اور پورے یورپ کو یہ پیغام پہنچا کہ کولون کے باشندے نسل پرستی کے نظریات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ کولون کی اس مسجد کا نقشہ ایک عیسائی آرکیٹیکٹ نے بنایا ہے۔

جب برطانیہ، ہالینڈ اور یورپ کے دیگر شہروں میں مسلمانوں پر حملے ہوتے ہیں تو عوامی تنظیمیں ان کے دفاع کے لئے آگے آتی ہیں، متعدد یوروپین وکیلوں، انسانی حقوق کے علمبرداروں نے امریکن اور برطانوی سپاہیوں کے ذریعہ مسلم قیدیوں پر کیے گئے ظلم کے خلاف

احتجاج کیا اور انہیں انصاف دلانے کی کوشش کی، ایمسٹرڈم میں ہزاروں مظاہرین نے مظاہرہ کیا، بعض مظاہرین تختیاں اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا: مسلمانوں کو ستانے کی پالیسی ختم کرو، ہم زیادہ خاموش نہیں رہ سکتے، ہالینڈ میں نفرت اور خوف کا ماحول ہے، ہالینڈ کی ایک نسل پرستی مخالف تنظیم کے ترجمان روے ڈانیین نے بھی یہ بات کہی، یہ مظاہرہ اسی تنظیم نے کرایا تھا، ہالینڈ میں جب میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کی گئی تو انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس کی، مذمت کی مقامی طور پر ہزاروں باشندوں نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔

کلیسا اور عیسائی تنظیموں نے کم وبیش ہر جگہ مسلمانوں کے کاز کی حمایت کی ہے، جرمنی میں کیتھولک چرچ نے ان انتہا پسند تنظیموں کے خلاف مسجدوں کی تعمیر کی حمایت کی ہے۔

کولون کے کیتھولک چرچ نے شہر میں نئی مسجد کی تعمیر کی حمایت کی ہے، سینٹ تھیوڈور کیتھولک چرچ نے تو مسجد کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کی پیشکش بھی کی ہے، جرمنی کے اسکولوں میں اسلام کی تعلیم شروع کئے جانے کی تجویز بھی ہے، جرمنی کے جرمن بشپ کانفرنس کے صدر رابرٹ اورلسک نے اس کی حمایت کی ہے، جرمنی نے ولیم فورسٹ کمیٹی نے صحت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی ایک اسکیم شروع کی ہے، اس اسکیم کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں کے مسلم عیسائی اور سکھ مذہبی نمائندوں کو ان کے علاقوں کی نشان دہی کرکے وہاں ان مذہبی نمائندوں کے ذریعہ صحت اور حفظان صحت کے بارے میں عوام تک پیغامات پہنچائے جائیں، سوئٹزرلینڈ میں یہودی اور عیسائی گروپوں نے میناروں کی تعمیر پر پابندی کی مخالفت کی ہے۔

فرانس میں کیتھولک چرچ نے پبلک اسکولوں میں سر پر دوپٹہ/ رومال پہننے پر پابندی کی مخالفت کی ہے، پبلک اسکولوں کے برخلاف فرانس کے کیتھولک اسکولوں میں مسلمان طالبات کو سر ڈھانپنے کی اجازت ہے، بعض عیسائی اسکول مسلمانوں کے تیوہاروں کے دن ٹیچروں اور والدین کی میٹنگ منعقد کرتے ہیں، بعض کیتھولک اسکولوں میں عربی بطور اختیاری

مضمون پڑھائی جاتی ہے، کیتھولک اسکولوں میں پڑھنے والے ۲۰ لاکھ طلبہ میں مسلم طلبہ کا تناسب ۱۰ فیصد ہے، رمضان کے مہینہ میں ان اسکولوں میں مسلمان طلبہ کو نماز پڑھنے کے لئے الگ کمرے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، بڑالونا بارسیلونا (اسپین) کے کیتھولک پادریوں نے شہر میں مسجد کی تعمیر کی حمایت کی، سوئٹزرلینڈ میں یہودی اور عیسائی جماعتوں نے میناروں کی تعمیر پر پابندی کی مخالفت کی ہے۔

حالیہ برسوں میں یوروپ میں تجارتی اداروں اور کمپنیوں نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتی جماعتوں کے مذہبی جذبات کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے، شہرۂ آفاق کوکا کولا کمپنی ہر ماہ رمضان کے دوران کولڈ ڈرنک کی بوتلیں مفت فراہم کرنے کا اہتمام کرتی ہے، جرمنی کولون میں فورڈ کمپنی اور فرنکفرٹ میں فور پورٹ نے اپنے مسلم ملازمین کے لئے نماز کی جگہ کا انتظام کیا ہے اور کینٹین میں ان کے لئے حلال خوراک کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے، لکسمبرگ میں کچھ فرموں نے اپنے مسلم گاہکوں کے لئے کچھ مثبت اقدامات کئے ہیں، مثلاً رمضان میں نماز کے لئے وقفہ دینا، اسلام کی غذائی شرائط کے مطابق کھانا تیار کرنا اور عید کے موقع پر چھٹیاں دینا۔

حالیہ برسوں میں مغربی ممالک میں سرکاری اور پرائیویٹ کمپنیوں میں مختلف النوع بندوبست یا فیکٹری چارٹر کے عنوان سے ایک رجحان فروغ پا رہا ہے، مختلف النوع بندوبست کا یہ نظریہ ۱۹۸۰ء میں امریکہ میں سامنے آیا، جہاں اسے مثبت عمل اور مختلف ثقافتی اکائیوں کے درمیان مساوی مواقع فراہم کرتا ہے، فیکٹری چارٹر کے تحت جو یوروپین یونین نے ۲۰۰۰ء میں شروع کیا تھا، کمپنیاں اس بات کا عہد کرتی ہیں کہ وہ اپنے یہاں کسی امتیاز وتفریق کے بغیر آزادانہ ماحول کو فروغ دیں گی، متعدد جرمنی کمپنیاں بشمول ڈیوتشے بنک، ڈیوتشے ٹیلی کام، ایلینز، ڈریسنر بنک اور ڈیملر کرائسلر نے کارٹا ڈرویفالٹ (ڈائرڈسٹی چارٹر) پر دسمبر ۲۰۰۶ء میں دستخط کئے، اس کے تحت کمپنی کے اندر تکثیری چارٹر (ڈانورسٹی چارٹر) کے تحت ہر قسم کے امتیاز اور تفریق سے

پاک ماحول پیدا کیا جائے گا، کمپنی کے اندر اور کمپنی کے باہر کسی قسم کے امتیاز پر عمل نہیں ہوگا، بعض فرانسیسی کمپنی بشمول آئی سی ایل کو ویلون کیب، جیمس سوجل اور گریڈٹ ایگری کول ایس اے نے بھی تکثیری چارٹر پر دستخط کیے ہیں، اس طرح انہوں نے عہد کیا ہے کہ ان کے ملازمین مختلف قومیت کے لوگ ہوں گے، ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا اور وہ فرانس کی تکثیری قومیت کے مظہر ہوں گے، بلجیم میں سرکاری ٹی وی وی آرٹی نے بھی ان ریاستوں سے اس تکثیری ماڈل معاہدہ پر دستخط کیے ہیں کہ بطور عوامی ذرائع ابلاغ وہ ملک کی آبادی کی تکثیری ساخت کو نمایاں کرے گا، یہ ٹی وی اپنے پروگراموں میں نسلی اقلیتوں کے نوجوانوں کی سرگرمیوں کو خصوصی طور پر نمایاں کرتا ہے، اس تکثیری منشور کو اب بطور سماجی اور تعاون باہمی کے اہم ذریعہ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی تنظیمیں خصوصاً اقوام متحدہ اور یوروپین کمیشن نے حالیہ برسوں میں نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے خلاف اہم اور مؤثر اقدامات کیے ہیں تاکہ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان خلیج کو پاٹا جا سکے، اکیسویں صدی کے آغاز سے اقوام متحدہ نے تہذیبوں کے درمیان مذاکرات کو اپنے اہم پروگراموں میں شامل کیا ہے، تہذیبوں کے درمیان مذاکرات یا تہذیبوں کے اتحاد کا نظریہ تہذیبوں کے تصادم کے جواب کے طور پر پیش کیا گیا تھا، تہذیبوں کے اتحاد کے اس نظریہ کی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تائید کی اور نومبر ۱۹۹۸ء میں اسے منظور بھی کیا اور یہ طے کیا کہ ۲۰۰۱ء کو اقوام متحدہ کی جانب سے تہذیبوں کے درمیان مذاکرات کے سال کے طور پر منایا جائے۔

یوروپین یونین نے اپنی مختلف تنظیموں اور اداروں کے ذریعہ نسل پرستی، غیروں سے وحشت اور اسلاموفوبیا کا مقابلہ کرنے اور مسلمانوں اور مغرب کے معاشرہ کے درمیان قربت پیدا کرنے کے مؤثر اور متواتر اقدامات کیے ہیں، ۱۹۹۱ء میں کونسل برائے یوروپ نے طے کیا کہ یوروپین ثقافت پر اسلامی اثرات کا عوامی طور پر اعتراف کیا جائے اور علمی، ثقافتی اور تعلیمی

اداروں کے ذریعہ ان اثرات کو واضح اور نمایاں کیا جائے، یوروپین یونین نے ۱۹۹۴ میں نسل پرستی اور غیروں سے وحشت کے بارے میں ایک کمیشن قائم کیا تھا، جون ۱۹۹۸ء میں نسل پرستی اور غیروں سے وحشت کی نگرانی کرنے والا کمیشن ویانا میں قائم کیا گیا جو یوروپین یونین کی سرپرستی میں کام کرتا ہے۔ ۱۱/ ۹ کے پس منظر میں یوروپین یونین نے اسلاموفوبیا کے بارے میں ایک بہت بڑا پروجکٹ شروع کیا، مئی ۲۰۰۲ء میں اس نے ایک رپورٹ بعنوان ۱۱رستمبر کے بعد یوروپین یونین میں اسلاموفوبیا کے بارے میں مختصر رپورٹ، اس میں یوروپین یونین میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وحقارت اور ان پر کیئے گئے حملوں کا حوالہ دیا گیا تھا، دسمبر ۲۰۰۵ء میں یوروپین یونین نے مسلم مما لک سے تعلقات میں قربت اور گہرائی پیدا کرنے اور یوروپ میں مقیم لاکھوں مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کی خصوصی مہم شروع کی یہ مہم اسلام کے بارے میں صحیح اندازفکر پیش کرنے، صحیح اور واضح الفاظ کے ذریعہ اسلام کے خلاف بدگمانی اور اشتعال انگیز اصطلاحات سے خودکو علیحدہ رکھنے کی غرض سے چلائی گئی، اسی کے ساتھ اشتعال انگیز اصطلاحات مثلاً اسلامی بنیاد پرستی اور اسلامی دہشت گردی کا استعمال بھی نہیں کیا گیا، مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے متعلق عوامی اطلاعات پہنچانے کے لئے غیر جذباتی الفاظ کا استعمال کیا جائے۔

یہ جاننا دلچسپ اور مفید ہوگا کہ مغربی مما لک میں رہنے والے مسلمان اسلاموفوبیا اور نسل پرستی کے چیلنجوں کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلمانوں کا ردعمل منفی علیحدگی پسندی، پسپائی یا صف آرائی کا نہیں ہے بلکہ ایک مثبت رابطہ کا ہے، امتیاز، تشدد اور بدنام کیئے جانے والے ماحول میں بھی وہ معاشرہ، اور ملک میں جہاں وہ مقیم ہیں افراد سے گھل مل کر رہتے ہیں، اوپن سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ کے ایک حالیہ سروے کے مطابق جو یوروپ کے گیارہ بڑے شہروں میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی طور پر روابط بڑھانے میں مسلمانوں کا کردار بہت زیادہ مثبت ہے، سروے سے ظاہر ہوا کہ مسلمان ملی

جلی آبادیوں میں رہتے ہیں، علیحدہ بستیاں نہیں بساتے، ان کے اور غیر مسلموں کے بیشتر مسائل مشترک ہیں، جن لوگوں سے رابطہ کیا گیا ان کی اکثریت نے کہا کہ وہ مقامی سیاست میں حصہ لینا چاہتے ہیں، مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان اپنے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج میں اپنے پڑوسیوں کا تعاون اور ہمدردی بھی حاصل کرتے ہیں، فروری ۲۰۰۷ء کو برطانیہ کے مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا توہین آمیز کارٹون شائع کرنے پر ایک پر امن احتجاجی مظاہرہ کیا جس میں تقریباً ۱۰ ہزار افراد شریک ہوئے، اس مظاہرہ کا اہتمام برطانیہ کی مسلم کونسل اور برطانیہ کی مسلم ایسوسی ایشن نے کیا تھا، متعدد عیسائی انجمنوں نے اس کی حمایت کی، ان میں لندن کے میئر کفن لونگٹن بھی شامل تھے۔

جرمنی میں اکتوبر ۲۰۰۸ء میں ملک کی سب سے بڑی مسجد ڈیوز برگ میں کھولی گئی، دیگر مساجد کی طرح اس مسجد کے کھولے جانے پر مقامی طور پر کوئی احتجاج نہیں ہوا، اس کے برعکس سیاستدانوں، کلیسا کے نمائندوں اور دیگر اہم عوامی شخصیتوں نے اس کے کھولے جانے کا خیر مقدم کیا، مسجد کی تعمیر سے پہلے تعمیر کے ذمہ داران نے کلیسا کے نمائندوں، مقامی افراد اور ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا، میٹنگ بلائی اور تمام غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی، اس مسجد کے بیسمنٹ میں ایک کانفرنس سنٹر ہے جو میکسلوہ ضلع کے باشندوں کی خوردنی ضروریات پوری کرتا ہے، نورتھ رہینے ویسٹ فالیا کی ریاست نے اس کانفرنس سنٹر میں ۳۲ لاکھ یورو کی سرمایہ کاری کی، مقامی لوگوں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے مسجد کے ذمہ داروں نے فیصلہ کیا کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان نہیں دیں گے۔

یوروپین ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اپنے جائز حقوق کے لئے دستوری اور قانونی دائرہ میں رہ کر اقدام کرتے ہیں، وہ اقلیتوں کے حقوق کی دہائی نہیں دیتے، جرمن دستور میں اقلیتوں کو بعض خصوصی مراعات دی گئی ہیں، ان سے یہودی کیتھولک

عیسائی فیض یاب ہوتے ہیں، دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہودی فرقہ کو اپنے مذہبی طریقہ کے مطابق جانوروں کے ذبیحہ کی اجازت دی گئی اور اس کے لئے جانوروں کے تحفظ کے ضابطوں میں بھی رعایت دی گئی۔ ۲۰۰۲ء میں جرمنی کی فیڈرل کانسٹی ٹیوشن کورٹ کے ایک فیصلہ کے تحت مسلمانوں کو بھی ایسا ہی حق حاصل ہو گیا اسی طرح مسلمانوں نے مذہبی اظہار کی آزادی کے حوالہ سے مسلم ٹیچروں کو سر پر رومال باندھنے کی آزادی کا مطالبہ کیا اور مسلمان طالبات کو تیراکی کی کلاسوں سے استثنا کا مطالبہ بھی کیا اگر اس کی کلاسیں مخلوط انداز میں ہوں۔

۲۹ر نومبر ۲۰۰۹ء کو سوئٹزر لینڈ میں ایک میمورنڈم کے ذریعہ مسجد کے میناروں کی تعمیر پر پابندی لگادی گئی، یہ انسانی حقوق کی پامالی کی ایک بدترین مثال ہے، ایک الجیریائی مسلمان اور جینوا کی مسجد کے ایک سابق ترجمان نے اسٹراسبرگ یوروپی یونین کے حقوق انسانی کمیشن کے روبرو استغاثہ دائر کیا ہے کہ اس پابندی کو انسانی حقوق کے یوروپی کنونشن کی خلاف ورزی قرار دیا جائے۔

پیچیدہ جذباتی اور نازک مسائل حل کرنے کے لئے باہمی گفت وشنید مصالحت اور افہام وتفہیم کی ضرورت ہوتی ہے، برطانیہ میں شہر کے اندرونی حصوں کے اسکولوں میں ۸۰ تا ۹۰ فیصد طلبہ مسلمان ہیں، ۱۹۷۶ء کی دہائی میں بریڈفورڈ کے اسکولوں میں ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا، یہ اسکول کی تمام طالبات کو یونیفارم میں اسکرٹ پہننے کے بارے میں تھا، بعض طالبات کے والدین نے اپنی بچیوں کو اسکول سے اٹھالیا، اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ایک مسلم رابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی، اس نے اس مسئلہ پر شہر کے ذمہ دار افسران سے ملاقات کی اور فارمولہ اس طرح تیار کیا گیا کہ مسلم طالبات کو اجازت دی گئی کہ وہ اسکول کی یونیفارم سے ملتے ہوئے رنگ کا پاجامہ پہن سکتی ہیں، مسلم طالبات کو اسکارف پہننے اور فزیکل تعلیم (پی ٹی) کے دوران پاجامہ پہننے کی اجازت بھی دی گئی۔

بریڈفورڈ اور برطانیہ کے دیگر شہروں کے اسکولوں میں مسلم طالبات کے لئے تیراکی کی

علیحدہ کلاسیں منعقد کی گئیں۔۱۹۸۶ء میں اسپین کے ایک گروپ نے جس نے اسلام قبول کرلیا تھا اسپین کے شہر غرناطہ میں مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، بدقسمتی سے مقامی آبادی اور انتہا پسند جماعتوں کی مخالفت کے سبب مسجد کی تعمیر کا منصوبہ التواء میں پڑ گیا، تقریباً ۲۰ سال تک اس پر عمل نہیں ہوسکا، آخر کار جب مقامی افسران نے مسجد کی تعمیر کی اجازت دی تو مسجد کا رقبہ اس کے اصل رقبہ سے آدھا کردیا گیا اور مقامی آبادی کو مطمئن کرنے کے لئے میناروں کی بلندی بھی کم کردی گئی، مسجد ۲۰۰۳ء میں قرطبہ کی شہرہ آفاق مسجد کے ۵۰۰ سال بعد کھولی گئی۔

اختتام:

یوروپ کے ایک بڑے حصے میں نسل پرستی، غیروں سے وحشت اور اسلاموفوبیا کے جو اثرات پھیلے ہوئے ہیں وہ دراصل بہت ہی بڑے چیلنجوں کی علامت ہے جن سے مغربی معاشرہ دوچار ہے، ان میں ثقافتی اختلاف کو اپنانا، ثقافتی اختلاف اور ثقافتی ربط وضبط کے درمیان توازن قائم رکھنا، فرد اور افراد کے مساوی مواقع کے حق کو تسلیم کرنا اور اقلیتی جماعتوں کے مذہبی احساسات اور حقوق کا پاس ولحاظ کرنا ہے، ان چیلنجوں پر قابو پانے کے لئے قانون سازی، مقامی آبادی کا تعاون، مذہبی جماعتوں کی شرکت، معاشرہ کے مثبت اقدام پر مشتمل ایک متعدد پہلو والا پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہے، سول اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی کمیشن اور حقوق انسانی کے یوروپی کنونشن نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے ذہن سے لڑنے کے لئے رہنما کا کام دے سکتے ہیں، یوروپین یونین اپنی مختلف ایجنسیوں مثلاً یوروپین کمیشن، انسانی حقوق کی یوروپی عدالت اور یوروپین یونین کے بنیادی حقوق ایجنسی کے ذریعہ اس بات کو یقینی بنانے میں زیادہ موثر رول ادا کریں کہ یوروپی یونین کے تمام ممالک انسانی واقلیتی حقوق کے نفاذ میں سرگرمی سے اقدام کریں۔

☆☆☆

عدم رواداری کی انتہا:

سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی تعمیر پر پابندی یوروپ کے لئے بیداری احساس کا لمحہ ہونا چاہئے

ڈاکٹر روی نائر☆

سوئٹزرلینڈ میں حال ہی میں میناروں کی تعمیر پر جو پابندی عائد کی گئی ہے وہ مذہبی عدم رواداری اور ملک میں خوف کی بنیاد پر امتیاز کی عکاس ہے، لیکن یہ عدم رواداری، تعصب، خوف اور اس کے بعد کے جابرانہ اقدامات صرف سوئٹزرلینڈ میں ہی محدود نہیں ہیں اور نہ یہ تعصب صرف مسلمانوں کے خلاف ہی ہے؛ بلکہ یہ نسلی امتیاز، تعصب اور اقلیتوں کے حقوق کی پامالی جس کا مظاہرہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا وہ یوروپ کی تاریخ کی ایک طویل روایت کا حصہ ہے، اگرچہ آج خصوصاً مغربی یوروپ کے بھیانک ماضی جس میں ہولوکاسٹ یہودیوں کا قتل عام بھی شامل ہے، کے پس منظر میں یوروپ کو حقوق انسانی کا حصار عافیت سمجھتے ہیں، حالانکہ ان دیگر تاریخی ستم رانیوں اور موجودہ عہد میں اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کے سبب اس پر گہری تشویش بھی پائی جاتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی تعمیر پر پابندی:

۲۹ رنومبر ۲۰۰۹ء کو ایک ریفرنڈم رائے شماری کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ میں تمام میناروں کی

☆ ایگزیکٹوڈائریکٹر جنوبی ایشیا حقوق انسانی ڈاکومنٹشن سنٹر، نئی دہلی

تعمیر پر پابندی کے حق میں ووٹ دیا (سوئس عوام نے آزادی پر خوف کو ترجیح دی، ملاحظہ ہو اسانی الدین کا مقالہ)۔

جس وقت یہ ریفرنڈم ہوا اس وقت سوئٹزر لینڈ میں صرف چار مینار تھے اور دو دیگر مینار زیر تعمیر تھے (سوئس عوام نے مسجدوں کے میناروں پر پابندی عائد کی، نیو یارک ٹائمز ۲۹ رنومبر ۲۰۰۹ء)۔

اس بات کے پیش نظر کہ مینار مسجد سے متصل محض ایک علامتی نوعیت کی بے ضرر چیز ہے، یہ پابندی اور بھی زیادہ افسوسناک ہے، اگر چہ یہ مینار بعض اوقات اذان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن سوئٹزر لینڈ میں انہیں اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا (سوئس عوام نے مسجدوں کے مینار کی تعمیر پر پابندی عائد کی، نیو یارک ٹائمز)۔

سوئٹزر لینڈ میں صرف ۱۵۰ مسجدیں ہیں، پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً چار لاکھ ہے جبکہ سوئٹزر لینڈ کی مجموعی آبادی ۷۵ لاکھ کے قریب ہے، سوئٹزر لینڈ میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت لباس وغیرہ کے معاملہ میں وہاں کی روایات کو اپناتی ہے، ان کی اکثریت کوسوو اور ترکی نسل کے لوگوں کی ہے، لیکن نیشنلسٹ سوئس پارٹی نے جس کی پارلیمنٹ میں اکثریت ہے منظم طریقہ سے اس کے خلاف مہم چلائی، اس نے اسلامی بنیاد پرستی کی بابت عوام کے خوف کا استحصال کیا اور دعوی کیا کہ یہ مساجد کے مینار سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کے مفروضہ سیاسی غلبہ کی علامت کے طور پر تعمیر کئے جارہے ہیں، ان مہم بازوں نے مخالفت کے نہایت ناشائستہ طریقے استعمال کئے، انہوں نے اشتہار شائع کئے جن میں سر سے پیر تک برقعہ میں ملبوس ایک مسلمان صورت کو ایک سیاہ مینار کے قریب کھڑے دکھایا گیا تھا، مینار کی شکل میزائل جیسی بنائی گئی تھی۔

یہ اشتہار سوئس عوام میں خوف کی نفسیات ابھارنے میں کامیاب رہے، اور مجموعی آبادی کے ۵۸ فیصد حصے اور ۲۶ میں سے ۲۲ حلقوں کے ووٹرز نے پابندی کے حق میں ووٹ دیئے، کیونکہ سوئٹزر لینڈ میں اسلام اور مسلمانوں کا اثر زیادہ نہیں ہے، اس لئے لوگوں کے ووٹ اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف ان کے خوف کا مظہر تھے، سیاسی پارٹیوں نے اس نفسیاتی خوف کا اپنے مفاد

میں استعمال اور استحصال کیا، جیسا کہ ایک ممتاز سوئس اہل قلم نے کہا: ہم سوئس عوام نے اپنے ملک میں میناروں کی تعمیر پر پابندی کے لئے ایک کثیر ثقافتی اور کھلے ذہن والے معاشرے کی روایات کی قربانی دی تا کہ ہم اسلام کے مقابل اپنا دفاع کر سکیں، جس کا سوئٹزر لینڈ میں کوئی وجود نہیں ہے۔

میناروں کی تعمیر پر پابندی سے سوئٹزر لینڈ میں مذہبی رواداری اور آزادی کے فروغ نیز مذہبی امتیاز پر پابندی کی پامالی ہوتی ہے جو کہ یورو پین کنونشن برائے حقوق انسانی (ای سی ایچ) اور بین الاقوامی عوامی و مذہبی حقوق کے ضابطوں کی خلاف ورزی ہے۔

جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل ۸ اور ایچ سی ایچ آر کے آرٹیکل ۸ کے تحت مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، اس میں اپنے مذہب کا تعین کرنے اور اپنے مذہب کا اظہار کرنے کی آزادی بھی شامل ہے جیسا کہ حقوق انسانی کی نگرانی کرنے والے ادارے نے موخر الذکر کے بارے میں کہا ہے کہ اپنے مذہب کا اظہار کرنے کے لئے عبادت، تبلیغ، شعائر کی پابندی اس مذہبی آزادی کے حق کا لازمی حصہ ہیں جس کی ضمانت بین الاقوامی حقوق انسانی معاہدوں کے ذریعہ دی گئی ہے۔

مسجد کے میناروں پر پابندی سے اپنے مذہب کا تعین کرنے اور اپنے مذہب کا اظہار کرنے، دونوں حقوق کی پامالی ہوتی ہے، جہاں تک میناروں کا تعلق ہے وہ یقیناً علامتی نوعیت کے ہوتے ہیں، میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کرنے کے حامیوں نے یہ دعوی کر کے کہ میناروں کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہے اسلام کے ایک اہم عقیدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

اسی طرح میناروں کو مسجد کے طرز تعمیر کا ایک لازمی حصہ بتایا گیا ہے جو عرش اور فرش کے درمیان رابطہ کا مظہر ہیں، یہ مینار فن تعمیر، سادگی، روحانیت اور دلکشی کا مظہر بھی ہیں، پس جبکہ مینار مسلمانوں کی مذہبی علامت کی نشانی ہیں تو ان کی تعمیر پر پابندی عائد کرنا لوگوں کو ان کے مذہب کے اظہار کی آزادی کے حق کی خلاف ورزی ہے، جہاں تک مذہبی امتیاز کا سوال ہے آئی

سی سی پی آر کے آرٹیکل ۲ اور ای سی ایچ آر کے آرٹیکل ۱۴ اور پروٹوکول نمبر ۱۲ کے تحت مذہبی امتیاز کے خلاف ضمانت دی گئی ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مینار کلیسا کی گھنٹیوں کے مینار کی طرح ہی ہوتے ہیں، بلکہ یہ مینار کلیسا کی گھنٹیوں کے میناروں کے انداز پر ہی بنائے گئے ہیں، لیکن سوئٹزرلینڈ کے قانون نے صرف میناروں پر ہی پابندی لگائی یعنی صرف میناروں کو ہی مذہبی شناخت کی علامت گردانا جبکہ چرچ کے میناروں اور دیگر مذہبی علامات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی، اس طرح انہوں نے بلا کسی جواز کے مسلمانوں کے خلاف مذہبی امتیاز کو روا رکھا اور اس طرح مذہبی حقوق کے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے حقوق انسانی نے اس پابندی کی مذمت کی ہے، اسی طرح اقوام متحدہ کی مذہبی اور عقیدہ کی آزادی کے خصوصی ادارے انسانی حقوق کے تحفظ کی نگرانی کرنے والے ادارے اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اس پابندی کی مذمت کی ہے، اس سے قبل اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی نے بھی اس جارحانہ انداز کے پروپیگنڈے پر تشویش کا اظہار کیا تھا جو سوئٹزرلینڈ میں ریفرنڈم کی مہم کے دوران جاری رہا جیسا کہ مسٹر ڈیوز ڈیاز جو جکس نے (جو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے خطہ یوروپ وسطی ایشیا پروگراموں کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں) کہا کہ یہ بہت بڑے صدمے کی بات ہے کہ سوئٹزرلینڈ جیسا ملک جس کی مذہبی رواداری کی طویل روایات ہیں اور مذہبی طور پر ستائے جانے والے افراد کے لئے جائے پناہ رہا ہے، وہاں مذہبی عدم رواداری کی ایسی بدنما پالیسی اختیار کی جائے، سوئٹزرلینڈ کی فیڈرل کونسل، سوئٹزرلینڈ پارلیمنٹ کے ممبران کی اکثریت اور ایس وی پی کو چھوڑ کر دیگر تمام پارٹیوں نے میناروں پر پابندی کی مخالفت کی جبکہ حکومت نے ریفرنڈم کے نتائج کو لازمی قرار دے کر منظور کر لیا۔

یوروپ میں جاری مذہبی عدم رواداری:

یوروپ میں ہر جگہ مسلمانوں کو مخالفانہ ماحول کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۲۰۰۹ء کے یورپی

یونین اقلیتوں کے خلاف امتیاز کے سروے کے مطابق یوروپ میں مقیم تین میں سے ایک مسلمان نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اسے سال گذشتہ امتیاز کا شکار ہونا پڑا، چار میں سے ایک کو پولیس نے روکا (کبھی کبھی ایک سے زیادہ بار روکا گیا)، اسی طرح گذشتہ سال دس میں سے ایک کو نسلی امتیاز کے تحت دھمکیوں، تحقیر اور حملوں کا نشانہ بننا پڑا، اب تو یوروپ میں مسجدوں اور قبرستانوں کی بے حرمتی بھی کوئی غیر متوقع بات نہیں رہی ہے، مثال کے طور پر حال ہی میں فرانس کے شہر کاسٹربس میں سواستکا کا نشان بنایا گیا، خنزیر کے پاؤں بنائے گئے اور ہٹلر کے نعرے نیز ''فرانس اہل فرانس کے لئے ہے'' اور سفید طاقت جیسے نعرے لکھے گئے، مذہبی امتیاز نسلی امتیاز کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے، جس میں مثال کے طور پر عربوں کو بھی مسلمانوں کے ساتھ نشانہ ستم بنایا جاتا ہے، ایسا یوروپ میں اکثر ہوتا ہے، یوروپ میں یہ نسلی امتیاز اور عدم رواداری محض مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ روما یہودی اور اقلیتوں کے دیگر افراد کو بھی اس کا شکار رہنا پڑتا ہے، یوروپ کے انسانی حقوق کونسل کے کمشنر نے حال ہی میں کہا تھا کہ یوروپ میں اسلاموفوبیا، یہودی دشمنی، خانہ بدوشوں سے نفرت، دیگر اقوام کے لوگوں سے مغائرت اور اسی قسم کے دیگر فوبیا پھیلے ہوئے ہیں جن کے تحت اقلیتی افراد کو نشانہ ستم بنایا جاتا ہے، ان کے خلاف نفرت انگیز تقریریں کی جاتی ہیں، نفرت کا پرچار کیا جاتا ہے، تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور منظم طور پر امتیاز برتا جاتا ہے، اس نسلی امتیاز کے ساتھ پولیس ان کی تلاشی بھی لیتی رہتی ہے، کمشنر مذکور نے اس سلسلے میں خاص طور پر روما قبائل کے خلاف تعصب کی نشان دہی کی ہے، ان لوگوں پر تشدد کیا جاتا ہے، امتیازی سلوک کا شکار بنایا جاتا ہے، مکانوں سے نکالا جاتا ہے، پولیس کی بربریت کا شکار ہوتے ہیں اور ان کے خلاف نفرت انگیز باتیں کہی جاتی ہیں، مذکورہ بالا سروے کے مطابق گزشتہ سال ۴۷ فیصد روما قبائل کو امتیاز کا نشانہ بنایا گیا، ۴۱ فیصد زیریں صحرائی افریقی اور ۳۳ فیصد شمالی افریقہ کے باشندے بھی اس نسلی امتیاز کا شکار ہوئے۔

جہاں تک ملک میں پھیلے حالات کا تعلق ہے انسانی حقوق کے یوروپین کمیشن کونسل کے کمشنر نے فن لینڈ میں روما قبائل کے لوگوں کے خلاف امتیاز کی خصوصاً نشان دہی کی ہے، انہیں مکانات حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے، ملازمت نہیں ملتی، تعلیم کے میدان میں بھی وہ امتیاز کا شکار ہیں، یہودیوں، آرمینیائی، یونانی آرتھوڈکس، اقلیت جو ترکی میں مقیم ہے، انہیں بنکوں تک رسائی، جائداد خریدنے کا حق، اراضی کا تحفہ قبول کرنے یا عمارت حاصل کرنے یا دیگر طریقہ سے حقوق حاصل کرنے کی آسانیاں میسر نہیں ہیں، بلغاریہ میں روما اور خانہ بدوش قبائل کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے، انہیں بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہوتیں، انہیں معیار زندگی، ملازمت اور مذہبی امور میں امتیاز اور محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے، اسی طرح توہین وتحقیر کے خلاف کام کرنے والی انجمن نے متعدد ایسی مثالیں پیش کی ہیں جہاں یہودیوں کے خلاف تحقیری واقعات بتائے گئے ہیں جو یوروپ میں وقوع پذیر ہوئے، ان میں یہودیوں پر حملے، علمی ومذہبی اثاثوں کی تباہی، موت کی دھمکیاں، بموں سے حملے، یہودی عبادت گاہوں (صومعہ) کی بے حرمتی یا آگ لگا دینا، ہولوکاسٹ میموریل اور دیگر یہودی عمارتوں پر حملے کرنا۔

ظلم اور انقلابی تبدیلیوں کا چکر:

جو لوگ میناروں پر پابندی جیسے اقدامات کی حمایت کرتے ہیں وہ اس کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایسا کرنا انقلابی اسلام کے مفروضہ طوفان کو روکنے اور یورپی معاشرہ میں اس کی دراندازی پر قدغن لگانے کے لئے ضروری ہے، لیکن حقیقت میں اس سے مذہبی اقلیتوں کے خلاف ظلم وستم، ان میں محرومی کے احساس کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ ان عناصر کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو انتہا پسند ہیں۔

جہاں تک جبر اور جور کا سوال ہے تو ریفرنڈم کی مہم کے دوران سوئٹزرلینڈ میں مسلمانوں اور ان کی عمارات پر حملے تیز ہوئے، جیسا کہ زیورج کی مسلم تنظیم کے صدر نامیر حاجی پولو نے

المناک لہجہ میں کہا: اسلاموفوبیا کا جنون بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، ریفرنڈم کی مہم کے دوران مسجدوں پر حملے کیے گئے جبکہ سوئٹزرلینڈ میں اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔

علاوہ ازیں میناروں پر پابندی کی مہم کی کامیابی سے مسلمانوں کے خلاف ستم رانی کی تحریک کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، انسانی حقوق کی نگرانی کرنے والے ادارہ کا کہنا ہے کہ اس ریفرنڈم سے یوروپ میں انتہا پسند سیاستدانوں کی مہم کو نئی تقویت ملی ہے، ڈینش پیوپلز پارٹی، بلجیم ولام بلانگ، اٹالین نیشنل لیگ اور ڈچ پارٹی فارفریڈم نے ریفرنڈم کے ووٹوں کی حمایت کی اور اپنے ملکوں میں بھی ایسی تحریکیں شروع کرنے کا دعوی کیا، فرانس میں بھی دائیں بازو کے نیشنل فرنٹ نے نہ صرف سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی تعمیر پر پابندی کی تائید کی بلکہ فرانس میں بھی ایسی ہی پابندی کا مطالبہ کیا، فرانس کے صدر نکولاس سرکوزی نے بھی پابندی کی حمایت کی، اسی طرح پوشیدہ طور پر ان لوگوں کی تائید کی جنہوں نے پابندی کے حق میں ووٹ دیا، سرکوزی کی کولیشن پارٹی کے سربراہ نے سوال کیا کہ فرانس کے مسلمانوں کو اپنی مسجدوں پر مینار بنانے کی کیا ضرورت ہے، یہ بات حکومت کی طرف سے شروع کی گئی، اس بحث کے دوران کہی گئی جو قومی شناخت کے عنوان پر ہوئی جس کے سبب ملک میں مسلم دشمنی اور مسلمانوں پر حملے تیز ہو گئے ہیں۔

اس قسم کا ریفرنڈم مذہبی اقلیتوں کو ملانے اور معاشرہ سے وابستہ ہونے کے بجائے ان میں مغائرت، محرومی اور دوری کے احساس کو شدت عطا کرتا ہے جیسا کہ سوئٹزرلینڈ میں اسلامی تنظیموں کی رابطہ کمیٹی کے صدر فرہاد افشار نے کہا: ہمارے لئے میناروں کی تعمیر پر پابندی اس درجہ تکلیف دہ نہیں ہے جس قدر وہ علامتیں ہیں جو اس ریفرنڈم کے ووٹ کے ذریعہ سامنے آئیں، مسلمانوں کو بطور ایک مذہبی فرقہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس قسم کے بڑھتے ہوئے جبر وجور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں میں انتہا پسندوں کی حمایت بڑھے گی، ان میں زیادہ کٹر پن آئے گا اور وہ غالب معاشرہ کے جبر کے خلاف مزاحمت پر مجبور

ہوں گے، مذہبی آزادی کے بیکفر فنڈ کے ایک اٹارنی نے سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی پابندی کے بارے میں کہا: جب کسی مذہب اور اس کے پیروکاروں کو پوری آزادی میسر نہیں ہوتی تو وہ بکھر نہیں جاتے بلکہ دوسرے طریقوں سے اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے پرامن احتجاج کی راہیں بھی کھلتی ہیں، یہ ایک مثبت رویہ ہوتا ہے جب کہ منفی رویہ کے طور پر مذہبی دہشت گردی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی مذہبی عدم رواداری اور تعصب کے طویل ماضی کی روایات کا ایک جدید مظہر ہے؛ حالانکہ یورپ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے تاریک ماضی کے دور سے باہر آچکا ہے، کثیر ثقافتی رواداری اور بقاء باہم کے خودساختہ دعووں کے ہوتے یورپ کو خود سے پوچھنا چاہئے کہ کیا وہ آج بھی ان اقدار کا پابند ہے۔

☆☆☆

اسلام فوبیا: رجحانات، اثرات اور تدارک

عبدالرشید اگوان☆

دور حاضر میں اسلام فوبیا (Islam Phobia) غیر مسلموں کو ہی نہیں؛ بلکہ خود مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کے لئے ایک مؤثر طریقہ کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے، اس طریقے کا استعمال کر کے صہیونی شرپسند، کرسچن بنیاد پرست، مستشرقین اور ہندو شدت پسندی کے علمبردار اسلام کی تبلیغ واشاعت کا سدباب کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ سورہ صف کی آیت میں بیان کیا گیا ہے:

''اور یہ اللہ کے نور کو پھونک سے بجھانا چاہتا ہے جبکہ اس کا ارادہ اس نور کی تکمیل ہے، چاہے اہل کفر کو یہ کتنی ہی ناگوار ہو'' (صف:۸)۔

ایک دور وہ تھا جبکہ اسلام مخالف قوتیں اسلام کے بارے میں مختلف قسم کے علمی سوالات اٹھا کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھیں، جن میں تعدد ازدواج، تین طلاق، پردہ، زنا، چوری پر سنگین سزائیں، گوشت خوری، مسلمانوں کی علیحدگی پسندی، وغیرہ پر اعتراضات بار بار اٹھائے جاتے رہے ہیں، مگر چونکہ ہر بار اسلام پر ان علمی حملوں کا موثر علمی جواب دیا جاتا رہا ہے؛ اس لئے عصر حاضر میں کچھ بدلے ہوئے تیر باطل کی ترکش سے جاری ہوئے ہیں جس کا مجموعی نام ''اسلام فوبیا'' ہے یعنی لوگوں کو اسلام سے دہشت دلانا تاکہ وہ اسے جاننے اور سمجھنے کے بجائے، نفرت اور کراہیت کے ساتھ دیکھنے کے لئے مجبور ہو جائیں، دہشت گردی اسی قبیل کا ایک ہتھیار

☆صدر یونیورسل نالج ٹرسٹ، نئی دہلی

ہے جو اس لیے وضع کیا گیا ہے کہ لوگ اسلام اور امت مسلمہ سے دہشت زدہ ہو کر اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

رجحانات:

اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جاتے ہیں:

۱-قرآن کریم کے جہاد بالسیف سے متعلق آیات کے سیاق وسباق کے علی الرغم ایسی تعبیر کو عام کرنا جس سے یہ تاثر عام ہو جائے کہ اسلام خون خرابے کا مذہب ہے اور مسلمان ایک جنگ پسند قوم ہے، ہمارے ملک میں ''چوبیس آیات'' کا فتنہ پچھلے دو تین دہائیوں سے جاری ہے جن میں جنگ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے یہ تأثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ قرآنی حکم ہے کہ ''کافروں کو جہاں دیکھو مارو''۔

۲- مدارس اور علماء کے بارے میں یہ الزام تراشی کی جاتی ہے کہ انہیں کے ذریعہ مسلمانوں کو بنیاد پرست، کٹر اور دہشت گرد بنایا جاتا ہے۔

۳- پیغمبر اسلام کی سیرت سے غزوات کو لے کر آپ کی ظلم کے خلاف جدوجہد کی تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ آپ کی تصویر رحمۃ للعالمین کے بجائے ایک جنگ پسند قائد کے روپ میں نظر آنے لگتی ہے، ڈنمارک کی کارٹون سازی اسی قسم کی تدبیر ہے۔

۴- کچھ نام نہاد مسلمانوں کی جوکس کی کتابوں کو بڑے پیمانے پر عام کر کے یہ تأثر پیدا کیا جاتا ہے کہ خود مسلمان امت کے غلط خیالات پر تنقید کر رہے ہیں؛ اس لیے اسلام مخالف قوتوں کی باتیں قابل غور ہیں۔

۵- مسلم ملکوں میں بیرونی ممالک کی غاصبانہ حرکات اور وہاں کے وسائل کے استحصال کے خلاف اٹھنے والی آواز اور جدوجہد کو دہشت گردی کا نام دے کر ایک طرف اس قسم کی جدوجہد کو کمزور کیا جاتا ہے تو دوسری جانب اس سے اسلام کی دہشت پسندی کو ثابت کیا جاتا ہے، کئی

ملکوں میں متعدد آلۂ کار عناصر کے ذریعے دہشت گردی کے کچھ عملی مظاہرے کرا کر اس میں جان پھونکی جاتی ہے، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ اسی قسم کی ایک سازش تھی (اکھنڈ بھارت)۔

۶- علامتی (Symbolic) اقدامات مثلاً: فرانس میں پردے پر پابندی یا اسپین میں مسجد کے مینار پر روک لگا کر اسلام مخالف عوامی عصبیت کو پیدا کرنا۔

اثرات:

اسلام فوبیا کی تکنیک کے ذریعے پچھلے کچھ عرصے میں جو اثرات عالمی میڈیا، انتہا پسند تنظیموں اور خود پسند سیاسی حلقوں نے اٹھائے ہیں اس کے مظاہر و نتائج سے ہر کوئی واقف ہے، یہ اثرات حسب ذیل ہیں:

۱- عمومی طور پر مسلمانوں کے تئیں نفرت اور عصبیت کا ماحول بن گیا ہے، خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

۲- مسلم قیادت فریضۂ جہاد کی معذرت خواہانہ تعبیر پر مجبور ہے۔

۳- بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا غیر مسلمانوں سے تعامل (Interaction) سطحی ہوتا جارہا ہے اور غیر مسلم ان سے معاملہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، مسلم علاقوں میں جانے سے غیر مسلموں کی اکثریت ڈرتی ہے، مسجدوں سے حی علی الصلاۃ پکارا جاتا ہے تو غیر مسلم پڑوسی سمجھتے ہیں کہ مسجد میں نیا اسلحہ آ گیا ہے، جب مسلمان مقرر مسلم مسائل کی بات کرتے ہیں تو غیر مسلم اسے ''مسلم میزائل'' سمجھتے ہیں۔

۴- مسلم دانشوروں کی ہر محفل میں علماء اور دینی مدارس زیر بحث رہتے ہیں، گویا کہ امت کے سارے مسائل سمٹ کر اسی نکتے پر مرکوز ہو گئے ہیں، حکومت چاہتی ہے کہ مدارس مذہبی تعلیم چھوڑ کر جدید تعلیم کے ادارے بن جائیں اور علماء اور ائمہ مساجد اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے بجائے اپنی معاشی فلاح و بہبود کی راہ پر دوڑ پڑیں۔

۵- ہزاروں مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے نام پر جیلوں میں ڈال دیا گیا؛ تاکہ دہشت گردی کی کہانی میں صداقت پیدا ہو، اور اس کے نتیجے میں مسلم نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور ایک اچھے کیریر کو یقینی بنانے پر دشواریاں آرہی ہیں، کچھ عرصے پہلے پرائیویٹائزیشن (Privatisation) کی وجہ سے جو فائدے پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کو حاصل ہورہے تھے ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہورہی ہیں۔

تدارک:

اسلام فوبیا ایک زہر کی طرح سماج میں گھلتا جارہا ہے اور نہ صرف دعوت اسلامی کا کام دشوار ہوگیا ہے؛ بلکہ خود امت مسلمہ میں احساس کمتری، احساس بے بسی، اور انتقامی جذبہ کا شعور عام ہورہا ہے، لہٰذا اسلام فوبیا کے تدارک کے لیے منصوبہ بند طریقہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ چند عملی مشورے درج ذیل ہیں:

۱- واقعات پر مشتعل ہونے یا غیر سنجیدہ ردعمل کے بجائے ان کا گہرے شعور سے تجزیہ کیا جائے، قانون کی بالادستی کو فروغ دیتے ہوئے ایسے واقعات کے خلاف مناسب قانونی چارہ جوئی کی جائے۔

۲- بڑے پیمانے پر غیر مسلم تنظیموں اور افراد کے ساتھ مل کر اداروں کا قیام اور منافرت کے ازالہ کے لیے تعاون کیا جائے، اس کے لیے مشترکہ فورم بنانے کو رواج دیا جائے۔

۳- مسلم فلاحی اداروں سے غیر مسلم ضرورت مندوں کی امداد کو فروغ دیا جائے۔

۴- میڈیا کی کارستانی کو روکنے کے لیے مسلم نوجوانوں کو میڈیا کیریر پر ابھارا جائے، انہیں اس کے لیے سہولتیں دی جائیں اور سیکولر غیر مسلم میڈیا اشخاص سے گہرا ربط ضبط رکھا جائے۔

۵- عالمی سازشوں کو کانفرنسوں کے ذریعے اور اخبار، کتابیں اور مضامین کے ذریعے بے نقاب کیا جائے، ان کو مسلم مخالف دکھانے کے بجائے انسانیت مخالف ظاہر کیا جائے۔

۶- اسلام کی ان تعلیمات کو پیش کیا جائے یا عام کیا جائے جو آج کے مسائل کے لیے مفید اور موزوں ہیں، مثلاً خاندان بنی آدم کا تصور، تصورِ عدل، تصورِ رحمت وغیرہ پر اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جائے، اسی طرح سود، جمع خوری، جوا، وعدہ، کاروبار، جنسیت، (Sexuality)، نسل پرستی، حرص مال، وغیرہ کے خلاف تحریکات چلائی جائیں تاکہ اسلام فوبیا کے اصل محرکات پر ضرب لگے اور اسلام اور امت مسلمہ کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

۷- بڑے پیمانے پر غیر مسلم دانشوروں، سیاستدانوں، میڈیا کے لوگوں اور مذہبی شخصیتوں سے تال میل (Interaction) کرکے اور انھیں کارآمد طریقوں سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں لگانا؛ تاکہ وہ اسلام فوبیا کی سازش کو ناکام کرنے میں ہمارے ساتھ کھڑے ہوں۔

اسلاموفوبیا اور مسلم اقلیت کے انسانی حقوق

مولانا عمید الزماں کیرانویؒ☆

یورپ میں اس وقت تقریباً 30 ملین مسلمان مقیم ہیں، امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد سات سے آٹھ ملین کے درمیان ہے، اسی طرح دنیا کے دوسرے خطوں میں مسلم اقلیتیں موجود ہیں، خود یورپ اور امریکہ کی بھی اہم سیاسی شخصیات کے اعتراف کے مطابق یورپ میں آباد مسلمان وہاں کی معاشی، علمی اور تمدنی ترقیات میں اہم رول ادا کررہے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہاں مسلم اقلیت کے خلاف امتیاز وتعصب نہ صرف پایا جاتا رہا ہے، بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہورہا ہے، خاص طور پر 11/ 9 کے بعد اس رجحان نے ایک خوف ناک شکل اختیار کرلی ہے، جسے اسلام فوبیا کا نام دیا گیا ہے، یورپ اور امریکہ میں اِس سرے سے اُس سرے تک سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اسلام فوبیا کے شکار افراد کی بڑی تعداد نظر آتی ہے اور اس میں بلاشبہ میڈیا اہم کردار ادا کررہا ہے۔

اس رجحان کی شدت اختیار کرنے کے بعد یورپ وامریکہ سمیت ان تمام ممالک میں جہاں مسلم اقلیت موجود ہے، اس کے انسانی حقوق کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں، بڑے پیمانے پر ان کی پامالی کے واقعات شب وروز پیش آرہے ہیں۔ 9/11 کے پس منظر میں مسلم اقلیتوں کے حقوق انسانی کی پامالی کے سلسلہ میں اسلاموفوبیا نے ایک نئے ڈبلیو۔ ایم۔ ڈی (W.M.D. بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار) کی شکل اختیار کرلی ہے۔

☆ سابق کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

اسلاموفوبیا یا اسلام کا خوف:

خوف وسواسی (لامعقول له) من شيئ ما (کسی چیز سے مبنی بر وسوسہ خوف جس میں کوئی معقولیت نہ ہو) (المغنی الکبیر)۔

(اسلام کی ہیئت یا نفرت، مسلمانوں کو معاشی، سماجی اور قوم کی عوامی زندگی سے الگ تھلگ کر کے امتیاز برتنے کا وہ سلوک جس میں یہ تصور بھی شامل ہے کہ اسلام میں کوئی ایسی قدر نہیں پائی جاتی، جو اس کے اور دیگر ثقافتوں کے درمیان مشترک ہو، اسلام مغرب سے کم تر ہے اور یہ کوئی مذہب ہونے کے بجائے ایک پرتشدد سیاسی نظریہ ہے)۔

2004ء میں انجمن اقوام متحدہ کے سابق جنرل سکریٹری کوفی عنان نے اسلاموفوبیا کو ''دور دور تک پھیلا ہوا شدید تعصب'' قرار دیا تھا۔

اسلاموفوبیا کی شدت نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جن رجحانات کو جنم دیا ہے، وہ عوام تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ سیاسی قیادت بھی اس وبا سے متاثر نظر آتی ہے، کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی وزیر پیٹر ہائن نے الزام لگایا تھا کہ ''مسلم فرقہ تخلیہ پسند (Isolationist) ہے۔'' اٹلی کے وزیر اعظم سلویو برلس کونی (Silvio Beriusconi) بھی برسر عام کہہ چکے ہیں کہ ''مغربی تہذیب اسلام سے برتر ہے۔'' دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے منتخب نمائندہ کیتھ ایلیسن (Keith Ellison) کا کیس ہے، انہوں نے جب دسمبر 2006ء میں قرآن پر حلف لینے کی خواہش ظاہر کی تو ایک دوسرے نمائندہ ورجل (Virgil) نے اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی روایت واقدار کے لیے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے کہا: ''مجھے اندیشہ ہے کہ اگلی صدی میں مسلمان لوگ اس ملک میں بہت زیادہ ہو جائیں گے۔''

واشنگٹن کی تنظیم کیر (Cair) کے قانونی ڈائرکٹر ارسلان افتخار کہتے ہیں: ''مسلم مخالف جذبات کثرت سے پائے جاتے ہیں، خاص طور سے یہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں۔''

امریکی ٹی وی چینل اے بی سی نیوز کے ایک سروے کے مطابق ہر دس میں چھ یعنی 60 فیصد امریکی یہ گمان رکھتے ہیں کہ اسلام تشدد اور انتہا پسندی کی جانب مائل ہے، تقریباً نصف امریکہ اس مذہب کو پسند نہیں کرتا، وہاں کے 27 فیصد لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں اور عربوں دونوں کے خلاف یکساں متعصّبانہ احساسات رکھتے ہیں، مشہور تنظیم گیلپ پول (Gallop Polls) کے مطابق امریکی متعصبین کی تعداد 40 فیصد ہے اور مزید 39 فیصد امریکی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو علیحدہ خصوصی شناخت نامہ اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہئے، 2007ء میں طبع شدہ تحقیقی مجلّہ جرنل آف سوشیولوجی (Journal of Sociology) کے ایک مقالہ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اسلاموفوبیا مسلم مخالف نسل پرستی ہے جو ایشیا مخالف اور عرب مخالف نسل پرستی کا تسلسل ہے، ایک ماہر اسلاموفوبیا نے لکھا ہے کہ امریکی سیاست دانوں اور دیگر حضرات کے ذریعے عربوں اور مسلمانوں کو شیطان بنا کر پیش کرنا (Demonisation) ایک قسم کی نسل پرستی ہے، جس کا استعمال ایک غیر منصفانہ جنگ (جنگ عراق وافغانستان) کی حمایت کے لیے کیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسلاموفوبیا کے ماہرین کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ اس اصطلاح کا زیادہ رواج 9/11 سانحہ کے بعد ہی ہوا ہے، البتہ یہ انکشاف ضرور حیران کن ہے کہ بائیں بازو کے کچھ لوگ بھی ''بش انتظامیہ کی اسلاموفوب منطق'' کا استعمال کرتے رہے ہیں، اس مجموعی ماحول کے سماجی اثرات کا اندازہ پیو رپورٹ (Pew Report) مجریہ 2009ء کے اس انکشاف سے لگایا جاسکتا ہے کہ بالغ عمر کے ہر 10/ امریکیوں میں تقریباً 6/ امریکی مسلمانوں کو دوسری اقلیتوں کے افراد کے مقابلہ میں زیادہ لائق تضحیک وتعصب سمجھتے ہیں۔

شناخت اور تشدد:

جنوری 2006ء میں ڈچ پارلیمنٹ نے حجاب میں رہنے کے خلاف امتناعی قانون منظور کیا تھا، جس پر حکومت حامی ''وامس بے لانگ'' (Vaams Belang) حزب کے لیڈر فلپ

دے ونٹر (Filip Dewinter) نے اعتراف کیا تھا: ''میری پارٹی اسلاموفوب ہے، ہم اسلام سے خائف ہیں، یورپ کا اسلامائزیشن خائف کن چیز ہے۔''

یوروپی یونین کے واچ ڈاگ ای یو ایم سی کی مئی 2002ء کی رپورٹ کے مطابق 9/11 کے بعد مسلمانوں کے خلاف پرتشدد وانتقامی حملے کئے گئے، اسلام اور مسلمانوں کے شعائر اور شناخت پر اس طرح کے حملے بار بار ہوئے، جن میں دشنام طرازی، مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی الزام تراشی اور ان کے بچوں کو اسامہ کہنا اور ان کی خواتین کا حجاب اتر وادینا شامل ہے۔ ستمبر 2007ء میں نیویارک میں مقیم ایران نژاد امریکی مسلم خاتون زہرہ عاصمی پر دہشت گردی کا الزام لگا کر مقامی باشندوں نے اسے بے دردی سے مارا پیٹا، اس کی دوکان پر ڈاکہ ڈالا اور تقریباً دو ہزار ڈالر کی رقم لوٹ لی، اس واقعہ کے بعد تقریباً دو ہفتوں تک زہرہ کو دھمکی آمیز فون کئے جاتے رہے، جن میں اس سے مطالبہ کیا جاتا کہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ، کناڈا میں مقیم خاتون حلیمہ معتبر پر بھی اس لیے حملہ کیا گیا کہ وہ حجاب میں تھیں، فرانس اور برطانیہ میں اسلامی حجاب کو بار بار موضوع بحث بنایا گیا ہے، جسے اسلاموفوبیا کا ہی شاخسانہ بتایا جاتا ہے، 16 راگست 2006ء کو ملاگا سے مانچسٹر جانے والے برطانوی مسافروں نے ہوائی جہاز کمپنی سے درخواست کی کہ جہاز پر سوار ایشیائی مسافروں کو اتار دیا جائے کیونکہ وہ اپنی وضع قطع سے مشتبہ لگ رہے ہیں، حالانکہ جب تلاشی لی گئی تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جس کی بنیاد پر انہیں دہشت گردی سے جوڑا جاسکے، ابھی 2009ء میں ایف بی آئی نے ایئر ٹرانس ایئر ویز کی ایک فلائٹ سے 5 رائمہ مساجد کو جبراً اتار دیا، کچھ عرصہ قبل جب مانچسٹر سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ جانے والی ایک فلائٹ سے ایک برطانوی مسلم کو اتارا گیا تو اس نے اس کی وجہ بتائی: ''میرا نام عربوں جیسا ہے، میں مسلمان ہوں، برطانیہ سے آرہا ہوں اور ہوائی جہاز اڑانا جانتا ہوں۔'' امریکہ میں اسلام اور مسلم مخالف تعصب کا یہ حال ہے کہ سیدہ متین بنام ریاست کیرولینا مقدمہ میں سرکاری وکیل نے عدالت میں

یہ اعتراض داخل کیا کہ شہادت کے حلف لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کرسچین بائبل پر حلف لیا جائے، اس طرح کے واقعات پر اسلامی حقوق انسانی کمیشن نے اشارہ دیا ہے کہ یہ اسلاموفوبیا ''وار آن ٹیرر'' (War on Terror) کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔

اسلاموفوبیا کا جنون داڑھی اور حجاب تک محدود نہیں ہے، مساجد، مقابر اور دیگر اسلامی ادارے بھی اس کی زد میں ہیں، ابھی حال میں 13ر دسمبر 2009ء جنوبی فرانس میں واقع کاسترے (Castres) کی مسجد کی سخت بے حرمتی کی گئی، دیواروں پر جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں مسلم مخالف نعرے لکھے گئے اور دروازہ پر خنزیر کی ٹانگیں لٹکا دی گئیں، پیرس میں بھی ایک مسجد کو نقصان پہنچایا گیا، حالیہ ایام میں مساجد کی بے جا اور ناوقت تلاشیوں کے واقعات بھی کافی تعداد اور متعدد ممالک مثلاً امریکہ، ہندوستان، چین اور برطانیہ میں دیکھنے میں آئے ہیں کئی یورپی ممالک میں مسلمانوں کی قبروں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے، فرانس کے صرف ایک شہر آرا (Arras) میں 148ر مسلم قبروں کی بے حرمتی کی گئی، جن میں سے کچھ قبروں کے کتبے پر خنزیر کا سر لٹکا کر اسلام و مسلم مخالف نعرے لکھے گئے، لندن کے چارلٹن (Charlton) قبرستان میں مسلمانوں کی قبروں کو نقصان پہنچایا گیا، اسپین کے شہر سیوطا (Ceuta) کے ایک تکیہ میں آتش زنی کی گئی۔ 6ر جولائی 2009ء کو اسکاٹ لینڈ میں واقع اسلامک ریلیف کی گلاسگو برانچ کو نذر آتش کیا گیا، اسلاموفوبیا کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر اردن کی ہاشمی مملکت نے 1999ء میں ہی بین الاقوامی برادری سے اپیل کی تھی کہ اس خطرہ کے فروغ کو روکنے کی تدبیر کی جائے، لیکن یہ اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی، البتہ تنظیم اسلامی کانفرنس نے اس غرض سے ایک مانیٹرنگ کمیٹی 2006ء میں قائم کی تھی۔

استحصال اور سیاست:

اسلاموفوبیا کی ایک وجہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد مثلاً برطانیہ

میں پاکستانیوں اور فرانس میں الجزائریوں کی موجودہ تعداد کو بتایا جاتا ہے، لیکن یہ ادھوری توجیہ ہے جو اس حقیقت کو چھپاتی ہے کہ فرانس، برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک میں موجود اکثر مسلمانوں کو وابستہ سیاسی اغراض کی بنا پر سیاسی پناہ گزینوں کی حیثیت سے بلایا گیا تھا یا پھر سستے مزدوروں کی فراہمی کی خاطر، مثلاً جرمنی اور اٹلی میں، سیاسی اور معاشی اغراض کی تکمیل کے بعد یہی مسلمان ان ممالک کو بوجھ معلوم ہوتے ہیں، خاص طور سے معاشی کساد بازاری کے ایام میں، مثال کے طور پر سابق برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کو پورا انگلینڈ ایشیائیوں (کے انبوہ) میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا، معاشی استحصال کی صورت حال بعض ایشیائی ممالک میں بھی نظر آتی ہے، مثلاً انڈونیشیا میں جہاں ہان نسل کے چینی چھوٹی تجارت اور خوردہ فروشی کے اجارہ دار ہیں، جب انڈونیشیائی مسلم نوجوان ان میدانوں کا رخ کرتے ہیں تو فسادات برپا کردئے جاتے ہیں اور الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلمان تشدد پسند ہوتے ہیں، جرمنی میں ترک مزدوروں کے خلاف کئی بار خوں ریز فسادات ہوچکے ہیں، ترکی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسلاموفوبیا کی وجہ سے ہی اس مسلم ملک کو یوروپی برادری میں شامل نہیں کیا جارہا ہے، جیسا کہ ہالینڈ کے سابق وزیر اعظم اور دیگر یوروپی لیڈروں کے بیانات سے مترشح ہے، دراصل (براؤن اور ملر کے مطابق) اسلاموفوبیا کا خمیر قومیت (مثلاً عربیت)، مذہب (یعنی اسلام) اور سیاست (فنڈامنٹلزم، دہشت گردی وغیرہ کی آڑ میں مغرب کی سیاسی بالادستی) کے ملغوبہ سے اٹھایا گیا ہے، چنانچہ اسلام اور مسلمانوں کو حریف مقابل کے بطور پیش کیا جاتا ہے تا کہ انہیں الگ تھلگ کیا جاسکے اور ان کے خلاف امتیاز و تعصب بلکہ کسی حد تک جبر و ظلم کو بھی روا ٹھہرایا جاسکے، اس رویہ کی جھلک مغرب کے علاوہ بعض ایشیائی ممالک میں بھی دیکھی جاسکتی ہے، جس کی ایک مثال چین کے ایغوری مسلمانوں کی ہے، جنہیں ہان نسل کے امتیاز و تعصب کا سامنا ہے۔

مغربی چین کے سنی مسلمانوں کی تحریک اسلامی مشرقی ترکستان کی شکایت ہے کہ چینی

حکومت اسلامی عبادات میں رکاوٹ ڈالتی ہے، حکومت نے حج پر ہی کنٹرول نہیں کر رکھا ہے، بلکہ نماز، روزہ اور تلاوت قرآن پر بھی سنسر لگا رکھا ہے، چینی حکومت نے تحریک اسلامی کو علیحدگی پسندانہ قرار دے کر ممنوعہ تنظیموں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے، ان باتوں کی تصدیق ہیومن رائٹس واچ کی حقوق انسانی کارکن رابعہ قدیر جو خود ایک ایغوری خاتون ہیں، ان کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ چینی حکومت علیحدگی پسندی اور دہشت گردی کی مخالفت کے نام پر چینی مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ تحریک چلاتی رہتی ہے، ایغوری مسلمانوں کے خلاف پچھلا فساد جولائی 2009ء میں صوبہ عرومقی میں ہوا تھا، جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ چینی پولس نے اس فساد میں مقامی غیر مسلم باشندوں کو اکسایا تھا اور مدد دی تھی۔

ہندوستان میں اسلاموفوبیا کی شکل قدرے مختلف ہے، یہاں مسلمانوں کی تشہیر ایک ووٹ بینک کی حیثیت سے کی گئی ہے، جس سے سیاسی استحصال کا محرک بہ خوبی ظاہر ہے، مسلمانوں کے سیاسی استحصال کا رجحان دوسرے ممالک میں بھی دیکھا گیا ہے، روزنامہ انڈپینڈنٹ کی ایک خبر کے مطابق برطانوی نیشنل پارٹی نے 2006ء کے مقامی انتخاب میں سیاسی فائدہ اٹھانے کی غرض سے اسلاموفوبیا کا ہوا کھڑا کیا تھا، ہندوستان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو برسر اقتدار لانے کے لئے بھی یہی نسخہ آزمایا گیا تھا، اس کے علاوہ اسلاموفوبیا کا استعمال مسلمانوں کو سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ بنانے کے لئے بھی کیا گیا ہے، خود سرکاری قائم کردہ سچر کمیٹی نے یہ رپورٹ دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف امتیاز و تعصب برتا جاتا ہے، لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی کے نائب صدر مختار عباس نقوی اس پوری رپورٹ کو سیاست آمیز پروپیگنڈہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ مغربی بنگال جو بالعموم اشتراکیوں کے زیر اقتدار رہا ہے، جن سے اصولی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مذہب کی بنیاد پر تعصب برتیں گے، لیکن اس کے باوجود وہاں کے مسلمانوں کو صرف 3 فیصد سرکاری ملازمتیں حاصل ہیں اور ان کے درمیان ناخواندگی کی شرح

تشویشناک حد تک بڑھی ہوئی ہے، حکومت مغربی بنگال اس طرف توجہ کرنے کے بجائے اپنی پسند کے ایسے مدرسے کھولنے میں مصروف ہے، جن کے اساتذہ کی بڑی تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے، مسلم اقلیت کی فلاح کے لیے مختص فنڈز کو غیر مسلم حضرات پر خرچ کرنے کی یہ واحد مثال نہیں ہے، اس سب کے باوجود مرکزی حکومت جب کبھی مسلم فلاح کی تجویز رکھتی ہے تو منصوبہ بندی اور غور وفکر کے مرحلہ میں ہی بھارتیہ جنتا پارٹی کی صفوں سے ''مسلمانوں کی منہ بھرائی'' کا شور اٹھنا شروع ہو جاتا ہے، اسلاموفوبیا کے ماہرین نے اس کی وضاحت ایک تکویری نموذج (Circular Model) سے کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلاموفوبیا کی وجہ سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف عناد میں اضافہ ہوتا ہے اور جب یہ عناد ایک حد سے گزر جاتا ہے تو حکومت کچھ تدابیر اختیار کرتی ہے، کچھ نئے قوانین بناتی ہے اور کچھ نئی ہدایات جاری کرتی ہے، پھر جب اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی پریشانی کچھ کم ہوتی نظر آتی ہے تو اسلاموفوبیا کے شکار لوگ اپنی زیادتیوں میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے، لیکن یہ ایک نامکمل تصویر ہے؛ کیوں کہ اس میں میڈیا کی سرگرمیوں سے صرف نظر کیا گیا ہے، حالانکہ حالیہ ایام میں میڈیا کا رویہ خاصا منفی اور اسلاموفوبیا کا شکار رہا ہے۔

میڈیا اور ضمیر:

انسائیکلوپیڈیا برائے نسلی ونژادی مطالعات کے مطابق 1994ء اور 2004ء کے دوران برطانوی پریس میں جو مضامین شائع ہوئے تھے، ان میں مسلم نقطہ نظر کی نمائندگی بہت ہی کم تھی، جب کہ ان مضامین میں مسلمانوں کی منفی تصویر پیش کی گئی تھی، جس میں یہ الزام بھی شامل تھا کہ اسلام اور مسلمانوں سے مغرب کے تحفظ اور اس کی اقدار کو خطرہ لاحق ہے، مسلم نقطہ نظر کو نظر انداز کرنے بلکہ دبا دینے یا غلط رخ دینے کا مظاہرہ عالمی میڈیا کے شانہ بشانہ ہندوستان کے

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی آئے دن ہوتا رہتا ہے، میڈیا کے اندھے بہرے ذہنوں نے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بندھی ٹکی (Steriotype) تصویر قائم کر رکھی ہے، اسلام وحشیانہ ہے، غیر منطقی ہے، آدی باسی ہے، جنس گزیدہ ہے، پرتشدد ہے، جامد ہے، ترقی کا دشمن ہے.......... مسلمان اپنے مذہب کے اندھے معتقد (Fanatics) ہیں، ''اسلامی دہشت گرد'' ہیں، ان کے پاس ''اسلامی ایٹم بم'' ہے وغیرہ وغیرہ۔ میڈیا کے اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اس پروپیگنڈے پر ایمان لے آیا ہے، وہ مسلمانوں کے بڑے سے بڑے عالم کو تو خاطر میں نہیں لاتا لیکن مسلمان نام رکھنے والا کوئی معمولی تعلیم یافتہ شخص بھی اسلام کے خلاف بکواس کردے تو وہ یاوہ گوئی میڈیا کے لئے آسمانی صحیفہ بن جاتی ہے، میڈیا نے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگوں کو جو سر پر بٹھا رکھا ہے، اس کی وجہ اسلاموفوبیا کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس فوبیا کی جھلک ہالینڈ کے روزنامہ زیلان پوسٹن (Jyllan Poston) کے بدنام زمانہ اہانتی کارٹونوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے، مسلمانوں نے ان کارٹونوں کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج کیا اور ہر قابل ذکر اتھارٹی کے سامنے اپنا کیس پیش کیا، لیکن ہر جگہ آزادئ اظہار کے حق کا اندھا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا، کسی نے بھی یہ خیال نہیں کیا کہ آزادئ مذہب اور تکریم انسانی کا حق بھی کوئی چیز ہوتی ہے، بالآخر مارچ 2006ء کی ایک رپورٹ میں اقوام متحدہ کی کمیشن برائے حقوق انسانی نے ان کارٹونوں کی اشاعت کو ہی اس قضیہ کی جڑ قرار دیا، پچھلے سال پاکستان کی تحریک پر کمیشن کی ایک کمیٹی نے مذہبی شخصیات کے احترام کو لازمی بنانے کے لیے ایک قرارداد منظور کی تھی، جس کی مغربی ممالک نے کھل کر مخالفت کی، دراصل مغربی اور عالمی میڈیا پر اسلاموفوبیا کا ہی غلبہ ہے، مغرب کے بہت سے نامی گرامی صحافیوں اور تھنک ٹینکس کو اسلاموفوب سمجھا جاتا ہے۔

اسلاموفوبیا میں مبتلا ہونے کے فیشن کی حوصلہ شکنی کی غرض سے اسلامی حقوق انسانی کمیشن نے ایک سالانہ ایوارڈ جاری کیا ہے: ''سالِ رواں کا اسلاموفوب'' (Islamophob of

the Year)۔ برطانوی صحافی پولی ٹائن بی، ڈینیل پائپس اور امریکی اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ اس ایوارڈ کے لیے نامزد کئے جا چکے ہیں، ایش کرافٹ نے برسرعام یہ انکشاف کیا تھا: ''اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں خدا آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کو اس کی خاطر مرنے کے لیے بھیجیں، کرسچیئٹی ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں خدا آپ کے بیٹوں کو خود ان کی خاطر مرنے کے لیے بھیجتا ہے۔'' امریکی مصنف اسٹیفن شوارٹز نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے: ''اسلاموفوبیا پورے کے پورے اسلام کو مسترد کرنے، اس کی تاریخ کو انتہا پسندانہ قرار دینے، اعتدال پسند مسلم اکثریت کے وجود کا انکار کرنے، اسلام کو پوری دنیا کے لیے مسئلہ قرار دینے، جن تنازعات میں مسلمانوں کا کچھ بھی تعلق ہو ان میں مسلمانوں کو لازماً ناحق ثابت کرنے اور مسلمانوں سے یہ اصرار کرنے سے مملو ہے کہ وہ اپنے مذہب میں تبدیلیاں کریں یعنی کل ملا کر یہ اسلام کے خلاف ایک جنگ ہے۔'' کیا آزادیٔ ضمیر کے حق کا یہی معنی ومطلب ہے؟

☆☆☆

اسلاموفوبیا۔ ایک بڑا عصری چیلنج؛ اور اس پر قابو پانے کی تدابیر

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی☆

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے ماننے والے دنیائے انسانیت کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، سب سے بڑی اکثریت عیسائی ہیں اور دوسرے نمبر کی بڑی اکثریت مسلمان ہیں اس لئے حصول حقوق کے لئے لفظ اقلیت کا سہارا بہت زیادہ نہیں لینا چاہئے، لفظ اقلیت کا بہت زیادہ استعمال اپنی کمزوری کا کھلا اعتراف ہے اور اس کا مسلمانوں کے ذہن ودماغ پر بھی بہت اچھا اثر نہیں پڑتا بلکہ وہ ایک تسلسل کے ساتھ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے چلے جارہے ہیں۔

واضح رہے کہ پوری دنیا کے تمام ممالک کے رقبہ کا تناسب ۲۵ فیصد ہے، پندرہ سال پہلے کی سروے رپورٹ کے مطابق دنیا کے جملہ ممالک کا مجموعی رقبہ ۱۴ کروڑ مربع کلومیٹر ہے جس میں مسلم ممالک کا مجموعی رقبہ ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ مربع کلومیٹر ہے (مسلم دنیا-ماضی اور حال)۔ اقوام متحدہ کے عالمی آبادی سے متعلق شعبہ کی ۱۹۹۲ کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا کی مجموعی آبادی ۵ ارب ۴۸ کروڑ ہے جس میں مسلم آبادی ایک ارب ۲۷ کروڑ ہے (مسلم دنیا-ماضی اور حال)۔ اس لحاظ سے پوری دنیا میں مسلم آبادی کا تناسب ۲۳ فیصد بنتا ہے، گوپال سنگھ کمیٹی اور نیشنل سیمپل سروے ۲۰۰۱ اور سچر کمیٹی ۲۰۰۶ کے حوالہ سے گفتگو اس لئے نہیں کی جارہی ہے کہ

☆ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ

اس میں آبادی اور تناسب اور بہتر نظر آرہا ہے، سب سے زیادہ مسلمان متحدہ افریقہ میں ۵۹ فیصد ہیں، اس کے بعد ایشیا میں ۲۴ فیصد، یورپ میں ۱۳ فیصد اور متحدہ امریکہ میں ۴ فیصد ہیں (مسلم دنیا- ماضی اور حال)۔

آبادی کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک انڈونیشیا اور سب سے چھوٹا ملک مالدیپ ہے (مسلم دنیا- ماضی اور حال)، پندرہ سال پہلے کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے جملہ ممالک ۲۲۸ ہیں جن میں مسلم ممالک ۶۰ ہیں، اس طرح دنیا کے ممالک میں مسلم ممالک کا تناسب ۲۶ فیصد ہے، دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں مسلمانوں کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، البتہ درجنوں ممالک ایسے ہیں جہاں کی مسلم آبادی ۱۰۰ فیصد ہے (مسلم دنیا- ماضی اور حال)، متعدد اشیاء کی عالمی پیداوار میں مسلم ممالک کا حصہ نصف سے زائد ہے، مثلاً پٹرول، ربڑ، کولمبائٹ، ٹین، کھجور، ناریل، باجرہ اور ریشمی روئی وغیرہ (مسلم دنیا- ماضی اور حال)۔

اس تفصیل سے فطری طور پر دو سوالات ذہنوں میں ابھرتے ہوں گے اور اگر نہیں ابھرتے تو ابھرنے چاہئیں۔

۱۔ جب رقبہ، آبادی اور ملکی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں مسلمانوں کی دوسری پوزیشن ہے تو عالمی سطح پر اپنی اہمیت، اثرات اور طاقت کے اعتبار سے ان کی دوسری پوزیشن کیوں نہیں؟

۲۔ مسلمان اپنے ابتدائی عہد میں محض ۲۳ برس کی قلیل مدت میں زیر دسے ہیرو بن گئے تو اب کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایک تسلسل کے ساتھ روبہ زوال ہیں۔

یہ دو اتنے اہم سوالات ہیں جن کا جواب لازماً تلاش کیا جانا چاہئے، یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر الگ سے بحث کی ضرورت ہے، لیکن سر دست باندیشۂ طوالت اپنی گفتگو محض اشارات تک محدود رکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔

ان دونوں سوالوں کا مختصر جواب یہ ہے کہ جیسے جیسے مسلمانوں کا اسلام سے تعلق کمزور

ہوتا گیا، ان کا وزن گھٹتا گیا اور وہ زوال وادبار کا شکار ہوتے گئے، اور اگر اب بھی انہوں نے اسلام سے اپنے تعلق کی تجدید نہ کی تو وہ دن دور نہیں جب وہ ایک قصۂ پارینہ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کی وجودی حیثیت خس وخاشاک سے زیادہ نہیں رہ جائے گی۔

یہ کتنی المناک صورت حال ہے کہ مسلمان خود تو اسلام کی قوت، حیثیت اور اہمیت کے شعور سے عاری ہیں، لیکن اسلام مخالف عناصر اس کی قوت، حیثیت اور اہمیت ہر ایک سے بخوبی واقف ہیں، اسی لئے وہ اسلاموفوبیا کے شکار ہیں، وہ اسلام کی طاقت سے اس قدر خوفزدہ اور ہراساں ہیں کہ وہ کسی بھی قسم کی اسلامی بیداری کو برداشت نہیں کرسکتے، بلکہ مسلمانوں کی عمومی بے فکری اور بے عملی کے باوجود شکستوں سے چور، کرب وبلا میں مبتلا کراہتی اور سسکتی انسانیت کو گاہے گاہے کسی فرد یا جماعت سے قرآن کا جو پیغام جاں فزا مل جاتا ہے وہ اس کے درد کا درماں بن جاتا ہے اس کا بھی راستہ یکسر مسدود کردینے پر تلے ہوئے ہیں، اپنے ان ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے انہوں نے قرآن کا بدعوائے خویش اپ ٹو ڈیٹ اور لیٹسٹ نسخہ میں بھی تیار کرایا جسے قبول عام حاصل ہونا تھا، نہ ہوا اور نہ ہوگا کیونکہ کامل قرآن کی حفاظت ونگرانی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے سر لے لی ہے، قرآن مجید وہ چراغ نہیں ہے جسے پھونکوں سے بجھایا جاسکے۔

اسلام دشمن عناصر نے جن کی فکری قیادت یہود کررہے ہیں، اپنے کاز کو استحکام بخشنے کے لئے پہلے مسلمانوں کے دل ودماغ میں جہاد کی اہمیت بٹھائی جس سے انہیں خود واقف ہونا چاہئے تھا اور پھر اپنی مقصد برآری کے لئے مجاہدین کی کھیپ کی کھیپ تیار کی، پھر انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالا، اس کے بعد دنیا میں مختلف قسم کی تخریبی کارروائی کروائیں اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان کا الزام انہی مجاہدین کے سر ڈال کر قرآن کی انہی جہادی آیات کو تنقید کا نشانہ بنایا جن کی طرف ابھی تک وہ مسلمانوں کی توجہ مبذول کراتے رہے اور اب تو نوبت بایں جارسید کہ قرآنی تعلیمات کے مراکز مدارس دینیہ اور مساجد کے کردار کو مشکوک بنا کر مسلمانوں سے ان کا

اسلام اور اسلام کی سب سے بنیادی کتاب قرآن مجید ہی چھین لینا چاہتے ہیں۔

مگر طرفہ تماشا دیکھئے کہ اسلام اور قرآن سے مغربی خوف زدگی اور لرزانی کو یہ بے فکر وعمل مسلمان اپنے چند بے روح اعمال واشغال سے مرعوبیت کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں، یہ سادگی نہیں تو اور کیا ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی خوش فہمی کے نتیجہ میں مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہو پارہی ہے اور جب تک صحیح تشخیص نہ ہو مناسب اور مؤثر علاج ممکن نہیں ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دنیا کے سامنے اسلام کا پیغام جدید اسلوب میں اور مؤثر انداز سے پیش کریں جس میں کشش اور اپیلنگ ہو، مثلاً یہ کہ ہم انسان ہیں، انسانوں کے بارے میں عالمی مذاہب کے نقطہائے نظر کیا ہے؟ یہیں سے پتہ چلے گا کہ کون سا مذہب ہماری فطرت سے قریب اور ہمارے لئے قابل قبول ہے، آج جن افراد کو اسلام کے سایۂ رحمت میں آنے کی سعادت مل رہی ہے، ان کو اسلام کی کسی ایک یا چند ایسی تعلیمات نے متاثر کیا ہے جن کا براہ راست تعلق ان کی زندگی اور موجودہ مسائل سے ہے۔

اسلاموفوبیا:

اس سائنٹفک دور میں توہمات کے لئے بہت زیادہ گنجائش نہیں ہے اور بیشتر افراد دو دو چار کی طرح ہر چیز کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں اور ان کی اس پیاس کو بجھانے کی صلاحیت اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں نہیں ہے؛ اس لئے تمام باطل نظریات اسلام کے خلاف اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جیسے اس سے خار اور اس کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہوں، چنانچہ اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے اس کو بدنام کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت پر اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ اس سے واقف نہ ہوسکیں، مسلمانوں کی عملاً اسلام سے دوری اور اس کی تعلیمات سے مجبوری جلتے پر تیل کا کام کررہی ہے، اسلام کا جو نفسیاتی خوف اسلام دشمن عناصر کے ذہنوں پر مسلط ہے، اس نے ان کے دماغوں میں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کا زہر گھول دیا

ہے، ان کی یہی نفسیات ہے جسے اسلاموفوبیا سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

لاریب تمام غیر اسلامی طاقتیں اپنی بے بضاعتی اور اسلام کی قوت علم واستدلال سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ رہیں اور اسلام کے مکمل اور مستحکم نظام حیات سے خوفزدہ نہ ہوں۔

یہ اسلاموفوبیا اس عہد کا اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ اس سے ان لوگوں کی نیند تو حرام ہے ہی جو اس بیماری میں مبتلا ہیں، وہ بھی پریشان ہیں جو ان ذہنی مریضوں کی غیر انسانی حرکتوں کا شکار ہیں اور وہ بھی مبتلائے آزار ہیں جو بزعم خویش اس قضیہ سے لاتعلق ہیں۔

اسلاموفوبیا کے اسباب:

اسلاموفوبیا کے اسباب ومحرکات یوں تو کئی ایک ہوسکتے ہیں لیکن اس کے دو اسباب بہت اہم ہیں:

۱۔ صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے ماننے والوں میں ہزار باہمی اختلافات کے باوجود کچھ بنیادیں ایسی ہیں جو بہت مضبوط اور سب میں مشترک ہیں، مثلاً ان سب کا خدا ایک، رسول ایک، کتاب ہدایت ایک اور تصور آخرت یکساں ہے، یہ سب اپنے دنیوی اعمال کے بے لاگ احتساب کا عقیدہ رکھتے ہیں، اسلاموفوبیا کے شکار تمام افراد اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا رشتہ ہر چند کہ کتاب ہدایت سے فی الحال کمزور ہے، لیکن موجودہ اسلامی بیداری پھر سے ان کو ان کی کتاب ہدایت سے جوڑ سکتی ہے اور اس بیداری میں نومسلمین کا کردار سب سے اہم ہے، وہ جانتے ہیں کہ اگر اس بیداری کا اثر ہمہ گیر ہوگیا تو یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے پھر زندگی کے کسی بھی میدان میں ان کو چیلنج کرنا مشکل ہوجائے گا۔

۲۔ اس عہد سائنس میں تمام امور ومعاملات پر جس آزادی کے ساتھ غور وفکر کی روش عام ہوتی جارہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ نئی نسل بڑی تیزی کے ساتھ اسلام کے

نظام حیات سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتی جارہی ہے، اور اگر یہ سلسلہ مزید دراز ہوتا ہے تو اہل مغرب کی کھڑی کی ہوئی ریت کی یہ دیوار معمولی سی ٹھوکر سے بھی بکھر جائے گی۔

مغرب کے اس اضطراب کو ہمیں سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہئے اور اپنی فراست ایمانی کو کام میں لانا چاہئے۔

اسلاموفوبیا پر قابو پانے کی تدابیر:

میرے نزدیک اسلاموفوبیا کے اس بڑے چیلنج پر قابو پانے کی ۶ تدابیر بہت اہم اور بنیادی ہیں:

۱۔ قرآنی تعلیمات کو ہر فرد بشر تک بتمام وکمال پہنچانے کی سعی وجہد کی جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے حقیقی کردار کو سیرت رسول کی روشنی میں نمایاں کیا جائے۔

۳۔ ہر سطح پر حق وانصاف کے قیام کی ہر ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔

۴۔ عوام وخواص سب کے سیاسی شعور کو بیدار کیا جائے۔

۵۔ اتحاد بین المسلمین کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔

۶۔ مذاکرات کی مجالس قائم کی جائیں اور دینیات کے متخصصین پوری جرأت، بصیرت، حکمت اور ٹھوس علمی وعقلی استدلال کے ساتھ اسلامی موقف کی وضاحت اور وکالت کریں۔

سطور ذیل میں ان شش نکاتی امور کی قدرے وضاحت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلی تدبیر:

سب سے پہلے تو مسلمانوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ دنیا کے ہر فرد بشر تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ قرآن سارے انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب، قوم یا خطے سے ہو اور انہیں یہ باور کرایا جائے کہ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ

یہی منشائے خالق کائنات ہے، اس نے یہ کتاب جب اپنے پیغمبر پر اتاری تو اس سے کہا:

''اے نبی! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب اس لئے بھیجی ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اسے پیش کرو اور اگر ان کو کوئی اشکال ہو تو تم اس اشکال کو دور کرو، تم خود بھی اس کی حیات بخش تعلیمات پر غور وفکر کرو اور ان سے بھی کہو کہ وہ اس پر اچھی طرح غور وفکر کریں'' (سورۂ نحل:۴۴)۔

دنیا کو یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو اپنے نزول کے زمانے سے اب تک حرف بحرف اپنی اصل شکل میں موجود ہے اور تا قیامت اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود مالک ارض وسماوات نے لے لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانے کی چھوٹی بڑی تحریفی کوششوں کے باوجود اب تک کوئی تبدیلی ممکن نہ ہوسکی، فنکاروں نے اپنے تمام تر کرشمہائے سحر وساز کے ساتھ اس نامحمود کام کی کوشش کی لیکن وہ شمہ برابر بھی اس میں تحریف نہ کرسکے اور نہ قیامت تک کرسکیں گے (سورۂ حجر:۹)۔

یہ حقیقت بھی سب کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کوئی پُر پیچ اور مغلق کتاب نہیں ہے جسے سمجھنے کے لئے منطق وفلسفہ کا سہارا لینا پڑے (سورۂ قمر:۱۷)، اور نہ یہ کوئی رف اور سپاٹ کتاب ہے جو اعلیٰ دماغوں کو اپیل نہ کرسکے بلکہ یہ اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مشتمل ایک انتہائی اہم اور وقیع کتاب ہے، اس کا اسلوب ایسا ہے جس سے ہر سطح کا آدمی بقدر ظرف واستعداد استفادہ کرسکتا ہے (سورۂ بقرہ:۱۸۵)۔

لوگوں کو یہ بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اس کتاب کی پیشین گوئی تمام آسمانی کتابوں نے کی ہے، آج بھی ان تمام کتابوں میں تمام تحریفات کے باوجود ان پیشین گوئیوں کے آثار موجود ہیں، کتاب استثناء میں ہے:

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا...... پھر آگے ہے...... میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں

سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جو میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا، تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا" (کتاب استثناء: ۱۵-۱۹)۔

لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات بھی اتارنے کی ضرورت ہے کہ یہ کتاب قلبی شقاوت کو دور کرتی ہے اور دل میں سوز وگداز پیدا کرتی ہے، اس لئے اس کے حاملین کو یہ الزام کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خوگر اور قتل وخوں ریزی کے شیدائی ہیں، اور اگر کہیں کچھ مسلمانوں میں یہ جوش جنوں فزوں نظر آرہا ہے تو اولاً اسے اسلامی کارروائی کے بجائے انسانی کارروائی قرار دینا چاہئے، یہ قطعاً انصاف نہیں ہے کہ جس کارروائی میں ایک فیصد مسلمان بھی شریک نہ ہوں، اسے اسلام اور مسلمان کی پہچان ہی بنا دیا جائے، اور ثانیاً اس کے اسباب ومحرکات کا پتہ لگا کر ان کا سدباب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور لکھنا چاہئے کہ یہ کارروائیاں تنگ آمد بجنگ کا مصداق تو نہیں؟

انہیں یہ بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ یہ وہی دین ہے جسے لے کر حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ آئے (سورۂ شوریٰ: ۱۳)۔

انہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید دین اور دنیا میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی بات نہیں کرتا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو دعائیں ہمیں سکھائی ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے کہ "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی (سورۂ بقرہ: ۲۰۱)۔

قرآن مجید روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے حالات کا جائزہ لیتے رہنے اور مناسب حال کارگزاری کی بھی تعلیم دیتا ہے اور صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ اقدام وعمل کے بغیر تبدیلیٔ حالات کی آرزو بے سود ہے (سورۂ رعد: ۱۱)۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ پوری کائنات کا خالق، رازق، مالک اور حاکم اللہ ہے، انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس کی مخلوق ہیں جن کے ذمہ اس کے فیصلوں کی تنفیذ ہے اور یہ کہ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے، خواہ وہ نوحؑ ہوں کہ ابراہیمؑ، موسیٰؑ ہوں کہ عیسیٰؑ یا خاتم الانبیاء محمد رسول اللہﷺ، سب نے اپنی اپنی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھایا۔ اسی نے تورات بھی نازل کی تھی اور زبور بھی، اسی نے انجیل بھی نازل کی تھی اور قرآن بھی، اب چونکہ قیامت تک کوئی نبی، رسول اور کتاب آنے والی نہیں ہے، اس لئے اس نے اس آخری کتاب کو بالکل محفوظ کر دیا ہے، اب قیامت تک یہی رسول رسول رہے گا اور یہی کتاب کتاب ہدایت رہے گی (سورۂ احزاب: ۴۰)۔

قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا میں آنے والے سارے انسانوں کو جس طرح ایک دن لازماً مرنا ہے، اسی طرح انہیں دوبارہ زندہ بھی ہونا ہے اور اپنی اس دنیوی زندگی کا تفصیلی حساب دینا ہے، وہاں جو عدالت قائم ہوگی، اس کا جج خود اللہ رب العالمین ہوگا، وہ بے لاگ احتساب کرے گا، پھر جس کا جیسا دنیوی عمل ہوگا، اسی کے لحاظ سے اس کی آخرت کی زندگی کا تعین ہوگا، نتیجہ یہ نکلے گا کہ یا تو ہمیشہ کا سکھ یا ہمیشہ کا دکھ، وہاں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی (سورۂ فصلت: ۴۶)۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ بے شک انسانوں کو بہت کچھ آزادیاں عطا کی گئی ہیں لیکن اس پر بہت ساری پابندیاں بھی عائد کی گئیں ہیں، انسان اس دنیا میں مطلق العنان نہیں ہے کہ جو چاہے کرے، کوئی اس سے باز پرس کرنے یا اس کی گرفت کرنے والا نہیں بلکہ یہ منعم حقیقی کے آگے جوابدہ ہے (سورۂ یونس: ۱۴)۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا بیزار زندگی بے راہ زندگی ہے، خدا سے وابستگی، اس کے آگے سرفگندگی اور اس کی کامل بندگی ہی صراط مستقیم ہے (سورۂ زخرف: ۶۴)۔

قرآن مجید اخلاقیات کا پورا ایک نظام رکھتا ہے تاکہ انسانوں کا شرف ووقار مجروح نہ ہو، وہ زبان کی حفاظت، دل کی صفائی، عمل کی ستھرائی، صبر وشکر، اعتدال وتوازن، عدل وانصاف،

امانت داری و دیانت داری، عہد کی پاسداری، عفوودرگزر، اعتماد و توکل اور ایثار و قربانی کا ایک پورا فلسفہ پیش کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح رذائل اخلاق، جھوٹ، فریب، وعدہ خلافی، خیانت، غیبت، تضحیک و تمسخر، تجسس اور بدگمانی، تکلیف دہی اور ایذا رسانی، بغض و حسد، دکھاوا اور ریا کاری وغیرہ سے کلی اجتناب کی تلقین کرتا اور ان کے نقصانات سے آگاہ کرتا ہے (ملاحظہ کیجئے: مضمون ''قرآن مجید کا تصور اصلاح'' مولانا محمد یوسف اصلاحی)۔

قرآن مجید معاشرت کے آداب بھی سکھاتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ انفرادی زندگی کیسی ہونی چاہئے اور اجتماعی زندگی کیسی؟ مرد کو بحیثیت بیٹا، بھائی، شوہر اور باپ کیا کیا کرنا ہے اور عورت کو بحیثیت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کون کون سی خدمات انجام دینی ہیں، مردوں کا عورتوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک ہونا چاہئے اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ کس طرح کا، مردوں کا دائرہ کار الگ اور عورتوں کا دائرہ کار الگ کیوں ہے؟ مرد اور خواتین کی مخلوط اجتماعی زندگی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟ اور غیر مخلوط زندگی کی کیا کیا برکتیں ہیں؟ کن کن پہلوؤں سے مردوں کو عورتوں پر اور کن کن پہلوؤں سے عورتوں کو مردوں پر فضیلت ہے؟ اور کن کن پہلوؤں سے دونوں یکساں ہیں؟ مردوں کو قوامیت کیوں دی گئی ہے اور عورتوں کو ان کا ماتحت کیوں بنایا گیا ہے؟ والدین کو اولاد کے لئے کیا کیا کرنا ہے اور اولاد کو والدین کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا ہے؟ پڑوسیوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے، قریب اور دور کے رشتہ داروں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے؟

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ غیر استحصالی اور نفع بخش کاروبار کس طرح کیا جائے اور سودی لعنت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے؟

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ محتاجوں، کمزوروں، غریبوں اور دبے کچلے لوگوں کی باعزت زندگی کی ضمانت کیسے فراہم کی جاتی ہے (ملاحظہ کیجئے: کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں)۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار انسانی مسائل ہیں جن کا ذکر قرآن نے کیا اور ان کا شاندار حل تجویز کیا ہے؛ اس لئے

دنیا کے ہر انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ ان مسائل اور ان کے قرآنی حل سے واقف ہو، ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم حامل قرآن ہونے کی وجہ سے ان تک اللہ کے اس پیغام کو پہنچائیں، سچی بات تو یہ ہے کہ اگر قرآن کا پیغام ہماری طرف سے قولاً اور عملاً لوگوں تک پہنچ جائے تو پھر دنیا "يدخلون في دين الله أفواجا" کا منظر دیکھ سکتی ہے، واضح رہنا چاہئے کہ باطل افکار ونظریات کی حیثیت گھورے پر اُگے ہوئے پودے سے زیادہ نہیں، بس ایک ہاتھ نمودار ہونے کی ضرورت ہے جو اسے اکھاڑ کر پھینک دے۔

دوسری تدبیر:

دوسری تدبیر یہ ہے کہ بطور اسوۂ حسنہ علماء، فضلاء، مجددین اور مصلحین سے زیادہ مہبط وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو پیش کیا جائے، آپ کی سیرت اور سنت پر توجہ زیادہ مرکوز کی جائے، اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوگا مسلمانوں کے اندر سے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کو زیادہ نمایاں کرنے کا جذبہ سرد پڑے گا اور باہمی خلیج کم سے کم ہوگی، اتحاد کی راہیں کھلیں گی اور اختلافات گھٹیں گے، اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عامۃ الناس کی توجہ سرورِ عالم کی طرف مبذول ہوگی، نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو اتنا روشن اور تابناک ہے کہ جو شخص بھی آپ کی سیرت وسوانح پر غیر متعصبانہ نظر ڈالے گا، وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "The Hundred" کا مصنف مائیکل ہارٹ بھی عیسائی سیرت نگار اور مورخ ہونے کے باوجود دنیائے انسانیت کی سو ممتاز ترین شخصیات میں نبی کریم ﷺ کو نمبر ایک کی شخصیت قرار دینے پر مجبور ہوا اور اسے بھی آپ کی عدیم النظیر عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

ہمیں دنیا کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ نبی کریم ﷺ بحیثیت ایک انسان، بحیثیت ایک مسلمان، بحیثیت ایک شوہر، بحیثیت ایک باپ، بحیثیت ایک پڑوسی، بحیثیت ایک قائد

امت، بحیثیت ایک رہبر انسانیت، بحیثیت ایک مفکر، بحیثیت ایک مدبر، بحیثیت ایک حکمراں، بحیثیت ایک سپہ سالار کیسے تھے؟ آپؐ نے یتیموں، بیواؤں، مسکینوں، خادموں اور سماج کے کمزور طبقات کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، انہوں نے اقدام کی کیا تدابیر اختیار کیں اور دفاع کا کیا طریقہ اپنایا، آپ نے اسیروں کے ساتھ کس اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا اور نمارودٔ عصر اور فراعنۂ وقت کو کس طرح کا جواب دیا، وہ ریشم کی طرح نرم اور فولاد کی طرح سخت کیسے تھے، انہوں نے نرمی اور درشتی کا امتزاج کیسے پیدا کیا؟ کس طرح آپؐ نے کل ۲۳ برس کی قلیل مدت میں ایک تحریک کی داغ بیل ڈال کر اسے دنیا کا سپر پاور بنا دیا اور یہ بھی کہ سپر پاور کو سارے لوگوں کے لئے سایۂ رحمت کس طرح بنا چاہئے، اتنے مختصر وقت میں اتنا عظیم انقلاب کیسے برپا کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس میں جانی اور مالی نقصان اتنا کم ہوا کہ اس کی نظیر تاریخ انسانیت پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سیرت نبویؐ ہی سے پتہ چلے گا کہ دوسروں کو آئین وضوابط کی پابندی کا سبق پڑھانے والا خود ان قوانین وضوابط کی کس سختی سے پابندی کرتا ہے، تب کہیں جا کر آئین کا احترام بحال ہوتا ہے۔

سیرت نبویؐ کے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی جس وسیع پیمانہ پر ضرورت تھی، میرے محدود علم ومطالعہ کے مطابق کوئی باقاعدہ منظم کوشش نہیں ہوئی ہے۔

تیسری تدبیر:

ہمیں ہر سطح پر اس امر کی بھی کوشش کرنی چاہئے کہ حق وانصاف کا بول بالا ہو، اس کام کے لئے کئی محاذوں پر لڑنے کی ضرورت ہے۔

پہلا محاذ:

پہلا محاذ ہر شخص کی اپنی ذات ہے، ہر شخص کو پہلے اپنے جذبات اور خواہشات کی قربانی دینی ہوگی، فرائض سے زیادہ حقوق کا خیال رکھنا ہوگا، اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس پر کس کس کے

حقوق ہیں اور وہ ان کی ادائیگی کی کیا صورت اختیار کرتا ہے۔

دوسرا محاذ:

دوسرا محاذ وہ گھر ہے جس کا وہ قوام ہے، بحیثیت سربراہ خاندان اسے اس بات کی ضمانت فراہم کرنی ہوگی کہ بیوی، اولاد اور والدین کے حقوق پورے ہوں، نہ وہ بیوی کی محبت میں اولاد سے غافل اور والدین سے لاتعلق ہو جائے اور نہ اولاد کی خاطر بیوی اور والدین پر ستم ڈھائے اور نہ والدین کی اطاعت میں حد اعتدال سے تجاوز کرے، ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ اس کی اس چھوٹی سی ریاست کے دیگر ارکان بھی کہیں اپنے فرائض سے چشم پوشی تو نہیں کر رہے ہیں؟ اور اگر چشم پوشی کر رہے ہیں تو بے دریغ ان کا احتساب کرنا ہوگا۔

تیسرا محاذ:

تیسرا محاذ وہ ادارہ یا سوسائٹی ہے جس کا وہ ذمہ دار ہے، ظاہر ہے کہ اس ادارہ یا سوسائٹی کے کچھ ارکان ہوں گے اور کچھ کارکنان، اسے ایک طرف تو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ جس طرح آئین اور قوانین کی پاسداری تمام ارکان و کارکنان کو کرنی ہے، اسی طرح آئین اور قوانین کی پاسداری خود اسے بھی کرنی ہے بلکہ بحیثیت سربراہ ادارہ یا سوسائٹی بہترین اسوہ فراہم کرنے کے لئے اسے زیادہ ذمہ دارانہ حیثیت کا ثبوت دینا ہوگا، دوسری طرف اسے اس بات کی بھی کڑی نگرانی کرنی ہوگی کہ اس نظام کے دیگر ارکان اپنے کارکنان کا استحصال تو نہیں کر رہے ہیں اور اگر کر رہے ہیں تو سختی کے ساتھ ان سے نمٹنا ہوگا۔

چوتھا محاذ:

ہر شخص کسی ادارہ یا سوسائٹی کا ایک عام فرد بھی ہوتا ہے۔ اسے اس حیثیت میں اس بات پر توجہ مرکوز رکھنی ہوگی کہ آیا وہ خود اس ادارہ کا ایک مفید کل بن رہا ہے یا نہیں اور اس پر بھی

نظر رکھنی ہوگی کہ ارکان ادارہ دونظری کا ثبوت دیتے ہوئے کسی کے لئے پھول اور کسی کے لئے کانٹا تو نہیں بن رہے ہیں، اور اگر ایسا ہورہا ہے تو اس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے اس پر احتجاج بھی کرنا ہوگا اور اس رویہ کی خطرناکی اور مضرت کا احساس بھی سب کو دلانا ہوگا تاکہ معاشرہ میں عدل وقسط کا قیام ممکن ہوسکے اور حق کا بول بالا ہو۔

اس وقت ملکی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی جس بے شرمی کے ساتھ ظلم وبربریت اور استحصالی اقدام کی کارفرمائی ہے، ہمارے ان تمام محاذوں کو چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ ہے، آج بھی سماج کی بڑی اکثریت ظلم کو ظلم سمجھتی اور اس پر اضطراب کا مظاہرہ کرتی ہے، لیکن ارباب فکر ودانش ان کے اس احساس اور اضطراب کا جائز فائدہ اٹھا کر اسے ظلم واستحصال کے خلاف عمومی صدائے احتجاج میں تبدیل نہیں کرپاتے، وہ اپنی ذاتی اور مادی مفادات سے کسی طرح بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں، اگر آج بھی اس کا احساس بیدار ہوجائے تو دنیا کے تمام ایوانہائے اقتدار میں زلزلہ آجائے گا، لیکن اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ ظلم بہر حال ظلم ہے، خواہ وہ کسی غیر مسلم حکمراں کی طرف سے مسلمانوں پر ہورہا ہو یا کسی مسلم حکمراں کی طرف سے غیر مسلموں پر ہورہا ہو، ماضی میں اس کے اثرات کی مثالیں ملتی ہیں۔

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرص کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کرکے شام میں آباد کردیا تو فقہائے اسلام اور عام مسلمان اس سے سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اسے گناہ عظیم قرار دیا، ولید نے اس جم غفیر کی ناراضگی کی تاب نہ لاکر جب دوبارہ انہیں قبرص میں لاکر آباد کردیا تو عام طور پر اس کی تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے (فتوح البلدان، ص ۱۵۶)۔

عدل وانصاف کے قیام اور حق کی بالادستی کی کوشش اصلاً مسلمانوں کو ہی کرنی ہے؛ کیونکہ یہ ان کا فریضۂ منصبی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اے ایمان والو! انصاف کو خوب قائم کرنے والے، اللہ کے لئے گواہی دینے والے

بنو، اگرچہ یہ اپنے خلاف یا والدین اور قرابت داروں کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے، اگر کوئی دولت مند یا مفلس ہوگا تو اللہ ان دونوں کو زیادہ جانتا ہے، پس تم عدل کرنے میں ہوائے نفس کے پیچھے مت چلو، اور جھکو گے یا اعراض کرو گے تو جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے" (سورۂ نساء:۱۳۵)۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"اے ایمان والو! اللہ کے لیئے عدل قائم کرنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو، اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم بے انصافی کرو بلکہ ہر حال میں عدل کرو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرو، اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے" (سورۂ مائدہ:۸)۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کو ایک کوشش اور کرنی چاہئے کہ وہ اپنا کوئی عالمی فورم تشکیل دیں اور اس فورم کے توسط سے عالمی رہنماؤں پر بالعموم اور مسلم حکومتوں کے سربراہوں پر بالخصوص اخلاقی ہی سہی یہ دباؤ لازماً ڈالیں کہ وہ اپنے اپنے ہاں قیام عدل کو یقینی بنائیں اور انہیں باور کرایا جائے کہ دلوں پر حکمرانی کا واحد راستہ یہی ہے۔

اسی طرح جن جمہوری ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت میں شراکت ہے اگر وہ سنجیدہ ہوں تو ان حکومتوں کے مزاج کو عادلانہ بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

چوتھی تدبیر:

چوتھی تدبیر یہ ہے کہ ہر سطح پر سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، حکمرانوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جو اقتدار آپ کو حاصل ہے، یہ مطلق نہیں ہے کہ آپ اپنی مرضی سے جس کے ساتھ جو رویہ چاہیں، اپنائیں بلکہ یہ عقیدہ بہ اطاعت خداوندی ہے؛ اس لیئے نظام مملکت کو انہی اصولوں پر چلایئے جو اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، ان اصولوں کی تفصیلات تو کتاب الٰہی میں

ملیں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی ہر شخص کی فطرت میں بھی ودیعت فرمادی ہے، اس لئے صدائے فطرت پر کان دھرنے کی ضرورت ہے، انہیں یہ بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ہر اٹھنے والی آواز کو سننے اور ہر نظر آنے والی تحریر کو پڑھنے کی عادت ڈالیں، تب حکمرانی باقی رہے گی ورنہ سر سے تاج اترنے کے بعد کرانہ کی دوکان پر بھی اپنا تعارف کرانا پڑے گا، پھر بھی سامان زیست ملنا مشکل ہوگا، باقی باشندگان ملک کو بھی یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ سیاست کیا ہوتی ہے؟ اس کے خدوخال کیا ہوتے ہیں؟ اس کے بناؤ بگاڑ میں تم کون سا کردار ادا کر سکتے ہو؟ تمہارے ایک ووٹ کی قیمت کیا ہے؟ وقتی اور عارضی مفادات اور جذباتی نعروں کے کیا مضمرات ہوتے ہیں؟ اور کس طرح لمحوں کی خطا سے صدیوں سزائیں جھیلنی پڑتی ہیں؟ کیا کیا چیزیں ملکی مفادات میں ہیں؟ اور کیا کیا چیزیں ملکی مفادات میں نہیں ہیں، ابتداء میں یقیناً کچھ زحمتیں پیش آئیں گی، کچھ قربانیاں دینی پڑسکتی ہیں لیکن بعد میں پُر امن انقلاب آئے گا اور انشاء اللہ ضرور آئے گا۔

جب قوموں کا سیاسی شعور بیدار ہوجاتا ہے تو سیاسی بازی گروں کے لئے خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد قرار دینا اور سب سے اسے باور کرالینا آسان نہیں ہوتا۔

پانچویں تدبیر:

پانچویں تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، بلاشبہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں اعمال وعقائد میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور ان اختلافات کو دور کرلینا شاید ممکن بھی نہیں، اس لئے اس نوعیت کے اتحاد کی کوشش بھی بے سود ہے؛ لیکن ان تمام مکاتب فکر کی کچھ مشترک بنیادیں ہیں، ان مشترک بنیادوں کا بڑی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے کر ان کی بنیاد پر اتحاد کی سبیلیں پیدا کی جاسکتی ہیں، امت کا اگر سیاسی شعور بیدار ہوجائے تو اختلافات خود ہی بہت حد تک کمزور پڑ جائیں گے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی تین اہم کام اور کرنے ہوں گے:

۱۔ مسلکی تعصب کی بنیادوں کو ختم کرنا۔

۲۔ مدارس کے نصاب سے ان اجزاء کو خارج کرنے پر دباؤ ڈالنا جن سے مسلکی عصبیت یا فرقہ واریت فروغ پاتی ہو۔

۳۔ دوسروں کی رایوں کا احترام سیکھنا اور سکھانا ہوگا۔

بہت سے امور و مسائل میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی اختلافات پائے جاتے تھے لیکن انہوں نے ان اختلافات کو ملی اتحاد کی راہ کا روڑہ کبھی نہیں بننے دیا، ایک مثال ملاحظہ ہو:

''ہجرت کے بعد جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، نماز قصر پڑھی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی اسی پر عمل کیا، حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے ابتدائی عہد خلافت میں یہی کیا لیکن بعد میں وہ نماز پوری پڑھنے لگے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اظہار ناپسندیدگی کے طور پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، پھر جب جماعت کھڑی ہوئی تو حضرت عثمانؓ کی اقتدا میں انہوں نے چار رکعت نماز پڑھی، لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے چار رکعت نماز پر انا للہ بھی پڑھی اور چار رکعت نماز بھی پڑھ لی تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ''اختلاف بری چیز ہے۔'' (حیاۃ الصحابہ ۲/۹۹)۔

اسی طرح ائمہ کرام کے ہاں بھی مختلف فیہ مسائل میں رواداری نظر آتی ہے۔

امام شافعیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بار بغداد تشریف لے گئے تو فجر کی نماز میں حنفی مسلک کی رعایت سے دعائے قنوت نہیں پڑھی جبکہ ان کے مسلک میں ایسا کرنا ضروری ہے (حجۃ اللہ البالغہ ص:۱۰)۔

یہ اور اس طرح کی دیگر مثالیں پیش کر کے لوگوں کے ذہنوں کو اس بات کے لئے ہموار کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے فقہی اختلافات میں تشدد کی راہ ترک کریں اور دوسروں کی رائے کا اقرار کریں، اسی میں پوری ملت کی بھلائی ہے۔

چھٹی تدبیر:

مختلف مذاہب اور متضاد افکار ونظریات کے حامل افراد کو مذاکرات کی دعوت دی جانی چاہیے، اس سے بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوں گی اور آپس کی دوریاں سمٹیں گی، دنیا کے تمام مذاہب کے معدودے چند افراد ہی ہیں جو سازشوں کے جال بنتے ہیں باقی افراد ان سازشوں کے شکار ہیں، انہیں اس اندھیرے سے نکالنا اور حقائق کی روشنی میں لانا ضروری ہے۔

اس عہد کی ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ میڈیا کا عمومی کردار منفی ہے اور وہ دانستہ یا نادانستہ انہی لوگوں کی مقصد برآری میں مصروف ہے جو انسانیت کے وقار سے کھلواڑ کر رہے ہیں، بلکہ بعض دفعہ تو یہ احساس ہوتا ہے کہ میڈیا والے انہی کے ساختہ اور پرداختہ ہیں، میڈیا ہی کی نوازش ہے کہ ملک اور قوم کا سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص راتوں رات ہیرو بن جاتا ہے، یہ میڈیا ہی کا کمال ہے کہ جن لوگوں کو ملک دشمنی کی عبرت ناک سزا ہونی چاہئے تھی، وہ ملک کے ہیرو بنے، پھول اور مالاؤں سے سجی، پوری دریدہ وہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرفاء کو مغلظات کی سوغات بانٹ رہے ہیں، اگر مذاکرات کی بامعنیٰ مجلسیں منعقد ہوں تو مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔

یہ مذاکرات بھی مختلف سطح کے ہونے چاہئیں:

صحافیوں کے درمیان ''اصول صحافت'' کے موضوع پر۔

دانشوران ملک وعالم کے درمیان ''ملک اور دنیا کے سلگتے مسائل'' کے موضوع پر۔

ارباب اقتدار کے ساتھ ''ملک کی تعمیر وترقی - امکانات اور رکاوٹ'' کے موضوع پر۔

مذہبی رہنماؤں کے درمیان ''اتحاد واتفاق کی راہیں'' کے موضوع پر۔

مختلف مذاہب کی سرکردہ علمی اور مذہبی شخصیات کے درمیان ''متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل پر مناسب رویہ'' یا ''بین المذاہب پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیوں اور کیسے'' جیسے موضوعات پر سنجیدہ مذاکرات کی مجلسیں منعقد کرکے بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے،

مجھے تو ذاتی طور سے کئی بار اس کا تجربہ ہوا کہ دوریاں بعض دفعہ غلط فہمیوں کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہیں، ابھی آنکھ کی پٹیاں کھول دی جائیں تو صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر جسے اب تک رسی باور کرایا جارہا تھا، وہ ہاتھی کی دم تھی، جسے کھمبا قرار دیا جارہا تھا، وہ ہاتھی کا پیر تھا اور جسے پنکھا بتایا جارہا تھا، وہ ہاتھی کا کان تھا، یہ کیسی چالاکی تھی کہ ایک جانور کو ایک عمدہ رہائش گاہ بتا کر انہیں بے وقوف بنایا جارہا تھا جن کی نگاہ کام نہیں کررہی تھی یا اسے کام نہیں کرنے دیا جارہا تھا۔

یہ ہیں وہ تدابیر جنہیں اختیار کئے بغیر اسلاموفوبیا پر قابو پانا مشکل ہے، یہ تمام تدابیر بیک وقت اختیار کی جانی چاہئیں، کسی علاقہ یا ملک کی مخصوص صورت حال کی وجہ سے بعض تدابیر کو بعض پر ترجیح تو حاصل ہوسکتی ہے لیکن عام حالات میں ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

امریکہ ویورپ میں اسلاموفوبیا-۱

عبدالحی مفتاحی☆

متحدہ امریکہ، آسٹریلیا اور ہندوستان کے انتہا پسند فرقہ پرست اسلام دشمن عناصر جیسے آر ایس ایس، ہندو مہاسبھا اور ان کی ذیلی تنظیمیں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، رام سینا، شیوسینا وغیرہ کی اسلام دشمن تحریکوں، مسلم مخالف سرگرمیوں کو ہم ان کی فطرت اور گزشتہ تاریخ کے پس منظر میں اسلاموفوبیا سے تعبیر کرسکتے ہیں اور فی الوقت اس سے جامع کوئی اصطلاح نہیں ہے، یہی وہ خطرناک مرض ہے جس نے یورپی وامریکی عوام میں اسلام سے خوف اور نفرت کی لہر پیدا کردی ہے، جس کے نتیجہ میں ایک دہائی سے یورپی ممالک میں مسلمانوں کو شدید نفرت وتعصب اور نسلی ومذہبی امتیاز کا سامنا کرنا پڑرہا ہے، صلیبی اور صہیونی عناصر ایک منظم سازش کے تحت سلسلہ وار اسلام اور شعائر اسلام نیز رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تحریکیں چلارہے ہیں، یوں تو یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی ان کی فطرت خبیثہ کا حصہ ہے، جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہوسکتی، مگر بہرصورت ادھر ۲۰۰۱ء کے بعد اس نفرت ومخالفت نے دھماکہ خیز صورت اختیار کرلی ہے اور بین الاقوامی پیمانہ پر یہود ونصاریٰ اور مشرکین کا ایک مثلث قائم ہوگیا ہے، ایک عالمی نیٹ ورک نے کام کرنا شروع کیا، جس کو امریکہ ویورپ کے ممالک کی حمایت وسرپرستی حاصل ہے، مستشرقین اور مغربی دانشوروں اور ادیبوں کی پوری ٹیم سرگرم ہے۔

۹رستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے بعد صدر جارج بش کا یہ اعلان

☆ ناظم مدرسہ عربیہ منبع العلوم، خیرآباد، مئو (یوپی)

کرنا کہ ہم صلیبی جنگ کا آغاز کریں گے اور اس حملہ کو فوری طور پر القاعدہ اور مسلمانوں سے جوڑ دینا ایک زبردست بین الاقوامی یہودی سازش کو عملی جامہ پہنانا تھا، اس لئے کہ کئی دہائیوں سے امریکی اور مغربی باشندوں کی ذہن سازی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہورہی تھی، مسلسل ان کو اسلام سے ڈرایا اور دھمکایا جارہا تھا، نصف صدی سے زائد کی محنت کا ثمرہ یہ نکلا کہ جب امریکہ نے عالمی تجارتی مرکز کے انہدام کو مسلمانوں سے منسوب کرکے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح وضع کی اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو خونخوار، جنونی، قاتل، دہشت گرد اور انتہا پسند، بنیاد پرست، انسانیت دشمن اور امن عالم کے لئے خطرہ بنا کر پیش کرنا شروع کیا تو مغربی اور امریکی عوام کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت وعداوت کا لاوا ابلنے لگا، وہ اخبار ورسائل اور ٹی وی چینلوں پر برابر مسلمانوں کو ایک وحشی خون آشام قوم کی شکل میں دیکھتے آرہے تھے، جب کسی چیز کو خواہ وہ غلط اور جھوٹ ہی کیوں نہ ہو، خوفناک بنا کر پیش کیا جاتا رہے گا، تو یقینی طور پر دل میں خوف بیٹھ جائے گا، جب کہ اس کے جواب میں اس کی تغلیط وتردید ان کے سامنے نہ آئے، سوءِ اتفاق یا ہماری کوتاہی اور دعوتی فریضہ سے تساہلی کہئے کہ یورپ وامریکہ میں مسلم ممالک اور علماء نے اسلام کا وہ تعارف نہیں کرایا، جو ہماری دعوتی وتبلیغی ذمہ داریوں کا بنیادی حصہ ہے، یا تو ان کے پاس وسائل نہیں تھے یا پھر ایک نفسیاتی مرعوبیت اور احساس کمتری کے شکار تھے، میرے خیال میں دونوں چیزیں ایک ساتھ ہوئیں، اس کے برعکس امریکہ میں یہودی عناصر بہت منظم طریقہ پر اسلام کے خلاف سرگرم تھے، اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ امریکہ ہی کے ذریعہ اسلام کو دبایا جاسکتا ہے، اس پر بھی ان شاء اللہ مختصر جائزہ لینے کی کوشش کروں گا، پہلے اسلاموفوبیا کی حقیقت پر بات شروع کرتا ہوں۔

اسلاموفوبیا سے کیا مراد ہے:

اسلاموفوبیا میری اپنی رائے میں ایک نفسیاتی خوف ہے، جو اہل یورپ کے لاشعور میں

بیٹھ گیا، جس کا بظاہر کوئی علاج نہیں ہے، جیسے کسی کو واٹر فوبیا ہو جاتا ہے، وہ تالاب، دریا، نہر کو دیکھتے ہی شدید ترین خوف وہراس میں مبتلا ہو جاتا ہے، اختلاجی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ایسے ہی یورپ وامریکہ کے باشندوں میں اسلام کا خوف ایک ذہنی خوف بن گیا ہے، اب جہاں کہیں مسلمانوں کو دیکھتے ہیں، تو غیر شعوری طور پر ان کو خونخوار، دہشت گرد، یہودیت وعیسائیت کا دشمن اور مغربی فکر وتہذیب کے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں اور نفرت کی لہر ان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اس طرح اسلام کو ایک تسلسل کے ساتھ مغربی میڈیا اور یہودی دانشوروں، عیسائی مفکروں نے ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کیا، جس کی تعلیمات فرسودہ، انسان کی فطری آزادی کو سلب کرنے والا اور ترقی کا مخالف، صدیوں پیچھے پہنچانے والا ایسا مذہب ہے، جو ترقی یافتہ متمدن زمانہ کے ساتھ نہیں چل سکتا، رجعت پسندی، بنیاد پرستی، فرسودہ خیالات کی تعلیم دیتا ہے، اسلام کی شبیہہ کو بگاڑنے میں مغربی میڈیا نے اپنا پورا زور صرف کر دیا، طبعی طور پر اہل مغرب نے اسلام کو اسی تصور کے ساتھ تسلیم کر لیا اور اس کا لاشعوری خوف ان کے ذہن پر جم گیا، جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی آبادی مغربی ثقافت کے لئے خطرہ ہے، تو اپنے وجود کی بقا کا احساس اسلام کے خلاف جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے، سوئزرلینڈ میں میناروں کو پوری تہذیب کے لئے زبردست خطرہ بنا کر نسل پرستوں نے مساجد کے میناروں پر پابندی کا قانون بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

اسلام مخالف جنون:

ایسے جنونی افراد کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بولنے لکھنے یا اس کی اہانت وتذلیل کر کے ایک طرح کا نفسیاتی اور ذہنی سکون ملتا ہے، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنا اور قرآن کریم کو دہشت گردی پیدا کرنے والی تعلیمات دینے والی کتاب کے طور پر پیش کرنا اسی لذت کے لئے ہے کہ جب مسلمان کرب واضطراب میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان عناصر کو محسوس

ہوتا ہے کہ ہم اپنے خوفناک وخطرناک دشمن کو سبق سکھا رہے ہیں۔

صلیبی اور صہیونی عناصر نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے ذریعہ اپنا دوہدف حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ایک مسلمانوں کو احساس جرم اور احساس کمتری میں مبتلا کر کے اسلامی تعلیمات سے دور کرنا، اور دوسرے اہل یورپ کو اسلام اور مسلمانوں سے جنون ودیوانگی کی حد تک متنفر کرنا، تاکہ اسلام کا مطالعہ نہ کریں ورنہ یقینی طور پر اس سے متاثر ہوں گے، نرسری اسکولوں کالجوں اور گرجا گھروں میں عیسائی بچوں اور نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی اسی نہج پر ذہن سازی اور تربیت کی جاتی ہے، جس کا اعتراف اکثر نو مسلم یورپین اور امریکن شہریوں نے کیا ہے کہ ہم کو اسلام سے ڈرایا جاتا تھا۔

مادہ پرست تہذیب:

چونکہ یورپین تہذیب کی اساس دین ومذہب سے آزاد مادہ پرستی پر ہے اور یہ ایک طرح کا ردعمل ہے؛ کیوں کہ صدیوں تک یورپ نے کلیسائی نظام کی چیرہ دستی، انتہا پسندی کا سامنا کیا ہے، یورپ کا نظام حکومت کلیسا کے تابع تھا، اصل حکمرانی پادریوں کی تھی اور اہل یورپ مذہب کے نام پر اپنے مذہبی پیشواؤں کی تنگ نظری سے اتنے روٹھ چکے تھے کہ ان سے آزاد ہونے کے لئے بے چین تھے، انقلاب فرانس کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ نے جب کلیسا کے تسلط سے نجات حاصل کی تو طبعی طور پر تمام مذہبی اخلاقی قدروں اور حدوں سے اس نے اپنے کو آزاد کرلیا، مذہب کو ترقی کا دشمن تصور کرلیا، یہاں تک کہ وہ انسانی حدیں بس ضد اور مخالفت میں پار کر گیا، آج جو یورپین تہذیب ہے، اسی آزاد مزاجی کا شاخسانہ ہے، عریانیت، فحاشی، بے شرمی، مرد وزن کا اختلاط، شراب نوشی، مادہ پرستی اس کی بنیاد ہے، مغربی تہذیب کسی روحانی واخلاقی قدر وقید کو تسلیم نہیں کرتی، ہر فرد اپنی ذات میں آزاد ہے، اس کو حق ہے کہ جیسے چاہے زندگی گزارے، مذہب اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔

مذہب بیزاری:

لہٰذا یورپی تمدن مذہب بیزار ہے، وہ مذہب کو اپنے لئے خطرہ اور ترقی کی راہ میں روڑا سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تہذیب جدید کی تمام روایات مذہبی روایات کے بالکل برعکس ہیں، مذہب نے جن چیزوں کو غلط، ناجائز اور فسادات کا سبب قرار دیا ہے، مغربی تہذیب نے ان کو آزادی، تہذیب، کلچر اور تمدن کا نام دیا ہے، چونکہ یورپ نے تمام تر مادی اور علمی ترقی کلیسا سے نجات کے بعد حاصل کی، اس لئے مذہب بیزاری اور مادہ پرستی اس کا نیا مذہب بن گیا ہے، ایک طرف زندگی کی آسائشیں بڑھتی گئیں، تو دوسری طرف نئی نسل میں بے راہ روی، فحاشی، بدکرداری نے وبا کی شکل اختیار کرلی، جس کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے، معاشرتی زندگی درہم برہم اور خاندانی نظام تہس نہس ہو چکا ہے، نوجوانوں میں بے چینی، اضطراب انتہا کو پہنچ چکا ہے، دل کا سکون تلاش کرنے کے لئے وہ روحانیت کی طرف رجوع ہو رہے ہیں، ایسے میں ان کو اسلام سے تعارف کا شوق پیدا ہونے لگا ہے، ایک طرف اسلام کا خوف طاری ہے، تو دوسری جانب اس سے واقفیت کا رجحان پایا جا رہا ہے، اسلام کو بدنام کرنے کی تحریک جتنی شدت اختیار کرتی جارہی ہے، اسی شدت سے اس کا مثبت اثر بھی نمایاں ہو رہا ہے۔

مغربی دانشوروں کی پریشانی:

اسلام فوبیا کے شکار یورپین پالیسی ساز، فلاسفر، دانشور اور ادیب اس رجحان پر محوحیرت اور انگشت بدنداں ہیں کہ یورپ نے مردوں، عورتوں کو ہر طرح کی آزادی سے نوازا ہے، ان کو ہر قسم کے مادی وسائل اور عیش وعشرت اور لذت کوشی کے سامان فراہم کئے اور مذہب سے دور رہنے کی ہر امکانی کوشش کی، اسلام سے متنفر کرنے میں اپنی ساری توانائی جھونک دی، پھر کیا سبب ہے کہ یورپین مرد وعورت کی بہت بڑی تعداد اسلام قبول کر رہی ہے، ۹ر نومبر ۱۹۹۳ء

کی اشاعت میں لندن ٹائمز نے اس پر ایک جائزہ مضمون شائع کیا، جس میں اعتراف کیا کہ مغربی میڈیا کی معاندانہ روش کے باوجود اسلام مغربی باشندوں کے دلوں کو فتح کر رہا ہے اور یہ واضح حقیقت ہے کہ ۲۰۰۱ء کے بعد ایک دہائی کے اندر جتنے زیادہ امریکن اور یورپین باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے، گزشتہ نصف صدی میں بھی اتنے لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا، اسلام کی اس مقبولیت نے مخالفت ومعاندت کے ایک نئے رجحان کی شکل اختیار کر لی ہے، فرانس وجرمنی اور آسٹریلیا، برطانیہ کے سرکاری حلقوں نے کھلم کھلا اسلامی شعائر کی مخالفت شروع کر دی ہے، یورپ کی تمام مذہبی رواداری کا پردہ فاش کر دیا ہے، فرانس میں حجاب پر پابندی، برطانیہ کے ایک وزیر کا مسلم ممبر پارلیمنٹ (برطانوی دار العلوم) کے گھر شادی کی تقریب سے اس لئے واپس آجانا کہ ان کی اہلیہ کو ان سے الگ خواتین کے ساتھ بیٹھایا گیا، آسٹریلیا میں مسلمانوں پر حملے، جرمنی کے ایک صحافی کا مصری خواتین کو حجاب میں دیکھ کر بے قابو ہونا اور عدالت کے اندر ہی اس پر پے در پے چاقو سے سولہ سترہ بار حملہ کرنا، یہ سب تشدد، نسل پرستی اور تعصب کی اس ذہنیت کو ثابت کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ مصنفین ہیں، جو اسلام کو یورپ کے لئے خطرہ قرار دے رہے ہیں اور اس موضوع پر مضامین لکھ رہے ہیں۔

اسلاموفوبیا کا دائرہ عالمگیر ہے:

اسلاموفوبیا کا دائرہ پورے یورپ میں پھیل چکا ہے، اس کے عصری اسباب جیسا کہ میں نے تحریر کیا ہے کہ مسلسل پروپیگنڈہ اور اسلام مخالف پے درپے تحریکیں ہیں، خاص کر یہودیوں نے جن کے قبضہ میں میڈیا کی طاقت ہے، ایک جدید حالیہ سروے کے مطابق صرف چھ بڑی یہودی کمپنیوں نے ۹۶ رفیصد امریکہ میڈیا کو اپنے چنگل میں لے لیا ہے اور انہیں کے ذریعہ صہیونی پالیسی کی ترویج، مسلمانوں کے خلاف عالمی پروپیگنڈہ اور امریکی ویورپی باشندوں کی ایک خاص فکر ونظریہ کے تحت ذہن سازی کی جارہی ہے، امریکہ کی سب سے بڑی میڈیا کمپنی

والٹ ڈزنی کا چیرمین یہودی ہے، یہ کمپنی ہزاروں چینل اور اخبارات نکالتی ہے، امریکہ کی دوسری سب سے بڑی کمپنی جس کے تحت ہزاروں چینل امریکہ و یورپ میں قائم ہیں، ٹائم وارنر ہے، اس کا چیرمین ڈینی گولڈ یہودی ہے، دیا کام تیسری بڑی کمپنی ہے، اس کا مالک بھی یہودی ہے، امریکہ کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ''نیویارک ٹائمز'' وال اسٹریٹ جنرل'' اور ''واشنگٹن پوسٹ'' بھی یہودیوں کے اخبارات ہیں، جو امریکی سیاست پر پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں، بلکہ عالمی سیاست میں بھی زبردست رول ادا کرتے ہیں۔

صہیونی یہودیوں کی تاریخ:

یہودیوں کو اسلام سے ازلی بغض وعناد ہے، اس ملعون ومبغوض قوم کو اسلاموفوبیا عہد رسالت ہی سے ہے، ان کی ذہنیت کا گندا مادہ ہر دور میں گل کھلاتا رہا ہے، مدینہ کے یہودیوں کا ایک زبردست حربہ یہ تھا کہ وہ عام یہودیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈراتے تھے کہ یہ مدینہ کے اقتدار سے تم کو بے دخل کردیں گے اور تمہارا دبدبہ ختم ہوجائے گا، اور اس قسم کی افواہیں پھیلاتے تھے کہ اسلام سے لوگ متنفر ہوں، خاص کر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کو استعمال کرتے تھے اور مشرکین مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکا کر کئی جنگیں کروائیں، اسی ذہنیت کا ثبوت عصر جدید کے یہودیوں نے دیا ہے، عظیم تر اسرائیل کا جو خواب یہودیوں نے دیکھا ہے، اس کے قیام کی راہ میں اسلام اور مسلمانوں کو سب سے بڑا خطرہ مانتے ہیں، ارض فلسطین پر مکمل قبضہ کرنے کے لئے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف فکری جنگ شروع کی اور امریکہ و یورپ نے اپنے اخبارات ورسائل کے ذریعہ مہم شروع کردی، جس کا خمیازہ اب ان ملکوں میں آباد مسلم اقلیت بھگت رہی ہے۔

ہماری کمزوری:

ایک دوسرا بڑا سبب اسلاموفوبیا کے پھیلنے کا میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے

یورپ کی مادی ترقیات کے سراب کو پانی سمجھ لیا اور اس کی چمک دمک سے مسلمانوں کی خاص کر عالم عرب کے حکمراں طبقہ کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، انہوں نے ماڈرن ازم کو ہر دور کا علاج اور پسماندگی کا مدار جان کر قبول کرلیا بجائے اس کے کہ امریکہ ویورپ میں اسلامی ثقافت وتہذیب کا اپنے کردار وعمل سے تفاوت کراتے، اسلام کی حیات آفریں تعلیمات سے یورپ کو روشناس کراتے خود ہی متاثر ہوتے چلے گئے، اس طرح ان تمام فحش کاریوں اور بدکاریوں کو سینما، عریانیت اور مخلوط تعلیم مغربی طرز معیشت کی شکل میں اختیار کرلیا، جو نہ صرف اسلامی تعلیمات سے متصادم اور حرام ہے، بلکہ ایمان سوز، اخلاق سوز، حیا سوز اور انسانیت سوز بھی ہیں، اس طرح جس نے قرون ماضیہ میں اسلام کا پرچم یورپ میں لہرایا تھا اور اندلس کو مرکز اسلام بنا کر قلب یورپ میں حق کا آواز بلند کیا تھا، وہی عرب خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد مغرب کے دام فریب میں جا پھنسے، سب سے پہلے مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں اسلام کی ہر پہچان کو ختم کیا اور اس کو ترقی کا دشمن تسلیم کر کے اسلامی لباس، نماز، اذان اور پردہ پر پابندی لگادی اور ہر مرد وعورت پر لازم کردیا کہ وہ انگریزی تمدن اور لباس اختیار کریں، حکومت ترکی کو سیکولر قرار دیا، کوئی بھی مذہب پرست پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا، یہ یہودیوں کی بہت بڑی کامیابی تھی، اسی عثمانی سلطنت کا فیض تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد وملت قائم تھا اور اسرائیل کا قیام کسی صورت میں ممکن نہ تھا، ہرٹزل نے سلطان عبدالحمید سے درخواست کی تھی کہ آپ جتنا سونا یا دولت مانگیں ہم یہودی اس کو حاضر کردیں گے، شرط یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو اسرائیلی ریاست قائم کرنے کی اجازت دے دیں، اس وقت عثمانی سلطنت مالی مشکلات کا شکار تھی، مگر حق پرست سلطان نے ہرٹزل کو ذلت کے ساتھ دربار سے نکال دیا، اس کے بعد ہی ۱۸۹۷ء میں سوئزرلینڈ میں یہودی دانشوروں کا اجتماع منعقد ہوا، جس میں تین سو یہودیوں نے شرکت کی، یہ خفیہ کانفرنس تھی، جس میں بہت سے پروٹوکول پاس کیئے اور عظیم تر اسرائیل کا خاکہ تیار کیا، جس پر کام شروع ہوا، عربوں کو علاقائیت اور

وطنیت کے نام پر عثمانی سلطنت کے خلاف بھڑکایا گیا اور بغاوت کرا کے علیحدہ کئی عرب ریاستیں قائم کرادیں، اس طرح یہودیوں نے مسلمانوں کو بے راہ روی اور بددینی میں مبتلا کرنے اور سودی کاروبار کو رائج کرنے کے لئے سینما اور بینک قائم کئے، عریانیت کو پھیلایا اور فحش کاری کو فروغ دیا۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آگیا، مگر یہودیوں نے اسلام کے خلاف نفرت وعداوت پھیلانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ جاری ہے، ہم نے اس کا مقابلہ نہیں کیا، دعوت اسلام کے لئے قرآن وحدیث اور دینی کتابوں کے انگریزی تراجم کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ اسلام سے ناآشنا امریکہ اور یورپ کو عربوں نے اپنے اربوں ڈالر دئے اور ان سے عیش وعشرت کے سامان حاصل کئے، زندگی کی رعنائیاں تو حاصل ہوگئیں، مگر دین کا نور دلوں سے دور ہونے لگا، ایک طرف امریکہ ویورپ میں اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ ہورہا ہے، تو دوسری طرف عالم اسلام میں یورپی تمدن پھیل رہا ہے، اسلام کا خوف دلاکر یورپی باشندوں کی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اسلام پر اعتراضات کرکے دین سے دور کرنے کا عمل باربار دوہرایا جاتا رہا، کبھی رجعت پسند کی اصطلاح اتنی شدت سے پھیلائی کہ مغرب پرست مسلمانوں کا بڑا طبقہ صفائی دینے لگا کہ ہم رجعت پسند نہیں اور ثبوت کے طور پر اسلام کی ہر پہچان کو مٹانا شروع کیا، پھر بنیاد پرست کہا گیا تو عربوں نے اپنے کو تجدد پسند ثابت کرنے کے لئے مغربی تہذیب کو گلے تک اختیار کرلیا، پھر دہشت گرد کہا گیا تو آنکھ کھلی ہے اور احساس ہورہا ہے کہ یورپ اسلام سے نفرت کا جوالامکھی بن چکا ہے، امریکہ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے، لیکن اتنی طاقت نہیں کہ کھل کر امریکہ ویورپ کی مخالفت کرسکیں، پھر بھی بیداری پیدا ہورہی ہے، تو ضرورت ہے کہ ان چیلنجوں کا مقابلہ اسی ایمانی قوت کے ساتھ کریں، جو ہمارے اسلاف کا شعار ومعیار تھا، اسلامی تہذیب کو بغیر کسی احساس ندامت کے مسلم ممالک میں اپنایا جائے، اسلام کی تعلیمات کا عملی

مظاہرہ کریں اور اسلامی میڈیا کو عالمی سطح پر منظّم کیا جائے، صلیبی وصہیونی ہر سازش کا جواب میڈیا کے ذریعہ دیا جائے، اس کے اثرات یقیناً ظاہر ہوں گے، یورپین اور امریکن باشندوں پر زیادہ توجہ ہو کہ اسلام سے متعلق مواد فراہم کئے جائیں، اس طرح نفرت وعداوت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

اسلام فوبیا

محمد عمران ندوی☆

میرا یہ مقالہ مندرجہ ذیل عناوین پر منقسم ہے:

۱۔اسلام فوبیا سے کیا مراد ہے اور اس کا دائرہ اثر کیا ہے؟

۲۔اس کے عصری اسباب ونتائج کیا ہیں؟

۳۔اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ان چیلنجوں پر قابو پانے کے لیے اسلامی پیغام کی معنویت واہمیت کیا ہے؟

اسلام فوبیا سے کیا مراد ہے اور اس کا دائرہ اثر کیا ہے؟

اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ عام لوگوں کا رجحان اسلام کی طرف ہو چلا ہے، مختلف میدانوں کے ماہرین کی متجسس نگاہیں اسلام کے نظام حیات کا خاموش مطالعہ کر رہی ہیں، اس لیے کہ اشتراکیت کا نظریہ اپنی جنگ ہار چکا اور سرمایہ داری نے تو دنیا کو ظلم وفساد سے اس طرح بھر دیا ہے کہ اللہ کی پناہ، اس کے نتیجہ میں آج کا انسان شعوری یا لاشعوری طور پر ایک ایسے نظام زندگی کا متلاشی ہے، جو اس کی روحانی پیاس بھی بجھائے اور دنیا کے معاملات میں اس کے لیے انصاف، عافیت اور خوشحالی کا ضامن بھی ہو۔

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عقل انسانی نے دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے

☆جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، رحیمیہ مسجد، تائی پورہ، مہاراشٹر

بجائے اور پیچیدہ بنا دیا ہے اور جس قدر ان کے حل کی کوشش کی جارہی ہے، اسی قدر وہ اور زیادہ پیچیدہ اور سنگین ہوتے چلے جارہے ہیں، لہٰذا یقینی طور سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسانی دنیا کے تمام مسائل خدائی رہنمائی کے بغیر صرف عقل انسانی کے بل بوتے پر حل نہیں کیے جاسکتے اور خدائی رہنمائی کے تحفظ کا دعویدار صرف اسلام ہے، جس کی وجہ سے سب کی امید کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں اور اس طرح لوگ غیر شعوری طور پر اسلام کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔

اسلام کی طرف عام لوگوں کا یہ رجحان صہیونیت کو نہ کل بھاتا تھا اور نہ آج گوارا ہے، لہٰذا اسلام کے آغوش رحمت میں پناہ لینے کے لیے بے قرار انسانیت کو گمراہ کرنے کے لیے صہیونی طاقتیں نت نئے طریقے اپناتی رہتی ہیں، ان ہی شیطانی طریقوں میں سے ایک پرانا اور آزمودہ کار طریقہ یہ ہے کہ اس قدر شور مچاؤ کہ حق کی آواز دب جائے اور لوگوں کی نظر میں حق ناحق بن جائے اور ناحق پر حق کا شبہ ہونے لگے، جس کو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے:

"وقال الذين كفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون"

(فصلت:۲۶)۔

اسی پلاننگ کے تحت انہوں نے اسلامی دہشت کا شور مچانا شروع کردیا ہے، تاکہ لوگ اس کو امن کے بجائے دہشت کا، اخلاق کے بجائے بداخلاقی کا، اخوت ومساوات کے بجائے نفرت وفرقہ پرستی کا، احسان شناسی کے بجائے احسان فراموشی کا، عفو وکرم کے بجائے قساوت وسنگدلی کا، وسعت نظری کے بجائے تنگ نظری کا، ترقی کے بجائے تنزل وزوال کا، امن وسکون کے بجائے اضطراب وانتشار کا، رشد وہدایت کے بجائے ضلالت وگمراہی کا علمبردار سمجھیں۔

یہ بات الگ ہے کہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ شور مچانے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے، ان بدلے ہوئے طریقوں میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ دنیا کے مختلف خطوں میں دھماکے کرانا اور اس کا تعلق کسی نہ کسی اسلامی تنظیم یا تحریک سے جوڑ دینا، جہاں کوئی نام نہاد تنظیم دستیاب نہ ہو سکے وہاں ایک فرضی نام بنا کر میڈیا میں یہ خبر شائع کرنا کہ فلاں مسلم تنظیم نے اس کی ذمہ داری قبول کی ہے اور ہفتوں مہینوں اس دھماکہ میں مرنے والوں کی نعشیں ان کے بکھرے اعضاء اور ان کے روتے وارثین اور بلکتے بچوں کو بلاناغہ ٹی وی پر دکھاتے رہنا اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت بھرتے رہنا اور اس حد تک متنفر کر دینا کہ اسلام کو دہشت کا دوسرا نام سمجھیں۔

۲۔ پوری دنیا میں مسلمان چاہے دفاعی جنگ لڑیں، آزادی کی جدوجہد کریں، غاصبانہ قبضے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں ان تمام کو دہشت گردی سے جوڑ دینا۔

۳۔ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا، مسلمانوں کو ظالم قرار دینا، قابل رحم لوگوں کو قابل نفرت بنا دینا۔

۴۔ دو چار داڑھی والے لوگوں کو کلمہ پڑھتے ہوئے ایک شخص کو باندھ کر گولی مارتے دکھانا اور عنوان یہ لگا دینا کہ کابل اور قبائلی علاقہ میں علماء اسلام ایک شخص کو قتل کی سزا دیتے ہوئے۔

۵۔ فلموں کے اندر چوری، ڈاکہ، غنڈہ گردی، عصمت دری کے کردار کو ادا کرنے کے لیے کسی داڑھی والے شخص کا انتخاب کرنا، اسی کا نام اسلام فوبیا ہے۔

اس کا دائرۂ اثر:

اسلام فوبیا کا دائرۂ اثر عالمی سطح سے لیکر دیہات کے گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، ہر سطح پر اپنے مفاد کی خاطر اس کو استعمال کیا جاتا ہے، صہیونی اس کو عالمی سطح پر استعمال کرتے ہیں، جیسے اسرائیل کو جس ملک سے اپنے مفاد یا اپنی سلامتی کو خطرہ ہوتا ہے، تو اس ملک میں القاعدہ کو سرگرم عمل بتلا کر پوری دنیا کو ان کے خطرناک منصوبوں سے مطلع کر دیا جاتا ہے، اور اگر بات کچھ ہلکی اور معمولی معلوم پڑتی ہے تو اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے تازہ مصنوعی ویڈیو ٹیپ میڈیا کے ذریعہ

نشر کر دیا جاتا ہے، ان کے منصوبوں کی خطرناکی بتانے میں اتنا مبالغہ ہوتا ہے کہ بس آج نہیں تو کل القاعدہ والے پوری دنیا کو تباہ و برباد کر دیں گے، اور کبھی یہ شگوفہ بھی چھوڑ دیا جاتا ہے کہ پاکستان کا ایٹمی اسلحہ دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔

بس اسی کو ایجنڈہ بنا کر پوری دنیا کے ممالک سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ دہشت گردی سے نمٹنے میں ان کا ساتھ دیں ورنہ کل دنیا کے نقشے سے ان کا وجود مٹ جائے گا، اس طرح پوری دنیا کی طاقت کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے متحد کرنے کی جان توڑ کوشش کرتے ہیں، لیکن اللہ پاک کا ارشاد عالی ہے:

"كلما أوقدوا نارا للحرب أطفأ الله۔"

(جب جب وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اس کو بجھا دیتا ہے)۔

یہ تو عالمی سطح کا اسلام فوبیا ہے، اب آتے ہیں براعظموں کی سطح پر تو جو ممالک ہتھیار بناتے ہیں اور اس کے سپلائر ہیں، ان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ تمام براعظموں میں ایک جنگی فضا قائم رہے، تاکہ ان کے ہتھیار کے بازار میں مندی نہ آنے پائے، یہ ممالک ہتھیار کی سپلائی بڑھانے کے لیے بھی اسلاموفوبیا کا سہارا لیتے ہیں، بطور مثال کے برصغیر میں ہندو پاک کو پیش کیا جا سکتا ہے، دونوں ملکوں کو الگ ہوئے تقریباً ساٹھ سال ہونے کو ہیں، لیکن آج تک دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدہ ہی چلے آرہے ہیں، آخر کون ہے ان کے لڑانے کے درپے۔

ملکی سطح پر اسلام فوبیا کا استعمال:

ان تمام ممالک کے نام نہاد قائدین جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اپنی تمام نااہلی، ناکامی، کرپشن کو بڑھتی ہوئی آبادی کے پردے میں چھپاتے ہیں اور مسلمانوں سے لوگوں کو ذہنی طور پر خوف میں مبتلا کرنے کے لیے تمام مسائل کی جڑ ان ہی کو قرار دیتے ہیں اور ملک کی اکثریت کو اس کا خوف دلاتے رہتے ہیں کہ ان کی آبادی بڑھنے کا تناسب یہی رہا تو مہنگائی آسمان

چھوئے گی، غلہ کا بحران ہوگا، بے روزگاری بڑھتی جائے گی، ملک کی معیشت کا دیوالیہ نکل جائے گا، حالات مزید بگڑتے چلے جائیں گے، لہٰذا ان کا وجود ملک وملت کے لیے بھی خطرناک ہے اور ہمارے لیے بھی مصیبت ہے۔

اس فوبیا کا استعمال ملکی سطح پر سیاسی پارٹیاں بھی کرتی ہیں، اس کا مشاہدہ الکشن کے زمانہ میں کیا جاسکتا ہے، جیسے جیسے الیکشن کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے، ہندو مسلم فسادات کا خونی سلسلہ شروع ہونے لگتا ہے، خفیہ سازش کر کے منظم طور سے فسادات کی آگ بھڑکائی جاتی ہے، میڈیا والے تشدد کے واقعات کو خوب اچھالتے ہیں، بار بار نشر کرتے ہیں، اس طرح وہ مسلمانوں کا خوف دکھا کر ہندو ووٹ یکجا کر لیتے ہیں۔

اس کا مظاہرہ صوبائی سطح کے الیکشن میں بھی ہوتا ہے، پھر اس کا سلسلہ آگے تک چلتا چلا جاتا ہے، فسادات کے ذریعہ وزارات کے عہدوں تک پہنچنا ایک عام بات بن گئی ہے اور ہندوؤں کے دلوں میں یہ دہشت بٹھائی جاتی ہے کہ یہ مسلم قوم بہت خطرناک اور دہشت پسند قوم ہے، اس کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی اتنے ہی پاور کا دہشت کا ہونا ضروری ہے۔

اسلام فوبیا کے عصری اسباب اور نتائج کیا ہیں؟

اسلام فوبیا کے عصری اسباب کے ساتھ ساتھ اس کے فطری اسباب بھی ہیں، دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا میں جب جب خدائی دعوت کو کوئی نبی لیکر اٹھا تب تب شیطانی طاقتیں اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ مخالفت کے میدان میں اتری ہیں، شروع میں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی مخالفت کا طوفان اس صالح دعوت کو جڑ سے اکھاڑ دے گا لیکن غبار چھٹنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس طوفان نے دعوت کو اکھاڑنے کے بجائے اس کی جڑوں کو اور مضبوط ہی کیا ہے اور اس پیغام کو اپنے کندھوں پر اٹھائے طوفانی رفتار سے وہاں جا پہنچایا ہے، جس کا تصور بھی محال تھا، اللہ رب العزت کا ارشاد عالی ہے:"**الم يجعل كيدهم في تضليل**" (سورہ الفیل)۔

گو یہ آیت ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اللہ کا یہ قانون ہے کہ حق سے ٹکرانے والوں کی ساری تدبیریں اللہ انہی کی گردنوں میں ڈال دیتا ہے اور مخالفین کی شدید مخالفت کو اپنے انبیاء کی دعوت کے ابلاغ میں استعمال کرلیتا ہے اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا، جیسا کہ اللہ کا پاک ارشاد ہے:

"ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین" (سورہ آل عمران/۵۴)۔

(ان لوگوں نے چالبازی کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے)۔

"ومکروا مکرا ومکرنا مکرا وھم لایشعرون" (سورۃ النمل/۵۰)۔

(ان لوگوں نے ایک سازش کی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور اس کی خبر بھی ان کو نہ ہوئی، وہ سمجھے بھی نہیں)۔

عصری اسباب:

جب نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اور لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کی تو سنۃ اللہ کے مطابق شیطانی طاقتیں مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کی شکل میں مخالفت کے لیے کمربستہ ہوگئیں، مختلف قسم کی تدبیریں اپنائی گئیں، جن پر بس چلا ان کو مارا گیا، پیٹا گیا، انگاروں پر لٹایا گیا، تپتی دوپہر میں ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھا گیا، جس کا کوئی حلیف نہیں تھا، اس کو قتل کردیا گیا، دوسرے قبائل کے بااثر لوگوں کو ذہنی خوف میں مبتلا کیا گیا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ملنے کی تاکید کی گئی، حضرت طفیل بن عمروؓ کے اسلام لانے کا واقعہ اس پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے، وہ اپنی کہانی خود اپنی زبانی بیان کرتے ہیں:

"حضرت طفیل بن عمروؓ اس داستان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں مکہ پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی سرداران قریش میری طرف لپکے اور انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا

استقبال کیا اور مجھے بڑی عزت وتکریم سے نوازا، پھر ان کے بڑے بڑے سردار اور سربرآوردہ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے: ''طفیل! تم ہمارے شہر میں آئے ہو، اور یہ شخص جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، اس نے ہمارا سارا معاملہ خراب کر کے رکھ دیا ہے، اس نے ہماری جمعیت کو منتشر اور ہماری جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے، ہم لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں تم کو اور تمہاری قیادت وسرداری کو بھی وہی خطرہ نہ لاحق ہو جائے جس سے ہم لوگ دوچار ہیں، اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم نہ تو اس شخص سے کوئی بات کرنا نہ اس کی کوئی بات سننا؛ کیونکہ اس کی باتیں بڑی جادو اثر ہیں، اس کی زبان میں بلا کی تاثیر ہے، یہ شخص اپنی ان باتوں کے ذریعہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں تفریق کر دیتا ہے۔

حضرت طفیل رضی اللہ عنہ اپنی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: '' خدا کی قسم وہ لوگ مسلسل اس شخص کی عجیب وغریب باتیں مجھے سناتے رہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں سے میری اپنی ذات اور میری قوم کے متعلق مجھ کو خوفزدہ کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے اس بات کا عزم مصمم کر لیا کہ میں نہ اس شخص سے ملوں گا نہ اس سے کلام کروں گا، نہ اس کی کوئی بات سنوں گا۔لیکن یہ ساری تدبیریں ناکام ہوئیں اور حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ ایمان سے سرفراز ہوئے''

(صور من حیاۃ الصحابہ۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا: ۱/ ۲۱-۲۰)۔

جب مشرکین کی یہ ساری تدبیریں اور سارے ہتھکنڈے بیکار ثابت ہوئے تو وہ سب ننگی تلواریں لیکر میدان جنگ میں کود پڑے اور اس صالح دعوت کو طاقت کے بل بوتے پر کچل ڈالنا چاہا، لیکن تقدیر خداوندی میں کچھ اور ہی طے تھا، جو لوگ حق کا گلا گھونٹنے نکلے تھے سوائے چند کے سب کو اللہ رب العزت نے حق کا داعی اور شیدا بنا دیا، اسلام کو مٹانے والوں کو اب اسلام کے لیے مٹنے والا بنا دیا، حق کے داعی کا گلا کاٹنے والے اب اسی کے تحفظ کی خاطر اپنا گلا کٹانا فخر سمجھنے لگے۔

مشرکین مکہ چونکہ نادانی اور انجانے میں مخالفت کر رہے تھے، اس لیے ان کو توفیق الٰہی

ملتی گئی اور وہ مخالفت کا میدان چھوڑ کر موافقت کے میدان میں آتے چلے گئے، ان کی مخالفت بھی اتنی سخت اور خطرناک تھی کہ پتھر دل بھی پگھل جاتے تھے، لیکن جب موافقت اور حمایت کرنے پر آئے تو ایسی نصرت کردی کہ رہتی دنیا تک ایک مثال بن گئی، جس ذات اقدس کے خون کے پیاسے تھے، اب اس کے تلوے میں ایک کانٹا چبھنا بھی گوارا نہ تھا۔

حدیث کا یہ ٹکڑا اس کا بہترین عکاس ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی یہ حدیث حضرت ثمامۃ بن اثال کے تأثرات میں ہے جو انہوں نے کلمہ پڑھنے کے بعد کہے تھے:

يا محمد والله ماكان على وجه الأرض وجه أبغض إلي من وجهك، فقد أصبح وجهك أحب الوجوه كلها إلي والله ماكان من دين أبغض إلي من دينك فأصبح دينك أحب الدين كله إلي والله ماكان من بلد أبغض إلي من بلدك، فأصبح بلدك أحب البلاد كلها إلي۔ (مرقاۃ، کتاب الجہاد، باب حکم الاسراء: ۷/۴۶۸)۔

(اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی قسم ساری دنیا میں مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چہرہ انور سے تھی، لیکن اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور مجھے سب سے زیادہ محبوب ہوگیا ہے، اور قسم خدا کی سب سے زیادہ بغض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب سے تھا، لیکن اب تمام مذاہب میں سب سے زیادہ پسندیدہ مذہب ہوگیا ہے، اور قسم خدا کی مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے تھی، لیکن اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر میرے نزدیک سب شہروں سے محبوب بن گیا ہے)۔

اسی طرح کا جملہ حضرت ہندہؓ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کے بعد کہا تھا:

فقالت! والله يارسول الله ماكان على وجه الأرض بيت أحب إلي أن يذل من بيتك، ولقد أصبحت وما على وجه الأرض بيت أحب إلي أن يعز من بيتك۔

(اے اللہ کے رسول! قسم خدا کی پہلے میری خواہش تھی کہ روئے زمین پر آپ (صلی

اللہ علیہ وسلم) کے گھر کی طرح ذلیل کوئی گھر نہ ہو، لیکن اب دلی خواہش یہ ہے کہ آپ کا گھر تمام گھروں میں سب سے زیادہ عزت والا ہو)۔

لیکن یہود کی مخالفت، حسد، بغض، کینہ، عداوت، تعصب کی وجہ سے اور دانستہ طور سے تھی، اس لیے وہ توفیق الٰہی سے محروم رہے اور اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی عداوت بھی بڑھتی رہی، لیکن وہ بزدل قوم تھی اور ہے، اس لیے میدان جنگ کے بجائے مکاری، سازش، دسیسہ کاری کا میدان اپنایا اور نسل در نسل آج تک اسی ڈگر پر چلے آرہے ہیں۔

اس کے نتائج:

اس سلسلہ میں حضرت مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کا یہ اقتباس اچھی روشنی ڈالتا ہے:

''یہودی شاطروں نے پہلی عالمی جنگ عظیم کے بعد اسلام اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فرسودہ طریقوں کے بجائے نئی تکنک اختیار کی، میڈیا پر قبضہ کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ذہن سازی کی، شہرت اور جاہ طلبی کے خواہشمندوں کو مغربی دشمنی کا غیر معمولی پروپیگنڈہ کر کے مسلمانوں کی نظر میں ہیرو بنانا، پھر ان سے اسلام دشمنی کا کام لینا اور ان کو آلہ کار بنا کر اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنا ہے، کمال سے جمال اور قذافی سے صدام تک کے کارناموں سے یہی تلخ حقیقت سامنے آتی ہے، ترک ناداں مصطفیٰ کمال پاشا کو غازی بنا کر قبائے خلافت کو چاک کرادیا، جمال عبدالناصر کو امریکہ دشمن بنا کر اس کے ہاتھوں ہزاروں فرزندان مصر کو تہ تیغ کرایا، اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلامی دنیا کے باقی رہنماؤں نے بھی اپنے نامہ اعمال سیاہ کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کی۔

اسلام کو بطور مذہب مقبولیت کا ہوا بھی اسی مغربی میڈیا نے کھڑا کیا، یہودی لابی مسلمانوں کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ اس لیے بھی کر رہی ہے کہ خود اس کی تعداد گھٹ رہی ہے، سیاسی اور سماجی سطح پر ان سے امریکیوں کو نفرت ہونے لگی ہے، امریکہ میں مقیم مسلمانوں سے

روابط وتعلق کی وجہ سے عیسائیوں کے سامنے اسلام کی حقیقت واضح ہونے لگی ہے، اور صرف یورپ ہی نہیں پورے امریکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اور خلیجی جنگ میں جن امریکی فوجیوں نے شرکت کی تھی اور بعد میں ان کا قیام سعودی عرب اور کویت میں رہا، ان کی خاصی تعداد نے اسلام قبول کرلیا ہے، اس کے غیر معمولی اثرات امریکی معاشرے پر پڑرہے ہیں؛ یہودیوں نے روایتی حسد اور اسلام دشمنی کے جذبے سے کام لے کر اپنا پروپیگنڈہ تیز کردیا ہے۔" (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی)۔

جس کا نتیجہ ان شکلوں میں سامنے آیا ہے:

۱۔ رائے عامہ گمراہی کی راہ پر لگادی گئی ہے۔

۲۔ دنیا کی حقیقی صورت حال عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔

۳۔ نوجوان نسل عیاشی کی راہ پر چل پڑی ہے۔

۴۔ مسلمانوں اور اسلام سے بدظنی بڑھ گئی ہے۔

۵۔ فحاشی کا دور دورہ ہے، جس کو دوسرے دانش ور بھی محسوس کررہے ہیں۔

ایک امریکی دانشور کی تقریر کا یہ اقتباس اس کا شاہد ہے، وہ کہتا ہے:

"عالمی خبر رساں نیوز ایجنسیوں کے ذریعہ یہودی تمہارے دل ودماغ کو دھو رہے ہیں، وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کے حالات وحوادث دیکھنے پر مجبور کردیتے ہیں، یہ نہیں کہ واقعی حقائق اور حوادث کیا ہیں۔

دوسری طرف فلموں کے ذریعہ ہمارے نوجوانوں اور فرزندان قوم کے دل ودماغ کو اپنے افکار وخیالات کی مسلسل غذا پہنچارہے ہیں، تاکہ ہمارے بچے جوان ہوکر ان یہودیوں کے دم چھلے اور غلام بن جائیں اور یہ صرف دو گھنٹہ کے قلیل وقفہ میں، اس وقفہ میں یہودی شاطر فلموں کے ذریعہ ہمارے نوجوان اور ابھرتی ہوئی نسل کی عقل وکردار کو مٹا کر رکھ دیتے ہیں، وہی عقل اور

کردار جس کی تیاری میں مہینوں اور سالوں اساتذہ اور مربیوں نے صرف کیے تھے۔ (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی۔ ص: ۱۷۵)۔

اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟:

۱۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے دنیا میں اپنی افادیت ثابت کرنی ہوگی۔

۲۔ جن ممالک میں ہم رہتے ہیں چاہے اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں، ان ممالک کو درپیش مسائل کے حل کرنے کے لیے اپنی خداداد صلاحیت اور خدمات پیش کرنا ہوگا۔

۳۔ ٹھوس بنیاد اور حقائق کی روشنی میں اپنے آپ کو ایک وفادار شہری اور خیر خواہ محبّ وطن ثابت کرنا ہوگا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے نئے طریقے اور جدید تکنک اپنا کر برادران وطن تک اسلامی پیغام پہنچانا ہوگا۔

۵۔ باطل جن ہتھیاروں سے مسلح ہے، ہمیں بھی ان ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑے گا، جس میں سب سے اہم اور موثر ہتھیار میڈیا ہے، اس لیے کہ جدید ذرائع ابلاغ و مواصلات نے پوری دنیا کو سمیٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں بنا دیا ہے، ٹیلی ویژن (Telivison) کے سٹیلائٹ چینل اور انٹرنیٹ جیسی ایجادات نے ہر ایک کے لیے پوری دنیا تک بیک وقت اپنا پیغام پہنچانے کی سہولت مہیا کر دی ہے، ان حالات میں بات واضح ہے کہ اب دنیا میں جو تبدیلی بھی آئے گی، عالمی سطح پر آئے گی، افکار و رجحانات کے عالمی سرچشموں سے دنیا کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس کا پیغام زیادہ مؤثر اور جاندار ہوگا بالآخر وہی جدید انسان کے ذہن کو مسخر کرنے اور اس کا دل جیتنے میں کامیاب رہے گا۔

آج اگر مغرب اپنے پروپیگنڈے کی طاقت سے دنیا کو باور کرا رہا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا دوسرا نام ہے، تو انہی جدید ذرائع سے لوگوں تک اسلام کی صحیح دعوت پہنچا کر

صورت حال یکسر بدلی بھی جاسکتی ہے، کیونکہ اسلام حق ہے اور فطرت کا اٹل قانون ہے، اور یہ بات فطری ہے کہ روشنی کے سامنے اندھیرا کبھی نہیں ٹھہرتا، حق کے سامنے باطل نہیں ٹکتا، لیکن جب تک حق میدان میں نہیں اترتا اس وقت تک باطل تو دندناتا ہی پھرتا ہے۔

۶۔ ہمارے نوجوان فضلاء اور گریجویٹ حضرات کو منظم طور سے تیاری کر کے صحافت کے میدان میں اترنا ہوگا اور لوگوں کے دماغوں سے اسلام کے تعلق سے جو شکوک وشبہات بھرے گئے ہیں، ان کا ازالہ حکمت اور فنی مہارت کے ساتھ کرنا ہوگا۔

ان چیلنجوں پر قابو پانے کے لیے اسلامی پیغام کی معنویت واہمیت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے حالات اسلامی پیغام کی اشاعت اور قبولیت کے لیے جتنے آج سازگار ہیں، انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں رہے، ہر نبی کی دعوت کی راہ میں عموماً سب سے بڑی رکاوٹ تقلید آباء کا روگ ہوتا تھا، لوگ صاف کہہ دیتے تھے کہ ہم تو وہی کچھ کریں گے جو ہمارے باپ دادا کرتے چلے آرہے ہیں، آج کی دنیا میں یہ روایت پرستی بالکل ختم ہو چکی ہے اور جدید دور کے انسان سے دلیل کی بنیاد پر بات کی جاسکتی ہے۔

سائنس کے نام پر انکار خدا کا فلسفہ بھی دم توڑ چکا ہے اور جدید سائنس، تخلیق کائنات کے پیچھے ایک ماسٹر مائنڈ یا خالق کی موجودگی کی پوری طرح قائل ہے، اشتراکیت کا نظریہ اپنی جنگ ہار چکا ہے، جب کہ سرمایہ داری دنیا کو ظلم اور فساد سے بھر کر آخری سانس گن رہی ہے۔

اس کے نتیجہ میں آج کا انسان شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نظام زندگی کا متلاشی ہے، جو اس کو روحانی غذا پہنچانے کے ساتھ دل کی پیاس بھی بجھائے اور جو دنیا کے معاملات میں اس کے لیے انصاف، عافیت اور خوشحالی کا ضامن بھی ہو۔

☆☆☆

مسلم اقلیات اور اسلام فوبیا

ارشاد احمد اعظمی ☆

جب تک انسان کی زندگی ہے اس کے ساتھ مسائل ہیں، کسی کا مسئلہ صرف روزی روٹی کا ہے اور وہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ روزی روٹی کی دوڑ میں لگ جاتا ہے اور اپنی حد تک جد وجہد اور کچھ مزاحمت کے ساتھ اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، کسی کے عزائم بلند ہوتے ہیں اور وہ روزی روٹی کے ساتھ اپنی شناخت بھی باقی رکھنا چاہتا ہے اور اسے کچھ زیادہ ہی محنت ومزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف کچھ لوگ ہیں جن کو ہر اس شخص سے نفرت ہوتی ہے جن کو وہ اپنا مزاحم سمجھتے ہیں اور اس کی طرف سے خوف میں مبتلا رہتے ہیں، ان کا طرز عمل جنگل کے جانور کی طرح ہوتا ہے جو خطرہ بننے سے پہلے ہی اپنے حریف کو ختم کر دینا چاہتا ہے، یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے، جسے ہم ہوّا کہہ سکتے ہیں، لاطینی زبان میں اس کو فوبیا کہتے ہیں، المورد میں ہے: PHOBIA (L) الفوبیا: هلع مرضي من شئ معين او طائفة من أشياء معينة، فوبیا لاطینی لفظ ہے، جو کسی مخصوص چیز یا چیزوں کے مجموعہ سے خوف ودہشت کی بیماری کیلئے بولا جاتا ہے۔

باشعور مسلمان جسے یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اسے مسلمان رہ کر جینا ہے؛ کچھ زیادہ ہی مسائل سے دوچار ہے، اور مختلف محاذوں پر اسے مزاحمتوں کا سامنا ہے، کبھی اس کا وجود ہی اغیار کو کھٹکتا ہے، اور اس کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، بوسنیا، فلسطین، برما اور دوسری

☆ استاذ الفقہ والتفسیر، الجامعۃ الاسلامیۃ العربیۃ ترجمہ والی مسجد، بھوپال

مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور کبھی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی شناخت سے دست بردار ہو جائے، اس کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں، مجبوری کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو بھگا تو نہیں پاتے؛ لیکن وہ ان کو پسند بھی نہیں کرتے، اس لئے ان کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اپنی شناخت کے ساتھ سکون سے جینے نہیں دیتے؛ البتہ جو نام کے مسلمان ہیں وہ ان طاقتوں کے لئے بڑے مفید و کارآمد ہیں، ان کو ان سے شاباشی بھی ملتی رہتی ہے، ان میں جو بڑے اچھے ہوتے ہیں وہ ان کے ساتھ کماتے ہیں، کھاتے ہیں اور انھیں کے رنگ میں رنگ کر زندگی گزارتے ہیں، نہیں تو پھر وہ محض مخالف طاقتوں کو خوش کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کے خلاف زبان درازی کرتے ہیں، اور ان کا ایجنٹ بن کر رہنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، باعمل مسلمانوں کو تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں مشکلات کا سامنا ہے؛ حالانکہ وہ کسی اور کے معاملات میں دخل نہیں دیتے، جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں تو مشکلات ہیں ہی؛ جہاں کہنے کو مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی مشکلات ہیں، ان کی یہ مشکلات الگ الگ قسم کی ہیں، کہیں ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم یہاں نہ رہو، کہیں کہا جاتا ہے کہ اگر تم کو رہنا ہے تو اس اس طرح رہنا ہوگا، کبھی ناصحانہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک کے مسلمان اس طرح اپنا نام رکھتے ہیں، ان ان تہواروں کو مناتے ہیں تم بھی انھیں کی طرح بن جاؤ، کبھی مسجد بنانے سے روکتے ہیں، میناروں پر اعتراض کرتے ہیں، حجاب سے ان کو کدورت ہوتی ہے اور کبھی سیدھے سیدھے بنی ہوئی مسجدوں کو گرادیتے ہیں، شعائر اسلام پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور پیغمبر اسلام کو نشانہ بناتے ہیں، ایسی ذہنیت والوں سے وہ لوگ بھی نہیں بچ پاتے جو نام کے مسلمان ہیں۔

ایک مرتبہ ہمارے ملک میں ایک پارٹی اقتدار سے بے دخل ہوئی اور دوسری پارٹی برسر اقتدار آئی تو پتہ چلا کہ پہلی پارٹی کی حکومت نے ایک سرکلر اعلی سطح پر جاری کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کو کچھ سرکاری ملازمتوں سے دور رکھا جائے؛ حالانکہ اس پارٹی کو مسلمان اپنا ہمدرد سمجھتے

تھے اور اس کی حمایت کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

مغربی ملکوں میں کچھ چیزیں ہیں جو قابل ستائش ہیں، ان کے عام آدمیوں میں انسانیت ہے، ان کے درمیان ایسے لوگ ہیں جو جانباز اور خطرات سے کھیل جاتے ہیں، آزادی فکر وفن نے ان کو ایجادات وانکشافات کے مواقع دیئے، وہ جو نظام وضابطہ بناتے ہیں آپس میں ان پر عمل بھی کرتے ہیں، اور دوسروں کے تعلق سے ان کو پردہ داری کا فن بھی خوب آتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہماری دوستی یا دشمنی اصل نہیں ہے؛ بلکہ ہم اپنے مفادات کو عزیز رکھتے ہیں، پھر بھی دوسروں کے ساتھ جب وہ دشمنی کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کے لئے جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان سب کے باوجود یہ سمجھ لینا کہ مغربی ممالک کو ہم سے پیار ہے اور وہ ہمارے غم میں گھلتے رہتے ہیں ہماری خوش فہمی ہے، انھوں نے مسلمانوں کو اپنے یہاں بسنے اور کام کرنے کا موقع دیا یہ ان کی ضرورت تھی، اگر مسلمان اور دنیا کی دیگر اقوام ان کا یہ کام نہ کرتیں تو نہ یورپ یورپ بنتا، اور نہ امریکہ امریکہ، مغربی ملکوں پر ان اقوام کے احسانات ہیں، جب یورپ اور امریکہ کو ان اقوام کی ضرورت تھی، اس وقت بھی کلیسا نے ان کو دل سے نہیں چاہا تھا؛ لیکن وہ مجبور تھا، وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا، وہ خود اپنے لوگوں کی نظر سے گر چکا تھا اور اس کی مخالفت کی ایک عام ہوا چل رہی تھی؛ اس لیے خاموشی کو ہی اس نے اپنے لیے سلامتی سمجھا، اب حالات بدل چکے ہیں، لوگوں کے ذہنوں سے پرانی یادیں مٹ چکی ہیں، روزگار کے حصول میں مقابلہ آرائی ہے، اور باہر سے آنے والی صلاحیتیں اپنا جھنڈا گاڑ رہی ہیں، اس موقع کو کلیسا نے بھنایا، اور نفرت کی چنگاری جو اس کے سینے میں دبی تھی ہوا دے کر شعلہ بنا دیا۔

جس وقت سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی تعمیر کا مسئلہ عروج پر تھا، ایک عربی نیوز چینل نے ڈاکٹر یوسف قرضاوی سے انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا کہ مختلف ادیان کے مابین تقارب

ومفاہمت کی جو کوششیں ہورہی ہیں، ان کا کیا نتیجہ ہے؟ تو علامہ قرضاوی نے جواب میں بتلایا کہ ایسی کئی کانفرنسیں جن میں میں خود شریک تھا جب مشترکہ اعلامیہ تیار ہونے لگا تو ارباب کلیسا نے اسلام کو دین سماوی ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

یہ تو عیسائیت کے وہ علم بردار ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان میں اور مسلمانوں میں کوئی مفاہمت ہو جائے، اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کانفرنس میں شریک تھے، بھلا ان عیسائیوں کا کیا حال ہوگا جن کو مسلمان ایک آنکھ نہیں بھاتے، اور ان کا شیوہ ہی اسلام کی عداوت ہے، مغربی ممالک قانون کے احترام اور حقوق انسانی کا شور مچاتے ہیں، اور ہم سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ انسان کا احترام اور قانون کا لحاظ کرتے ہیں، شام کے ایک مشہور عالم کہا کرتے تھے کہ شاید امریکہ صرف اپنے قانون کو قانون اور امریکی یا یہودی کو انسان مانتا ہے، یہ طاقتیں مسلمانوں کے لئے غمزدہ نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت اور اس کی کشش ان پر آشکار ہو چکی ہے، اور ان کو ڈر لگتا ہے کہ مغرب کی کھلی فضا میں کہیں اسلام چھا نہ جائے، اور ان کی ساری ناانصافیوں، بے اعتدالیوں اور شہوانیت پر روک لگا دے؛ اس لئے وہ اسلام کا ہوّا کھڑا کر کے سیدھے سادے لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنے اور باعمل مسلمانوں کو ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس مضبوط آواز نہیں جو اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کر سکے، جن پر یہ ذمہ داری تھی انھوں نے مخالف طاقتوں سے ہاتھ ملا لیا اور ان کے آلۂ کار بن گئے، یا ان کو اپنے مسائل سے ہی فرصت نہیں، اکا دکا جو آوازیں اٹھتی ہیں ان سے نپٹنے کے لئے مغرب نے الگ الگ انتظامات کر رکھے ہیں۔

جو صرف دنیا کے لئے جیتے ہیں ان کے لئے چارہ کی کمی نہیں، ان کے آؤ بھگت کے لئے لوگ آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں، پریشانی ان کے لئے ہے جو دین کا سودا کرنے کو تیار نہیں، ان کے لئے حالات بہت مشکل ہیں۔

بخاری کی روایت کے مطابق جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تنگ آ کر مکہ چھوڑ کر جانے لگے، تو ایک عرب سردار نے ان کو روکا، اور ان کی حمایت میں پوری طاقت سے مداخلت کی، پھر بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے کچھ حقوق سے دست بردار ہونا پڑا؛ حالانکہ مشرکین مکہ کے مطالبات نہایت غیر معقول اور ناجائز تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر جس طرح مشرکین نے اپنی شرطیں منوائیں، ہر کوئی جانتا ہے، ہم نے بھی معلوم وجوہات کی بنا پر اپنے بہت سے حقوق سے دست برداری قبول کر رکھی ہے؛ لیکن ہم میں اور اسلاف میں فرق ہے، اسلاف اپنے حقوق کے لئے کوشاں رہے بالآخر انھوں نے سب کچھ پالیا جو کھویا تھا، اور ہم اطمینان سے سو گئے، نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن ہم سے ہمارے حقوق چھینے جاتے ہیں۔

جنوبی امریکہ کے دو ملکوں کا میرا اپنا مشاہدہ ہے، ایک ارجنٹینا کا، بہت خوب صورت ملک ہے، رقبہ میں ہندوستان سے کچھ ہی چھوٹا ہے، اور آبادی تین کروڑ کے آس پاس ہے، وہاں کے باشندے زیادہ تر اسپین اور اٹلی سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف اسپینی زبان بولی جاتی ہے، شہروں اور بستیوں کی پلاننگ قابل دید ہے، خوردنی اشیاء، انواع واقسام کے پھلوں اور گوشت کی اتنی فراوانی ہے کہ پوری دنیا اور خاص طور پر عرب ممالک کو بڑی مقدار میں ایکسپورٹ کرتا ہے۔

اس ملک نے یہ پالیسی بنائی کہ کسی سیاہ فام کو بسنے نہیں دے گا، اور یہاں رہنے والے صرف وہی نام رکھ سکیں گے جس کو یہ منظور کرے گا، عرب قومیت کے عروج اور خلافت عثمانیہ سے مخاصمت کے دور میں عربوں کی ایک بڑی تعداد شام، لبنان اور ملحقہ علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں چلی آئی، جن میں عیسائیوں کے ساتھ ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنے کو مسلمان کہتے تھے، ارجنٹینا کے ساحل پر پہونچتے ہی ان کے نام بدل گئے، انھوں نے مکمل طور پر خود کو مقامی تہذیب وتمدن کے سانچے میں ڈھال لیا، اب ان میں اور دوسروں میں صرف اتنا فرق رہ گیا ہے کہ ان کے کچھ افراد اپنی شادیاں گرجا گھروں میں پادری سے کرانے کے بجائے

مسلمان قاضی سے کراتے ہیں، اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک اسلامی مرکز بنا رکھا ہے، اسی میں جمعہ اور عیدین کی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، باقی کسی بھی چیز میں یہ دوسروں سے الگ نہیں ہیں، عیسائیوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر تقریبات مناتے ہیں، انھیں کی طرح ملتے، کھاتے، پہنتے اور تعلق کے اظہار کے لئے مرد وزن بوس وکنار ہوتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ ان کے اسلامی مرکز میں آرائش کے لیے در و دیوار پر چھوٹی چھوٹی مورتیاں بنی ہیں، اور ایک بہت بڑی تانبے کی مورتی مین گیٹ کے سامنے نصب تھی، جو بڑی مشکل سے ۱۹۸۰ء میں ہٹائی گئی، ان کی اپنی رقص گاہیں اور کلب ہیں جن میں یہ خوب فن کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ لیکن بیس سال پہلے تک نہ ان کے یہاں مسجد تھی اور نہ دینی مدرسہ، ان کے لئے مصر سے ایک سرکاری امام آتا تھا، جس کو یہ امام المسلمین کہتے تھے، اور وہ بھی یہاں آکر انھیں کے رنگ میں رنگا رہتا تھا۔

بھلا ایسے لوگوں سے کسی کو کیا تکلیف ہوگی؟ یہ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ ترین مناصب تک پہونچتے ہیں، ان میں صدر جمہوریہ بھی ہوا، لیکن وہاں کا میڈیا جس پر یہودی ذہنیت حاوی ہے اسلام اور مسلمانوں کی تضحیک کرتا رہتا ہے اور کسی کی پیشانی پر بل نہیں آتا۔

دوسری طرف جنوبی امریکہ کے دوسرے سرے پر گھانا ہے، اس کا رقبہ بھی کم نہیں؛ لیکن آبادی تھوڑی ہے اور ملک پسماندہ ہے، یہاں انگریز گنّے اور دھان کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے ہندوستانی مزدوروں کو لے آئے، جن میں تقریباً بیس فیصد مسلمان تھے، اس سے متصل جنوب میں ایک دوسرا ملک سورینام ہے، یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

یہ مسلمان غریب مزدور تھے، ان پڑھ تھے؛ لیکن ان میں دین کی لگن تھی، وہ مسلمان بن کر رہنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے مسجدیں بنائیں، مدرسے قائم کئے، اپنے نام وشناخت کی حفاظت کی، آج ان کی بستیوں میں جانے والا ایسا محسوس کرے گا جیسے برصغیر کی کوئی مسلم بستی ہو، میلوں گھنے جنگلات سے گزریئے آپ کے سامنے بار بار یہ منظر آتا رہے گا۔

ہمیں خود طے کرنا ہے کہ ہم کیسے جئیں، اگر ہم مسلمان رہ کر جینا چاہتے ہیں تو مشکلات آئیں گی، اور صبر کے ساتھ حکمت سے ان پر قابو پانے کی ہم کو کوشش کرنی پڑے گی، ہم اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ اب مشکلات کا خاتمہ ہو چکا اور اگر مشکلات کسی طرف سے آئیں بھی تو دوسرے ہماری طرف سے ان سے نپٹ لیں گے، مختلف عقائد اور تہذیبوں کا ٹکراؤ ایک حقیقت ہے، ہمیں خود اس کا سامنا کرنا پڑے گا اور حکمت کے ساتھ ان کے بیچ سے راستہ نکالنا ہوگا۔

آج عالمی دباؤ ہے، لوگوں میں بیداری اور امنگیں ہیں، ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے، کھلی فضا ہے، کام کی آزادی ہے، لوگ اپنے حقوق کو جانتے ہیں اور ان کو پانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں؛ اس لئے ٹکراؤ کا امکان بڑھ گیا ہے، اور کوئی ملک کسی قوم کو محض مصیبت سے نجات دلانے کے لئے اپنے یہاں بسانے کو تیار نہیں اور نہ ہی دنیا میں کوئی جگہ خالی ہے جہاں مصائب کے ماروں کو لے جا کر آباد کیا جا سکے؛ اس لئے ہم کو کوئی اور ہی راستہ تلاش کرنا پڑے گا، اور وہ راستہ ہوگا تحمل و رواداری کا، عدل و انصاف کا، میل ملاپ کا، ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ کا اور انسانیت کے احترام کا، اور اس فریضہ کو مسلمانوں سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ جن کو سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے: ''**ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ألا تعدلوا**'' (کسی بھی حال میں کسی قوم سے قلبی بعد تم کو عدل و انصاف سے ہٹانے نہ پائے)، اور جن کا ایمان ہے ''**کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی أنفسکم**'' (اللہ کے لئے شہادت دینے والے اور عدل و انصاف کے قائم کرنے والے بن کر رہو، گرچہ اس کی زد خود تمہارے اوپر کیوں نہ پڑے)۔

☆☆☆

دنیا میں معاصر اقلیتوں کے ساتھ سلوک کا واقعاتی مطالعہ

مولانا عبدالحی مفتاحی☆

یورپ وامریکہ میں مسلم اقلیت کے خلاف نفرت وعداوت کی ایک لہر چل پڑی ہے اور اا/ ۲۰۰۱ء کے بعد امریکہ و یورپ نے بین الاقوامی پیمانہ پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم سطح پر تحریک شروع کی ہے، یہ حقیقت میں دو تہذیبوں اور نظریوں کا تصادم ہے، اسلام اور مغربیت کی کشمکش اور حق وباطل کی جنگ ہے، جس کو قرآن کریم نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ حق کی آواز کو دبانے اور نور اسلام کو محو کرنے میں یہ طاغوتی طاقتیں اپنا پورا زور صرف کرتی رہیں گی اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی عداوت ونفرت سے مسلمانوں کا سامنا ہمیشہ رہے گا، اور تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ حق وباطل کی معرکہ آرائی ہر دور میں ہوتی رہے گی، یہ نیگیٹیو اور پوزیٹیو کا ٹکراؤ ہے۔

"ولتجدن أشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا" کا فرمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو سنایا گیا ہے، اس لئے امریکہ ہو یا یورپ یا کوئی اور مشرقی ملک، بہر صورت مسلمان جہاں جہاں اقلیت میں ہیں، وہ استحصال اور نسلی تعصب کے ساتھ ظلم وستم کا شکار رہیں۔

امریکہ و یورپ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، جن میں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو تارکین وطن ہیں، تجارت یا ملازمت کی غرض سے نقل مکانی کر کے امریکہ،

☆ ناظم اعلیٰ مدرسہ عربیہ منبع العلوم، خیر آباد، مئو

فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، آسٹریلیا، اسپین وغیرہ میں آباد ہو گئے، یہ مسلمان اپنے ساتھ مشرقی تہذیب، اسلامی عقیدہ ونظریہ لے گئے اور مسلمان بن کر اپنی مشرقی تہذیب کو بہت حد تک باقی رکھتے ہوئے ان کی نسلیں آج بھی ان ممالک میں وہاں کے شہری ہیں، مغربی تہذیب کی فضول کاری اور عریانیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اخلاقی وایمانی قدروں نے اور کچھ مسلمانوں سے میل جول کے باعث ان ملکوں کی عوام نے اسلامی تعلیمات کو سمجھا اور مسلمانوں کے پاکیزہ تہذیب کو دیکھا پرکھا اور یورپی زندگی کی مصنوعیت، لادینیت سے اکتائے بے چین دلوں نے اسلام میں سکون قلب پایا تو وہ مسلمان ہونے لگے، اس طرح تارکین وطن مسلمان اور یورپین مسلمانوں نے ایک مسلم اقلیت کی شکل اختیار کر لی ہے، اس وقت جو سروے اور تحقیقاتی رپورٹیں مہیا ہیں ان کے مطابق:

۱۔ فرانس میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے۔ تیرہ سو (۱۳۰۰) مساجد اور اسلامی سینٹر اور چھ سو (۶۰۰) اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں ہیں۔

۲۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ ہے۔ چھ سو (۶۰۰) مساجد اور چار سو (۴۰۰) اسلامی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔

۳۔ جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد چار لاکھ ہے۔ چودہ سو (۱۴۰۰) مساجد اور اسلامک سینٹر کام کر رہے ہیں۔

۴۔ اٹلی میں مسلمانوں کی تعداد دس لاکھ ہے اور چار سو (۴۰۰) مساجد اور اسلامک سینٹر ہیں۔

۵۔ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے ستر لاکھ تک ہے۔ پندرہ سو (۱۵۰۰) مساجد اور اسلامک سینٹر کام کر رہے ہیں۔

۶۔ سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہے۔ چار (۴) مساجد ہیں۔

۷۔روس میں مسلمانوں کی کل تعداد دو کروڑ تیس لاکھ ہے۔

ان ملکوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں شرح پیدائش زیادہ ہے، اسلام دشمن یہودی میڈیا نے زور وشور سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا ہے کہ مسلمانوں کی شرح پیدائش کے مدنظر بہت جلد یہ ممالک مسلم اکثریت میں تبدیل ہو جائیں گے، جس سے ان ملکوں میں عیسائی اور یہودی اور دوسری مذہبی قومیں اقلیت میں آ جائیں گی، اگر اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی سرگرمیوں پر بندش نہیں لگائی گئی، تو قریب ہے کہ عیسائیت و یہودیت جو یورپین ممالک کا اصل مذہب ہے نیست و نابود ہو جائے گا اور یہودیوں کو خاص طور پر اسلام کی اشاعت میں عظیم تر اسرائیل کا تصور فنا ہوتا نظر آ رہا ہے، مذکورہ یورپین ممالک کی شرح پیدائش اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے یورپین افراد کی کثرت پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں، ہالینڈ میں پیدا ہونے والے بچوں میں پچاس فیصد مسلم بچے ہوتے ہیں یعنی اصل عیسائی باشندوں میں شرح پیدائش بہت کم ہے، وہاں پر قائم عیسائی تنظیموں کو خطرہ ہے کہ اگر یہی صورت حال رہی تو پندرہ سال کی مدت میں ہالینڈ کی نصف آبادی مسلمان ہوگی۔

بلجیم جو چھوٹا یورپی ملک ہے، مسلمانوں کی موجودہ تعداد پچیس فیصد ہے، بلجیم حکومت کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۵ء میں یورپ میں نومولود بچوں میں ایک تہائی مسلمان ہوں گے، جب کہ ماہرین آبادیات کا کہنا ہے کہ یورپ میں ۲۰۲۰ء تک کل آبادی کی دس فیصد تعداد مسلمان ہوگی، اس وقت یورپ کے کل ملکوں میں آباد مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ پچھتر لاکھ کے قریب ہے، امریکہ کے ایک تحقیقی ادارہ کے سروے اور اندازے کے مطابق ۲۰۲۵ء تک زمین پر آباد نفوس میں ایک تہائی مسلمان ہوں گے، جبکہ ۴ء۱۳ فیصد ہندو ۲۰۲۵ء تک صرف ۷ء۵ فیصد رہ جائیں گے، اور یہودی ۷ء۳ فیصد سے بہت کم ہو کر صرف دو فیصد رہ جائیں گے، ابھی چند ماہ قبل امریکہ کے ایک تحقیقاتی ادارے کے سروے کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب

ستاون کروڑ ہے یعنی دنیا کا ہر چوتھا آدمی مسلمان ہے۔

فرانس نے نئے مسلمان ہونے والے فرانسیسی باشندوں کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے، جب کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسکالر عبدالکریم مراد کا کہنا ہے کہ تارکین وطن فرانسیسی مسلمانوں کے علاوہ اصل فرانسیسی ایک لاکھ کے قریب مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں، جرمنی میں مسلمانوں کا تناسب ۳ء۰ ۳ فیصد ہے، جرمنی کے وفاقی شماریاتی آفس کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کا یہی حال رہا تو ۲۰۵۰ء میں جرمنی ایک مسلم ریاست بن جائے گا۔

ایک عجیب صورت حال مغربی ماہرین کے لئے یہ ہے کہ ۲۰۰۱ء کے بعد جب کہ امریکہ اور یورپ نے اپنی منافقانہ رواداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھل کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے اور ہر طرح سے اسلام کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈہ کر کے مسلمان ہونے سے یورپی اور امریکی باشندوں کو روکنے کی کوشش ہو رہی ہے، دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے افراد کی تعداد میں اسی سرعت سے ۲۰۰۱ء کے بعد اضافہ ہوا ہے، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ اور اس کے انہدام کے بعد جس بے غیرتی سے جھوٹ بول کر اس کو القاعدہ اور مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا اور امریکہ اور یورپ کا میڈیا جس کا ۸۰ ر فیصد حصہ یہودیوں کے قبضہ میں ہے، پوری شدت سے اسلام مخالف پروپیگنڈہ میں مصروف ہوا اور اہانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنی تعلیمات کے خلاف جو سلسلہ اور تحریک چلائی گئی، اس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ اسلام اور رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام کی حقانیت اور محمد عربی کی رسالت وصداقت کے نقوش دلوں میں بیٹھتے گئے، اس طرح نومسلموں کی تعداد میں اچانک گزشتہ سالوں کے مقابلہ میں پندرہ تا بیس فیصد سالانہ اضافہ ہو گیا، اس صورت حال نے صلیبی عناصر اور صہیونی لابی کو مسلمانوں سے خوف زدہ کر دیا ہے، لہٰذا یورپ وامریکہ کے حکمرانوں، سیاست داں اور اسلام سے بغض وعناد رکھنے

والے انتہا پسند اب طرح طرح کے الزامات اور بہتان پر آ گئے ہیں اور اسلامی شعائر پر حملوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خلاف احتجاج اور ان پر حملے بھی کرنے لگے ہیں، سوئٹزرلینڈ میں ابھی اسی خوف کے تحت مساجد کے میناروں کی تعمیر پر پابندی کا قانون تیار ہوا ہے، جو نسل پرستی کی انتہا ہے، اور لندن میں ابھی اسٹاپ اسلامائزیشن آف یورپ نامی تنظیم نے بھی مساجد کی تعمیر پر پابندی کا مطالبہ اور مظاہرہ کیا ہے، امریکہ میں کئی مقامات پر مسلمانوں کے ساتھ نسلی تعصب کو خود امریکی انتظامیہ نے تسلیم کیا ہے، ان کو ہراساں کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ پرائیویٹ کمپنیوں اور دکانوں پر ان کو ملازمت حاصل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

آسٹریلیا میں نسل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہاں ہندوستانیوں پر حملہ ہو رہا ہے اور ڈاکٹر حنیف کو دہشت گردی میں ملوث کرنے کی جو سازش گزشتہ سال ہوئی تھی، اس کا علم ہر ایک کو ہے، امریکہ و یورپ میں مسلم اقلیتوں کے خلاف یہ محض جذباتی وحادثاتی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک گھناؤنی منصوبہ بند سازش ہے، جس کے تار ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ میں منعقد صہیونی یہودیوں کے پروٹوکول سے ملتے ہیں، یہودیوں نے عظیم تر اسرائیل کے قیام کا جو خطرناک منصوبہ تیار کیا تھا، اس میں تین چیزیں خاص تھیں۔

اول دنیا کے اقتصادی ومعاشی پالیسی ساز بننا، اس کے لئے انہوں نے سونے کے ذخائر پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے نتیجہ میں آج امریکہ و یورپ کے تمام بڑے بڑے بینکوں کے مالک یہودی ہیں، دوسرے اپنے منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے بین الاقوامی سطح پر ذہن سازی کرنا تھی، اس لئے میڈیا پر قبضہ ضروری تھا، آج امریکہ کے الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کا اسّی فیصد یہودیوں کے قبضہ میں ہے، امریکہ کے تمام بڑے اخبارات، رسائل اور ٹی وی چینلز یہودیوں کے قبضہ میں ہیں، کئی ہزار اخبارات ورسائل امریکہ میں نکلتے ہیں، جبکہ اس کے ماتحت دنیا کے تمام ملکوں میں چار ہزار سے زائد اخبارات اور ٹی وی چینلز کام کرتے ہیں اور تمام

عالمی نیوز ایجنسیاں جو خبریں فروخت کرتی ہیں اور جن پر دنیا کے اکثر اخبارات ورسائل کی زندگی موقوف ہے، سب یہودیوں کے قبضہ میں ہیں۔

لہٰذا اسلام اور مسلم اقلیت کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے، وہ حق وباطل کا خطرناک ٹکراؤ ہے، جس نے اس وقت جنونی کیفیت اختیار کرلی ہے، اس لئے کہ یورپ میں اسلام کا فروغ یہودیوں اور صلیبیوں کے ناپاک منصوبوں کے بالکل برعکس عمل ہے اور بوکھلاہٹ میں ان دشمنان حق کی نفرت وعداوت نے شدت اختیار کرلی ہے، وہ ہر حال میں مسلمانوں کو کمزور، اور بے حال دیکھنا چاہتے ہیں۔

امریکہ کے ایک صحافی کرسٹوفر کاڈویل اپنے ایک مضمون ''یورپ کے انقلاب پر تاثرات'' میں لکھا ہے کہ دوسرے ملکوں سے نقل مکانی کرکے آنے والے ایشیائی مسلمانوں سے یورپ کو ویسا ہی خطرہ لاحق ہے، جیسا کہ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب سے روس میں رونما ہوا تھا، اس کا کہنا ہے کہ یورپ میں ہر جگہ مسلمان نظر آتے ہیں اور اہل یورپ مسلم اقلیت سے شکست کھاتے نظر آتے ہیں، کرسٹوفر کاڈویل کا یہ مضمون یورپ وامریکہ میں کافی مقبول ہورہا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آج کل اسلام سے یورپ کو خطرہ کے عنوان پر مضامین اور کتابیں لکھی جارہی ہیں، جو اسلام سے خوف زدہ یورپین معاشرہ میں پذیرائی حاصل کررہی ہیں، ایک امریکی مصنف کہتا ہے کہ بہت جلد مسلمان یورپ پر حاوی ہوجائیں گے، نیویارک ٹائمز جو امریکہ کا کثیر الاشاعت یہودی اخبار ہے، اس قسم کے مضامین بہت اہتمام سے شائع کرتا ہے بروس باربر نامی امریکی مصنف کی کتاب '' ہتھیار ڈال دو — اسلام کی میزبانی آزادی کو فنا کردے گی'' کو نیویارک ٹائمز نے پیغام بیداری قرار دیا ہے، اس میں یورپین مسلمانوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے، ہم کو اس مخالفت اور مسلم اقلیت کے تئیں جنونی انداز اختیار کرنے والی نفرت کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا ہے تاکہ حقیقت آشکارا ہوسکے، میرا اپنا عقیدہ ونظریہ ہے کہ یہ ایک فطری

تصادم ہے، یہ دو متضاد تہذیبوں کا تصادم ہے، جس کو قرآن کریم نے حق و باطل سے تعبیر کیا ہے، مفکر اسلام علی میاں ندویؒ نے ''اسلام اور مغربیت کی کشمکش'' میں اس پر بڑا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے، جس کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۹۳ء سموئیل نامی یہودی مصنف نے امریکہ سے نکلنے والے ''فارن افیئرز'' رسالہ میں لکھا تھا، دور جدید کا تصادم دراصل خیر و شر کا تصادم ہے، خدائی ہدایت کی اطاعت اور انحراف کا تصادم ہے، یہ سراسر اسلام اور غیر اسلام کا تصادم ہے، یہ صرف کلچر اور تہذیب کا تصادم نہیں بلکہ عقائد و عبادات کا بھی، لیکن اس کو پس پردہ رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی سازشی فطرت اور حق سے عناد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے اور صاف طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ''ولتجدن أشد الناس عداوة للذین آمنوا الیهود والذین أشركوا'' (اور ضرور بالضرور یہود اور مشرکین کو اہل ایمان کا سب سے سخت دشمن پائیں گے)۔

یہودیوں کی پوری تاریخ اسلام دشمنی سے بھری ہے، یہ ملعون قوم ہر دور میں فتنہ انگیزی اور دسیسہ کاری کرتی رہی ہے، آج امریکہ اور یورپ میں جو تحریکیں مسلم اقلیت اور اسلامی شعائر کے خلاف چل رہی ہیں، یہ حقیقت میں یہودیوں کی ایما اور اشارہ پر چل رہی ہیں، اس لیے کہ امریکی سیاست پر یہودیوں کا کنٹرول ہے، امریکہ میں یہودی صرف چھ فیصد ہیں، لیکن امریکی سرمایہ دارانہ نظام کی لگام انہیں کے ہاتھوں میں ہے، بینکنگ پر ان کا تسلط ہے۔

امریکی میڈیا کا اسّی فیصد حصہ یہودیوں کے قبضہ میں ہے، ہتھیار ساز بڑی بڑی فیکٹریاں یہودی سرمایہ داروں کے ماتحت ہیں، گویا امریکی سیاست کے پالیسی ساز دراصل یہودی ہیں اور امریکہ کا کوئی بھی صدر یہودیوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔

ابھی گزشتہ سال جون میں صدر براک اوباما نے مصر میں عالم اسلام کو خطاب کرتے

ہوئے کہا تھا کہ ہم کو افسوس ہے کہ مسلمانوں کو دہشت گردی میں بدنام کیا گیا اوران پر زیادتیاں ہوئیں، ہم اس کی تلافی کریں گے، ہم اسلام اور مسلمانوں کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے، ہم شکوک وشبہات کو ختم کرنا چاہتے ہیں، صدر براک اوباما نے سابق صدر جارج بش کی جارحانہ پالیسی کے نتیجہ میں امریکہ کی بدنامی اور عالم اسلام کی امریکہ سے دوری کے احساس سے یہ سب باتیں کہیں تھیں، مگر عملی طور پر وہ خود ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے، ان کے اس بیان کی امریکہ لابی نے سخت مذمت کی تھی اور دیواروں پر اسلام مخالف پوسٹر چسپاں کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ عہدۂ صدارت کو باقی رکھنا ہے، تو پھر ہمارے نظریہ کے تحت کام کرنا ہوگا، لہٰذا فلسطین اور اسرائیل کے مسئلہ کا کوئی حل نکالنے کی کوشش نہیں ہوئی، امریکہ میں مسلم اقلیت پر ہورہی زیادتیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے، امریکہ کی مساجد پر خفیہ ادارے نگاہ رکھ رہے ہیں اور اماموں کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کی خبریں ہیں، مصر میں اگر براک اوباما نے اسلام کی صلح پسندانہ تعلیمات کا اعتراف کیا تھا اور قرآن کریم کی آیت سے اسلام کی امن پسندی کا ثبوت دیا، تو اس کے معاً بعد فرانس کے صدر نکولس سرکوزی نے پردہ کے خلاف یہ بیان جاری کردیا کہ فرانسیسی معاشرہ میں پردہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کہا کہ مسلم عورتوں کو عوامی جگہ پر پردہ کرنے سے روکا جائے، یہ سب واقعات اتفاقی نہیں بلکہ وہی ازلی تصادم ہیں، جو ہر دور میں جاری رہا ہے، اسلام کے آفتاب جہاں تاب کو غروب کرنے اور اسلام کے روشن چراغ کو گل کرنے کے لیے ان سازشی عناصر نے ہر دور میں کوششیں کی ہیں اور آج ایک نئے انداز میں یہ تصادم ہمارے سامنے ہے، ہم کسی احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر اس کو قدرت کی آزمائش سے تعبیر کرنے کا حوصلہ پیدا کریں اور یہ غور کریں کہ اس کا مقابلہ کس انداز سے کیا جائے۔

دنیا میں مسلم اقلیت کے خلاف یورپی وایشیائی ممالک میں جو عناصر سرگرم ہوئے، اس میں خاص کر حکومتوں کی سرپرستی اور یہودیوں کی منصوبہ بندی کا بڑا کردار ہے، مغربی میڈیا نے

جس شدت سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منفی پروپیگنڈہ شروع کیا ہے، اس کا الٹا اثر ظاہر ہورہا ہے، جس کی طرف میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یورپ وامریکہ میں اسلام فروغ پارہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ منفی پروپیگنڈہ نے یورپین عوام کی اکثریت پر مثبت اثر ڈالا ہے، ہم کو اسی نہج پر کام کرنے کی ضرورت ہے، حکومتوں سے احتجاجات کرنا لا حاصل ہے، اس کا خمیازہ ہم مسلمان بھگت چکے ہیں، یورپ میں اسلام کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یا قرآن کے بارے میں جو بیہودہ بکواس اور اہانت آمیز حرکات ہوتی ہیں، ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس سے مسلمان جنون وغضب میں آکر توڑ پھوڑ کریں گے، ہنگامے اور فسادات ہوں گے اور اس طرح مغربی میڈیا اپنی عوام کو دکھا سکے گا کہ دیکھو مسلمان غیر مہذب، وحشی اور انسانیت دشمن، قانون شکن ہیں، یہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ فکر کو برداشت نہیں کرتے، آپ خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب بھی کسی غیر اسلامی اہانت آمیز عمل پر خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی تصویر ہو یا سلمان رشدی کی ''شیطانی آیات'' اور تسلیمہ نسرین کی کتاب ''لجا'' پر زبردست احتجاج کیا اور شعلہ بار تقاریر سے ماحول کو گرمایا تو مغربی چینلوں، اخباروں نے اس کی تصاویر کو اعلیٰ پیمانے پر نشر کیا اور شائع کیا، پھر اس پر مسلسل مضامین آتے رہے، یہیں بات ختم نہیں ہوئی بلکہ ان سب بدکردار مصنفوں کو راتوں رات عالمگیر ادیب بنا دیا، ان کو ایوارڈ سے نوازا گیا، مغربی ملکوں میں ان کا زبردست استقبال ہوا، یہ ادیب ومصنف زرخرید ہوتے ہیں ان کو استعمال کرکے صلیبی اور صہیونی عناصر یورپین عوام کو اسلام سے ڈراتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں سے دور رہیں۔

جن جن ملکوں میں مسلم اقلیت کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ ہورہا ہے اور اسلام کو بدنام کیا جارہا ہے، وہاں کی عوام میں اسلام کے بارے میں جانکاری کا جذبہ بیدار ہورہا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم اپنی دعوتی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے زبردست پیمانے پر اسلام کا تعارف کرائیں اور اسلام کی عملی تصویر اپنے کردار وعمل سے پیش کریں، ہمارے سامنے اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے، جب مشرکین مکہ اور یہودیوں نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے ادیبوں، شاعروں کو میدان میں اتارا اور ہجو کی تحریک شروع کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا۔ ''**قولوا لهم مثل مايقولون لكم**'' (ابوداؤد) (تم بھی ان سے اسی طرح ہجو کرو، جس طرح وہ تمہاری ہجو کرتے ہیں)، اس زمانہ میں اشعار کے ذریعہ مدح سرائی کر کے کسی کو شہرت وعزت دی جاتی تھی اور ہجو کے ذریعہ ذلیل ورسوا کیا جاتا تھا، جو بہت تیزی سے پھیل جاتا تھا۔

آج ہم کو اسی نہج پر کام کرنا پڑے گا اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مسلم اقلیت جہاں بھی ہوگی، اس کے ساتھ تعصب اور نسل پرستی کا معاملہ ہوگا، خود ہمارے ہندوستان کا جو حال ہے، ہم ساٹھ سال سے دیکھ رہے ہیں، اس سے قبل انگریزوں نے جس طرح ہندو مسلم منافرت پیدا کی وہ ہر ذی شعور محقق جانتا ہے، تو ہماری کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ مختلف زبانوں میں اسلام کا تعارف ہو، اسلامی میڈیا کے ذریعہ ہی یہ کام ممکن ہے، میں یہ بتا تا چلوں کہ ہم کو جس پیمانے پر اسلام کی تبلیغ کرنی تھی وہ سلسلہ موقوف ہے، عیسائی مشینریوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہر ملک میں سرگرم ہیں، بائبل کے چار ہزار زبانوں میں تراجم کرا کے پوری دنیا میں تقسیم کیے گئے ہیں، چھوٹی سے چھوٹی زبان جو کوئی بہت ہی محدود علاقہ میں بولی جاتی ہے، اس زبان میں بھی بائبل تقسیم کی گئی ہے جب کہ ہم نے قرآن کریم اور احادیث رسول کو دو سو زبانوں میں بھی منتقل نہیں کیا ہے۔

اسلامی پریس، اسلامی چینل اور اسلامی روایات کے ذریعہ ہی شکوک وشبہات کم کیے جاسکتے ہیں، ختم تو کسی صورت میں نہیں ہوں گے، اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ان ملکوں میں اسلام کا غلبہ ہو، اور ایک وجہ ہماری ناکامی کی اور ہے، جو سب سے اہم ہے کہ خود ہمارے مکاتب فکر میں اتنا زیادہ ٹکراؤ ہے اور آپس میں اتنی زیادہ دوریاں ہیں کہ کسی ایک تنظیم کی سرگرمیوں کی

تائید کے بجائے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔

صہیونی یہودیوں نے ایک کام اور کیا ہے کہ وہ اسلام مخالف پروپیگنڈہ کے ساتھ ساتھ ایسی نام نہاد اسلامی تنظیمیں بناتے ہیں، جو ملکی اختلافات کو فروغ دیتی ہیں، پاکستان و فلسطین میں یہ کام بہت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے، سنی زرخرید علماء سے شیعوں کے خلاف کتابیں اور پمفلٹ لکھا کر طبع کراتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں، شیعہ زرخرید علماء سے سنیوں کے خلاف لکھواتے ہیں، مساجد کے ائمہ سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، اس کا اعتراف موساد کے ایک فلسطینی جاسوس نے کیا ہے، جو کئی رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔

☆☆☆

اسلام فوبیا کے ازالہ میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت و معنویت

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ☆

چودہویں صدی ہجری میں عالم اسلام نے مغربی دنیا سے شدید علمی وفکری مزاحمت کے بعد جو برتری ثابت کی اور جس کے نتیجے میں بہت سے علاقوں میں اسلام نے پھر سے اپنے قدم جمائے، وہاں اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی اقدار اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی واضح اور عمدہ تعلیمات نے لوگوں کو متاثر کرنا شروع کیا، عیسائیت کی سمٹتی طنابیں اور یہودیت کی مادیت سے قربت اور مذہب سے دوری کی وجہ سے اسلام لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا، جس سے مغربی استعمار کو خطرہ لاحق ہوا اور ایسا انہیں محسوس ہونے لگا کہ اسلام دنیا کی بڑی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے، اس احساس نے ان کے اندر اسلام سے خوف پیدا کر دیا اور وہ اسے ہوّا بنا کر فوبیا کے شکار ہو گئے، فوبیا نارمل حالت کو نہیں کہتے، یہ Abnormalfear ہوتا ہے، یہ لفظ انگریزی سے منتقل ہو کر ان دنوں عربی میں اسی معنی میں استعمال ہو رہا ہے، چنانچہ عربی میں اس کے معنی ”هلع مرض من شئ معين“ مریضانہ انداز میں کسی معین چیز کا ہوّا کھڑا کر دینا کے ہیں، یہ ہوّا ادباء، شعراء، مفکرین، میڈیا، دانشور، سیاست داں و حکمراں سبھی طبقہ کی طرف سے کھڑا کیا گیا، اور ایسا ماحول بنایا گیا کہ کبھی تہذیب وثقافت اور کبھی آئیڈیالوجی کے لوگ اسلام سے

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ

خطرہ محسوس کرنے لگے، اس خطرہ کے پیش نظر انہوں نے ایسی پالیسیاں بنائیں اور ایسے اقدام کیے جس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت کی آگ بھر دی، مستشرقین یورپ نے غلط پروپگنڈہ کر کے نفرت کی اس آگ کو خوب خوب ہوا دیا، اور شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کے پھیلانے کا کام منصوبہ بند انداز میں کیا گیا جس کی وجہ سے غیر مسلم دنیا یقین کرنے لگی کہ اسلام تشدد، زبردستی، بے لوچ، کٹر پن، تعصب اور تنگ نظری کا مذہب ہے، انہوں نے اپنے منصوبہ کی بنیاد جن اصول ودفعات پر رکھی، اسمیں ایک اصول یہ طے کیا کہ اسلامی معاشرہ سے ایسے طریقے سے نفرت دلائی جائے، جس سے ہماری دشمنی طشت ازبام نہ ہو اور ہم دینی و روحانی اقدار میں عیوب ونقائص نکال کر اسے تہہ وبالا کرنے میں کامیاب ہو جائیں (دیکھئے: کلمۃ الحق ماہ محرم ۱۳۸۷ھ مطابق اپریل ۱۹۶۴ء)۔

اس مہم میں بڑا حصہ یہودیوں کا رہا، یہودیوں کی انٹرنیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۰ء نے قرارداد پاس کیا کہ "ہم صرف اس پر اکتفا نہیں کریں گے کہ دین داروں پر فتح حاصل کریں، ان کی عبادت گاہوں پر غلبہ حاصل کرلیں بلکہ ہمارا بنیادی اور اصل مقصد ان لوگوں کے وجود کو ختم کرنا ہے"۔ ماسونی مجلّہ کا سیا ۱۹۰۳ء میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ ہمیں دین کو حکومت سے جدا کرنا ہے اور ایسی جدوجہد کرنی ہے کہ ماسونیت دین کی جگہ لے لے اور اس کی محفلیں عبادت گاہوں کی جگہ لے لیں، ماسونی مشرق اعظم نے ۱۹۱۳ء میں انسانوں کو مقصود بنانے اور خدا کو چھوڑنے کی تجاویز پاس کیں اور بلغراد کی ماسونی کانفرنس ۱۹۲۲ء نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم ماسونی دین کے دشمن ہیں اور ہمیں دین کے آثار اور علامات کے خاتمہ کی کوشش میں کوتاہی نہیں کرنی چاہے، عیسائی دنیا نے بھی اس جدوجہد میں حصہ لیا اور ساری توجہ مسلمانوں سے اسلامی فکر کے خاتمہ اور خدا سے ان کے تعلق کو منقطع کرنے پر صرف کردیا، ان کی جدوجہد کا مرکزی محور مسلمانوں کی وحدت کو ختم کرنا، پارہ پارہ کرنا رہا؛ تاکہ مسلمان

کمزور، ذلیل اور بے سہارا ہو جائیں، ان کے یہ منصوبے وقتاً فوقتاً کامیاب ہوتے رہے، خلافت اسلامیہ کا خاتمہ، ترکی کے دستور سے اسلامی اساس کو نکال باہر کرنا، عراق و افغانستان میں مسلمانوں کی قوت وطاقت کا زوال اور عراق کے مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا، اسی منصوبے کے نتائج ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، جو لوگ کچھ اور نہیں کر سکے وہ تنگ نظری کے سبب، سب وشتم پر اتر آئے، نبی ﷺ کی شان میں گستاخی، چاہے وہ مضامین ومقالات کی شکل میں ہو، یا کارٹونوں کی شکل میں، اس کی تہہ میں یہی جذبہ کارفرما ہے، اس کی بھی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکا جائے اور ثقافتی تقریبات منعقد نہ ہوسکیں، بعض نام کے مسلم لوگوں سے ایسے کام کروائے گئے جس سے اسلام کے طور طریقوں اور عبادات کا مذاق اڑایا جاسکے، میڈیا نے بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر کی، جیسے سب کچھ بدل رہا ہے، اس طرح اسلام فوبیا کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، بنیادی حقوق کی ساری دفعات کتابوں میں بند ہو کر رہ گئیں، اور ان کے خلاف اظہار رائے کی آزادی کا ہتھیار استعمال کیا گیا، اور ان لوگوں نے کیا، جنہوں نے دوسروں سے آزادی کے حقوق چھینے اور سلب کیے، اس صورت حال سے مسلمانوں کو ذہنی اور کبھی کبھی جسمانی اذیتیں بھی اٹھانی پڑیں، اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں ہی میں سے کچھ لوگ مغرب کے سامنے سپر انداز ہو گئے اور انہوں نے مغربی تہذیب وثقافت کو اپنانے میں خیر وشر کی تمیز کے بغیر تیزی دکھائی اور اسلامی تہذیب وثقافت کو عقیدہ، عبادات اور پرسنل لا تک محدود کر کے رکھ دیا، تدریجاً ان شعبوں میں بھی انہوں نے اسلام سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پورے طور پر مغرب کے ہم نوا ہو گئے، اس طرح اسلام فوبیا کا دائرہ مسلمانوں تک پہنچ گیا اور وہ بھی مغرب کے غلط پروپگنڈے کے شکار ہو گئے، یہ دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا ہے۔

لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے اسلام کو جاننا اور

پڑھنا شروع کیا، ان میں اس مذہب کے تئیں ایک قسم کا تجسس پیدا ہو گیا، اور اسلام کی صداقت نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا، یہی وجہ ہے کہ آج بڑی تیزی سے دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام فوبیا کے ازالہ کی شکل صرف یہ ہے کہ ہم اسلام کی واضح اور صحیح تعلیمات کو لوگوں میں پھیلائیں، مغرب میں جن کتابوں کو اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، وہ بیش تر مستشرقین کی لکھی ہوئی ہیں اور وہ قاری کو گمراہ کرتی ہیں، ضرورت ہے کہ مغرب اور یورپ کی مروجہ زبانوں میں وہاں کے معیار و مزاج کو سامنے رکھ کر اسلام کی بنیادی تعلیمات، نبی رحمت کی رحمت و محبت سے پُر احکام و ہدایات کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی جائیں اور ان سے مغرب کو روشناس کرایا جائے، ایسا نہیں کہ یہ کام نہیں کیا جا رہا ہے مقصد صرف یہ کہ جس بڑے پیمانے پر ہونا چاہئے نہیں ہو رہا ہے، اس کے لئے احمد دیدات جیسے مین ٹو مشن (Man to Mission) کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اسلام فوبیا کا ازالہ ممکن نہیں معلوم ہوتا، اب تک جس نہج پر ہم نے کام کیا ہے اس کی بنیاد بیش تر **موعظة حسنہ** پر ہے، دعوت دین کا کام حکمت کے ساتھ ہم نے کم کیا ہے، حالانکہ دعوت دین کے کاموں میں اس کو اولیت حاصل ہے، جس کا پتہ حکم خداوندی "**ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن**" سے چلتا ہے اور جس میں دعوت بالحکمۃ کو مقدم کیا گیا ہے۔

یہاں مجھے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ خود ہمارے بہت سارے عمل "اسلام فوبیا" کا سبب بن جاتے ہیں، تلواروں سے ٹپکتے خون کے اشتہارات، بابری مسجد کی تصویر کے ساتھ "الٰہی بھیج دے محمود کوئی" کا اشتہار، اور انتہائی پر امن کارواں میں تلوار کو تحفے میں پیش کرنے، جیسا عمل، دیکھنے میں جتنا بھلا معلوم ہو، دوسرے مذاہب والے اسے دہشت اور تشدد کا اشاریہ سمجھتے ہیں اور خود مسلم سماج کو ایسے اشتہارات سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، اس قسم کی

حرکتوں سے دوسرے مذاہب والے اسلام فوبیا کے شکار ہو جاتے ہیں، ہماری بے عملی اور بداعمالی بھی اسلام فوبیا کا پیغام دوسروں تک پہنچانے میں معاون ہوتی ہے؛ اس لئے ہمیں اپنے اعمال کا بھی محاسبہ کرنا چاہئے کہ کہیں دانستہ یا نادانستہ اسلام کو نقصان تو نہیں پہنچا رہے ہیں۔

اسلام فوبیا کے ازالہ کے لئے کرنے کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اسلام کے محاسن کے اظہار کے ساتھ ساتھ اسلام دشمنوں کی جانب سے مخالفانہ فکری یلغار کا علمی جواب دیا جائے، اس سے اسلامی تہذیب وثقافت پر مسلمانوں کا اعتماد بحال ہوگا، اور اسلام مخالف اعتراضات کا دفاع کیا جا سکے گا۔

اگر ہم ان امور پر توجہ دے سکے اور لوگوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا سکے، تو اگلی صدی انشاء اللہ اسلام کی صدی ہوگی۔

☆☆☆

اقلیتوں کے حقوق اور اسلام فوبیا — آزادی کے حدود

مولانا محمد ریاض الدین فاروقی ندوی ☆

یونانی اور رومی طرز فکر آج بھی مغرب پر غالب وحاوی ہے، جس کے مطابق رومی ویونانی دائرہ کے باہر سب غیر مہذب بلکہ بربریت کے علمبردار ہیں، چنانچہ مغرب اپنے سے باہر کسی قوم وملک میں مثبت اقدار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور یونان وروم ہی سے مغربی مفکرین ومؤرخین تاریخ عالم کو یورپی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اور ان کے نزدیک صرف مغربی کلچر اور مغربی تہذیب وتمدن ہی صحیح معنوں میں تہذیب وتمدن ہے، اگر مغرب نے دیگر تہذیبوں میں کوئی خوبی دیکھی یا اسے اچھائی کا کوئی پہلو نظر آیا تو بھی سب ان کے نزدیک مغربی فکر، مغربی کلچر اور تہذیب وتمدن کا پرتو نظر آیا، چنانچہ ایک اوسط یا عام یورپین یہ سمجھتا ہے کہ صرف مغرب کی تہذیب ہی دوسری تہذیبوں پر بالا دست ہے اور یہ کہ دوسری تہذیبوں (جنہیں وہ تہذیب کہنے کے لئے بھی تیار نہیں) کو مغرب اور یورپی وامریکی تہذیب سے کوئی نسبت نہیں، بزعم خود ان کی دانست میں ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ان کی نظر میں مغربی طرز زندگی ہی وہ واحد معیار ہے، جس کے مطابق دوسری تہذیبوں کو چاہئے کہ اپنے آپ کو اس میں ڈھالیں، بزعم خود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر دانشورانہ تصور، سماجی ادارہ یا

☆ ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم، اورنگ آباد، مہاراشٹر

اخلاقی قدر جو مغربی معیار پر پوری نہیں اترتی خود بخود نچلے درجہ میں گر جاتی ہے، یونان وروما ہی کی طرح مغرب بھی یہ سمجھتا ہے کہ دیگر اقوام اور ان کی تہذیبیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، زیادہ سے زیادہ دوسری تہذیبوں کو از راہ کرم اتنی رعایت دے سکتے ہیں کہ وہ تہذیب کی کتاب کے ابتدائی ابواب ہیں، جب کہ مغربی تہذیب اور اس کا طرز زندگی آخری باب بلکہ حرف آخر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغرب ہندومت اور بدھ مت کو تو کسی حد تک برداشت کر لیتا ہے گو وہ اپنے سوا کسی تہذیب اور ثقافت کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتا، لیکن اسلام سے جو بغض وعناد ہے اور مغرب کی اس سے جو عداوت ہے، وہ کسی دوسری تہذیب سے نہیں ہے، اسلام سے اس کی دشمنی اور اس کا بغض اس کی گھٹی میں پڑا ہے، حالانکہ اسلام بدھ مت اور ہندومت کے فلسفہ کے مقابلہ میں مغربی اور عیسائی و یہودی اقدار Values کے قریب تر ہے، کیونکہ اسلامی اقدار یورپی مغربی فکر کو پریشان اور ڈسٹرب کر دیتی ہے اور اس کا سبب جذباتی تعصب ہے، کیونکہ اسلام کی اقدار یورپی اور مغربی اقدار سے اتنی قریب ہے کہ وہ ان کے لئے ایک چیلنج بن جاتی ہے، بطور خاص یورپ اور امریکی سماجی وروحانی زندگی کے لئے۔

اسی لئے مغرب اسلام سے لرزہ براندام ہے، جب کہ ہندو اور بت پرست تہذیبوں اور دیگر اقدار کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لاتا، نہ اسے اپنا حریف یا مد مقابل سمجھتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس کے لئے ہمیں محمد اسد سابق لیو پولڈ کی اس تھیوری پر غور کرنا پڑے گا، اسد کہتے ہیں کہ ہم کو نفسیاتی پس منظر کے لئے بہت پیچھے جا کر مغرب اور دنیائے اسلام کے مابین تعلقات کی جانچ کرنی ہوگی، بالکل **ابتدائی** دور کے تعلقات اور ان کے درمیان تصادم کا جائزہ لینا ہوگا، مغربی ذہن آج اسلام کے بارے میں جو سوچتا ہے اور اس کا جو رویہ ہے اس فکر وطرز عمل کی جڑیں بہت گہری ہیں، یعنی یہ فکر و عمل صلیبی جنگوں میں پیوست ہے اور ان مذہبی جنگوں سے جڑا ہے، جنہیں انگلش میں Crusades کہتے ہیں، یعنی صلیبی جنگیں، یقیناً یہ بات حیرت انگیز اور چونکا دینے والی

ہے کہ کیا آج سے ہزار سال پہلے یعنی پہلی ملینیم میں واقع ہونے والی تہذیبی جنگوں کا اثر اکیسویں صدی میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، خاص طور پر اہل مغرب پر، ضرور امر واقعہ ایسا ہی ہے، جس طرح ایک فرد پر اس کے بچپن کے واقعات جوانی ہی نہیں کہولت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح قوموں کے حال پر ماضی کے ان جنگوں کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں اور نفسیات کے مطابق یہ ایک معقول اور استدلالی حقیقت ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں سے فوراً پہلے کی صدی یعنی عیسائی کلینڈر کے پہلے ہزار سال کو صحیح معنوں میں ہم مغربی تہذیب کا بچپن کہہ سکتے ہیں۔

یہ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ مغربی تہذیب زمانہ قدیم سے جس طرح اسلام دشمنی کی بنیاد پر قائم تھی، آج بھی مغربی ذہن پر اسی طرح قائم ہے، جب کہ مذہب کی گرفت مغرب پر آج کے زمانہ میں ڈھیلی پڑ چکی ہے، یہ بات اس لئے حیرت انگیز نہیں کہ ایک فرد پر بچپن میں ہونے والے مذہبی اثرات تو ختم ہو جاتے ہیں، لیکن بعض مخصوص جذبات جوان عقائد سے متعلق ہیں غیر استدلالی طور پر آخر تک قائم رہتے ہیں اور مغربی تہذیب کے ساتھ اسلام کے تعلق سے یہی معاملہ آج بھی درپیش ہے اور اسلام کے تعلق سے اس کے تمام رد عمل اسی سخت جان نفرت کے سبب ہے جو مغرب کو اسلام دشمنی یا خوف اسلام سے نجات نہیں پانے دے رہا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں ابھی اسلام ابھرا ہی تھا کہ عیسائی عفریت جو مختلف فرقوں میں بٹا ہوا تھا اسلام کے خلاف متحد ہو گیا تا کہ اسے نگل جائے، عیسائیت نے ہمیشہ اسلام اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالف عیسیٰ علیہ السلام کے روپ میں دیکھا اور دکھایا، حالانکہ قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کم حیثیت سے پیش نہیں کیا، بلکہ جو معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں قرآن میں اتنے معجزے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی نہیں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر احترام سے کرنے کی تاکید قرآن وسنت میں ملتی ہے، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کو مہاوند جیسے اہانت آمیز رکیک نام سے پکارا۔

زمانۂ دراز کے گذر جانے کے بعد آج بھی کچھ تو نہیں بدلا، ڈنمارک کے اخبار میں آج بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اہانت آمیز اور دل آزار کارٹونوں کا سلسلہ جاری ہے، یہ حرکتیں بھی اسلام فوبیا کے نتیجہ میں کرسچین یورپ سے آج سرزد ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، صلیبی جنگیں جن کا محل وقوع دوسرا ملینیم (ہزار سال بعد عیسیٰ علیہ السلام) ہے، اسلام پر عیسائی یورش کا یہ ایک اہم واقعہ ہے، چنانچہ ایک ہزار سال ہونے کو آئے، لیکن یورپ کے اجتماعی شعور سے اسلام دشمنی اور اسلام کا خوف نہیں مٹتا اور وقتاً فوقتاً ابھرتا رہتا ہے۔

نومبر ۱۰۵۹ء میں یورپ اربن دوم نے کلیر مانٹ کے مقام پر وہ کلیدی تاریخی خطبہ دیا، جس میں مسلمانوں کے خلاف زہر بھرا ہے، جس نے یورپ کو ابھارا کہ مسلمانوں کی اس بدنسلی کے خلاف جنگ کریں، جس نے مقدس ارض فلسطین پر قبضہ کر رکھا ہے، اس طرح اسلام کے خلاف سارا عیسائی یورپ متحد ہو گیا، اسلام کی آمد سے ۱۰۵۹ء تک کا عرصہ دو چار صدی سے زیادہ کا نہیں، دو چار سو سال کسی قوم کی زندگی میں فرد کے دو چار دن سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوتا، یعنی اسلام ابھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہی تھا کہ عیسائی یورپ اس کے مٹانے کے درپے ہو گیا۔

پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء سے ۱۰۹۹ء تک جاری رہی، جس کے نتیجہ میں یروشلم پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن دوسری صلیبی جنگ کے دوران ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کر لیا، غرض آٹھویں اور آخری صلیبی جنگ ۱۲۷۰ء تا ۱۲۷۱ء لاحاصل رہی جب کہ اس کا لیڈر فرانس کا لوئی ایلیون مشرق کے راستہ ہی میں مر گیا، یہ کہنے کو تو یہ مذہبی جنگیں تھیں، لیکن ازمنہ وسطی کی دوسری جنگوں کی طرح بدنظمی کا نمونہ تھیں اور غیر فیصلہ کن تھیں۔

حیرت کی بات ہے کہ یورپ عیسائیت کے نام پر اسلام کے خلاف متحد ہو کر بھی اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکا، البتہ اسلام کے خلاف اس کا رویہ یعنی اسلام دشمنی اور اسلام فوبیا اس کے دل

میں راسخ ہو گیا، مسئلہ فلسطین عالم اسلام کے سینہ میں ایک مستقل ناسور ہے، جو برطانیہ اور امریکہ کی سازش کا نتیجہ ہے، یورپ اور امریکہ مسلسل اسلام اور عالم اسلام کے خلاف سازشیں کرتے آرہے ہیں، ۱۹۱۷ء کے بالفور ڈکلیریشن اور اس کے نتیجہ میں اسرائیل کا وجود برطانوی سازش کا وہ نتیجہ ہے، جس سے سارا عالم اسلام آج تک اور پتہ نہیں کب تک مسلمانوں کے لئے باعث تکلیف رہے، اسی کا ردعمل تھا، جو پی ایل او (P.L.O.) کا قیام عمل میں آیا اور اسرائیل کے دہشت گرد حملوں کے جواب میں فلسطینی تنظیموں نے بھی دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے دیا، غرض عمل اور ردعمل کا سلسلہ چلتا رہا اور آج بھی جاری ہے۔

افغانستان پر روس کے حملہ اور قبضہ سے اسلام کو عجیب عجیب آزمائشوں سے گزرنا پڑا، مجاہدین افغانستان جن کی پشت پناہی امریکہ کر رہا تھا، اس میں حب علیؓ سے زیادہ بغض معاویہؓ کو دخل تھا، آخر پاکستان اور طالبان کی مدد سے افغانستان سے روس کو ہٹادیا گیا، تو اب باقی ماندہ افغانستان اور طالبان، بالخصوص امریکہ اور بالعموم مغرب کی دشمنی کا ہدف بن گئی، نتیجہ میں امریکہ کی شہ پر ناٹو نے افغانستان کو تہس نہس کر دیا۔

اسامہ بن لادن جو کل تک روس کے خلاف جنگ میں امریکہ کا نور نظر تھا، اب وہی اسامہ امریکہ کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا، اسامہ کی تنظیم القاعدہ اب امریکہ کے نشانہ پر تھی، القاعدہ پر الزام ہے کہ 9/11 کے امریکی ٹاورس کی سازش اسی نے رچی تھی، اسی عالمی واقعہ نے پورے یورپ اور امریکہ میں اسلام کو خوفناک بنا کر پیش کر دیا، اسی سے اسلام فوبیا بہت عام ہو گیا، اس کے بعد جہاں کہیں کوئی دہشت گردی کے واقعات پیش آئے، سب کے لئے اسلام اور مسلمانوں ہی کو ذمہ دار قرار دیا گیا، حالانکہ اس حادثہ کے دن ان ٹاورز میں کام کرنے والے سیکڑوں یہودی حاضر خدمت نہ تھے، اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟ جہاں کہیں کوئی دہشت گردی کی واردات ہوئی وہ سب مسلمانوں سے منسوب کردی گئیں اور انہیں کے کھاتہ میں ڈال دی

گئیں، امریکہ اور خصوصاً یورپ میں مسلمان اقلیتوں سے برا سلوک کیا جانے لگا، چنانچہ فرانس میں حجاب پر اعتراض کیا جانے لگا، بلکہ اسے ممنوع تک قرار دیا گیا، اسلام کا تشخص مٹانے کے لئے بہت سے اسلامی شعائر پر پابندی عائد کردی گئی، اظہار کی آزادی کے نام پر سلمان رشدی جو اہانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتکب تھا اور جو شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا اس کی حفاظت کی گئی، یہ اسلام دشمنی کے نتیجہ میں کیا گیا، تا کہ مسلمانوں کی دل آزاری ہو۔

ڈنمارک میں مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے اخبارات نے ایسے کارٹون شائع کیے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہوتی تھی اور وہ اہانت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب بنے۔

غرض پورے امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے، یہ محض اسلام فوبیا کے مظاہر ہیں، مسلم اقلیتوں کی دل آزاری کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جاتا، یہ داستان ظلم بہت طویل ہے اور وقت ناکافی بلکہ مختصر ہے۔

☆☆☆

اسلام فوبیا - اسباب اور حل

محمد ابصار الحق قاسمی☆

اسلام پر کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب اسلام دشمنوں کے فتنوں سے مسلمان محفوظ رہے ہوں، ظلمت ونور کی جنگ ختم ہونا تو دور کی بات ہے کبھی یہ جنگ ملتوی بھی نہیں ہوئی ہے، ہر ملک اور ہر زمانہ میں نئے نئے چولے بدل کر نئے نئے قسم کے اسلحوں سے اسلام پر یلغار کی جاتی رہی، لیکن اسلام، اپنے صالح پیغامات اور رب ذوالجلال کی جانب سے عطا کئے جانے والے نسخۂ کیمیا کے ساتھ قائم ودائم ہے، بلکہ اسلام کے ماننے والوں کی تعداد بڑھی ہے اور مزید بڑھ رہی ہے، البتہ اسلام کو نہ ماننے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ اور اس میں بھی اسلام دشمن عناصر کی کاریگری کے دخل سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

''اسلام فوبیا'' کی اصطلاح مغرب کی اختراع ہے اور اس اصطلاح میں اسلام دشمنی اور اسلام سے خوف ونفرت کے اجزاء شامل ہیں۔ ''اسلام فوبیا'' کا لفظ تقریباً پندرہ سال سے مغربی میڈیا نے استعمال کرنا شروع کیا، ''فوبیا'' کے لغوی معنیٰ خوف اور ڈر کے ہیں، لیکن لفظ ''فوبیا'' لفظ ''فلو'' کی طرح کچھ بیماریوں کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے، جیسے ہائیڈروفوبیا (Hydrophobia) ۔ یہ ایک ایسا مرض ہوتا ہے جس کا مریض پانی سے ڈرتا ہے یہ مرض عام طور سے سگ گزیدہ لوگوں کو ہوتا ہے، اسی طرح ایک مرض ہوتا ہے فوٹو فوبیا

☆المعہد الاسلامی، متوناتھ بھنجن

(Photophobia) اس مرض کا مریض روشنی سے ڈرتا ہے، اسی طرح ایک مرض فوبوفوبیا (Phobophobia) ہوتا ہے، اس کا مریض کسی حادثہ کو دیکھ کر خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں اسکے ساتھ بھی یہ حادثہ نہ پیش آجائے۔

اسلام دشمن عناصر نے ایک بیماری کی طرح ہی مذہب اسلام کی شبیہ پیش کرنے کے لئے اسلام کے ساتھ ''فوبیا'' کا لفظ جوڑا اور ''''اسلام فوبیا'' کو اپنی تشہیری طاقت کے ذریعہ پوری دنیا میں پھیلا کر اسلام کی شبیہ کو نقصان پہونچانے کی مذموم کوشش کی۔

''اسلام فوبیا'' کا لفظ جہاں ایک طرف خالص اسلام پسندوں کے لئے استعمال کرتے ہوئے یوں کہا گیا کہ ''افغانستان میں اسلام فوبیا پھیل گیا ہے''، اس لفظ کو خود مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور جس طرح پہلے آزاد خیال قسم کے مسلمان، مذہب پسند مسلمانوں کو ''دقیانوس'' اور ''شدت پسند'' مسلمان کہہ کر اپنی مغرب پسندی کا ثبوت فراہم کرتے تھے، اب وہ ''دقیانوسی'' کی جگہ اسلام فوبیا کا لفظ استعمال کر کے اپنا کام چلا لیتے ہیں، یہ سچ ہے کہ اسلام کا سچا ماننے والا اپنے گردوپیش کو اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور اسے ایسا سوچنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، لیکن حالات اور ملکی وعائلی قوانین اگر اس کو اس کا موقع فراہم نہیں کرتے تو اپنی مذہبی خواہشات کی تکمیل سے محروم رہتا ہے، پھر بھی اس کی یہ خواہش نہیں مرتی؛ کیوں کہ اس کی یہ خواہش ایمان کا تقاضہ ہوتی ہے، جب کہ قوم پرستی کا نظریہ رکھنے والے دیگر مذاہب کے ماننے والے اپنے گردوپیش کو مذہبی رنگ میں دیکھنے کے اتنی شدت سے خواہاں نہیں ہو سکتے؛ کیوں کہ ان پر مذہبیت غالب نہیں ہوتی بلکہ قومیت غالب ہوتی ہے، بالخصوص یورپ کی قوموں اور حکومتوں نے اپنے گرد سیاسی مقاصد کے چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ رکھے ہیں، قوم پرستی کے تخم نے انھیں ایسا شجر بنا رکھا ہے جس پر نفرت اور خوف کے ثمر ہی لگ سکتے ہیں؛ کیوں کہ نفرت اور خوف ہی قوم پرستانہ زندگی کا عنصر خاص ہے، قوم پرستی کا جوش

اور ولولہ اسی وقت فروغ پاتا ہے، جب کوئی ایسی چیز موجود ہو جس سے قوم نفرت کرتی ہو، یا ڈرتی ہو، نتیجہ کے طور پر چھوٹی چھوٹی نفرتوں اور اختلافات کی پرورش کر کے قوم کے جذبہ نفرت کو تحریک دی جاتی ہے، اس سلسلہ میں پروفیسر جوڈ کا کہنا ہے کہ:

''وہ مشترک جذبات جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں ہیں؛ بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں، جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس قوم کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کر لیں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لئے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کر لیں جس سے وہ ڈرے۔

میں ہی اگر قوموں کو متحد کرنا چاہوں تو مجھے چاہئے کہ میں ان کے لئے کسی اور سیارہ پر کوئی دشمن ایجاد کروں، مثلاً چاند پر، جس سے یہ سب قومیں ڈریں''۔ (Guid to modern wickedness - P150-51)

اسلام کے علاوہ سبھی مذاہب سے تعلق رکھنے والی اقوام پر حکمرانی کے لئے حکمراں طبقہ کو کل بھی ''نفرت'' اور ''خوف'' کی ضرورت تھی اور آج بھی ہے، چنانچہ بیشتر نے اسلام اور مسلمانوں کو نفرت اور خوف کی کاشت میں استعمال کرنے کی غرض سے پہلے تو وہ بنیادیں تلاش کیں جو اسلام کے ماننے والوں کو برتر اور نمایاں بناتی تھیں، پھر ان بنیادوں کو تلاش کرنے کے بعد ایک طویل مدتی منصوبہ کے تحت اسلام کے ماننے والوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے نام پر ایسی ایسی ایجادات پھیلائیں جس سے اسلام کے ماننے والے مذہب کی روحانیت سے محروم ہو کر ارتقاء کی رنگینیوں کے اسیر ہو گئے اور متحرک قوم کے بجائے منجمد قوم کی شکل اختیار کرتے چلے گئے، فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی۔

قوم پرست اقوام نے ایک ساتھ دو کام کئے، پہلا تو یہ کہ اسلام کے ماننے والوں

کو کردار کی عظمتوں اور اسلامی تہذیب سے خارج کرنے کا جال بچھایا اور دوسری طرف ان کے کردار کو مسخ شدہ شکل میں پیش کرنے کے لئے صیہونی ذرائع ترسیل کو تمام تر تشہیری حربوں کے ساتھ متحرک کر دیا اور اپنے خفیہ اداروں کے ذریعہ اس طرح کی وارداتیں کرائیں جو مسلمانوں کے نام سے منسوب کر کے ان کو مسلسل بدنام کیا جاتا رہے۔

یہ سب کچھ جو ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے ہو رہا ہے وہ سب قوم پرستی کی بقا کی خاطر خوف اور دہشت کی پرورش کے لئے ہو رہا ہے اور یہ واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''اسلام فوبیا'' تمام اسلام دشمن طاقتوں کو لاحق ہے، چنانچہ وہ اسلام کے پھیلنے کا خطرہ اور اپنے اقتدار کی ہلتی دیواروں کے خوف سے ''اسلام فوبیا'' کے زیر اثر ایک راستہ ہموار کر رہے ہیں اور اس کا دائرہ اثر پورا عالم ہے۔

یہ بات تو تقریباً واضح ہو گئی کہ ''اسلام فوبیا'' سے کیا مراد لیا جاتا رہا ہے اور کیا کیا مراد لیا جا سکتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ''اسلام فوبیا'' کو غیر اسلامی اقوام نے اپنے لئے کس کس طرح کار آمد بنانے کی کوششیں کی ہیں اور اب بھی کر رہی ہیں۔

جہاں تک اس کے اسباب ونتائج کا سوال ہے، اس ضمن میں کچھ ایسے معقول اسباب گوش گذار ہو چکے ہیں، رہا نتائج کا سوال تو وہ بھی کافی حد تک ہم دیکھ اور سن چکے ہیں اور مختصراً یہ کہہ کر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہیں کہ افغانستان اور عراق میں امریکہ نے جو کچھ کیا وہی سب کرنے کے لئے ہی ''اسلام فوبیا'' جیسی اصطلاح ایجاد کی گئی، جو آگ امریکہ نے لگائی اور جس آگ میں یہودیت نے پٹرول ڈالا وہ آگ خود ہمارے ملک ہندوستان تک پہنچی اور کچھ مواقع تو ایسے آئے جب پورے ملک کا مسلمان خوفزدہ اور سہا سہا نظر آیا اور ہر مسلم نوجوان، ہر شبہہ کی انگلی کا نشانہ بننے لگا، داڑھی، ٹوپی اور رومال خفت کی علامت اور دہشت کا اشاریہ بنا دیئے گئے اور یہ سراسیمگی کی فضا اس وقت بدلی جب اپنی فوج میں دشمن کا آدمی نکلا۔

اب اس سوال پر گفتگو کرتے ہیں کہ اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور ان چیلنجوں پر قابو پانے کے لئے اسلامی پیغام کی معنویت واہمیت کیا ہے؟

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اگر ہم اسلامی پیغام کی معنویت واہمیت کا احساس کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی میں شامل کرلیں تو یہ سارے چیلنج خود بخود قابو میں آ جائیں گے، یوں بھی اسلام نے انسانوں کو دو ہی حصوں میں تقسیم کیا ہے، خدا کے حامی اور خدا کے منکر، اسلام میں قومی ونسلی بنیادوں پر ملکوں اور شہروں کی حدود پر کوئی تقسیم نہیں ہے۔

اب وقت آ پہنچا ہے کہ اسلام کے اس نظام ترسیل کو اپنایا جائے جسے ''کردار'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ آج دنیا پھر اسی دوراہے پر کھڑی ہے جہاں چھٹی صدی عیسوی میں تھی اور پیغمبر آخرالزماں ﷺ نے غفلت اور مدہوشی کے عالم میں پڑے رہنے والے عربوں میں ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور انھیں اپنی مرغوبات وترجیحات چھوڑ کر انسانیت پر قربان ہونے لئے تیار کیا۔

آج ہمیں یہ عہد کرنے کی ضرورت ہے کہ:

- اب ہم احتجاج اور ماتم کے بجائے اپنی، اپنی قوم اور اپنے مذہب کے ارتقاء اور اسکے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے جدوجہد کریں گے۔
- ہم دنیا کی امامت کے لئے ہیں، امامت کے لائق بنیں گے اور امامت کریں گے۔
- تعلیم ہمارا خاصہ اور امتیاز رہا ہے، اسے واپس لیں گے خواہ اس کے لئے ہمیں رات دن محنت کیوں نہ کرنی پڑے۔
- ہم دوسری قوموں کی نقالی میں اپنا سب کچھ بھول گئے، اب ہمیں ایسا بننا ہے تا کہ دنیا ہماری نقالی کرنے پر مجبور ہوجائے۔

- اسلام کا صحیح پیغام دنیا کے سامنے پیش کرنا ہماری ذمہ داری ہے، لہٰذا ہم اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھانے کی کوشش کریں گے۔

یہی ہے وہ نسخہ ہے جو اسلام دشمن طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور مذموم حرکتوں کو پسپا کر سکتا ہے۔

☆☆☆

اسلاموفوبیا کے چیلنج کا مقابلہ، مثبت اقدامات سے

عارف عزیز☆

''اسلاموفوبیا'' دراصل ایک مریضانہ خوف کا نام ہے، جو ۲۱ ویں صدی عیسوی میں اسلام کی روز افزوں مقبولیت کے مقابلہ کے لئے ابھارا جارہا ہے، یوں اسلام کو ایک جارح مذہب کے طور پر پیش کرنا مغرب کا پرانا مشغلہ ہے، جسے وہاں کے دانشور بالخصوص مستشرقین نے عرصہ دراز سے اختیار کر رکھا ہے، آج اس مہم میں شدت اسلئے محسوس ہورہی ہے کہ مغرب کے عوام میں فکری طور پر اسلام سے متاثر ہونے کا عمل تیز ہوگیا ہے، یوروپ وامریکہ میں فروغِ اسلام کی اس لہر پر قابو پانے کیلئے مسلمان، ان کی تہذیب، عقائد، اقدار اور مذہب سے وابستہ پورے نظام پر حملے ہورہے ہیں، جارج بش کا صلیبی جنگ کیلئے لگایا گیا نعرہ ہو یا پیغمبر اسلام ﷺ پر تشدد کی تعلیم دینے کا الزام، یا جہاد کو تشدد سے تعبیر کرنے کی حکمتِ عملی، سب کے پسِ پشت ایک ہی مقصد کارفرما ہے کہ اسلام کو ایک جارح مذہب ثابت کرکے اس کی مقبولیت پر روک لگائی جائے؛ حالانکہ اسلام امن، سلامتی، اعتدال اور سہولت کا مذہب ہے، تشدد، بدامنی، انتہا پسندی، شدت اور دہشت گردی سے اسلام کا وہی رشتہ ہے جو روشنی کا اندھیرے سے، نور کا ظلمت سے اور سچائی کا جھوٹ سے ہوتا ہے۔

جہاں تک تاریخی پس منظر کا سوال ہے تو صلیب وہلال یا دوسرے الفاظ میں مغرب اور اسلام کی یہ کشمکش کافی پرانی ہے، عروج اسلام کے بعد سے عیسائی دنیا نے مسلمانوں پر کروسیڈ

☆سینئر صحافی، بھوپال

کے نام سے ایک دو نہیں سات صلیبی جنگیں مسلط کیں، جو بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح پر انجام کو پہونچیں، اُس وقت شاہ لوئی نہم نے مسلمانوں سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اہل مغرب کو نصیحت کی تھی کہ ''اگر تم مسلمانوں پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہو تو فوج کشی کے بجائے ان کے عقیدہ پر ضرب لگاؤ تاکہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں گر جائیں''۔ شاہ فرانس کی اس نصیحت پر یوروپ کے حکمرانوں سے زیادہ مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے توجہ دی، پاپائے روم کی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر گزشتہ دنوں کی گئی بے بنیاد تنقید اسی سلسلہ کی کڑی ہے، بالخصوص ان کا یہ الزام کہ ''اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا'' اس مہم کا ایک حصہ ہے جو مغرب نے اسلام کے خلاف چھیڑ رکھی ہے اور جس کا مقصد فکری و عملی سطح پر اسلام کے مقابلہ میں پسپائی کے بعد دنیا کو اُس کے بارے میں گمراہ کرنا ہے، اس طرح کے الزامات کا ماضی میں مسلم علماء و فضلاء مدلل جواب دے چکے ہیں، ہندوستان میں علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرت النبی'' لکھ کر پیغمبر اسلام ﷺ کے اعلیٰ انسانی خصائل اور فکر کی بلندی کو ثابت کیا تھا، سرسید علیہ الرحمہ بھی بدنام زمانہ ولیم میور کے سیرت النبی پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دے چکے ہیں، دوسرے مفکرین نے بھی اسلام کے اوپر عائد اس اتہام کا کہ ''یہ مذہب تلوار کے زور سے پھیلا ہے'' مسکت جواب دیتے ہوئے واضح کیا کہ اپنے ظہور کے پہلے دن سے اسلام سلامتی کا مذہب رہا ہے، دنیا جانتی ہے کہ مکہ مکرمہ جہاں سے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، وہاں تلوار حضرت محمد ﷺ کے ہاتھ میں نہیں، اُن کے نہ ماننے والوں کے قبضہ میں تھی۔

نبی پاک ﷺ پر جو حلقے جنگ باز ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں، وہ اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ۵۳ برس کی عمر تک لڑنا تو کجا، کبھی ہتھیار ہاتھ میں نہیں لیا تھا، حالانکہ اس وقت عرب معاشرہ میں لڑائی جھگڑا عام تھا، ہر شخص کم عمری سے فن سپہ گری میں طاق ہو جاتا تھا، زندگی کے آخری ایام میں مدینہ کے قیام کے دوران آپ ﷺ کو

جن خونریز جنگوں کا سامنا کرنا پڑا اُن کے محرک آپ کے حریف تھے، حضور ﷺ میدان جنگ میں تشریف لائے تو آپ نے جنگ کو بھی عبادت بنا دیا، حکم صادر ہوا کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں اور عبادت گاہوں میں کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، فرمان الٰہی تھا کہ صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑنے پر کمربستہ ہوں، تاکید فرمائی کہ دوسرا حریف صلح کرنا چاہے تو اس کی پیش کش کو قبول کرلو، نبی رحمت ﷺ تشریح فرماتے رہے کہ جنگ کا مقصد سمجھ لو، یہ نہ مال غنیمت کیلئے ہے اور نہ اقتدار کے حصول کیلئے، قرآن میں مقصد جہاد کی وضاحت یوں کی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک کے ذریعہ دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو راہبوں کی خانقاہیں، یہود ونصاریٰ کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھا دیئے جاتے، اسی لئے دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں بھی تلوار اٹھائی، اس کا مقصد اپنا اور مظلوموں کا دفاع کرنا تھا، غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا ہرگز نہیں، اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنا تھا جس میں تمام مذاہب کی آزادی برقرار رہے اور ان کے ماننے والے کسی پابندی کے بغیر اپنے مذہبی فرائض ادا کرسکیں۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی دنیا کے سامنے ہے جس سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جاسکتی کہ کسی شخص کو ایمان لانے پر مجبور کیا گیا ہو، یہی وجہ ہے مسلمانوں کے بہت سے قریبی اعزاء کی موت کفر کی حالت میں ہوئی، کفار مکہ ہوں یا یہودی قبائل، انہوں نے اسلام جیسے امن واخوت کے مذہب اور اس کے علمبرداروں کی مخالفت اس لئے کی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مساواتِ انسانی کی یہ تحریک ان کے صدیوں سے چلے آرہے استبدادی معاشرہ کو مٹادے گی؛ لٰہذا مدینہ منورہ میں جن اعلیٰ اصولوں پر اسلامی ریاست کا قیام ہورہا ہے، اس کو مستحکم ہونے سے پہلے ختم کردیا جائے، اسی مقصد سے جنگوں کا سلسلہ شروع کیا گیا، انگریز مصنف لارڈ ریڈ لے نے مذکورہ جنگوں کا تجزیہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ ان جنگجوؤں میں جارح کون اور جارحیت کا مقابلہ کون

کر رہا تھا، جنگوں کے جائے وقوع سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے، پہلی ''جنگ بدر'' اُس میدان میں لڑی گئی جو مدینہ سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے، مکہ سے طویل مسافت طے کر کے کفار مکہ وہاں پہونچے تھے، دوسری جنگ احد میں ہوئی جو مدینہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، اس جنگ میں بھی حملہ آور اہلِ مکہ تھے، تیسری جنگ ''غزوہ احزاب'' ہے، جس میں عرب تمام دشمنان اسلام بشمول یہود نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا، ان تینوں جنگوں سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حملہ آور مسلمان نہیں، اُن کے حریف تھے اور دفاع کی ذمہ داری مسلمان نبھا رہے تھے، یہ بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں نے طاقت حاصل کرنے کے بعد پہلی مرتبہ جنگ کیلئے نہیں حج کا فریضہ ادا کرنے کیلئے مکہ مکرمہ جانے کا قصد کیا تو اس امر کے باوجود کہ وہ اپنی قوت کے بل پر بآسانی وہاں پہونچ سکتے تھے، اہل مکہ نے انہیں فوراً داخلہ کی اجازت نہیں دی بلکہ ایک سال بعد کی شرط عائد کردی، آنحضرت ﷺ نے محض امن کو قائم رکھنے کیلئے اہلِ مکہ کی جملہ شرائط کو قبول کرلیا، حضور اکرم ﷺ کی امن پسندی کا اس سے بڑا شاہکار وہ مرحلہ ہے جب آپؐ مسلمانوں کے لشکر عظیم کے ہمراہ فاتح کی حیثیت سے اپنے قدیم وطن مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو جنہوں نے آپ کو اس شہر سے نکالا تھا انہیں پناہ دیدی، جنگ وخونریزی تو درکنار کسی دشمنِ اسلام کو ایک خراش تک نہیں لگی، ان کی جانیں اور املاک محفوظ رہیں، اس سے بڑھ کر اسلام کی امن پسندی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی انسانیت نوازی کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے؟

موجودہ عالم اسلام کے نقشہ پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کئی علاقے ایسے ہیں جہاں کبھی مسلمانوں نے لشکر کشی نہیں کی، انڈونیشیا، ملیشیا، مالدیپ اور افریقہ کے بہت سے ممالک میں عرب تاجر اور علماء کرام کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہونچی، ہندوستان سمیت بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں سب سے پہلے صوفیائے کرام نے اپنے خیمے ڈالے اور اخلاق کی تلوار سے لوگوں کے دل مسخر کرلئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین

بختیار کا کی اور مولانا سید کرامت علی جونپوری کے ہاتھوں لاکھوں اشخاص مشرف بہ اسلام ہوئے، یہ دلوں کو فتح کرنے والے اور محبت کی تلوار سے دشمنوں کو گرویدہ بنانے کا فن جانتے تھے، آج امریکہ و یوروپ میں اسلام قبول کرنے کی جو لہر چل رہی ہے، اس کی وجہ کونسی طاقت یا جبر ہے، اسلام کی سادگی، اصول پسندی اور فکری قوت کا ہی یہ کرشمہ ہے کہ وہاں اس مذہب کے تئیں لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

اسلاموفوبیا میں مبتلا مغربی اقوام بھی مذکورہ حقائق سے واقف ہیں، لیکن اسلام کی مقبولیت انہیں اس پر مجبور کررہی ہے کہ وہ اسلام کے خلاف جارحانہ رویہ اپنائیں، ان کے نزدیک دنیا میں کمیونزم کی شکست کے بعد اسلام ہی سب سے بڑا خطرہ ہے، آج یوروپ و امریکہ میں ہزاروں کی تعداد ہر سال اسلام قبول کررہی ہے، گزشتہ چند سالوں میں ۱۳ ہزار سے زیادہ امریکی فوجی مشرف بہ اسلام ہوچکے ہیں، یہ کسی طرح کے جبر یا ترغیب کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی تہذیب، روایات اور اصولوں کی خوبیوں کے اثرات ہیں، اسلام کی خوبیاں جوں جوں اجاگر ہورہی ہیں، لوگ اسی قدر اس کے گرویدہ بن رہے ہیں، جھوٹ، الزام تراشی یا پروپیگنڈہ کی کوئی عمر نہیں ہوتی، انہیں بالآخر سچائی کے آگے دم توڑنا پڑتا ہے، اسلام کی اہمیت فی زمانہ اس لئے بڑھ رہی ہے کہ مغرب اور اس کی تہذیب بحرانی دور سے دوچار ہے؛ کیونکہ وہ پہلی اور واحد تہذیب ہے جو بالفعل مادہ پرست اور ملحد واقع ہوئی ہے۔ اس مادی تہذیب نے انسانوں کو بے شمار مسائل کا شکار بنادیا ہے، خاندانوں میں انتشار، احترام باہمی کا فقدان، جنسی بے راہ روی اور پورنوگرافی کے ذریعہ اجتماعی وانفرادی استحصال اس کے ثمرات ہیں، اس تہذیب کو مسیحی تہذیب بھی نہیں کہا جاسکتا؛ کیونکہ وہ مادی آئیڈیالوجی کی پیداوار ہے، اور جب تک الٰہی قدروں کو اس میں جگہ نہیں دی جاتی، یہ تہذیب اسی طرح شکست وریخت کا شکار بنی رہے گی۔

"اسلاموفوبیا" کے چیلنج کا مقابلہ کیلئے جہاں مذکورہ حقائق کی تشہیر واشاعت ضروری

ہے، وہیں اسلام کی خوبیوں اور برکات سے اہل مغرب کو متعارف کرانا بھی مفید ہوگا؛ کیونکہ تجربہ میں یہ بات آرہی ہے کہ جو لوگ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اس کا مطالعہ شروع کردیتے ہیں، وہ بہت جلد اسے قبول کرلیتے ہیں اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں کہ مغرب کا آزاد خیال انسان اپنی آزادروی کو چھوڑ کر ایک پابند مذہب کو کیوں اپنا رہا ہے، مغرب کے دانشور، اِس گتھی کو سلجھانے میں اس لئے بھی ناکام ہیں کہ وہ اسلام کو اول تعصب کی نظر سے دیکھتے ہیں، دوم تحفظِ ذہنی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، بحیثیت مجموعی اسلام کی دعوت یا اس کا مثبت تعارف ہی وہ وسیلہ ہے جو ''اسلاموفوبیا'' کی مہم کا کارگر تدارک کرسکتے ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق اور اسلاموفوبیا- آزادی کی حدود

پروفیسر ایم افضل وانی ☆

اسلاموفوبیا اور آزادی کی حدود کا موضوع ایسا ہے کہ اس پر بحث کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر متعدد اہم موضوعات پر بھی بحث کرنی ہوگی اور امن، یک جہتی، بقائے باہم، جمہوریت، ضمیر کی آزادی اور ترقی کو قومی اور بین الاقوامی تناظر میں زیر بحث لانا ہوگا؛ اگرچہ خوف محض فرضی ہے، غیر حقیقی شعوری طور پر پیدا کردہ بدنیتی سے ابھارا گیا اور ساختہ پرداختہ ہے؛ تاہم اسے اچھی طرح سے مرتب کیا گیا اور منظّم طریقہ سے ہر طرف پھیلایا گیا ہے، اس کے پھیلانے میں سرکاری مشینری اور رضاکارانہ تنظیمیں دونوں ہی مستعدی سے کام کر رہی ہیں، لہٰذا اسے غیر مؤثر کرنے، پسپا اور ختم کرنے کے لئے حقائق کا معروضی انداز میں جائزہ لے کر ان کی اشاعت کرنا اور وقفہ وقفہ سے اس کے مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ لگانا ضروری ہے، یہ کام دنیا میں موجود صحیح انداز سے سوچنے والوں اور دیگر تمام مذاہب اور اداروں کے تعاون سے ہی بروئے عمل آ سکتا ہے، ان سب کے علاوہ شعوری طور پر مشکلات پیدا کر کے ان کے حقوق پر غیر واجب پابندیاں عائد کر کے اور ان کے لئے دشواریاں پیدا کر کے مسلمانوں کو تاریکیوں میں دھکیل کر مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے انہیں فنا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے یا پھر ان کے بے تیغ وسپر جاں بازوں کو اس پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ تصادم کی راہ اختیار کر کے برباد کردیں یا خود برباد ہوجائیں، یہ ان عناصر کی حکمت عملی ہے جو اسلام کے خلاف غلط فہمیاں پھیلانے میں سرگرم عمل ہیں، مسلمانوں کو تعلیمی وتربیتی مواقع سے محروم

☆ گروگوبند سنگھ اندر پرستھا یونیورسٹی دہلی ۱۱۰۰۰۶

کر کے جو وہ اپنے دین پر استقامت کے ساتھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں نفرت وحقارت اور تباہی کے میدان میں دھکیلا جا رہا ہے، یہ صورت حال مختلف ہوسکتی ہے اگر: (۱) دیگر مذاہب کے لوگوں تک اسلام کی صحیح تعلیمات کو پہنچایا جائے، (۲) مسلمانوں کو اپنے دین اسلام کی تعلیم و تربیت کے مواقع دیئے جائیں (۳) انہیں سوشل ٹکنالوجیکل اور کاروباری نظم وانصرام کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم نہ کیا جائے (۴) اور شعوری طور پر انہیں تحقیر کا نشانہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔

اس کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے دین یعنی اسلام کو جو توحید، انسانی اخوت و مساوات، اپنے تمام اعمال کے لئے اللہ کے حضور جواب دہی کی تلقین کرتا ہے اسے نفرت کا ہدف بنایا جائے یا مسلمانوں کے خلاف مہم چلائی جائے محض اس لئے کہ وہ ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہیں جو انسانی مساوات کا درس دیتا ہے، اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے اپنے نظام کے تحت جائداد کے حقوق اور شائستگی کے ساتھ آزادانہ رائے اور زندگی گزارنے کے حق کو تسلیم کیا؛ جب کہ دیگر نظام وعقیدے اس سے پہلے ۲۰ ویں صدی کے آخر تک محض ان باتوں کو سوچتے ہی رہے۔

اصل موضوعات:

تمام دنیا کے مسلمان جائز طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا دین ایک مکمل نظام حیات ہے جو ایک ایسی دنیا کی ضمانت دیتا ہے جہاں حق وانصاف، مساوات، وقار، تحفظ اور شائستگی کا ماحول ہوگا، یہ مذہب صحیح معنوں میں جمہوری اقدار کا حامل ہے، اس کے علاوہ یہ دینا ہر فرد کو اللہ کی اطاعت اور اس کی جزا کے طور پر آخرت میں اجر کی بشارت دیتا ہے، مسلمانوں کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کے مذہب اور خصوصاً ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک منظم سازش کے تحت تحقیری مہم چلائی جا رہی ہے جس میں حکومتیں، معاشرتی، مذہبی، ثقافتی، علمی، تجارتی تنظیمیں سب پوری طرح شامل ہیں بالواسطہ طور بھی اور بلاواسطہ طور پر بھی۔

اس شر پسند مہم کے باعث مسلمان ثقافتی تحفظ، اقتصادی، معاشرتی، مذہبی اور نفسیاتی طور پر شدید نقصان اٹھا رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو محصور سمجھتے ہیں، ان میں سے بعض اس امید کے تحت یہ سختیاں برداشت کر رہے ہیں کہ شاید ایک دن ایسا آئے کہ فہم وشعور رکھنے والے لوگ اسلام کے بارے میں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے متعلق صحیح ڈھنگ سے سوچیں گے اور ان کے دفاع کے لئے سامنے آئیں گے؛ کیونکہ وہ شعوری طور پر کئے جانے والے ان حملوں کو برداشت نہیں کر پاتے ،مسلمانوں کو شعوری طور پر اس حقیقت کا ادراک ہے کہ اسلام انسان کو اس کے خالق کے قریب لاتا ہے اور ان تمام آقاؤں سے اسے آزادی دلاتا ہے جو اسی کی طرح انسان ہیں، اللہ کی نعمتوں سے سب کو مساوی طور پر فیض یاب ہونا چاہئے اور تقویٰ کی بنیاد پر عزت واحترام حاصل ہونا چاہئے یعنی وہ اللہ کا فرمانبردار ہو اور اللہ کی مخلوق کی فلاح کے لئے کام کرے۔

مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ عصر حاضر میں تمام دنیا میں جس طرح انہیں نشانہ ستم بنایا جارہا ہے اس کی تاریخی وجہ یہ ہے کہ بعض دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے غلط اور مذموم پروپیگنڈے اور سازشوں کے ذریعہ امت مسلمہ پر غلبہ رکھنا چاہتے ہیں۔

عصر حاضر میں مسلمانوں کے سامنے فلسطین، بوسنیا، افغانستان اور عراق کی مثالیں موجود ہیں، یہ ساری جارحیت اس لئے کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے ان میں الجھایا جائے اور ترقی وخوشحالی کے راستے پر ان کی پیش قدمی کو روکا جاسکے اور انہیں مایوسی اور محکومی کی تاریکیوں میں اسیر رکھا جائے۔

بلاشبہ مسلمان شدت سے ان مذموم کوششوں کی مزاحمت کر رہے ہیں جن کا مقصد انہیں اپنی حیثیت سے ہٹانا ہے، جیسے کہ (۱) وہ اپنے مذہب کے وفادار ہیں (۲) وہ عالمی طور پر قدرتی

ذخائر سے مالا مال ممالک میں رہتے ہیں، (۳) ان کے ہاں ثقافتی استحکام ہے جو مضبوط عقیدے کی بنیاد پر قائم ہے، (۴) دیگر ممالک کے درمیان ایک اسٹریٹجک حیثیت رکھتے ہیں، (۵) ان کی وسیع کاروباری صلاحیتیں ہیں (۶) اور خیر امت ہونے کا شرف حاصل ہے، الغرض انہیں اس مقام سے محروم کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے اور وہ اس مہم کی مزاحمت جائز طور پر کررہے ہیں۔

فوبیا:

اسلام کے مخالفین اس بات سے آگاہ ہیں کہ مسلمان معصوم ہیں، ایک ایسے اقدار پر مبنی نظام کے حامل ہیں جو کسی بھی وقت کمزور بنیادوں پر قائم معاشرہ پر اثر انداز ہو کر ان کی اس سلطنت کو برباد کرسکتا ہے جو انہوں نے محض دولت کے سہارے قائم کی ہے جو کہ بلاشبہ بہت ہی کمزور بنیاد ہے، اس قسم کے کلچر کی کوئی دائمی انسانی اقدار پر قائم بنیاد یا شکل نہیں ہوتی، اور ان کا مٹ جانا یقینی ہوتا ہے۔

یہ مخالفین کو احساس ہے کہ ان کی اسلام دشمنی سرگرمیاں خود ان کے ماحول اور معاشرہ میں ہی ناکام ہورہی ہیں، چونکہ ان کا حلقۂ اثر صرف ہتھیاروں اور پرفریب ڈپلومیسی پر قائم ہے، اس احساس کے سبب وہ اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کرتے ہیں۔

مخالفین اسلام، اسلام کے مقابلے میں انسانی زندگی کو ایک بہتر جہت اور منہج نہیں دے سکتے، اسلام ایک بہترین اور قابل قبول طریقے پر دین و دنیا کے معاملات میں توازن عطا کرتا ہے۔

مخالفین اسلام جن جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں یہ جرائم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرزد ہوئے ہیں، اب وہ اس خوف سے سراسیمہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے جرائم کی پاداش میں انہیں کسی وقت اور کہیں بھی سزا مل سکتی ہے، یہ سزا قدرتی آفات کی شکل میں ہوسکتی ہے۔

مخالفین اسلام اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اسلام کے خلاف ان کی مہم جو وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کررہے ہیں اب اپنا اثر کھو چکی ہے لہٰذا وہ اب منافقت کا نقاب اوڑھ کر مسلمانوں

کو دوستی کا فریب دے رہے ہیں تا کہ در پردہ وہ اپنی دشمنی کو تقویت پہنچاتے رہیں۔

دشمنان اسلام کو اب مختلف ممالک میں اپنی کٹھ پتلی حکومتوں کو سہارا دینے میں مشکل پیش آ رہی ہے کیونکہ انتخابات میں یہ لوگ عوامی تائید وحمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

مفکرین ان مخالفین اسلام کو بتارہے ہیں کہ انہیں اشتراکی نظام کی طرح اپنی سازشی مہم کو ختم کرنا پڑے گا جس کے لئے انہوں نے پوری دنیا میں لاکھوں لوگوں کو اسلاموفوبیا کے پروپیگنڈے کے لئے لگا رکھا ہے۔

جس قسم کے بھی خوف اور خدشات ہوں وہ حقائق پر مبنی نہیں ہیں، مخالفین کو اپنے ذہن کے دریچے کھولنے ہوں گے اور تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانیت کا نجات دہندہ ہے اور بقاء باہم کے جذبے سے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کرنی ہوگی، مذہبی آزادی سے متعلق اسلام کی روح سے آشنا ہونا پڑے گا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں بند کرنی ہوں گی، دیگر وہ تمام راستے جو انہوں نے امت کے خلاف کھول رکھے ہیں وہ ایک دن خود ان کے لئے عذاب بن جائیں گے کیونکہ جیسا کہ کہاوت ہے جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔

ہندوستان میں فوبیا:

متحدہ ہندوستان روایتی طور پر پرامن بقائے باہم کی آماجگاہ تھا، یہ سامراجی طاقتوں اور ان کے حلیفوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا انہوں نے یہاں مذہبی فرقوں کے درمیان انتشار کے بیج بوئے جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوا اور خون خرابہ کا طویل دور شروع ہوا، اگرچہ مسلمانوں نے ملک کی آزادی کے لئے باعتبار تناسب زیادہ قربانیاں دی ہیں اور اب بھی قومی تعمیر کے لئے قابل ستائش کام کررہے ہیں، اگرچہ فرقہ پرست طاقتوں کے ذریعہ انہیں بہت زیادہ نشانۂ ستم بننا پڑتا ہے پھر بھی ان کی حب الوطنی کا جذبہ غیر متزلزل ہے، مفاد پرست عناصر یہ

پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ ہندوؤں پر غلبہ حاصل کرلیں کیونکہ وہ اپنے مذہب اسلام میں پختہ یقین رکھتے ہیں جبکہ ہندو اپنے مذہب کے معاملہ میں متذبذب ہیں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، یہ مفاد پرست عناصر عوام کو قومی تعمیر میں لوگوں کی شرکت کے لئے اور ان دستوری اور اخلاقی بنیادوں پر جو قدیم سے ہمارا ورثہ رہا ہے باخبر کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے۔

ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں جن میں سے بعض تو اپنی سنگینی کے سبب نسل کشی کہے جا سکتے ہیں، یہ فسادات ان ہی مفاد پرستوں کی سازش سے ہوئے، ان میں بعض نام نہاد اسکالرز بھی شریک ہیں، یہ لوگ نفرت اور فوبیا کو ہوا دیتے ہیں، ۱۹۸۷ء کے میرٹھ فسادات اور ۲۰۰۲ کے گجرات فسادات ماضی قریب میں ملک کے بدترین فسادات میں سے تھے، تقسیم وطن کے بعد ان فسادیوں نے مسلمانوں کا کس قدر خون بہایا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔

تعلیم حاصل کرنے کا حق:

کسی دیگر شخص کی طرح ہر مسلمان کو بھی تعلیم پانے کا حق ہے، دستور ہند نے اسے ایک بنیادی حق کے طور پر عطا کیا ہے، اسی طرح ہندوستان کے دستور نے آرٹیکل ۲۹ اور ۳۰ کے تحت مسلمانوں کو ایک اقلیت کی حیثیت سے اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے، انہیں چلانے اور بندوبست کرنے کا حق دیا ہے، اسی طرح اپنی زبان، رسم الخط اور کلچر کے تحفظ کا حق بھی عطا کیا ہے، ہندوستانی مسلمان تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں اس کی وجوہات واضح ہیں، انہیں سرکاری ملازمت نہیں ملتی، ان کے لئے ریزرویشن وغیرہ کا بندوبست بھی نہیں ہے، ان کے ساتھ بہت سے معاملات میں تعصب برتا جاتا ہے، ان کے بارے میں کوئی مثبت پالیسی بھی نہیں ہے، لہٰذا مسلمان دستکاری کے چھوٹے چھوٹے پیشے اختیار کرنے یا تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ اپنی

خاندانی چھوٹی موٹی بزنس میں لگے رہتے ہیں، جنہیں سرکاری ملازمت بھی مل جاتی ہے وہ بھی زیادہ خوش قسمت نہیں ہوتے، انہیں ترقی پانے میں دشواری کا سامنے کرنا پڑتا ہے اور دیگر طریقوں سے بھی منصفانہ سلوک سے محروم رہتے ہیں، چھپی ہوئی نفرت اور فوبیا کے تحت عملاً وہ نگرانی کے دائرہ میں رہتے ہیں، انہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر بلاسبب تحقیر کا شکار رہنا پڑتا ہے، کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں مسلمان فریاد لے کر جائیں اور امید ہو کہ ان کی دادرسی ہوگی، بہت سے مظلوم اس خوف سے شکایت نہیں کرتے کہ مبادا انہیں صاحب اختیار حلقہ یا ان کی شہ پر دوسرے افسران کی جانب سے ستم کا شکار ہونا پڑے گا، اونچے طبقہ کے وہ چند مسلمان جو اعلیٰ عہدہ پر پہنچ گئے ہیں وہ مسلمانوں کی نگاہ میں رہتے ہیں، لیکن سب جانتے ہیں کہ ان کی حیثیت محض نمائشی ہے وہ کسی کے کام نہیں آسکتے؛ کیونکہ افادیت واہمیت کے لحاظ سے وہ بالکل بے حقیقت ہیں، پارلیمنٹ کے ایوان میں مسلم ممبران کی گھٹتی ہوئی تعداد اقتدار کے ایوان میں ان کے بے اثر ہونے کو ظاہر کرتی ہے، ملک کو تقسیم کرانے کے الزام کے نفسیاتی اثر سے بھی مسلمان ذہنی طور پر مضطرب رہتے ہیں، یہ اور ایسے ہی دیگر عوامل مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے اور اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں، وہ مواقع کی مناسبت سے اپنے آپ کو اہل بنانے اور قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قانونی طور پر ایک ایسا حوصلہ افزا ماحول ہونا چاہئے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں، اداروں میں اعتماد سے کام کریں، اس سے ان میں احساس محرومی کم کرنے میں آسانی ہوگی، مساوی مواقع حاصل ہونے سے ان میں اعتماد پیدا ہوگا جو انہیں مین اسٹریم میں لانے اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے میں معاون ہوگا۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جوہر (صلاحیت) کی کمی نہیں ہے، بہ حیثیت دستکار، کاریگر، صنعت کار وہ ہندوستانی اقتصادیات کو استحکام عطا کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی روزگار کے مواقع فراہم کرتے ہیں لیکن مینجمنٹ اور تجارت میں ان کا وجود غیر محسوس قسم کا ہے، اقتصادی

طور پر پسماندہ ہونے کے سبب وہ تعلیم کے میدان میں تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اختتامیہ:

اسلام ایک طرز حیات ہے جس کی بنیاد اللہ کی وحدت (توحید) اور عالمی انسانی مساوات پر قائم ہے، پوری انسانی برادری کو ایک کنبہ سمجھتے ہوئے یہ سب کو ایک معیاری سلوک کی تلقین کرتا ہے جس میں ایک دوسرے کا احترام اور فطرت کی پاسداری و پاسبانی بھی شامل ہے، قرآن عظیم میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن میں انسانی قدروں کو بحال رکھنے اور ماحول کے تحفظ کی تلقین کی گئی ہے، اسلامی تعلیم کے مطابق بہتر انسان وہی ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، رنگ، نسل، ذات، عقیدہ اور مذہب کے نام پر کوئی شخص معزز ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسلام کا پیغام سیدھا سچا اور آسان ہے، اسے سمجھنا بھی آسان ہے اور اس پر عمل کرنا بھی آسان ہے اسلام کی یہ صفت ہے کہ وہ عمومی کشش رکھتا ہے دوسرے اسے بآسانی قبول کرسکتے ہیں، اس مقبولیت کی وجہ سے متعصب اور ستم کیش افراد جو اللہ کی حدود سے سرکشی کرتے ہیں بہت زیادہ پریشان ہیں، وہ معقولیت اور منطقی استدلال کے ذریعہ اسلام کی مقبولیت اور کشش کی حقیقت کو چیلنج نہیں کرسکتے، لہٰذا ان کے دلوں میں جو عفونت بھری ہوئی ہے وہ مسلمان اور اسلام کی ایسی غلط اور ناپسندیدہ تصویر پیش کرتے ہیں جس سے دین کی پاکیزہ تعلیمات اور بہترین انسان دوست خصوصیات سامنے آسکیں لیکن ان کی یہ ساری نامسعود کوششیں جن کے پیچھے ان کی اپنی برتری کو قائم رکھنا اور تمام دنیا کو اپنا مطیع بنائے رکھنے کا جذبہ پوشیدہ ہے، اب پوری دنیا میں بری طرح ناکام ہورہی ہیں، آج انسان کی خواہش یہ ہے کہ وہ انسانی شکل میں ابھرنے والے ان باطل خداؤں سے پیچھا چھڑائے اور آخری حد تک انسانی وقار کو بحال اور برقرار رکھے، یہ اسلام ان باطل خداؤں کو مسترد کرتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک کنبہ کے افراد قرار دیتا ہے، جنہیں مساوی احترام حاصل ہے اور اعمال صالح کی بنیاد پر متقی کو اور بھی زیادہ احترام وعقیدت حاصل ہوتی ہے، دنیا میں ہر جگہ

مسلمان اسی انداز سے سوچتا ہے، وہ عمل صالح کرتا ہے، ماحول کی پاکیزگی کو برقرار رکھتا ہے اور اس طرح اللہ کا اطاعت کیش بندہ بننے کی بھرپور کوشش کرتا ہے یعنی وہ اللہ کی دیگر مخلوقات کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے، اب اگر مسلمان کو اس کے تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے تو بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے دیگر انسانوں کی بہبود کے کام سے روکا جارہا ہے، لہٰذا اس کے اس حق پر کسی بھی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیئے تاکہ وہ آزادی کو بروئے عمل لاکر اسے انسانیت کی خدمت کرنے کی آزادی میسر ہو۔

☆☆☆

صحت مند معاشرے کی تشکیل میں امت کا کردار اور اسلاموفوبیا سے مقابلہ کی چند تدابیر

مولانا محمد ارشد فاروقی ☆

جو انسانی گروہ حلقہ بہ گوش اسلام ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے معاش اور معاد کے تحفظ کے تمام تر بہتر راستے کا تعین اسلام ہی کر سکتا ہے وہ عقیدہ و ایمان کے طور پر بھی اسی دین کو اپناتا ہے اور دنیا کے نظام کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھنے اور چلانے کے لئے کوشاں رہتا ہے، وہ ایک چراغ کے مانند ہے، خود پگھل کر روشنی پھیلانے کی خواہش رکھتا ہے، وہ دیا جلاتا ہے اجالا پھیلاتا ہے۔

اللہ کا کنبہ

یہ انسانی گروہ کہلاتا ہے، ساری مخلوق خالق کائنات کا کنبہ ہے، اس کے لئے پیدا کرنے والے نے جیون بتانے کے لئے ایک ہی میپ روڈ دیا ہے، اگر اس پر یہ کنبہ چلتا رہے تو سارے راستے پرسکون طریقے سے طے کرتا ہوا دشواریوں سے بچتا ہوا منزل مقصود (جنت) تک پہنچ جائے گا۔

اگر خالق کے کنبے نے طے شدہ راستے (دین) سے انحراف کیا تو ایکسیڈنٹ سے نہیں

☆ صدر شعبہ افتاء جامعہ امام انور، دیوبند

بچ سکتا، جسم لہولہان ہو کہ نہ ہو قلب و روح سنگین زخم سے نہیں بچ سکتے اور حقیقی منزل تک پہنچنا ناممکن ہوگا؛ بلکہ گہری کھائی اور دہکتی آگ میں گرتا جائے گا۔

تین گروہ

جب یہ انسانی گروہ چراغِ ہدایت لئے لوگوں کو اس کی روشنی میں آنے کی دعوت دیتا ہے تو لوگ عام طور پر تین گروہوں میں بٹ جاتے ہیں: ایک گروہ اس روشنی سے فیضیاب ہونے لگتا ہے جسے مسلمان کہتے ہیں، دوسرا اس روشنی کو ناپسند کرنے لگتا ہے اور انکار کی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے، اصطلاح میں وہ کافر کہلاتا ہے، تیسرا گروہ مفاد کو سامنے رکھتا ہے کبھی ادھر تو کبھی اُدھر، یہ منافق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے پہلے گروہ کو "وأولئک هم المفلحون" (اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے) کامیاب قرار دیا ہے اور مومنین کے سنہرے لقب سے یاد کیا ہے، دوسرے کو کافر بتایا ہے۔(إن الذین کفروا) اور تیسرے کو منافق کہا ہے(وماهم بمؤمنین)۔

چراغ بجھانا چاہتے ہیں

جب مسلمانوں کی جماعت اٹھتی ہے کمر کستی ہے حق کا ڈنکا بجاتی ہے تو کفر کے ایوانوں میں زلزلہ آتا ہے، وہ بلبلا اٹھتے ہیں، روشنی ناپسند کرتے ہیں، سکون ٹھکراتے ہیں، انصاف سے بیر رکھتے ہیں، اندھیرے میں رہنا چاہتے ہیں اور اندھیرا پھیلانا چاہتے ہیں، اگر طاقت میں ہوئے تو ٹکراتے ہیں، قتل و غارت گری کے بازار گرم کرتے ہیں، زمین میں فساد مچاتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ روشنی کو، خدا کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نور کو درجۂ کمال تک پہنچانے والا ہے، چاہے ان کی آنکھیں کتنا ہی چندھیا ئیں "یریدون لیطفؤوا نور اللہ بأفواههم واللہ متم نوره ولو کره الکافرون (الصف:٨)۔

انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو ضروری قرار دیا اور سب سے پہلے انسان کو پہلا نبی و نمائندہ بنایا جو بابائے انسانیت کہلائے جن کا نام نامی آدم علیہ السلام ہے۔

اسلام فوبیا کی بنیاد

خیر کے اولین سرچشمہ کی مخالفت، اس کے تئیں عداوت کا مظاہرہ اور اسلام فوبیا کی بنیاد رکھنے والا ابلیس ہے جس نے آدم کی تعظیم نہ کر کے اللہ کے حکم کو ٹھکرایا اور بابا آدم اور حوا کے پیچھے پڑ گیا اور حق و باطل کی کشمکش شروع ہو گئی۔

اسلام فوبیا کا مظاہرہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے لوگوں کو قرآن کی آیتیں اور سورتیں سنانا شروع کیا اور جادو اثر کلام نے اپنی طرف لوگوں کو کھینچنا شروع کیا تو مکہ کے سرکش لوگوں نے کہنا شروع کیا، اے لوگو! اس قرآن پر کان نہ دھرو اور بک بک کرو پڑھتے وقت شاید تم غالب ہو (سجدہ:۲۶)، جب قرآن سنایا جائے تو تم شور مچانا شروع کر دو تاکہ لوگ سن نہ سکیں، یہ ہے اسلام فوبیا کا مظاہرہ۔

اس دور میں معاشرے و سماج کی ذہنی و فکری تبدیلی میں ''میڈیا'' کا بڑا ہاتھ ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ منصفانہ کردار کے حامل میڈیا کی تلاش بے سود ہے، دنیا کا میڈیا کسی نہ کسی بڑے نظام، بڑی تنظیم کی نمائندگی کرتا ہے۔

امریکہ نے عراق پر حملے کے لئے خطرناک گیس کی موجودگی کو عنوان بنایا اور میڈیا کے ذریعہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا، مقصد کی تکمیل کے بعد جھوٹ کا پلندا سامنے آیا، افغانستان کی طالبان حکومت اور اسامہ کو دنیا کے لئے خطرہ میڈیا ہی کے ذریعہ بتایا گیا، حملے کے وقت طالبان افغان چھوڑ گئے افغان و طالبان کو دنیا کے سامنے دہشت گرد بنا کر پیش کیا گیا اور دہشت گردی دنیا

کے لئے عذاب بنا کر پیش کی گئی، نہ جانے کیسے کیسے اور کتنے لوگوں کو اس کے لئے تیار کیا گیا اور اس دام فریب میں بڑی دینی درسگاہوں، مسلم شخصیات کا استعمال بھی جانے انجانے میں کیا گیا؛ یہاں تک کہ ہر مدرسہ اور ہر عالم وکیل صفائی بن گیا، یہ نمونہ ہے اسلام فوبیا کا۔

نیا عالمی نظام

جب روس بکھرا اور امریکہ دنیا کا واحد طاقتور ملک رہ گیا تو وہ پوری دنیا میں نئے امریکی نظام کا سکہ چلانا چاہتا ہے، اس کے سکہ کو کھوٹا ثابت کرنے والا صرف اور صرف اسلامی نظام کا سکہ ہے؛ اس لئے ایک لمبی مدت کے بعد اسلام اور ایک نظام آمنے سامنے ہے، امریکی نظام چاہتا ہے کہ لوگوں کو اسلام کے تئیں خائف رکھے، بدگمانی کا شکار بنائے اور اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرے، اس مقصد کے لئے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح گڑھی گئی، اسی مقصد کے لئے غیر مسلم غیر مختون لوگوں نے داڑھیاں بڑھائیں، طالبان کی شکل اختیار کی اور سوات میں امریکی فوج کے ہتھے چڑھے، اس طرح کی سازشوں، منصوبوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

سازشیں

ماضی قریب کی عراق و ایران جنگ بھی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ تھی، ان جنگی مناظر کو امریکہ و یورپ میں دکھا کر مسلمانوں کو جنگ جو بتایا جاتا، ہالینڈ کے اخبار میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر چھاپنا، قرآن کریم پر مبنی فلم بنانا اسی سلسلے کی کڑی ہے اور جہالت کی نئی شکل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں گستاخوں نے ایسی گستاخیاں کیں لیکن حق کا بول بالا ہوا، باطل کا منہ کالا ہوا۔

میڈیا کے ذریعہ اسلام کے ماننے والوں، اس کے ترجمانوں، داڑھی کرتے والوں کے لئے زمین تنگ کرنے کی کوشش کی گئی، مسلم نام والے مسافروں کو ہوائی جہاز سے اتار

دیا گیا۔

افسوسناک واقعات

ہمارے ملک ہندوستان میں جب شدت پسندوں نے بابری مسجد کا مسئلہ اٹھایا تو ٹرین میں سے نقاب پوش خواتین کے شیر خوار بچوں کو پھینک دیا گیا اور مودی کے بھڑکائے فساد میں حاملہ کے حمل کو ترشول پر اچھالنا انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے، اسی طرح جعفری ایم پی کا بھیانک قتل قانون کو منہ چڑاتا ہے۔

آزادی کے بعد

آزادی کے بعد سے فرقہ وارانہ فسادات، بابری مسجد کی شہادت اور دیگر مظالم اقلیت کی حق تلفی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

مانا کہ دستور ہند ہر شہری کے حقوق کا یکساں طور پر تحفظ کا ضامن ہے؛ لیکن بار بار مسلم اقلیت کے حقوق کی پامالی اس اقلیت کا مقدر بن چکی ہے، منصوبہ بند فسادات کے ذریعہ مسلم اقلیت کو کچلنا گویا ملک کی سیاست کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔

اس طرح آزادی کے بعد سے مسلم اقلیت کو ابھرنے، ترقی کرنے نہیں دیا گیا، تعلیمی، اقتصادی، سیاسی ہر میدان میں مسلم اقلیت خطرناک حد تک پسماندگی کا شکار ہوکر رہ گئی جس پر سچر کمیٹی کی مہر ثبت ہے۔

ہندوستان میں عیسائی اور سکھ اقلیتوں کے ساتھ بھی ظلم کیا گیا؛ لیکن ظلم کے خلاف اٹھنے والی آواز نے انہیں بڑی حد تک انصاف دلایا۔

حکمرانوں کا رویہ

ہندوستان کے حکمرانوں کی ایسی پالیسی اور حکمت عملی ہوتی ہے کہ سیاسی مفادات کے

تحفظ کے لئے اقلیت کونشانہ بنایا جاتا ہے اور بنیاد پرستی کا موقع دیا جاتا ہے، آر ایس ایس اور اس کی معاون انتہا پسند تنظیموں کی سرگرمیوں سے بھرپور واقفیت کے باوجود انہیں پھولنے پھلنے، تناور درخت بننے کا موقع دینا منصوبہ بندی اور درپردہ تال میل کی کھلی علامت ہے۔

دفاعی محکمہ

یہ حقیقت ہے کہ ملک کا دفاعی محکمہ اس قدر مضبوط ہے کہ بڑے سے بڑے فرقہ وارانہ فساد پر چند گھنٹوں میں قابو پایا جاسکتا ہے؛ لیکن چونکہ فسادات وحق تلفی منصوبہ بندی کے نتیجے میں ہوتی ہے؛ اس لئے نشانہ مکمل ہونے تک روکنے کے اقدامات نہیں کئے جاتے۔

پیچھے ڈھکیلنے کا عمل

سیاسی میدان میں مسلم اقلیت کو پیچھے ڈھکیلنے کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے، اسمبلی و پارلیمانی حلقوں کی تقسیم اس طور پر کرائی گئی کہ مسلم امیدوار کا کامیاب ہونا مشکل ہو جائے۔

اعداد و شمار کے حساب سے 66 اور 70 مسلم ممبران کو پارلیمنٹ میں ہونا چاہئے؛ بلکہ 120 تک کی بات کہی جاتی ہے؛ لیکن بہ مشکل 30 نمائندے ہوتے ہیں۔

فسطائیت کا عروج

ملک جمہوری ہے؛ لیکن جمہوریت پر فسطائیت کے دھبے برابر لگائے جا رہے ہیں، کبھی ایسا لگتا ہے کہ لا اینڈ آرڈر معطل ہو گیا ہے اور جنگ کا قانون چل رہا ہے اور یہ منظر پوری دنیا نے 6 / دسمبر 1992 کو دیکھا کہ ہزاروں انتہا پسند ہندوؤں نے دن کے اجالے میں انتظامیہ کی موجودگی میں بابری مسجد کو شہید کر دیا، ریاستی حکومت ڈھانے والوں کی ہمت بندھا رہی تھی اور مرکزی حکومت جانتے ہوئے تماشائی بنی تھی، یہ سیاہ ترین دن تھا، اقلیت کے حقوق کی حفاظت

کے سارے انتظامات معطل تھے، فسطائیت جمہوریت کے مدعیوں کے سر پر ناچ رہی تھی۔

اسرائیل سے دوستانہ

ہندوستان میں یہ سارے کھیل کھیلے جا رہے ہیں، اسرائیل کے ساتھ تعلقات بڑھائے جا رہے ہیں، فوجی مشترکہ مشقیں کی جا رہی ہیں، شاندار اسرائیلی سفارتخانے کی عمارت دہلی میں موجود ہے، ممبئی میں نریمن پوائنٹ پر یہودی خود مختار انداز میں رہ رہے ہیں، تاج محل ہوٹل میں مارے گئے یہودیوں کا کیا پوسٹ مارٹم انڈین اتھارٹی نے کیا؟ کیا ان لاشوں کو تابوت میں بند کرتے وقت انڈین اتھارٹی تھی؟ ان کو انڈین جہاز نے ان کے وطن پہنچایا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب بہت مشکل ہے۔

ماضی میں ہندوستان کی ہمدردی فلسطین کو حاصل رہی ہے؛ لیکن اسرائیل سے دوستی کے انداز اب نرالے ہیں، یہ اقدامات مسلم اقلیت کے لئے خطرناک ہیں، اور جمہوری ملک کے مفادات کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔

مظالم کا نشانہ

مسلم اقلیت اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں مظالم کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے، اسرائیل مسلم دنیا کے قبلہ اول مسجد اقصی کو ہیکل میں تبدیل کرنے کی راہیں ہموار کر رہا ہے اور غزہ میں محصور 15 لاکھ آبادی کو بربریت کا شکار بنایا جاتا ہے، فلسطینیوں کی زمین پر یہودی بستی تعمیر کر رہا ہے۔

عالم اسلام کا نقصان

امریکہ اتحادیوں نے عراق وافغانستان کو شدید نقصان پہنچایا اور ہنوز سلسلہ جاری ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں میں امریکی فوجیں کارروائی کر رہی ہیں، مختلف ایجنسیاں بم دھماکے

کرارہی ہیں۔

لبنان، سوڈان اور ایران کی فوجی طاقت ختم کرنے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔

امریکہ اور اس کے ہمنوا یوروپی ممالک مسلم ممالک جو تیل وگیس جیسے قدرتی وسائل سے مالامال ہیں ان پر تسلط کے ذریعہ وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور کررہے ہیں۔

قطر، سعودی عرب، کویت، پاکستان میں امریکی افواج موجود ہیں، یہ ان ملکوں کے لئے تحفظ نہیں؛ بلکہ بڑے نقصان کا ذریعہ ہے، مسلم اقلیت کے مسائل اور مسلم ملکوں کے مسائل ان دنوں پیچیدگی ومشکلات کے شکنجے میں کستے جارہے ہیں۔

تحفظ کے قوانین ماسک کی طرح

اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی ترقی کے قوانین ہندوستان میں بھی موجود ہیں اور دیگر ترقی پذیر وترقی یافتہ ممالک نے بھی بنا رکھا ہے؛ لیکن یہ ماسک ہنگامی مواقع پر اتار دیا جاتا ہے، جیسے: نائن الیون کے موقع پر امریکہ ویوروپین ممالک اور بابری مسجد کی شہادت کے وقت ہندوستان میں دیکھا گیا۔

عالمی تنظیمیں

حقوق انسانی کے تحفظ کی عالمی تنظیمیں رضا کارانہ طور پر کوشاں ہیں کہ تمام انسانوں بہ شمول اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری کی جائے؛ لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے، اس میں شفافیت لانے کے تمام انسانی ذرائع اپنائے جائیں۔

مسلم اقلیت مشکلات سے نجات پاسکتی ہے

ہندوستانی مسلم اقلیت ہو کہ مسلم امت بحیثیت امت سب کے مسائل ومشکلات اور ان کو

درپیش چیلنجز بنیادی طور پر یکساں ہیں، علاقائی دشواریاں ضرور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

چند اساسی مشکلات و چیلنجز

☆ مغربی استعمار

☆ صیہونی معرکہ آرائی

☆ آزاد، بے ہنگم میڈیا

☆ تعلیمی پسماندگی

☆ صنعتی و تکنیکی پسماندگی

☆ مسلمانوں کے سامنے مغربی آئیڈیل کا پیش کیا جانا

☆ مسلم ممالک پر تسلط کی بڑھتی کوششیں

یہ چند خطرناک قسم کے چیلنجز ہیں جن کا مقابلہ ایمانی قوت، اسلامی غیرت کے ناقابل شکست ہتھیار سے کیا جانا چاہیے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی تطبیق انسانیت کو قعر مذلت میں پہنچائے گی، یہ انتہائی فرسودہ واہمہ ہے، حقیقت تو یہی ہے کہ انسانیت کی معراج اسلام کے اپنانے میں ہے۔

اسلام نے اول دن سے باطل کو للکارا، رسول اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کو چیلنج کیا، عقیدے کی خرابیوں، کفر و شرک کی اصلاح کی، قرآن نے اعلان کیا: اگر تم شک میں ہو اس کے بارے میں جو ہم نے اتارا تو اس جیسی ایک سورہ بنا لے آؤ (بقرہ: ۲۴)۔

اسلام نے جاہلیت پر فتح حاصل کی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے، سیدنا ابوبکرؓ نے فتنہ ارتداد کا مقابلہ اولوالعزمی کے ساتھ کیا، سیدنا عمرؓ نے روم و فارس کی طرف پیش قدمی فرمائی، بیت المقدس میں داخل ہوئے، سعد و نعمان نے فارس کے حکومتی نظام کو سرنگوں کیا۔

اسلام کی تاریخ باطل طاقتوں کی سرکوبی سے بھری ہے، صلاح الدین ایوبی کی قائدانہ حربی صلاحیت نے لوہا منوایا۔

۔ آج بھی امت مسلمہ دشمنوں، چیلنجوں، انسانیت کو درپیش خطرات کے سامنے کھڑی ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنا احتساب کرے اور دین کے نام پر اکٹھی ہو اور بکھری ہوئی طاقت کو جمع کرے اور اللہ سے ڈرنے والا رہنما اس کی قیادت کرے۔

داخلی مشکلات وچیلنجز

امت اسلامیہ یا مسلم اقلیتوں کو جہاں خارجی حملوں کا سامنا ہے وہیں داخلی طور پر زخموں سے چور اپنے کیے کا خمیازہ بھی بھگت رہی ہے اور کڑی مصیبتوں میں جھوجھ رہی ہے۔

1924 میں اسلامی خلافت کا جنازہ نکلا کہ دشمنان اسلام دندناتے پھرنے لگے اور مسلم امت کے منتخب باصلاحیت طبقے تک ان کی رسائی بہ آسانی ہونے لگی، ان کی برین واشنگ شروع کی گئی، اسلام کے مسلمات سے بدظن اور نئے فتنوں سے آشنا کرایا جانے لگا، قومیت اور وطنیت کو اسلام کا بدل پیش کیا گیا، نتیجہ منطقی تھا امت کمزور پڑ گئی، اس کے علاقے ہتھیائے جانے لگے، اسلام کی عملی بالادستی باقی نہیں رہ گئی۔

اسلامی نظام تعلیم پر حملے

ہر ملک میں اسلامی شعائر کو باقی رکھنے میں دینی مدارس وجامعات کا اہم رول ہے؛ اس لئے اعداء اسلام کی نگاہیں ان پر مرکوز رہتی ہیں؛ اس لئے جامعہ ازہر کے تعلیمی نظام کو اسلامی علوم کے تخصصات سے بڑھا کر عصری علوم کے تخصصات تک پہنچایا گیا اور دینی روح کی جوہری توانائی کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، چونکہ ازہر شریف کو بلاد عرب میں مرجعیت حاصل ہے، اس لئے اس کی دینی روح کو کمزور کرنے کی کوشش کے اثرات دیگر جامعات پر پڑیں گے۔

جس طرح ہندوستان؛ بلکہ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزیت حاصل ہے تو نہ صرف ملکی انتہاپسندوں کی کرشمہ سازیوں کا اس کو سامنا ہے؛ بلکہ عالمی طاقتوں کے نمائندے اس کے گرد برابر منڈلاتے رہتے ہیں، کبھی دہشت گردی کے نام پر کانفرنس کرائی جاتی ہے تو کبھی وندے ماترم کے خلاف فتوے کو منظر عام پر لایا جاتا ہے، اس سلسلے میں انتظامیہ اور بہی خواہوں کو ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں جانے انجانے میں وہ آلہ کار نہ بن جائیں۔

لاقانونیت کا شکار معاشرہ اور مصلحین کا کردار

مسلم اقلیتوں کو سنبھالا دینے، ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے میں مصلحین اور داعیوں کی ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے، ان کی مسٔولیت بڑھ جاتی ہے، ایسے وقت میں تمام ذرائع اور وسائل کا استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اہم ذریعہ

مساجد کا آباد کرنا، مسلمانوں کو مسجد میں لانے کی امکانی کوشش کرنا، پھر نمازیوں کی نگرانی اس کاشت کار کی طرح کرنا جو پیداوار کی حفاظت کے لئے کرتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نصیحت فرماتے رہتے مبادا ہم مصیبت کے شکار نہ ہو جائیں۔

مصلحین کے لئے علم وافر اور تقوی الٰہی اساسی حیثیت رکھتے ہیں، انہی دونوں صفات کے ذریعہ رسالت کی نیابت ممکن ہے۔

☆ اقلیتوں کے خلاف زہر افشانیوں، پروپیگنڈوں، غلط نظریات وباطل افکار سے واقفیت اور تجزیہ بھی ضروری ہے۔

☆ اسلامی اخلاق وکردار، امن وسلامتی اور اخوت وبھائی چارہ سے لوگوں کو آشنا کرانا،

دلوں کے چراغ جلانا،نفرتوں کے جلتے چراغ بجھانا اولین فریضہ ہے۔

☆ اقلیت کے مسائل کا تجزیہ کرنا،حل ڈھونڈنا، اس کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا اور وقت ضرورت سر دھڑ کی بازی لگا دینا رہنماؤں کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

جوانوں کی تربیت

ہر قوم کی بنیاد اور سرمایہ و مستقبل اس کے نوجوان ہوتے ہیں، مسلم اقلیتوں کی ذمہ داری ہے کہ نوجوانوں کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے اور ان کو دشمنوں کا آلہ کار بننے سے بچائے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت کو خیر امت بننے کے لئے اعلی درجہ ریاض کی ضرورت ہمہ جہت میدانوں میں مطلوب ہے۔

واضح رہے کہ حق مانگے نہیں لیے جاتے ہیں، مسلم اقلیت کو اپنے اندر حق لینے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد اتنی ہے کہ اس پر دوسری اکثریت کی تعریف صادق آتی ہے، اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے، اسے اپنے اندر نافعیت کی صلاحیت بڑھانی چاہئے۔

مسلم اقلیت کے کردار کو مضبوط کرنے میں مسلم تنظیموں کا نمایاں رول ہوسکتا ہے، ہر تنظیم ''اقلیت مسلمہ'' کی تعمیر کا فیصلہ کرے، تعلیم، تجارت، سیاست، ملازمت، حکومت میں شہری ہی نہیں نمایاں ممتاز شہری کی حیثیت سے حصہ دار بنے اور انصاف وعدل قائم کرے۔

اگر مسلم اقلیت کے مسائل حل کرنے کے لئے ساری مسلم تنظیمیں اٹھ کھڑی ہوں اور زیادتی وظلم کے خلاف آواز بلند کریں، احتجاج کے جمہوری طریقے استعمال کریں، ووٹ کی قیمت جتائیں تو جیت ان کی تقدیر بنے۔

کڑی محنت

ہندوستانی مسلم اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اکثریت کے مقابلے زیادہ محنت کرے، تعلیم وتجارت، صنعت وحرفت، سیاست وحکومت ہر میدان میں اپنی قابلیت کا سکہ جمائے اور ملک وقوم کی ضرورت بن جائے اپنی نافعیت اس قدر بڑھائے کہ ہر طبقہ فائدہ مند سمجھنے لگے، یہ سب کچھ دینی روح اور اسلامی اسپرٹ کے تقاضے کے تحت ہو۔

دنیا کی مسلم اقلیتیں اس باب میں سبق لینا چاہیں تو یہودیوں سے لیں، امریکہ میں یہودی ڈھائی فیصد سے تین فیصد ہیں، لیکن اقتصادیات پر ان کا قبضہ، عالمی میڈیا پر وہ مسلط، ایک طریقے سے وہ امریکا کے توسط سے پوری دنیا کے حکمراں ہیں، اس کامیابی کے پیچھے انتھک محنت، سعی مسلسل اور منصوبہ بندی ہے۔

قرآن میں ہے: ''کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة'' کتنی ہی چھوٹی ٹکڑی بڑی پر چھا جاتی ہے۔

بات بہت واضح ہے، سو منظم فوجی ہزاروں کی بھیڑ کو منتشر کر دیتے ہیں؛ اس لئے ضروری ہے کہ مسلم اقلیت ملکی سطح کا منصوبہ تیار کرے اور ترجیحی بنیاد پر کام کرے۔

خلاصہ

اسلام فوبیا کے اثرات کا ازالہ داعیانہ کردار، عالمانہ ومحققانہ اسلوب، معیاری بلند پایہ تحریر اور مفید ڈائلاگ سے کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا بین الاقوامی مسئلہ ہے تو اصولی بات یہ ہے کہ ہر ملک کے دستور میں تحفظات ہیں؛ البتہ ہنگامی حالات میں وہ بند ٹوٹ جاتے ہیں۔

پھر یوروپ وامریکہ اپنے ملکوں میں مسلم اقلیت کو کچھ رعایتیں دے کر چاہتے ہیں کہ

مسلم ممالک اپنے وجود ہی کو ان کے حوالے کر دیں، اس خواہش کی تکمیل کے لئے مسلم ممالک کہاں تک جا سکتے ہیں، امارات نے غیر مسلم عبادت گاہوں کے لئے اجازت دے رکھی ہے، قطر نے گرجا گھر بنانے کی اجازت دی، مطالبات اور بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان امور کو دیکھا جائے تو اقلیتوں کی نگرانی میں وہ ناکام ہیں، عوامی تحریک اور جمہور کا دباؤ ہی حقوق ضائع کرنے والوں کے ہاتھ روک سکتا ہے۔

دین اسلام نے جو حقوق انسانیت کو اللہ کا کنبہ مان کر دیئے ہیں ان میں ہر فرد بشر کی بھرپور رعایت رکھی گئی ہے، اس کی اشاعت کی ذمہ داری ان پر یقین رکھنے والوں کی ہے۔

☆☆☆

اسلاموفوبیا

مولانا محمد عمر بن عبدالرشید☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد!

ارشاد باری تعالیٰ ہے:"إنما ذلكم الشيطن يخوف أولياء ٥، فلا تخافوهم وخافون إن كنتم مؤمنين" (یقیناً یہی وہ شیطان جو اللہ کے نیک بندوں کو ڈراتا ہے، تم لوگ تو صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہو اور ان سے ہرگز نہ ڈرو اگر واقعی تم مومن ہو)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ذمہ داران کا میں تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں کہ انھوں نے "اقلیتوں کے حقوق اور اسلاموفوبیا: آزادی کی حدود" کے موضوع پر نئی دہلی میں ایسسکو کے تعاون سے اس انٹرنیشنل سمینار کا انعقاد کیا اور اس میں ناچیز کو شرکت کرنے کا موقع فراہم کیا، نیز میرے لئے نہایت شرف وسعادت کی بات ہے کہ اس سمینار میں "اسلاموفوبیا" کے موضوع پر چند صفحات آپ کے سامنے پیش کروں۔

لفظ فوبیا کی اصطلاح آج کل ہم بکثرت سن رہیں، اس وجہ سے نہیں کہ یہ نئی اصطلاح ہے بلکہ کچھ مدتوں سے اس لفظ کے ساتھ نئے نئے اسماء جوڑ کر ہر خاص وعام کی زبان پر میڈیا کے ذریعہ استعمال کیا جارہا ہے، مثال کے طور پر اسلاموفوبیا اور بطور خاص اس

☆ بھوپال

کا استعمال ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہوئے حملے اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ عالمی بحران کے وقت سے زیادہ ہو رہا ہے یہاں تک کہ انٹرنیشنل پیمانے پر اس کے وجود کو تسلیم کیا جانے لگا اور اس کے متعلق بہت سارے عالمی کانفرنس اور سمینار بھی ہوئے، مثلاً نیویارک میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر میں ۲۰۰۴ء میں ''اسلاموفوبیا کی مخالفت'' کے موضوع پر انٹرنیشنل سمینار کا انعقاد، مئی ۲۰۰۵ء میں واشنگٹن میں کونسل برائے اسلامی امریکی تعلقات کی جانب سے ''اسلام سے خوف اور امریکا کی دشمنی: اسباب وعلاج'' کے موضوع پر عالمی کانفرنس کا انعقاد، استنبول ترکی میں ستمبر ۲۰۰۷ء میں منعقد اسلاموفوبیا انٹرنیشنل کانفرنس، اور حال ہی میں اسلام کے تئیں غلط فہمیوں کے ازالہ کے میدان میں ریسرچ اینڈ اسٹڈیز سینٹر کی جانب سے مراکش میں ۱۰-۱۲ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو ''اسلاموفوبیا کا مسئلہ اور اس سے نمٹنے کے طریقے'' کے موضوع پر منعقد انٹرنیشنل کانفرنس وغیرہ۔

در اصل ''فوبیا'' کا لفظ یونانی ہے جس کا مطلب خوف اور ڈر ہے، اس لفظ کو بالعموم دوسرے الفاظ کے اخیر میں جوڑ کر بولا جاتا ہے جس سے لفظ میں ایک اضافی مفہوم پیدا ہوتا ہے، جیسے (Hydrophobia) fear of water ''پانی سے خوف'' لیکن یہ لفظ انسان کے اندر فطری خوف کو نہیں بتاتا جسے وہ فطری طور پر کسی خطرے وغیرہ کے وقت اپنے اندر محسوس کرتا ہے، مثلاً شیر سے خوف یا ہلاکت سے خوف وغیرہ بلکہ یہ اس کا غیر فطری اور زائد خوف ہے جس کی عقلی یا منطقی توجیہ نہیں کی جا سکتی، بلکہ یوں کہیں کہ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے، ایسے مریض کو نفسیاتی علاج کرانا ضروری ہوتا ہے، جیسے (Acrophobia) اونچائی سے خوف، (Ablutophobia) پانی یا غسل سے ڈر، اور (Claustrophobia) بند جگہوں سے ڈر، اور (Aviophobia) اڑنے سے ڈر، (Monophobia) تنہائی سے ڈر (Ailurophobia) بلیوں سے ڈر۔

یہاں پر ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ مشہور فرانسیسی کمانڈر نپولین بونا پارٹ، بلیوں کے خوف کا مریض تھا اور اسے بلیوں سے بہت زیادہ ڈر لگتا تھا، یہی نہیں بلکہ ہمارے پاس اس فوبیا کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

اس اصطلاح کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کوئی شخص ظالمانہ روش اور نفرت وتشدد کسی خاص گروہ یا جماعت کے خلاف اپنائے، مثال کے طور پر (Christian phobia) یعنی مسیحیت یا عیسائیوں کے تئیں خوف یا تعصب ونفرت کا اظہار، یہ اصطلاح آج کے دور کی ہے جو یورپ میں عیسائیوں کے خلاف تعصّبانہ سلوک کو بتاتی ہے۔

ان مذکورہ مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہورہی ہے کہ اسلاموفوبیا کی اصطلاح دو مختلف مفہوم کو بتاتی ہے۔

نمبر ۱:- امریکا اور یورپ کا ان کے علاقہ میں اسلام کی اشاعت سے خوف وہراس۔

نمبر ۲:- اس خوف کے نتیجے میں مسلمانوں پر ہورہے مظالم، تعصب اور تفریق و امتیاز کے مظاہر۔

اسلاموفوبیا کی شکلیں اور مظاہر:

دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلاموفوبیا کے جن منفی آثار سے مسلمان دوچار ہورہے ہیں ان میں سے ایک (Identity Crisis) (تشخص کا بحران) ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو خاص طور پر اجنبی ممالک میں اسلامی کمیونٹی کی حیثیت سے دینی تشخص، ثقافتی خصائص اور تہذیبی روایات کا التزام کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں انہیں یوروپین سماج میں گھل مل جانے میں دشواری ہورہی ہے، ان کے ساتھ یوروپین سماج پردیسیوں جیسا معاملہ کررہا ہے اور ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، نیز ان پر مسلسل

طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں، ان کی حیثیت دفاعی پوزیشن کی ہو چکی ہے، اسی بنا پر ان کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے، ان کے اصول زندگی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور کبھی آزادی رائے کے نام پر تو کبھی صحافت اور میڈیا کی آزادی کے نام پر ان کے عقائد پر حملہ کر کے ان کے جذبات کو ٹھیس پہونچایا جا رہا ہے، زمین پر ان کا چلنا پھرنا عام انسان کی طرح نہیں بلکہ کسی خوفناک اور عجیب وغریب بھوت یا سایہ کے مانند ہو چکا ہے جن کی نقل وحرکت اور حقیقت وماہیت کا ادراک عام لوگ نہیں کر پا رہے ہیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نئی نسل کی اکثریت، ان کے اپنے دینی انتساب کی بنا پر نسلی امتیاز اور تعصبانہ رویہ کا شکار ہونے، نیز مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد چیزوں کی ترویج، اور دین اسلام پر دہشت گردی، اصول پسندی، انتہا پسندی جیسی الزام تراشیوں کے نتیجے میں، اپنے دینی تشخص کے تئیں اعتماد کھو رہے ہیں اور مادیت پرست مغربی تہذیب کی لائی ہوئی سائنسی ٹکنالوجی اور ترقی سے بے پناہ متاثر ہو رہے ہیں اور ان کی تہذیب میں اس طرح گھل مل رہے ہیں کہ انہیں اسلامی اقدار اور اس کے تہذیبی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، اور اس کی تائید کے لئے جمہوریت سیکولرزم آزادی رائے، روشن خیالی، دور جدید، عقل ومنطق جیسے نعروں کی آڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگ نفسیاتی مریض کہلاتے ہیں جیسے آج کے دور میں "تشخص کا بحران" (Identity Crisis) کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ اپنی تاریخی اور تہذیبی بنیادوں کو بھول کر ایسی تہذیب اور تشخص کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں جس سے ان کا دور دور کا رشتہ نہیں ہے ان کی مثال درخت کی ان ٹہنیوں کی ہے جس کی جڑیں ختم ہو چکی ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولاتکونوا کالذین نسوا اللہ فأنساھم أنفسھم" (تم ان لوگوں کی مانند ہرگز نہ بنو جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا پس وہ خود اپنے آپ کو بھول بیٹھے)۔

مسلمانوں کے تئیں امتیاز اور تفریق برتنے کی بے انتہا شکلیں اور مظاہر ہیں، چاہے مسلم قوم اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے رہ رہے ہوں یا غیر مسلم ممالک میں کالونیوں میں، مثال کے طور پر ایرپورٹوں، اسٹیشنوں اور لوکل علاقوں میں حفاظتی پولیس کی جانب سے بے جا تفتیش و تحقیق، نیز ان ہی مظاہر میں سے مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر کے سالوں سال تک عدالتی کارروائی کرنا اور محض شک کی بنیاد پر یا جھوٹے الزامات لگا کر انھیں سلاخوں کے پیچھے ڈال دینا، کوئی حادثہ بم پھٹنے یا آگ لگنے یا یرغمال بنانے کا ہو جائے تو سب سے پہلے شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف کرنا اس انداز میں کہ مسلمانوں کو حادثہ سے قبل اطلاع تھی یا انہیں الہامی طور پر معلوم کرایا گیا تھا یا یہ کہ اس طرح کے حوادث مسلمانوں کے ہاتھوں ہونا ایک بدیہی اور معروف چیز ہے، اس میں بہت زیادہ غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان ہی مظاہر میں سے ایک مظہر مسلمانوں کو ان کی علمی صلاحیت اور لیاقت کے باوجود ملازمتوں سے محروم کرنا، نیز انہیں تعلیمی، معاشی اور سیاسی طور پر قصداً پسماندہ بنانے کی کوشش کرنا، جس کی قریب ترین مثال سچر کمیٹی کی رپورٹ ہے جس نے پوری وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان پہلی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود تعلیمی اور معاشی سطح پر سب سے زیادہ پیچھے ہیں۔

ان ہی مظاہر میں سے ایک قبیح مظہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ڈنمارک کے اخبار میں شائع کر کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچانا، نیز فرانس کی مسلم خواتین کو پردہ کرنے پر پابندی، سوئٹزرلینڈ میں مسجدوں کی تعمیر پر پابندی، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا میں مداخلت، اور مسلم مرد وعورت کو داڑھی، پردہ اور دیگر اسلامی تعلیمات کے التزام کی وجہ سے ملازمت سے نکال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

اسباب:

کچھ لوگوں کا خیال ہے اس صورت حال کی وجہ نائن الیون کا حادثہ ہے جسے بہت چالاکی سے مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا گیا، اور یہ کہ مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانے اور انہیں دہشت گرد بنانے کی یہی بنیادی وجہ ہے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں ہے؛ کیونکہ یوروپین ممالک کی مشرقی ممالک سے بالخصوص اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی، ان کو غلام بنانے، ان کی دولت پر قبضہ جمانے اور ان کی تہذیب وثقافت کو ختم کرنے کی کوششیں وغیرہ اب قابل تعجب نہیں رہیں۔

اسلام سے بغض وحسد کرنے والے بعض مغربی یوروپی افراد اس بے بنیاد جھوٹی بات کی جم کر ترویج کر رہے ہیں کہ یورپ جن چیزوں کی بنا پر اسلام کے پھیلنے سے خوف کھا رہا ہے وہ چند امور ہیں:

☆ مذہب اسلام میں لچک اور نرمی نہیں اس لئے زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔

☆ یہ بالکل منفرد اور الگ دین ہے، اس کے اقدار واصول وضوابط دوسری تہذیبوں سے میل نہیں کھا سکتے، نیز یہ دوسری تہذیبوں کے تئیں تأثیر وتأثر کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

☆ یہ مذہب مغرب کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے اندر وحشت، نامعقولیت، علاقائیت اور اصول پرستی پائی جاتی ہے۔

☆ یہ مذہب ظلم وتشدد اور خطرات سے بھرپور ہے، اس کی فطرت میں دہشت گردی اور تہذیبوں کے مابین تصادم اختیار کرنا ہے۔

☆ یہ محض اپنی فوجی اور سیاسی مصلحتوں کو حاصل کرنے والا ایک سیاسی آئیڈیالوجی ہے۔

☆ تہذیبی، صنعتی اور جدید ٹیکنالوجی کی ترقیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والا مذہب ہے۔

اور اس جیسے نہ جانے کتنی اسلام کی شبیہ خراب کرنے والی بے بنیاد باتیں اور بہتان تراشیاں کی جارہی ہیں جن سے مذہب اسلام مبرا اور پاک وصاف ہے۔

درحقیقت اس کے اسباب کی جڑیں نہایت قدیم ہیں بایں طور کہ اسلاموفوبیا در اصل زمانہ قدیم سے جاری حق وباطل کی کشمکش ہے، جسے ہم بالفاظ دیگر اسلامی نظام اور دنیاوی من گھڑت نظام کہتے ہیں۔

آیئے ہم اسلامی دعوت کے دور اول میں پہونچ کر دیکھیں کہ قریش مکہ نے بھی حج کے وقت اسلام سے خوف زدہ کرنے کا وہی موقف اور پروپیگنڈا اختیار کیا تھا، جس وقت پورے جزیرہ عرب سے مکہ مکرمہ میں آتے اور دارالندوہ میں جمع ہوتے اور ایک ہی بات پر اتفاق کرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو خوف زدہ کریں، ہر ہر قبیلے تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پہونچ کر انہیں خبردار کردیتے کہ ہمارے مابین ایک ایسا شخص ظاہر ہوا ہے جو نبوت کا دعوی کررہا ہے جبکہ وہ جادوگر ہے اس کے قریب ہرگز نہ ہونا؛ کیونکہ وہ ایسا کلام پیش کرتا ہے جو خالص جادو ہے جو میاں بیوی کے مابین، آدمی اور اس کی ماں کے مابین، اس کے باپ اور اس کے بھائیوں کے مابین تفرقہ پیدا کردیتا ہے، یہی صورت حال یورپ کی بھی ہے کہ اس نے اسلام کو مختلف فوبیا کے ضمن میں تقسیم کررکھا ہے، پوری دنیا کو اسلام سے اس انداز سے خوف زدہ کردیا ہے کہ اسلام ایک زبردست خطرہ ہے جس وقت یہ دنیا پر چھا جائے گا تو آزادی، جمہوریت اور بالشوازم (اباحیت) سے دنیا

محروم ہوجائے گی دنیا کی موجودہ تہذیب میں ہونے والی سائنسی اور ٹکنالوجی ترقی کی رفتار تھم جائے گی، عورت کی آزادی اور حقوق مسلوب ہوجائیں گے اور پھر وہ دوبارہ شوہر کی حاکمیت کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور گھر کی دیواروں میں قید کردی جائے گی، یہی یورپ اور امریکہ کے خوف زدہ کرنے والے خیالات ہیں۔

ان اندیشوں کا علاج بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے، بایں طور کہ یورپ کا اسلام سے خوف درحقیقت ایسے ہی ہے جیسے مریض کا دوا سے، علاج دراصل مرض کی صحیح تشخیص اور مریض کو دوا اور علاج کی تاثیر سے مطمئن کرنے کا نام ہے۔

اس کو ہم مختصر طور پر درج ذیل تجاویز میں منحصر کرسکتے ہیں:

۱- ضروری ہے کہ اسلام کا تعارف کرانے پر توجہ دی جائے، اور اس کو صاف و شفاف اور اصلی صورت میں پیش کیا جائے نیز اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط خیالات کا ازالہ اور دعوت وتبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر ہر ممکن وسائل بالخصوص میڈیا کو استعمال کرکے کیا جائے۔

۲- اسلام کو ایک ہمہ گیر اور کامل مذہب اور نظام زندگی کی شکل میں پیش کیا جائے اور یہ باور کرایا جائے کہ اسلام عقیدہ وعبادت کا بھی نام ہے اور معاملات و اخلاقیات کا بھی، یہ معاشیات، سیاست، تعلیم وتربیت غرض تمام میدان میں ایک مکمل نظام اور اصول وضوابط کا نام ہے، اس کی تہذیب نہایت شاندار اور قدیم ہے، اس کی ثقافتیں بے انتہا وسیع اور سرسبز وشاداب ہیں، اور اسلام ہی دور جدید کا صانع اور علوم وفنون، تہذیب وثقافت اور ٹکنالوجی کے میدان میں موجودہ ترقی کا موجد ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ کے دوران انسانی حقوق، آزادئ نسواں، خواتین کے فطری حقوق، حقیقی جمہوریت کے اقدار،

آزادی خیال وآزادی رائے، انٹرنیشنل امن وسلامتی کے اصول وضوابط اور منصفانہ گلوبلائزیشن وغیرہ جو اقوام متحدہ کے معاہدوں میں ذکر کئے گئے ہیں اور جسے اسلام نے روئے زمین پر کئی صدیوں تک نافذ کیا ہے، دنیا والوں کے سامنے علی الاعلان بتادیا تھا۔

۳- ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے پوری قوت اور دلائل وشواہد کے ساتھ بتائیں کہ اس وقت انٹرنیشنل پیمانے پر جو اقتصادی اور سیاسی نظام رائج ہے وہ صہیونی نظام ہے، جو صرف صہیونیوں کے مقاصد کی تکمیل کررہا ہے اور عالمی معیشت مکمل طور پر صہیونیوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ لوگ پوری دنیا کو اپنا غلام بنانا چاہ رہے ہیں، ہر بغاوت، فتنہ وفساد کے پیچھے آج تک کی تاریخ میں انہی کا ہاتھ ہوتا ہے، پہلی اور دوسری دونوں عالمی جنگوں کے ذمہ دار بھی ہیں، انہیں نے محض اپنی اقتصادی مصلحتوں کے تحقق کی خاطر ان جنگوں کی آگ بھڑکائی تھی۔

۴- ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے یہ واضح کردیں کہ صہیونی قوم صرف مسلمانوں کی ہی دشمن نہیں ہے بلکہ یہ پوری انسانیت کی دشمن ہے، ان کے یہاں انسان کی حیثیت محض ایک غلام کی ہے جو ان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، کیونکہ یہ یہودی اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب بندے ہیں۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمیں کسی طرح کا خوف وخطر نہیں؛ کیونکہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ہم حق کے ساتھ۔ ارشاد باری ہے: "**قل لن يصيبنا إلا ما كتب الله لنا هو مولانا وعلى الله فليتوكل المؤمنون**" (اے نبی کہہ دیجئے کہ ہمیں جو تکلیف ملتی ہے وہ اللہ کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے، وہی ہمارا کارساز ہے، اور اللہ ہی پر مؤمنوں کو بھروسہ کرنا چاہئے)۔ ہمارے پاس پوری دنیا کی مشکلات، مسائل اور امراض کا حقیقی، مفید اور شفا بخش علاج موجود ہے، اگر مریض ہم سے ڈر رہا ہے تو ہماری ذمہ داری

بنتی ہے کہ ہم دوا مرض بتانے کے بعد پیش کریں، کیونکہ مریض اگر یہ جان جائے کہ جو چیز اسے دی جارہی ہے وہ دوا ہی ہے نہ کہ زہر، تو ان شاء اللہ ہماری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی اور آنے والے کل میں صرف اسلام کا ہی بول بالا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" (تم نہ تو کمزور پڑو اور نہ غم کرو اگر تم ایمان پر ثابت قدم رہے تو تمہیں بالا و برتر رہو گے)۔
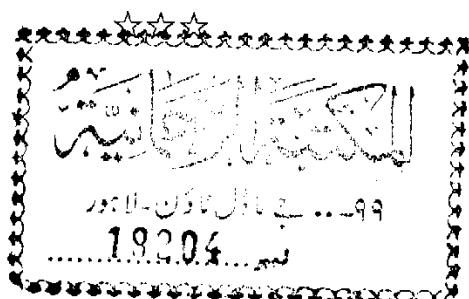
IFA Publications

161 - F, Basement, Joga Bai, Post Box No - 9708,

Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Tel : 26981327 Email:ifapublications@gmail.com